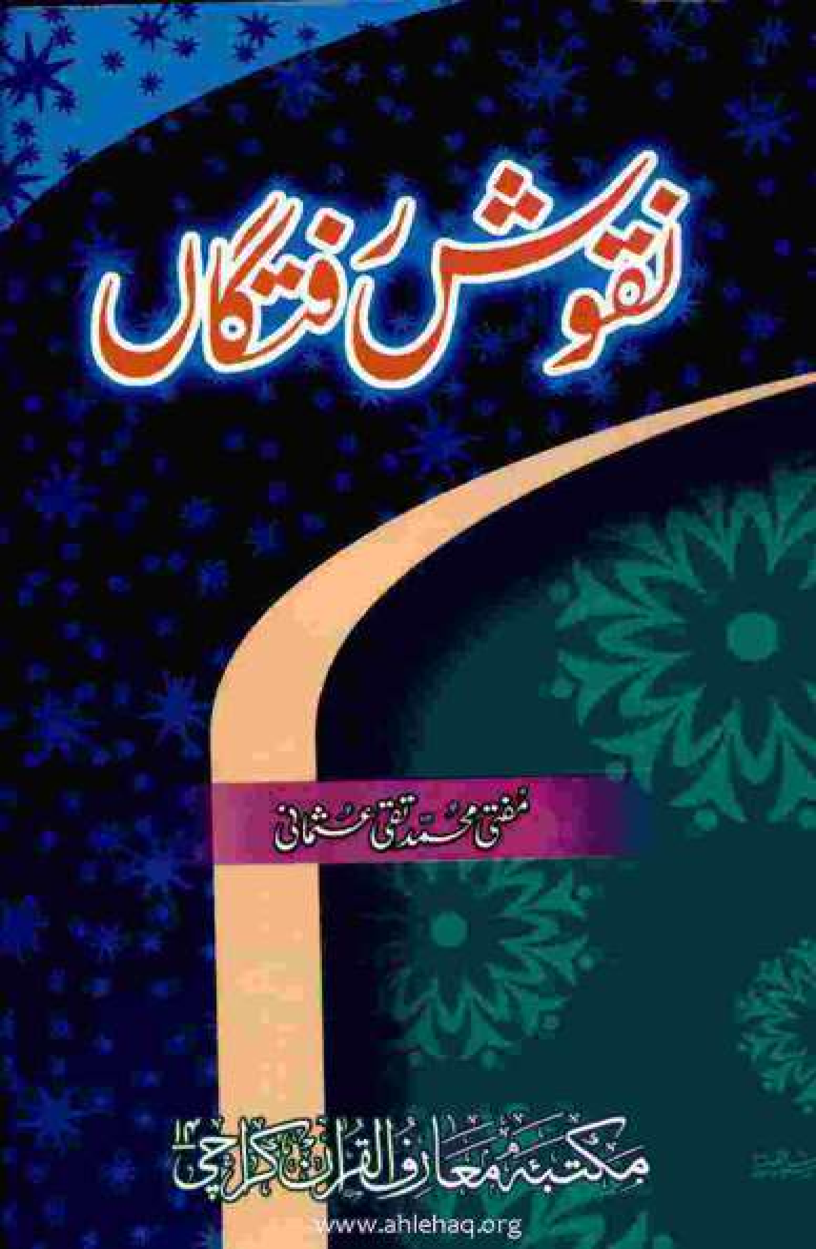

نقوش رفتگاں

مفتی محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی

نُقوشِ رفتگاں

نقوشِ رفتگاں

مفتی محمد تقی عثمانی

⁂

مکتبہ معارف القرآن کراچی

جملہ حقوق بحق مکتبہ معارف القرآن کراچی محفوظ ہیں

باہتمام : محمد مشتاق عثمانی
[illegible] : [illegible] الثانی [illegible] - اپریل [illegible]
مطبع : [illegible]
ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
فون : 5031565 - 5031566
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے

- مکتبہ معارف القرآن کراچی
فون 5031565 - 5031566
- ادارۃ المعارف احاطہ دار العلوم کراچی
فون 5049733 - 5032020

ڈھونڈیں ہم اب نقوشِ سبک رفتگاں کہاں؟
اب گردِ کارواں بھی نہیں کارواں کہاں؟

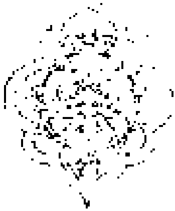

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حرف آغاز

زندگی میں جن شخصیتوں سے کسی بھی نوعیت کا رابطہ رہا، جب وہ اس دنیا سے سدھارے اور آخرت کی منزل کی طرف روانہ ہوئے تو اپنے طبعی تاثرات میں اپنے ماہنامے "البلاغ" میں لکھتا رہا۔ ان تاثرات میں اُن کے اوصاف و کمالات اور ان کے ساتھ گذرے ہوئے واقعات شامل ہوتے تھے۔ بعض احباب نے خیال ظاہر کیا کہ اب یہ مضامین جن کا خاصا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، ایک مجموعے کی صورت میں شائع کر دیئے جائیں۔ چنانچہ میرے بیٹے عزیزم مولوی عمران اشرف سلمہٗ نے "البلاغ" کی پرانی فائلوں سے ان مضامین کو اکٹھا کر کے انہیں کتابی صورت دیدی ہے جو اب "ادارۃ المعارف" سے شائع ہو رہے ہیں۔

بعض بزرگوں یا بعض علمی یا ادبی شخصیات کے بارے میں لکھنے کا ارادہ تھا، لیکن موقع نہ مل سکنے کی وجہ سے اُن پر کچھ لکھا نہیں جا سکا۔ لہٰذا اگر اس مجموعے میں اس دور کی کسی اہم شخصیت کا تذکرہ نہ ہو تو اس کے لازماً یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ خدانخواستہ اُن سے اعراض برتا گیا ہے، بلکہ بسا اوقات میری مصروفیات اس کا سبب بنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس مجموعے کو قارئین کیلئے مفید بنائیں۔ آمین

احقر

محمد تقی عثمانی

۱۸ جمادی الاول ۱۴۲۴ھ

فہرست مضامین

نمبر شمار	اسمائے گرامی	وفیات	صفحہ نمبر
۱	[illegible]	ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ	۱۱
۲	مولانا ظفر احمد عثمانی	ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ	۱۹
۳	جناب [illegible]	محرم الحرام ۱۳۹۵ھ	۳۳
۴	[illegible] مرحوم	ربیع الاول ۱۳۹۵ھ	۵۲
۵	[illegible]	۱۳۹۵ھ	۶۰
۶	جناب [illegible]	۱۳۹۵ھ	۶۲
۷	[illegible]	شوال المکرم ۱۳۹۶ھ	۶۳
۸	مولانا مفتی محمد شفیع	شوال المکرم ۱۳۹۶ھ	۶۵
۹	[illegible]	شوال المکرم ۱۳۹۶ھ	[illegible]
۱۰	[illegible]	محرم الحرام ۱۳۹۷ھ	۷۷
۱۱	[illegible]	۱۳۹۷ھ	۷۹
۱۲	[illegible]	۱۳۹۷ھ	۸۳
۱۳	[illegible]	ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ	۸۵
۱۴	[illegible]	شوال المکرم ۱۳۹۷ھ	[illegible]
۱۵	[illegible]	۱۳۹۸ھ	[illegible]
۱۶	[illegible]	۱۳۹۸ھ	[illegible]
۱۷	[illegible]	۱۳۹۹ھ	[illegible]
۱۸	[illegible]	۱۳۹۹ھ	[illegible]
۱۹	[illegible]	۱۳۹۹ھ	[illegible]
۲۰	[illegible]	۱۴۰۰ھ	[illegible]
۲۱	[illegible]	۱۴۰۰ھ	[illegible]
۲۲	[illegible]	ذی قعدہ ۱۴۰۰ھ	[illegible]
۲۳	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۲۴	[illegible]	[illegible]	[illegible]

نمبر شمار	اسمائے گرامی	سن وفات	صفحہ نمبر
۲۵	[illegible]	رجب المرجب ۱۳۰۱ھ	۱۵۹
۲۶	مولانا محمد [illegible] نانوتوی	ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ	۱۶۵
۲۷	مولانا محمد [illegible]	ربیع الثانی ۱۳۰۳ھ	۱۶۸
۲۸	[illegible]	ربیع الثانی ۱۳۰۳ھ	۱۷۳
۲۹	[illegible] مولانا [illegible]	شعبان المعظم ۱۳۰۲ھ	۱۷۶
۳۰	مولانا [illegible]	۱۳۰۳ھ	۱۸۵
۳۱	مولانا قاری [illegible]	شوال المکرم ۱۳۰۳ھ	۱۸۹
۳۲	مولانا قاضی [illegible]	۱۳۰۴ھ	۱۹۵
۳۳	[illegible] قادری	۱۳۰۴ھ	۱۹۸
۳۴	مولانا [illegible]	۱۳۰۴ھ	۲۰۱
۳۵	مولانا [illegible] بخاری	ربیع الثانی ۱۳۰۵ھ	۲۰۳
۳۶	مولانا [illegible]	ربیع الثانی ۱۳۰۵ھ	۲۰۴
۳۷	مولانا [illegible]	جمادی الاولی ۱۳۰۵ھ	۲۰۷
۳۸	مولانا محمد [illegible]	جمادی الاولی ۱۳۰۵ھ	۲۰۹
۳۹	مولانا [illegible]	جمادی الاولی ۱۳۰۵ھ	۲۱۱
۴۰	مولانا [illegible]	۱۳۰۵ھ	۲۱۶
۴۱	مولانا [illegible]	رمضان المبارک ۱۳۰۵ھ	۲۲۲
۴۲	دار العلوم کے [illegible]	۱۳۰۵ھ	۲۲۶
۴۳	حضرت مولانا محمد [illegible]	رجب المرجب ۱۳۰۶ھ	۲۲۹
۴۴	مولانا [illegible]	جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ	۲۳۲
۴۵	مولانا [illegible]	شعبان [illegible] ۱۳۰۷ھ	۲۳۴
۴۶	مولانا [illegible]	رمضان المبارک ۱۳۰۷ھ	۲۳۶
۴۷	[illegible]	شعبان المعظم ۱۳۰۷ھ	۲۵۳
۴۸	[illegible]	[illegible] ۱۳۰۸ھ	۲۵۹
۴۹	[illegible]	محرم الحرام ۱۳۰۹ھ	۲۶۲
۵۰	مولانا [illegible]	جمادی الثانی ۱۳۰۹ھ	۲۶۶
۵۱	مولانا [illegible]	۱۳۰۹ھ	۲۶۸
۵۲	مولانا [illegible]	۱۳۰۹ھ	۲۷۰

نمبر شمار	اسمائے گرامی	سنہ وفات	صفحہ نمبر
۵۳	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۵۴	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۵۵	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۵۶	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۵۷	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۵۸	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۵۹	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۶۰	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۶۱	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۶۲	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۶۳	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۶۴	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۶۵	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۶۶	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۶۷	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۶۸	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۶۹	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۷۰	[illegible] [illegible]	[illegible]	[illegible]
۷۱	[illegible] [illegible]	[illegible]	[illegible]
۷۲	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۷۳	[illegible]	[illegible]	[illegible]

مولانا شمس الحق صاحب فرید پوریؒ

ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ کو مشرقی پاکستان کے معروف عالم دین حضرت مولانا شمس الحق صاحب فرید پوری رحمۃ اللہ علیہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شب و روز کے ہنگاموں میں نہ جانے کتنوں کے بارے میں یہ خبر ملتی ہے کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ بہت سوں کے چھوٹ جانے سے دل شدید رنج و الم بھی محسوس کرتا ہے۔ لیکن ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جن کی وفات کی خبر دلوں پر بجلی سی گرا دے جن کا آفتاب زندگی مشرق میں غروب ہو تو مغرب والے اندھیرا محسوس کریں۔ اور جن کی یاد ان لوگوں کے دل میں بھی ایک ہوک پیدا کر دے جو ان سے رشتہ داری کا رسمی رابطہ نہیں رکھتے۔

اللہ تعالیٰ مولانا شمس الحقؒ پر اپنی رحمت کی بارشیں برسائے' وہ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ اپنے اخلاص' للہیت' مجاہدانہ عزم و عمل اور پر خلوص خدمات کی وجہ سے وہ علمی اور دینی حلقوں میں ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے' اور جو شخص بھی علم و دین کی کچھ قدر و قیمت اپنے دل میں رکھتا ہے اس کے لئے ان کی وفات ایک عظیم سانحہ ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں علم دین کے دو بڑے مرکز تھے۔ دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں سے اکتساب فیض کیا تھا' ان دونوں اداروں میں ان کو اکابر اہل اللہ کی صحبت اٹھانے کا موقع ملا' پھر دار العلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد تھانہ بھون میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چشمۂ فیض سے بھی سیراب ہوئے' جہاں علم کی حقیقت کے ساتھ قلب کو سوز و گداز نصیب ہوا۔

مولانا مشرقی پاکستان کے شہر فرید پور کے رہنے والے تھے آخر وقت تک وطن وہی رہا' لیکن علمی اور تبلیغی خدمات کے لئے ڈھاکہ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا' وہیں پر قلعۂ لال باغ کے پاس جامعہ قرآنیہ کے نام سے ایک دینی مدرسے کی بنیاد ڈالی جو ڈھاکہ کے مشہور اور مرکزی دینی اداروں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ کبھی کبھی چھٹیاں گذارنے کے لئے یا خرابئ صحت کی بنا پر اپنے اہل و عیال کے پاس فرید پور چلے جاتے تھے۔ ورنہ مدرسے کے انتظام کے علاوہ ملک کی

دینی اور کسی حد تک سیاسی سرگرمیوں میں مؤثر حصہ لینے کی وجہ سے سال کے بیشتر اوقات میں گذارتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص اور دینی لگن کی وجہ سے انہیں عوام و خواص میں غیر معمولی مقبولیت اور وجاہت عطا فرمائی تھی، وہ چاہتے تو اپنے لئے بہتر کوٹھی بنگلے بنوا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے قیام کے لئے جامعہ قرآنیہ کا ایک ایسا تنگ و تاریک حجرہ منتخب کیا جسے دیکھ کر کن فی الدنیا کانک غریب (دنیا میں ایسے رہو جیسے ایک پردیسی) کی عملی تفسیر سامنے آجاتی تھی۔

مولانا بنگلہ زبان کے بڑے اچھے مصنف تھے۔ بنگال کے عوام کو دینی تعلیمات سے روشناس کرانے کے سلسلے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ "بہشتی زیور" حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی وہ مقبولِ عام کتاب ہے جس نے لاکھوں بلکہ شاید کروڑوں مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا، زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس سے متعلق ایک مسلمان کی ضروریات کو اس میں جمع نہ کر دیا گیا ہو، حضرت مولانا شمس الحق صاحبؒ نے اس عظیم الشان کتاب کا بنگلہ ترجمہ کیا ہے جو ان اطراف میں بہت مقبول ہے، اس کے علاوہ حضرت مولانا تھانویؒ کی اور بھی بہت سی تصانیف کو بنگلہ زبان میں منتقل کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔

اخلاص اور خیر خواہی کے ساتھ حق گوئی اور بیباکی ان کی خاص صفت تھی، وقت کے حکمرانوں کے ساتھ ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے، اور عام طور سے وہ ان میں گھلے ملے رہتے تھے، لیکن جہاں کہیں دین کا معاملہ آجاتا اور حدود اللہ میں کوئی رخنہ پڑتا نظر آتا، وہ پوری صفائی، بیباکی اور جرأت و عزیمت کے ساتھ اپنی بات کہنے سے نہ چوکتے۔ اس صاف گوئی کے سلسلے میں انہیں بعض حکمرانوں کا معتوب بھی بننا پڑا۔ لیکن چونکہ ان کا غم و غصہ اخلاص کے ساتھ ہوتا تھا، اس لئے عام طور سے حکمران اس کا احساس کرتے تھے کہ ان کی حمایت و مخالفت میں کوئی ذاتی مفاد یا گندی سیاست کا کوئی داعیہ شامل نہیں ہوتا، وہ جو کچھ کہتے ہیں، اللہ کے لئے کہتے ہیں۔ اس احساس کا نتیجہ تھا کہ سیکڑوں معاملات میں حکمرانوں کی مخالفت کے باوجود کوئی ان کے درپے آزار نہیں ہوا۔ اور کسی نے انہیں اپنا دشمن نہیں سمجھا۔

مولاناؒ نے عمر زیادہ نہیں پائی، بمشکل ساٹھ تک پہنچے ہوں گے، لیکن سالہا سال سے مختلف بیماریوں نے انہیں گھیر رکھا تھا، اور ان مسلسل و متواتر بیماریوں نے انہیں بہت

ضعیف بنا دیا تھا۔ مجھے اپنے بچپن میں تو انہیں تندرست و توانا دیکھنا یاد ہے لیکن بندہ کے شعور کے بعد انہیں مکمل طور سے صحت مند کبھی نہیں دیکھا' اختلاج قلب کے مستقل مریض تھے ایک زمانے میں سارے جسم پر سخت ورم آگیا تھا' لیکن ان تمام بیماریوں کے باوجود دین کی خدمت کے لئے ان کے عزم و حوصلہ میں کبھی کمی نہیں آئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عمر گذرنے کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی محبت میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے' اور خدمت دین کے ولولے جوان ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے جس حصے میں جب کبھی علماء کی طرف سے کسی اجتماعی کام کا پروگرام بنتا' ناممکن تھا کہ مشرقی پاکستان کے علماء میں مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام اس کا جز نہ ہو......!

تین سال پہلے جہاد پاکستان کے فوراً بعد والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب دامت برکاتہم نے ان کی دعوت پر مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ راقم الحروف بھی ان حضرات کے ساتھ تھا۔ ڈھاکہ کے تمام اجتماعات اور نجی مجلسوں میں وہ اپنی بیماری کے باوجود دل و جان سے شریک رہے' لیکن جب کشور گنج' چاٹ گام اور سلہٹ وغیرہ جانے کا موقعہ آیا تو وہ سفر کے قابل نہ رہے اور ڈھاکہ ہی میں رک گئے۔ اور اس کے بعد ان پر مرض کا شدید حملہ ہوا' جب ہم لوگ واپس ڈھاکہ پہنچے تو مولانا اس وقت بھی شدید بیمار تھے' اور ان کو بار بار دل کے دورے پڑ رہے تھے۔ اتفاق سے حضرت والد صاحب مدظلہم بھی سفر کے دوران بیمار ہو گئے تھے اور مسلسل سفر نے بے حد کمزور کردیا تھا' اس بناء پر سفر کو مختصر کر کے کراچی واپس جانا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ ہم عصر کے وقت ڈھاکہ پہنچے اور اسی رات دو بجے کے طیارے سے کراچی روانہ ہونا تھا' ہمارا قیام مدرسہ اشرف العلوم میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ذرا مہلت ملے تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کر آؤں' اتنے میں ایک صاحب میرے پاس ان کا پیغام لیکر آئے کہ میں بھی بیمار ہوں اور حضرت مفتی صاحب بھی' تھوڑی دیر کے لئے تم آجاؤ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں کرم فرمائے محترم جناب مولانا مفتی محی الدین صاحب کو والد صاحب کے پاس چھوڑ کر لال باغ چلا گیا۔ جھٹپٹے کا وقت تھا' میں مولانا کے کمرے میں داخل ہوا تو کچھ دیر کے لئے ششدر رہ گیا۔ یہ مسجد کے ایک گوشے میں ایک نہایت تاریک سا کمرہ تھا' چاروں طرف سے بند بیچ میں ایک پارٹیشن کھڑا تھا' اور اس کے سامنے میں ایک چھوٹا سا تخت بچھا ہوا تھا' یہ تخت

مولانا کا بستر استراحت تھا، تخت کے نیچے ایک چٹائی پڑی تھی، مولانا اس چٹائی پر بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے، کھانا کیا تھا؟ ایک بڑے سے پیالے میں دال اور شوربے کا ملا جلا سالن تھوڑی روٹی اور بس۔

اس سے قبل مولانا کا خصوصی کمرہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، ہمیشہ مدرسے کے دفتر میں ملاقات ہوتی رہی جو بڑا کشادہ اور خاصا باسلیقہ تھا۔ آج پتہ چلا کہ جس شخص نے مدرسہ اور مسجد کی اتنی بڑی اور کشادہ عمارتیں بنوائی ہیں وہ خود اس طرح رہتا ہے؟ مجھ کو حیرت تھی کہ اختلاج قلب کا وہ مریض جو صبح و شام دل کے جھٹکے سہہ رہا ہے اس حجرے میں اس بے سروسامانی کے ساتھ کیسے گزارہ کر سکتا ہے؟ معاً میرے ذہن میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ گونج گئے "کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل" (دنیا میں ایسے رہو جیسے تم ایک پردیسی ہو یا ایک مسافر)

مولانا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اس وقت بھی طبیعت پر اضمحلال کا اثر تھا، لیکن کافی دیر تک بڑے اثر انگیز انداز میں مسلمانوں کے باہمی افتراق کا ذکر کرتے رہے اور اسے ختم کرنے کی کچھ عملی تجویزیں بتائیں۔

فرمانے لگے :

"ہم تو چند روز کے مہمان ہیں، خدا جانے پھر ملاقات ہوگی یا نہیں، اب آپ کے کام کرنے کا وقت ہے، خدا کے لئے اس افتراق کو ختم کرنے کی کوشش کیجئے، یہ ہماری تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ حضرت مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ عافیت کے ساتھ سلامت رکھے، ان سے میرا سلام کہئے اور میری طرف سے کہہ دیجئے کہ اتحاد کی جس دعوت کو لیکر وہ چلے ہیں وہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اسے کسی قیمت پر نہ چھوڑیں۔"

اس وقت نہ جانے کیوں بار بار میرے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ شاید یہ مولانا سے آخری ملاقات ہو ———— اور بالآخر یہ ملاقات آخری ہی ثابت ہوئی۔ ایک سال بعد پھر جانا ہوا، لیکن مولانا خرابی صحت کی بنا پر فیروزپور میں تھے، ملاقات کی حسرت ہی لیکر واپس آگیا ———— اور اب چند روز پہلے حضرت والد صاحب مدظلہم کی زبانی یہ اضطراب انگیز خبر سنی کہ مولانا ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے، ان کی بے چین

روح مالک حقیقی سے جا ملی اور ان کی ؏
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

علم و فضل کی دنیا میں کبھی کمی نہیں رہی، لیکن اخلاص اور دین کی سچی تڑپ وہ جنسِ گراں ہے جو کہیں خال خال ہی ملتی ہے۔ اس اعتبار سے مولانا کی وفات ملّت کا ایسا نقصانِ عظیم ہے جسکی تلافی ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا پر اپنی رحمتیں نازل فرما کر انہیں دارِ آخرت کا سکون اور چین نصیب فرمائے، ان کے بعض صاحبزادگان بھی عالم ہیں، امید ہے کہ انشاء اللہ وہ اپنے والد ماجد کے مشن کو سنبھال کر ان کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہوں گے، اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے اور خدمت دین کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

البلاغ جلد ۲ شمارہ ۱۲

◆

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ

ابھی حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سانحہ وفات کا زخم تازہ ہی تھا کہ آج حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کے حادثۂ ارتحال نے دلوں پر بجلی گرادی۔ آج کسی اور موضوع پر اداریہ لکھنے کا ارادہ تھا، لیکن اس المناک خبر نے دل و دماغ کو ہر دوسرے موضوع کے لئے بند کر دیا۔

برصغیر کے جن اہل علم و اخلاص نے اس خطے کو ایمان و یقین اور دین کے علم صحیح سے جگمگایا تھا اب وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں، اور ہر جانے والا اپنے پیچھے ایسا مہیب خلا چھوڑ کر جا رہا ہے جس کے پر ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ جہاں تک علم کے حروف و نقوش، کتابی معلومات اور فنی تحقیقات کا تعلق ہے ان کے شناوروں کی اب بھی زیادہ کمی نہیں، اور شاید آئندہ بھی نہ ہو، لیکن دین کا وہ صحیح مزاج و مذاق اور تقویٰ و طہارت، سادگی و قناعت اور تواضع و للّٰہیت کا وہ البیلا انداز جو کتابوں سے نہیں، بلکہ صرف اور صرف بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے، اب مسلسل سمٹ رہا ہے اور اب اس خسارے کی تلافی کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

دیوبند، سہارنپور اور تھانہ بھون کو اللہ تعالیٰ نے اس صدی میں ان نورانی شخصیتوں کا مرکز بنایا تھا جنہوں نے اپنے علم و فضل، جہد و عمل، ورع و تقویٰ، سادگی و انکسار اور خشیت و انابت میں قرون اولیٰ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ دین اور اس کے احکام کی اتنی جزرسی اور احتیاط کے ساتھ پابندی اس چودھویں صدی میں بھی ممکن ہے، اور قرونِ اولیٰ کی مثالیں آج بھی زندہ کی جا سکتی ہیں۔

لیکن اب علم و دین کے ان مراکز سے فیض پانے والے رفتہ رفتہ کوچ کر رہے ہیں اور کرب انگیز بات یہ ہے کہ جو دولت انہوں نے دیوبند، سہارنپور اور تھانہ بھون کے اکابر سے حاصل کی تھی وہ بھی انہی کے ساتھ رخصت ہو رہی ہے۔ ان حضرات کے علم و فضل کے مداح اب بھی بہت ہوں گے، ان کے کارناموں سے علمی استفادہ بھی بند نہیں ہو گا، لیکن صحیح مزاج و مذاق اور اصلاح و عمل کی وہ دولت جو صرف انہی حضرات سے حاصل ہو سکتی تھی

اسے حاصل کرنے والے نہ صرف کالعدم ہیں بلکہ اس کی طرف توجہ اور اس کی اہمیت کا احساس بھی مفقود ہے۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ، حضرت مولانا عبدالغنی صاحب پھول پوریؒ، حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ، حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ، حضرت مولانا وصی اللہ صاحب الٰہ آبادیؒ، حضرت مولانا محمد رسول خاں صاحب ہزارویؒ، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ یہ سب حضرات وہ ہیں جن کے علم یا سیاست خوشہ چین تو کافی ملیں گے، لیکن ایسے افراد ڈھونڈے سے بھی ملنے مشکل ہیں جنھوں نے ان کے عملی کمالات کو جذب کیا ہو۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اسی مقدس قافلے کے ایک رکن تھے آج وہ بھی ہم سے رخصت ہو گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے بھانجے تھے، اور حضرت تھانویؒ نے بیٹے کی طرح ان کی تربیت کی تھی۔ انہوں نے دینی تعلیم کانپور اور مظاہر العلوم سہارنپور میں حاصل کی تھی جہاں انہیں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی طویل صحبت نصیب ہوئی۔ بعد میں انہوں نے متفرق اوقات میں مظاہر العلوم کے استاذِ حدیث، خانقاہ تھانہ بھون کے مفتی اور مصنف اور مدرسہ عالیہ کے شیخ الحدیث کی حیثیت میں سالہا سال علمی اور تدریسی خدمات انجام دیں۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے حکم سے اور انہی کی سرپرستی میں انہوں نے "اعلاء السنن" تالیف کی جو علم حدیث میں اس صدی کا شاید سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ کتاب اٹھارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کے دو مبسوط مقدمے "**انہاء السکن**" اور "**انجاء الوطن**" اس کے علاوہ ہیں اس کتاب میں تمام فقہی ابواب سے متعلق احادیث نبویہؐ کو جمع کر کے ان کی بے نظیر شرح لکھی گئی ہے جس نے اپنی تحقیق، وسعت معلومات اور دقت نظر کے لحاظ سے پورے عالم اسلام سے اپنا لوہا منوایا ہے۔ افسوس ہے کہ اب اس کتاب کی ابتدائی جلدیں نایاب ہو چکی ہیں۔ اور جو حصے دستیاب ہیں ان کی بھی

کتابت و طباعت شایان شان نہیں ہے۔ اب اس کتاب کے دوبارہ شائع ہونے کے امکانات نظر آرہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے اسباب مہیا فرمادیں[1]

علم تفسیر میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ کا بڑا کارنامہ "احکام القرآن" ہے۔ یہ کتاب بھی حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے ایماء پر چار حضرات نے لکھنی شروع کی تھی۔ پہلی دو جلدیں جو سورہ فاتحہ سے سورہ نساء تک کی تفسیر پر مشتمل ہیں حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ کی لکھی ہوئی ہیں۔ بیچ کی دو جلدیں احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے لکھی ہیں۔ اور آخری جلد حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ نے۔ یہ حصے اگرچہ طبع ہو چکے ہیں مگر ان کی کتابت و طباعت بھی انتہائی ناقص ہے اور سورہ نساء سے سورہ شعراء تک کا حصہ ابھی ناتمام ہے۔ پچھلے دنوں جب حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ دارالعلوم تشریف لائے تو انہوں نے ذکر فرمایا تھا کہ میں سورہ نساء سے احکام القرآن کی تالیف کا آغاز کر چکا ہوں۔ خدا جانے یہ مسودہ کہاں تک پہنچ سکا ہوگا؟[3]

علم فقہ میں حضرت موصوفؒ کی عظیم یادگار ان کے فتاویٰ کا مجموعہ "امداد الاحکام" ہے۔ جب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے فتویٰ لکھنا چھوڑ دیا تھا تو خانقاہ تھانہ بھون میں آنے والے تمام سوالات کا جواب حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ ہی

---

[1] اس کتاب کا ایک مقدمہ "انہاء السکن" کراچی میں بھی طبع ہو چکا ہے اور اسی کو شام کے محقق عالم شیخ عبد الفتاح ابو غدہ مدظلہم نے "قواعد فی علوم الحدیث" کے نام سے اپنی گراں قدر تعلیقات کے ساتھ شائع کردیا ہے۔ دوسرا مقدمہ "انجاء الوطن" ابھی ان کے پاس زیر طبع ہے ادھر "اعلاء السنن" کی جلد اول پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی فرمائش کے مطابق مصنف علیہ الرحمۃ نے حال ہی میں نظر ثانی کی ہے اس کے مسودہ پر آج کل راقم الحروف تحقیق و تعلیق کر رہا ہے اور انشاء اللہ یہ جلد ہی منقریب ٹائپ کی عمدہ طباعت کے ساتھ دارالعلوم کراچی دار التصنیف سے شائع ہو جائے گی اللہ تعالیٰ باقی جلدوں کی اشاعت کا بھی انتظام فرمادے۔ آمین (م ت ع)

یہ کتاب عربی ٹائپ پر ادارۃ القرآن کراچی سے شائع ہو گئی ہے جس کے ۲۱ حصے ۱۳ مجلدات پر مشتمل ہیں۔ ناشر

[3] بحمد اللہ یہ بھی عربی ٹائپ پر ادارۃ القرآن سے ۵ جلدوں پر مشتمل چھپ چکا ہے۔ ناشر

لکھا کرتے تھے۔ اس طرح ان کے لکھے ہوئے فتاویٰ کا ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو گیا، جس کا انتخاب فرما کر حضرت تھانویؒ نے ہی اسکا نام "امداد الاحکام" تجویز فرمایا تھا جسے "امداد الفتاویٰ" کا تتمہ کہنا چاہئے۔ اس کا مسودہ سات ضخیم رجسٹروں میں ہے اب تک یہ گرانقدر مجموعہ شائع نہیں ہو سکا تھا، اب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی نگرانی اور سرپرستی میں یہ کتاب دارالعلوم سے شائع ہو رہی ہے، پہلی جلد کی کتابت مکمل ہو چکی ہے، اور امید ہے کہ وہ انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آجائے گی۔[1]

یہ علم تفسیر، علم حدیث اور علم فقہ میں حضرت مولاناؒ کے صرف تین نمایاں ترین کارناموں کا مختصر تعارف تھا۔ اس کے علاوہ بھی حضرت موصوفؒ نے مختلف دینی موضوعات پر عربی اور اردو میں دسیوں کتابیں یا مقالات لکھے ہیں لیکن اگر صرف مذکورہ بالا تین کاموں ہی کو دیکھا جائے تو بلاشبہ وہ ایسے کام ہیں جو آج کے دور میں بڑی بڑی اکیڈمیاں سالہاسال کی محنت اور لاکھوں روپے کے خرچ سے بھی انجام نہیں دے پاتیں۔ حضرت مولاناؒ نے یہ سارے کام تن تنہا انجام دیئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

علمی خدمات کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ کی سیاسی اور اجتماعی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایماء پر انہوں نے قیام پاکستان کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ حضرت تھانویؒ نے قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم کے پاس مختلف علماء کے جو تبلیغی وفود بھیجے ان میں وہ بھی شامل تھے۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس اللہ سرہ نے قیام پاکستان کی جدوجہد کے لئے جو جماعت "جمیعت علماء اسلام" کے نام سے قائم فرمائی تھی ایک عرصہ تک وہ اس کے نائب صدر رہے اور ہندوستان کے طول و عرض میں پاکستان کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کیا۔ سلہٹ کے عوام سے پاکستان میں شمولیت کیلئے جو ریفرنڈم کرایا گیا، اس میں پاکستان کی کامیابی بڑی حد تک دو حضرات کے مرہون منت ہے ایک حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ اور دوسرے حضرت مولانا محمد سہول صاحب عثمانیؒ۔

مولانا کی انہی خدمات کا اثر تھا کہ جب پاکستان بنا اور اس سرزمین پر پہلی بار پاکستان کا

---

[1] بحمد اللہ اس کی ۳ جلدیں بہترین کتابت پر مکتبہ دارالعلوم کراچی سے شائع ہو گئی ہیں۔ ناشر

پرچم لہرانے کا وقت آیا تو قائد اعظم کی نگاہ انتخاب دو حضرات پر پڑی ایک شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی جنہوں نے مغربی پاکستان میں یہ جھنڈا لہرایا اور دوسرے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی جن کے ہاتھوں سے مشرقی پاکستان میں یہ پرچم بلند ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد اگرچہ انتخابی سیاست سے موصوف کا کوئی تعلق نہیں رہا لیکن جب بھی مسلمانوں کو کوئی اجتماعی ضرورت پیش آئی تو مولانا ان لوگوں میں سرفہرست تھے جن کی طرف سب کی نگاہیں باتفاق اٹھتی تھیں۔

عبادت و تقویٰ میں مولاناؒ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ اور حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ جیسے حضرات کی صحبت اٹھائی تھی ان کی عملی زندگی میں اس صحبت کا اثر نمایاں تھا۔ ہم جیسے طفلان مکتب نے انہیں ضعف اور کبر سنی کی حالت ہی میں دیکھا۔ لیکن اس عمر میں بھی ان کی ہمت و عزیمت اور ان کا جذبہ و حوصلہ ہم جوانوں کے لئے قابل رشک تھا۔ آخر وقت تک دار العلوم اسلامیہ ٹنڈوالہ یار میں صحیح بخاری کا درس دیتے رہے اور پچاسی سال کی عمر میں ضعف و امراض کے ساتھ بھی نہ صرف پانچوں وقت کی نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کرتے بلکہ ظہر و عصر کی نمازوں میں امامت بھی خود فرماتے تھے۔ احقر کو مشرقی پاکستان کے ایک دورے میں آپ کی رفاقت میسر ہوئی۔ ضعف و علالت کے باوجود عبادات کا اہتمام اور وعظ و تذکیر کا جذبہ ہر دم جوان معلوم ہوتا تھا۔

آخری بار دار العلوم تشریف لائے تو اساتذہ دار العلوم نے ان سے اجازت حدیث لی" اس وقت کمزوری کا یہ عالم تھا کہ موٹر میں بیٹھنے کے لئے بھی دو آدمیوں کے سہارے کی ضرورت تھی لیکن اسی مجلس میں "احکام القرآن" کی تکمیل کے لئے تصنیفی کام شروع کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا اور کہا کہ جب مجھے مرض اور کمزوری کا زیادہ احساس ہونے لگتا ہے تو میں صحیح بخاری کا درس شروع کر دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے صحت و قوت عطا فرما دیتے ہیں۔

آخر وقت تک ڈاک کے جواب میں پابندی حیرت انگیز تھی' کبھی یاد نہیں ہے کہ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے یا احقر نے کوئی عریضہ لکھا ہو اور تیسرے چوتھے روز جواب نہ آیا ہو۔

اعلاء السنن کی پہلی جلد "احیاء السنن" کے نام سے چھپی تھی اور اس میں ایک

ضرورت کی بناء پر "**الاستدراک الحسن**" کے نام سے ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا گیا تھا۔ ان مختلف ناموں اور سوال وجواب کے انداز کی بناء پر علماء کو بالخصوص عالم عرب کے اہل علم کو بڑی الجھن پیش آتی تھی۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مد ظلہم نے خواہش ظاہر فرمائی کہ یہ جلد ایک مسلسل کتاب کی صورت اختیار کرے اور اس کا نام بھی "**احیاء السنن**" کے بجائے "**اعلاء السنن**" ہی ہو جائے تو اچھا ہو۔ یہ کام کس قدر الجھا ہوا اور دیدہ ریزی کا طالب تھا اسکا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے یہ کتاب دیکھی ہے لیکن حضرت مولانا عثمانیؒ نے اس پیرانہ سالی میں یہ پیچیدہ کام بھی مکمل فرمادیا۔ اب یہ کتاب دارالعلوم کے دارالتصنیف سے ٹائپ پر شائع ہونے والی ہے۔ تمنا تھی کہ یہ حضرت موصوف کی حیات ہی میں منظر عام پر آجائے لیکن تقدیر میں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے **ولن یؤخر اللہ نفسا اذا جاء اجلها**۔

حضرت مولاناؒ کے ساتھ موجودہ صدی کی ایک تاریخ رخصت ہو گئی وہ ان مقدس ہستیوں میں سے تھے جن کا صرف وجود بھی نہ جانے کتنے فتنوں کے لئے آڑ بنا رہتا ہے۔ ان کی وفات پورے عالم اسلام کا سانحہ ہے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے انھیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہمیں ان کے فیوض سے مستفید ہونے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

البلاغ جلد ۸ شمارہ ۱۲

جناب محمد زکی کیفیؒ

میرے بھائی جان

تم کیا گئے کہ رونقِ ہستی چلی گئی

باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے، اس دنیا کی ہر شخصیت، خواہ وہ کتنی دلکش، کتنی پربہار، کتنی ہردلعزیز اور کتنی زندگی افروز ہو بالآخر اسے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ آگے اور پیچھے کا فرق ضرور ہے لیکن ہم میں سے کون ہے جو یہاں ہمیشہ رہنے کے لئے آیا ہو۔ لیکن انسان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ وہ اس سامنے کی حقیقت کو ہمیشہ نظرانداز کر کے اس کائنات اور اس میں پائی جانے والی رنگینیوں سے اس طرح دل لگا بیٹھتا ہے جیسے اسے ان کے بقائے دوام کی کوئی ضمانت مل گئی ہے کل من علیہا فان اور وما تدری نفس بای ارض تموت کے قرآنی ارشادات سے کوئی کٹر سے کٹر دہریہ بھی انکار نہیں کر سکتا، لیکن عملی زندگی میں یہ مسلّم حقیقت ہماری نظروں سے اس طرح اوجھل رہتی ہے جیسے یہ کوئی حقیقت ہی نہیں۔

اس کا نتیجہ ہے کہ اب تک اس بات پر یقین کر لینے کو دل آمادہ نہیں ہوتا کہ آج جو کچھ لکھنے جا رہا ہوں وہ اپنے سب سے بڑے بھائی (مولانا محمد زکی کیفی صاحبؒ) کی وفات کا تذکرہ ہے، ان کے سفر آخرت کا بیان ہے، ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے واقعات ہیں۔ جانتا ہوں کہ یہ روح فرسا واقعات پیش آچکے، مانتا ہوں کہ یہ دنیا فانی ہے اور اس میں بھائی جان جیسی ہنستی کھیلتی، اور چہکتی مہکتی شخصیت کا یکایک اٹھ جانا کوئی پہلا یا نیا واقعہ نہیں ہے

تسلیم نہ کیا جائے لیکن دل میں رہ رہ کر اٹھنے والی اس ہوک کو کیا کروں جو بھائی جان کے نام کے ساتھ "مد ظلہم" کے بجائے "مرحوم و مغفور" کے الفاظ لکھتے ہوئے دل پر لرزہ، ہاتھوں میں کپکپاہٹ اور جسم میں جھرجھری پیدا کر دیتی ہے۔ ہر وقت، ہر آن اور ہر لمحہ سامنے رہنے والی اس دلکش تصویر کو کیا کہوں جس کے بارے رہ رہ کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ابھی سامنے سے مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتی نمودار ہوگی۔ اور ہمیشہ کی طرح دل کے سارے داغ دھو دے گی۔ غموں کے سارے بادل چھٹ جائیں گے اور یہ ڈراؤنا خواب جو ایک ہفتہ سے نظر آرہا ہے یک بیک ختم ہو جائے گا۔ ہر گھڑی کانوں میں گونجنے والی اس محبت بھری آواز کو کیا کروں جو ہر پریشانی کے موقع پر تسلی اور سکون کا پیغام بن کر سنائی دیتی تھی اور اب بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ غموں کے اس انبوہ میں یک بیک سنائی دیگی اور ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی لذت و حلاوت سے جسم و جان کا گوشہ گوشہ سکون پا جائیگا۔ وہ آواز جس نے ہر کٹھن گھڑی میں ماں باپ، بہن بھائی اور بیوی بچوں سے لیکر اپنے تمام عزیز و اقارب اور دوست احباب کے حوصلے ابھارے۔ جس نے ہر نازک موڑ پر، یہاں تک کہ اپنے آخری لمحات تک اپنوں پرایوں سب کی ڈھارس بندھائی۔ جس نے ایک عرصہ تک علم و ادب اور دین و سیاست کی محفلیں زندہ رکھیں اور جس کی نغمہ بار چہک سے لاہور کے علمی و ادبی حلقے اب بھی مترنم ہیں کیسے یقین کر لوں کہ اب وہ چہچہتی دوبارہ سنائی نہیں دے گی ؎

زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ آواز اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

لیکن نہیں! اب یہ یقین کرنا پڑے گا کہ قدرت کے قوانین اٹل ہیں اور اس قسم کی جذباتی شاعری سے ان کا مفہوم بدلا نہیں کرتا۔ اگر کوئی سخت سے سخت محنت یا بڑی سے بڑی قیمت کسی جانے والے کو واپس لا سکتی تو میں سب سے پہلے اپنے بھائی جان کو موت کے پنجوں سے چھین کر اس "کاشانہ زکی" کو دوبارہ خوشیوں سے آباد کرنے کی کوشش کرتا جو ابھی چند روز پہلے تک مسرتوں کا گہوارہ تھا اور آج آنسوؤں میں بہہ رہا ہے۔ اگر کسی بڑی سے بڑی قربانی کے ذریعہ کسی کی موت کو مؤخر کرنا ممکن ہوتا تو میں سب سے پہلے بھائی جان کو اپنے ان

دل شکستہ والدین کے سامنے لا کھڑا کرتا جنہوں نے اس ضعیفی میں بسترِ علالت پر ایسے بیٹے کا زخم سہا ہے۔ لیکن تقدیر کے فیصلوں میں اس اگر مگر کی گنجائش نہیں۔ میں کیا اور میرا صدمہ کیا؟ اور اس صدمے کو دور کرنے کے لئے میری کسی قربانی کی حقیقت کیا؟ اس زمین کے سینے پر سب سے بڑا صدمہ ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، صدیقہ عائشہؓ، فاطمۃ الزہرہؓ اور تمام صحابہؓ نے سہا تھا۔ قربانی پیش کرنے کا لفظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان جاں نثاروں پر جچتا تھا اور اگر کوئی بڑی سے بڑی قربانی کسی کی اجل کے فیصلے کو ٹال سکتی تو وہ یقیناً سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ایک سانس کے بدلے اپنی ہزاروں زندگیاں نچھاور کر دیتے۔ لیکن حکیم و علیم کا بنایا ہوا یہ کارخانہ حیات کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے جس کے فیصلے آرزوؤں، تمناؤں اور حسرتوں کے مدار پر گردش کیا کریں۔ تم ایک محدود دائرے میں رہ کر سوچتے ہو، تمہاری ساری تمنائیں اور حسرتیں اسی تنگ دائرے سے وابستہ ہیں۔ اس دائرے سے باہر وہاں تک ان کی رسائی نہیں جہاں سے پوری کائنات کا نظام کنٹرول ہو رہا ہے، جہاں کائنات کی ہر چیز کی گھڑی گھڑی کا حساب مقرر ہے اور جہاں کی مستحکم اور حکیمانہ منصوبہ بندی میں کوئی جھول نہیں ہے۔ اگر تمہیں اس مستحکم منصوبہ بندی اور اس میں پنہاں حکمتوں کا علم نہیں تو ان حکیمانہ منصوبہ بندیوں کا قصور نہیں، تمہاری جہالت کا قصور ہے۔ تم اس کائنات میں خدائی کے اختیارات لیکر نہیں، خدا کے بندے بن کر آئے ہو لہٰذا مشیت کی حکمتوں کو جھانکتے پھرنا تمہارا کام نہیں، تمہارا کام یہ ہے کہ قدرت کے فیصلوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرو اور انکی حکمتوں کو اللہ کے حوالے کر دو۔

ہاں ایک ظلوم و جہول بندے کی حیثیت سے کسی المناک واقعہ پر رنجیدہ ہونا اور اپنے کسی بچھوٹ جانے والے کو شرعی حدود میں رہ کر یاد کرنا تمہارا فطری حق ہے اور اللہ نے تمہارے اس حق پر پابندی نہیں لگائی۔ اس حزن کے بعد مشیت ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم ہے اور اس بات پر ایمان ہے کہ جو کچھ ہوا وہ حکیم مطلق کی حکمتوں کے عین مطابق ہے۔ ماشاء اللہ کان وما لم یشأ لا یکون اور ذٰلک تقدیر العزیز العلیم۔ اور انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لیکن اس حادثے نے دل و دماغ پر جو غیر معمولی اثر ڈالا ہے اور اس کے بعد بھائی جان مرحوم کے ساتھ گزرے ہوئے تیس سالہ واقعات کی جو چلتی پھرتی تصویریں ہر لمحے نگاہوں

کے سامنے ہیں ان سے مسلسل دل پر لگنے والے نشتروں کو روکنا میرے بس کی بات نہیں۔ آج ان نشتروں میں آپ کو بھی تھوڑا سا حصہ دار بنانا چاہتا ہوں۔

بچپن کے بالکل آغاز میں بھائی جان کا تصور ہمارے ذہن میں ایک ایسی محبوب مگر بارعب شخصیت کا تھا جس سے آنکھیں ملانا مشکل تھا۔ ان کا سب سے پہلا واقعہ جو مجھے یاد ہے' وہ یہ ہے کہ ہمارے دیوبند کے مکان میں ایک کمرہ بھائی جان کے لئے مخصوص تھا۔ اس میں ایک میز پر ان کی کتابیں کاپیاں اور قلم دوات رکھی رہتی تھی۔ میری عمر اس وقت بمشکل چار سال کی ہوگی' میں ایک روز ان کے کمرے میں داخل ہوا تو کھیلتے کھیلتے میرا ہاتھ ان کی دوات کو لگا اور ساری روشنائی میز پر پھیل گئی' روشنائی کے اس طرح پھیل جانے سے واقعتاً جو نقصان ہو سکتا ہے اس کا احساس تو اس وقت کیا ہوتا؟ لیکن بھائی جان کی بارعب شخصیت کے پیش نظر اس کے جو نتائج ہماری ذات پر اثر انداز ہو سکتے تھے ان کا اندیشہ ضرور دامن گیر ہو گیا۔ بھائی جان کا رعب تو بیشک چھایا ہوا تھا۔ لیکن جس چیز کا رعب تھا۔ اس کا عملی تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا' آج یہ یقین تو ہو گیا کہ اب یہ عملی تجربہ ہو کر رہیگا لیکن وہ کیسا ہوگا؟ اور ہمارے لئے کس حد تک قابل برداشت ہوگا؟ اس کا اندازہ بالکل نہیں تھا۔ ہم نے پہلے تو روشنائی کو صاف کرنے کی کوشش کی لیکن جب علاج سے درد بڑھتا ہی چلا گیا تو اس کو اپنے حال پر چھوڑ کر باہر نکل آئے اور گھر میں ایک ایک فرد سے یہ تحقیق شروع کی کہ بھائی جان کا ہاتھ (طمانچے کا ہاتھ) کیسا پڑتا ہے؟ لیکن اس کا جواب پانے کے لئے بجائے ہر فرد کے چہرے پر ہنسی دیکھ کر تشویش بڑھتی چلی گئی اور اس وقت رفع نہ ہوئی جب تک بھائی جان خود نہ آگئے۔ کیونکہ وہ بھی دوسروں کی زبانی میرا یہ سوال سنکر مسکرائے اور پھر ایک تبسم آمیز مصنوعی غصے کے ساتھ مجھے تھپتھپا کر رخصت کر دیا۔ مجھے اپنے اس سوال کا عملی جواب تو اس کے بعد کبھی نہ مل سکا لیکن بڑے ہونے کے بعد بھائی جان یہ بات یاد دلا کر اکثر چھیڑا کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی رفاقت کے سلسلے میں ان کی سب سے پرانی بات جو مجھے یاد ہے وہ یہی ہے۔

قارئین البلاغ شاید یہ الجھن محسوس کریں کہ اس مرتبہ میں نے خلاف عادت یہ ذاتی قصے کیوں چھیڑ دیے ہیں' لیکن میں نے دو وجہ سے ان واقعات کو بیان کرنا نامناسب نہیں سمجھا۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ قارئین البلاغ سے آٹھ سالہ رفاقت کی بناء پر اپنا حق سمجھتا

ہوں کہ اس جیسے موقع پر انہیں اپنے تاثرات میں حصہ دار بناؤں۔ دل میں اٹھنے والے ان جذبات کی داستان آپ نہیں تو اور کون سنے گا۔ پچھلے آٹھ سال سے ہر مہینے کم از کم البلاغ کا اداریہ تو ضرور لکھتا ہی ہوں لیکن لکھتے وقت مجھے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اسے کون کون پڑھے گا؟ صرف ایک شخصیت ایسی تھی۔ جس کے بارے میں مجھے یقین ہوتا تھا کہ اسے جس دن البلاغ ملے گا اسی روز یہ اداریہ لازماً اس کے مطالعہ میں آئیگا اور وہ بھائی جان کی شخصیت تھی۔ بھائی جان کو اس بات سے بڑی غیرت آتی تھی کہ حضرت والد صاحب مد ظلہم یا ہم بھائیوں میں سے کسی کی کوئی قابل ذکر بات انہیں کسی تیسرے شخص کے واسطے سے معلوم ہو' وہ ہماری ایک ایک بات سے خود باخبر رہتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ البلاغ پہنچنے کے تیسرے ہی دن ان کا خط مجھے مل جاتا جس میں اداریہ پر تبصرہ اور اس کے محاسن و معائب کا تذکرہ ہوتا تھا اور خط نہ ملے تب بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ بھائی جان کو کوئی دوسرا شخص البلاغ میں میرے کسی مضمون کا حوالہ دے اور وہ انہوں نے نہ پڑھا ہو۔ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں اداریہ لکھ رہا ہوں اور اس پر کیف یقین سے محروم ہوں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بھائی جان کا تذکرہ محض میرا ذاتی تذکرہ نہیں' ان کی شخصیت ان خاموش رضاکاروں میں سے تھی جو انتہائی خلوص کے ساتھ ملک و ملت کی قیمتی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں' لیکن جب شہرت اور کریڈٹ کے ہار تقسیم ہوتے ہیں تو گوشہ گمنامی میں جا بیٹھتے ہیں۔ جو لوگ ملک کی دینی تحریکات کے اندرونی احوال سے باخبر ہیں ان سے پوچھئے کہ ملک کی دینی تحریکات میں کونسا موقع ایسا تھا جس میں دامے قدمے سخنے ان کا کوئی نہ کوئی حصہ نہ ہو؟ لیکن جب ان تحریکات سے شخصیتوں کا ابھرنے کا موقع آتا تو وہ محض ایک دینی کتابوں کے ناشر و تاجر یا زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب شاعر تھے اس سے آگے کچھ نہیں۔ انہوں نے سچ کہا تھا ۔

کہنے کو ایک ذرۂ ناچیز ہیں مگر
تعمیر کائنات کے کام آرہے ہیں ہم

بڑے بڑے دینی اور سیاسی رہنماؤں کے تذکرہ نگار آپ کو بہت سے مل جائیں گے

لیکن وہ خاموش رضاکار جن کے خون پسینے سے ملک و ملت کا چمن سیراب ہوتا ہے ان کے حالات سنانے والا آپ کو ڈھونڈے سے بھی ملنا مشکل ہے اور آج میں آپ کو ایک ایسے ہی رضاکار کا حال سنا رہا ہوں۔

ہاں تو بچپن میں بھائی جان کی شخصیت ہمارے لئے صرف ایک بارعب شخصیت تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ اس رعب پر محبت غالب آتی چلی گئی۔ قیام دیوبند کے دوران مجھے ان کے چند ہی مناظر یاد ہیں جن میں سے وہ منظر بھلائے نہیں بھولتا جب ۱۹۴۸ء میں ہم چار بھائی اور دو بہنیں والدین کے ساتھ بغرض ہجرت پاکستان کے لئے روانہ ہو رہے تھے اور بھائی جان دہلی کے اسٹیشن پر بھیگی نگاہوں کے ساتھ ہمیں رخصت کر رہے تھے۔ میں اس وقت پانچ سال کا بچہ تھا اور زیادہ سے زیادہ اتنا سمجھ سکتا تھا کہ ان کے یہ آنسو والدین اور بھائی بہنوں سے جدائی کے تاثرات ہیں، لیکن بعد میں ذرا ہوش آیا تو اندازہ ہوا کہ بات صرف اتنی نہیں تھی بلکہ ان آنسوؤں میں غموں حسرتوں اور تفکرات کا ایک جہاں پوشیدہ تھا۔ ہم بھائیوں میں تنہا وہ تھے جنہوں نے قیام پاکستان کی تحریک میں حضرت والد صاحب مدظلہم کا ہاتھ بٹایا تھا جنہوں نے اس مقصد کے لئے والد صاحب کے ساتھ سفر کئے تھے، جو سرحد ریفرنڈم، لاہور کانفرنس اور حیدرآباد کانفرنس میں والد صاحب کے ساتھ رہے تھے۔ جنہوں نے اس کام کے لئے دیوبند میں نوجوانوں کی ایک تنظیم بنائی تھی جنہوں نے فسادات کے زمانے میں لوگوں کے گھروں پر راتوں کو پہرے دیئے تھے اور جن کی جوانی کی بیشتر امنگیں پاکستان سے وابستہ تھیں، لیکن اسوقت بھائیوں میں تنہا وہی تھے جنہیں والد صاحب کے ساتھ پاکستان آنے کے بجائے ہندوستان میں رکنا پڑ رہا تھا۔ اس ہندوستان میں جہاں (قیام پاکستان کے بعد) ایک لمحہ ٹھہرنا بھی ان کے لئے دوبھر تھا اور جہاں کا ماحول اس وقت (خود بقول ان کے) انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا لیکن چونکہ حضرت والد صاحب مدظلہم شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی فوری طلبی پر اچانک روانہ ہوئے تھے اور دیوبند میں بہت سے الجھے ہوئے کام نمٹانے باقی تھے جن میں بھائی جان کے سوا بھائیوں میں سے کوئی بھی کمسنی کے سبب نمٹا نہیں سکتا تھا، اس لئے حضرت والد صاحب انہیں کچھ عرصے کے لئے وہیں چھوڑ کر جانے پر مجبور ہوئے۔ بھائی جان اس وقت تیئیس چوبیس سال کی عمر میں ان تمام الجھے ہوئے کاموں کا بوجھ، والد صاحب کے ساتھ پاکستان نہ پہنچنے کی حسرت اور گھر والوں سے جدائی کا غم لئے کھڑے تھے اور گویا زبان

حال سے اپنا یہ شعر پڑھ رہے تھے کہ ۔

میں ہوں کہ مرے دم سے ہے میخانے کی رونق
میرا ہی بھری بزم میں اک جام تہی ہے

پھر تقریباً سات مہینے وہ ہندوستان میں رہے۔ اس دوران ان کی جو کیفیت تھی اس کا اندازہ ان کے ایک منظوم خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے عید کے موقع پر ہم سب بہن بھائیوں کے نام بھیجا تھا اس خط کے یہ اشعار مجھے آج تک یاد ہیں۔۔

مانا کہ میں دل درد کا خوگر ہی بنا لوں
لیکن جو نقش چھپ نہ سکے کیسے چھپا لوں
آنکھوں میں ہے اندھیر تو دل ڈوب رہا ہے
ایسے میں بتاؤ کہ میں کس کس کو سنبھالوں
تم عید کی خوشیوں سے کرو گھر میں چراغاں
میں محفل دل اپنے ہی داغوں سے سجا لوں
ماں باپ جدا ' بھائی بہن پاس نہیں ہیں
ایسے میں بتاؤ کہ میں کیا عید منالوں

لیکن ملی غیرت کا یہ عالم تھا کہ جس ماحول میں پاکستان کا نام لینا جرم تھا وہاں اعلانیہ پاکستانی ٹوپی پہنتے پاکستان کے حق میں بحثیں کرتے اور اس کے خلاف کسی کی زبان سے ایک لفظ نہیں سن سکتے تھے۔ عیدالاضحیٰ کا موقع آیا اور گائے کی قربانی پر جگہ جگہ فسادات ہوئے۔ بہت سے مسلمانوں نے گائے کی جگہ بکرے ذبح کئے انہیں بھی سمجھایا گیا کہ ایسے ماحول میں گائے کی قربانی مناسب نہیں لیکن انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی گائے خرید کر کھلم کھلا ذبح کی اور ہندوؤں کے خوف سے اس معمول کو ترک کرنا گوارا نہیں کیا۔ ان کا مسلک خود ان کے بقول یہ تھا۔

غیر کے سامنے جھک جائے یہ سر؟ ناممکن!
اس نے اے جان جہاں آپ کا در دیکھا ہے

تقریباً سات مہینے ہندوستان میں رہے اور انہوں نے یہ زمانہ جس کرب میں گزارا اس کا تذکرہ وہ بعد میں کبھی کبھی کیا کرتے تھے۔ ان کی عمر اس وقت کوئی بہت زیادہ نہ تھی لیکن انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اپنی کٹھن ذمہ داریوں کو نبھایا۔ حضرت والد صاحب مد ظلہم کی شخصیت دیوبند میں تمام اعزاء و اقرباء و احباب کے لئے ایک مرکز و محور کی حیثیت رکھتی تھی اور ان کی بہت سی ذمہ داریاں حضرت والد صاحب مد ظلہم کے سر تھیں جنہیں وہ پاکستان پہنچنے کے بعد نبھا نہیں سکتے تھے۔ بھائی جان دیوبند میں حضرت والد صاحب مد ظلہم کے نمائندے بن کر اور حضرت والد صاحب مد ظلہم کی ہدایات کے مطابق تمام ضروری کام انجام دیتے رہے۔ اس زمانے میں دونوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بھائی جان کتنا کٹھن کام انجام دے رہے تھے۔ ان کے کارنامے کے تصور سے خود انہی کا ایک شعر یاد آیا۔

میں کچھ نہ سہی لیکن میری ہی اسیری ہے
اک ربط ہوا قائم گلزار سے زنداں تک

سات آٹھ مہینے بعد محرم ۶۸ھ میں وہ ہماری بھابھی اور ضعیف دادی جان کو لے کر کراچی پہنچے۔ ادھر ان کی جلد از جلد آمد کے انتظار میں ہم لوگوں کا عالم یہ تھا کہ برادر محترم مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہم روزانہ ڈاکیے کا انتظار کرنے کی بجائے خود ڈاک خانے پہنچ جاتے اور وہاں سے حضرت والد صاحب مد ظلہم کی ڈاک چھٹوا کر لایا کرتے۔

جس میں عموماً بھائی جان کا خط ضرور ہوا کرتا تھا۔ وہ روزانہ اپنے حالات کی تفصیل سے مطلع کیا کرتے تھے اور پھر جس روز ان کا وہ خط موصول ہوا جس میں انہوں نے اپنی آمد کی تاریخ سے مطلع کیا تھا' اس روز گھر بھر میں مسرت کا عالم ناقابل بیان تھا۔ ہم سب لوگ انہیں لینے کے لئے ایئرپورٹ پہنچے اور انتظار کی شدید گھڑیاں گزارنے کے بعد اچانک ان کا جو

مسرت سے دمکتا ہوا چہرہ سیڑھیوں پر نمودار ہوا وہ اس وقت بھی اس طرح فردوس نگاہ ہے جیسے ابھی یہ واقعہ ہو رہا ہے۔ ہماری ضعیف دادی جان ان کے ہمراہ تھیں، اور اس وقت نقل و حرکت سے معذور ہو گئی تھیں، اس وقت ان کو کرسی سے کار تک لانے کا انتظام کچھ مشکل نہ تھا، لیکن بھائی جان اپنی ایک جھلک دکھا کر دوبارہ ہوائی جہاز میں گئے اور واپس آئے تو دادی جان کو انہوں نے بازوؤں میں اٹھایا ہوا تھا اور پھر اسی حالت میں انھیں باہر لیکر آئے۔

کراچی پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انہوں نے والدین کے مشورے سے لاہور کو مستقل سکونت کے لئے اختیار کر لیا۔ انار کلی میں مال روڈ کے قریب ایک وسیع دکان کرائے پر لی اور "ادارۂ اسلامیات" کے نام سے دینی کتابوں کا ایک کتب خانہ قائم کیا، جو بحمد اللہ اب تک قائم ہے۔ یہ کتاب خانہ کیا تھا؟ شہر بھر کے علمی اور ادبی حلقوں کا ایک مرکز تھا، جہاں علم و ادب اور دین و سیاست کی باغ و بہار محفلیں جمتیں اور ہر شعبہ زندگی کے افراد کا رنگا رنگ اجتماع رہتا تھا۔

۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں بھائی جان نے والدین کے ہمراہ پہلا حج کیا۔ اس سفر میں مجھے بھی والدین اور بھائی جان کی رفاقت میسر آئی۔ میری عمر اس وقت صرف نو سال تھی۔ اس مبارک سفر میں والدین کی خدمت کی سعادت بھائی جان کے حصے میں آئی۔ وہ نہ صرف والدین کا بلکہ دوسرے ہمراہیوں کا کام بھی خود ہی کرنے کی فکر میں رہتے۔ مناسک حج کی ادائیگی میں ان کی والہیت قابل دید تھی، وہ ملتزم پر کھڑے ہو کر جس انداز سے بلک بلک کر دعائیں مانگتے اس کا نقشہ آج بھی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ اس سال حج کے موقع پر گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اب تو حجاج کے لئے حکومت کی طرف سے بہت سی سہولیات مہیا کر دی گئی ہیں، اس وقت ان سہولیات کا نام نہیں تھا۔ منیٰ میں درجہ حرارت ۱۲۰ درجے تک پہنچا ہوا تھا۔ قربان گاہ پر بلا مبالغہ سینکڑوں افراد کھڑے کھڑے چکرا کر گرے اور ختم ہو گئے۔ اس قیامت کی گرمی میں بھائی جان نے تنہا تمام ہمراہیوں کی طرف سے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ قربانی ادا کی۔ وہ ہمیشہ ان تمام مشقتوں کا ذکر انتہائی محبت کے ساتھ کرتے اور کوئی شخص ان کا ذکر شکایت آمیز انداز میں کرتا تو اسے نرمی و ہمدردی سے ٹوکتے تھے۔ ان کا مسلک تو خود انہی کے الفاظ میں یہ تھا کہ۔

تیرے دیوانوں کو خوفِ دار کیا؟
پھول چنتے ہیں تو خوفِ خار کیا؟

مکہ مکرمہ میں ہمارا قیام حرم شریف کے باب الرباط کے اوپر بنی ہوئی ایک عمارت میں تھا، جہاں سے حرم شریف کا منظر ہر وقت سامنے رہتا تھا۔ ایک دن اچانک بارش شروع ہو گئی۔ بھائی جان بجلی کی سی پھرتی سے نیچے اتر کر میزابِ رحمت کی طرف لپکے اور اس کے پانی سے اپنا جسم اور کپڑے تر کر لئے۔ میں نے بھی ان کے پیچھے پیچھے پہنچنے کی کوشش کی مگر ان کا ساتھ نہ دے سکا اور قریب پہنچنے تک بارش رک گئی۔ وہ ہر ہر سعادت کے حصول میں اسی طرح ہمیشہ سبقت لیجاتے اور ہم ان کی گرد کو نہ پہنچ سکتے۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ آخرت کے سفر میں بھی اتنی عجلت سے کام لیں گے اور اس مرحلے میں بھی اتنی جلدی ہمیں پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ آہ وہ کیا شعر کہہ گئے تھے۔

پھر مری گرد کو بھی پہنچ سکے گی دنیا
جس کو دنیا سے مرا جینا ہو وہ اب بن جائے

حج کے سفر سے واپسی پر سفینۂ عرب ہی میں ہم نے شہیدِ ملت لیاقت علی خان صاحب مرحوم کی شہادت کی خبر سنی۔ اس خبر پر جہاز کے تمام ہی افراد آبدیدہ تھے، لیکن بھائی جان کو میں نے اس موقع پر بچوں کی طرح روتے دیکھا۔

بچپن میں ہمیں بھائی جان کے ساتھ بے تکلف ہونے کی جرأت نہ ہوتی، لیکن پھر رفتہ رفتہ انہوں نے ہم سب بھائیوں کو اپنے آپ سے اس حد تک قریب کر لیا کہ تکلف کے سارے پردے اٹھ گئے۔ ان سے ملاقات کرکے بیک وقت ایک باپ کی شفقت، ایک بھائی کا پیار اور ایک بے تکلف دوست کا لطف محسوس ہوتا تھا۔ ہمارے لئے اس سے بڑھ کر روزِ عید کوئی نہ ہوتا جب وہ کراچی آجاتے اور ان کے لئے اس سے بڑھ کر مسرت کا دن کوئی نہ ہوتا جب ہم بھائیوں میں سے کوئی لاہور پہنچ جاتا۔ ریلوے اسٹیشن یا ایئرپورٹ پر ایک دوسرے کو دیکھتے ہی ہماری کائنات مسرتوں سے گنگنا اٹھتی۔ ہم آپس میں ملتے تو دنیا و مافیہا

سے بے خبر ہو جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے اس فضائے بیکراں کا ہر ذرہ ہماری مسکراہٹوں میں محو ہے اور افق سے افق تک مسرتوں کا اجالا ہی اجالا پھیل گیا ہے۔ بھائیوں کے درمیان الفت و محبت کا تعلق ایک فطری چیز ہے لیکن ہمارے تعلق میں بھائیوں کی محبت کے ساتھ دوستی کی ایک ایسی حلاوت شامل ہو گئی تھی جسے بیان کرنے کے لئے اظہار محبت کے تمام اسلوب بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے درمیان دین و مذہب، تاریخ، تصوف، معیشت و سیاست، شعر و شاعری، لطائف و ظرائف، ادب و صحافت غرض کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو زیر بحث نہ آیا ہو۔ بحث و مباحثہ سے لے کر تفریح اور خوش طبعی تک وہ ہم چھوٹوں کے ساتھ اس طرح شریک تھے جیسے وہ ہمارے ہم عمر اور بے تکلف دوست ہوں۔ ہم بات بات پر ہنستے بلکہ بعض اوقات بے بات بھی ہماری تلمیحات کو بسا اوقات دوسرے لوگ سمجھ نہ پاتے اور پوچھتے کہ اس میں ہنسی کی کیا بات تھی؟ بھائی جان اکثر کہا کرتے تھے اور یہ ہم سب کا حال تھا کہ دنیا کی کسی محفل اور کسی تفریح میں اتنا کیف و سرور میسر نہیں ہوتا جتنا بھائیوں کی ملاقات میں ہوتا ہے اور اگر کوئی دوسرا شخص ہمیں اس طرح ایک دوسرے میں محو دیکھ لے تو شاید ہمیں دیوانہ سمجھے مگر وہاں تو حال یہ تھا کہ ؎

خلقے ہمی دیوانہ دیوانہ پکارے

انہیں خود کوئی راحت یا خوشی میسر آتی تو والدین اور بہن بھائیوں کو اس میں شریک کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بعض اوقات یہ جذبہ اس حد تک بڑھ جاتا کہ دوسروں کو الجھن ہونے لگتی۔ ایک مرتبہ میں لاہور میں تھا، رات گئے تک انہوں نے گھر کو جنت زعفران بنائے رکھا، سونے کے وقت ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں بستر پر لیٹ چکا تھا، روشنیاں گل ہو چکی تھیں، اچانک انہوں نے اپنے کمرے سے مجھے پکارا، مجھے کچھ تشویش سی ہوئی اور میں دوڑا ہوا پہنچا۔ لیکن انہوں نے مجھے اپنے قریب بستر پر بٹھایا اور بستر کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ ان کے سرہانے ایک کھڑکی تھی اور باہر سے ایک درخت کی شاخیں اس کھڑکی کو چھپاتی تھی۔ چودھویں رات کی چاندنی اس درخت کے پتوں میں چھن چھن کر بستر پر ایک عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ بھائی جان کہنے لگے کہ

"دیکھو! کتنا خوبصورت منظر ہے' مجھے یہ منظر بڑا حسین معلوم ہوا میں نے سوچا کہ تم بھی اس منظر سے لطف اندوز ہو کر سوؤ' بس تمہیں اسی لئے بلایا تھا۔" اور پھر اتنی سی بات مزید آدھا گھنٹہ ان کے پاس بیٹھنے اور باتیں کرنے کا بہانہ بن گئی۔ یہی وہ باتیں تھیں جن کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ دوسرے لوگ انہیں دیکھیں تو ہمیں دیوانہ کہیں۔

اسی آخری حج سے واپسی کے بعد وہ بار بار کہتے تھے کہ اب دل یہ چاہتا ہے کہ سب بھائی ایک ساتھ عمرہ کے لئے جائیں اور میں نے اس کے لئے دعائیں بھی کی ہیں مگر یہ کسے معلوم تھا کہ ان کی یہ آرزو ان تمناؤں میں ہے جن کے بارے میں وہ کہہ گئے تھے کہ۔

تمنائیں ہیں لاکھوں' کم ہے لیکن فرصت ہستی
اقامت کے ارادے ہیں مگر حالت سفر کی ہے

والدین سے انہیں جو تعلق تھا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ وہ دور رہنے کے باوجود ان کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور ان کی تمام جزئیات سے پوری طرح باخبر رہتے اور ادا ادا سے انہیں راحت پہنچانے کی فکر کرتے تھے۔ والدین کو بھی ان سے جو راحت ملتی اور جس مزاج شناسی کے ساتھ وہ ان کے خدمت کرتے وہ ہم لوگوں کے لئے قابل رشک تھی۔ اللہ تعالیٰ حضرت والد ماجد مدظلہم کو عافیت کے ساتھ ہمارے سروں پر سایہ فگن رکھے' پچھلے دنوں جب انہیں دل کا دورہ ہوا تو دوپہر کے وقت انہیں ہسپتال میں داخل کیا گیا اور شام کو مغرب کے فوراً بعد بھائی جان ان کے سرہانے موجود تھے۔ اس کے بعد پندرہ بیس روز تک انہوں نے جس انداز سے حضرت والد صاحب مدظلہم کی خدمت کی وہ ہمارے لئے ایک گرانقدر مثال تھی۔ اسی زمانے میں پہلی بار انہیں بھی دل میں معمولی تکلیف محسوس ہوئی چند روز انہوں نے اس تکلیف کو چھپایا' لیکن ایک روز ہسپتال ہی میں کہنے لگے کہ "تم لوگ سوچو گے کہ مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا لیکن میں چند روز سے دل کے پاس ایک ثقل محسوس کر رہا ہوں" اسی وقت معائنہ کرایا گیا لیکن کارڈیو گرام بالکل صاف تھا' اس لئے اطمینان ہو گیا لیکن واپس لاہور پہنچنے کے بعد انہیں یکے بعد دیگرے وجع القلب کے متعدد دورے ہوئے اور کچھ وقفے کے بعد ایک شدید حملہ ہوا' جس کی شدت کی اطلاع ہمیں بہت بعد میں ہوئی مگر

بحمد اللہ کچھ دنوں کے بعد ان کی طبیعت ٹھیک ہو گئی اور اس کے بعد انہوں نے کراچی کے کئی سفر کئے۔

حضرت والد صاحب مدظلہم سے ان کی خط و کتابت جسے انہوں نے پوری طرح محفوظ رکھا ہے، گزشتہ ۳۹ سال کی پوری تاریخ ہے جس میں ملک و ملت سے لیکر دارالعلوم اور گھریلو مسائل تک کوئی قابل ذکر واقعہ فروگزاشت نہیں ہوا۔ پھر حضرت والد صاحب مدظلہم کی علالت کے بعد سے زیادہ تر خط و کتابت مجھ سے رہتی تھی۔ چند مہینے ہوئے ہیں کہ انہوں نے ایک مختصر خط میں ہمارے دیوبند کے ایک قریبی عزیز کے انتقال کی خبر دی، یہ خبر ہم سب کے لئے انتہائی اندوہناک تھی، اسلئے ساتھ ہی انہوں نے مجھے لکھا کہ حضرت والد صاحب مدظلہم کو اس حادثے کی اطلاع کسی مناسب موقع پر رفتہ رفتہ کرکے دینا، ایسا نہ ہو کہ اچانک اس اطلاع سے حضرت والد صاحب کی صحت پر خدانخواستہ کوئی برا اثر پڑے۔ چنانچہ یہ اطلاع ان کی ہدایت کے مطابق اسی طرح دی گئی۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ اب کچھ ہی دنوں بعد بھائی جان خود اپنے بارے میں اس سے زیادہ جانکاہ خبر اس سے کہیں زیادہ ضعف و علالت کے عالم میں حضرت والد صاحب مدظلہم کو سنانے کی ذمہ داری بھی ہمیں سونپنے والے ہیں۔ آہ بھائی جان کا کیسا شعر کس موقع پر یاد آیا ہے:

ابھی سے کس لئے ہے عارض گلنار پر شبنم
ابھی تو بات محفل میں حدیث دیگراں تک تھی

ابھی عیدالفطر کے بعد وہ برادر محترم جناب محمد رضی صاحب مدظلہم کی بچی کی شادی میں شرکت کے لئے کراچی آئے تھے۔ اس موقع پر وہ انتہائی بے تابانہ انداز میں حج و زیارت کی خواہش کا ذکر کرنے لگے۔ اس وقت عالم اسباب میں اس خواہش کے پورے ہونے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی، لیکن یہ تمنا دعا بن کر ان کے سینے میں مچلتی رہی، یہاں تک کہ انہوں نے وہ نعت کہی جو البلاغ کے اس شمارے میں شائع ہو رہی ہے، اور جس کا مقطع یہ ہے کہ:۔

دعا ہے یہ کیفی کہ اس سال ہم بھی
مدینے کے دیوار و در دیکھ آئیں

اس وقت تک بھی بظاہر اسباب حج کو جانے کی کوئی صورت نہیں تھی اور دن بالکل قریب آچکے تھے لیکن بارگاہ قضا و قدر میں ان کی یہ دعا قبول ہو چکی تھی' ان کو معلوم بھی نہ تھا کہ ان کے ایک مخلص اور باوفا دوست جو کسی سرکاری عہدے پر فائز نہیں ہیں انھیں حج پر لیجانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ نعت شائع کرنے کے دوسرے تیسرے ہی دن اچانک ان کا ٹیلی فون آیا کہ حکومت پاکستان کی طرف سے جو حج وفد بنا ہے اسمیں آپ کا نام بھی شامل ہے۔ بھائی جان نے لمحہ بھر کے لئے بھی اس وفد میں شامل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی' لیکن جب غیب سے یہ صورت پیدا ہوئی تو انہوں نے حضرت والد صاحب مدظلہم سے اجازت کے لئے کراچی ٹیلیفون کیا' والد صاحب نے حالات سنکر اجازت دیدی۔ اس زمانے میں انھیں سینے میں وجع القلب (انجائنا) کی تکلیف چل رہی تھی' لیکن حضرت والد صاحب مدظلہم نے فرمایا کہ انشاء اللہ حجاز مقدس کی برکت سے وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے حج کا ارادہ کرلیا اور اسی دوران انھوں نے وہ نعت کہی جو ان کی آخری نعت ہے اور جس کا مطلع ہے۔

اس لئے آرزو ہے جینے کی
دیکھ لوں پھر زمین مدینے کی

وہ حج کے ارادے سے کراچی پہنچے' ایئرپورٹ سے گھر آتے ہوئے راستے ہی میں انہوں نے سنایا کہ میں نے حج وفد میں شمولیت کی خود ذرہ برابر کوشش نہیں کی تھی' البتہ ایک روز اللہ تعالی سے یہ باتیں کر رہا تھا کہ "مالک بے نیاز آپ نے میری کوئی دعا بھی رد نہیں کی' لیکن میں حج و زیارت کی دعا کر رہا ہوں' ابھی تک اس کے پورا ہونے کے آثار نظر نہیں آتے اور اب حج کی آخری پرواز بھی جانے والی ہے۔ اب اگر حج مقدر نہیں تو محرومی کے اسباب پیدا فرما دیجئے۔" کہنے لگے کہ "میں یہ دعا کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ میرے پاس ٹیلی فون آیا کہ تمہارا نام حج وفد میں شامل کرلیا گیا ہے" اس کے بعد انہوں نے اپنی یہ دونوں نعتیں بڑے مزے لے لیکر سنائیں۔

اس انداز سے بھائی جان حج کو گئے ان کے رفیق خاص جناب مصطفیٰ صادق صاحب

(مدیر وفاق لاہور) راوی ہیں کہ جس ذوق و شوق و انابت اور رعایت حدود کے ساتھ انہوں نے مناسک ادا کئے ہیں، وہ سب لوگوں کے لئے باعث رشک تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولوی محمود اشرف سلمہ مدینہ طیبہ میں زیر تعلیم تھے۔ وہ اس سفر میں ان کے ساتھ رہے، وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے دل کی تکلیف کو کسی فضیلت کے حصول یا عاشقانہ آرزو کی تکمیل میں آڑے آنے نہیں دیا۔ اور یہ تکلیف آڑے آتی بھی کیسے؟ انہیں تو۔ خود ان کے الفاظ میں۔ اس بات کا یقین تھا کہ۔

پھر سامنے میں ہم روضۂ اطہر کے رہیں گے
دیکھیں گے تجھے، تو غم ایام! کہاں ہے؟

چنانچہ وہ حج کے پورے سفر میں بحیثیت مجموعی تندرست رہے، اور ان کی طبیعت لاہور کے مقابلے میں بہت بہتر رہی۔ تقریباً انیس روز بعد وہ کراچی پہنچے تو یہ ہجری حساب سے ان کی ولادت کا دن تھا اور اس روز ان کی عمر کے پچاس سال پورے ہوئے تھے، اس مرتبہ کراچی میں وہ چوبیس گھنٹے ٹھہر کر لاہور روانہ ہوئے۔ اس وقت یہ وہم و گمان کیسے ہو سکتا تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہوگی، لیکن برادر محترم جناب مصطفےٰ صادق صاحب (مدیر وفاق لاہور) نے صحیح لکھا تھا کہ "وہ حج کے موقع پر اللہ کے مہمان بن گئے تھے مگر اس عارضی مہمانی سے ان کی طبیعت سیر نہیں ہوئی، اور وہ بہت جلد اللہ کے دائمی مہمان بن گئے" ان کی اصلی خواہش تو وہ تھی جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک شعر میں کیا تھا۔

الٰہی نبض ہستی ٹوٹ جائے ایسے عالم میں
زہے قسمت کہ ان کا آستاں ہے اور جبیں میری

اور۔

نگاہ اولین کیفی کہ جب روضہ پہ ہو یارب
تمنا ہے کہ رہ جائے نگاہ واپسیں ہو کر

وہ اکثر ایک بزرگ کا واقعہ بڑے رشک آمیز انداز میں سنایا کرتے تھے کہ انہوں نے ایک مرتبہ خواب میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ وسلم کی زیارت کی اور اس خواب میں یہ تمنا ظاہر کی کہ آپ کے جلوہ جہاں آرا کے بعد میں کسی اور کو دیکھنا نہیں چاہتا اس لئے اس دیدار کے بعد میری بینائی سلب ہو جائے' چنانچہ وہ بیدار ہوئے تو بینائی جا چکی تھی۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر انہوں نے کس قیامت کا شعر کہا تھا۔

چھین لے مجھ سے نظر اے جلوہ خوش روئے دوست
میں کوئی محفل نہ دیکھوں اب تری محفل کے بعد

اللہ تعالٰی نے ان کی یہ ساری دعائیں اور آرزوئیں کس شان سے پوری کی ہیں؟ اللہ اکبر! حج سے واپس ہونے کے بعد انہیں چند ہی روز گزرے تھے کہ دل کی تکلیف شروع ہو گئی' یہ تکلیف انہیں پہلے بھی بارہا ہو چکی تھی۔ اسلئے شروع میں کسی کو کوئی تشویش نہ ہوئی' ادھر حضرت والد صاحب مدظلہم کی طبیعت کئی روز سے ناساز تھی' پاؤں میں ایک انتہائی شدید قسم کا درد روز بروز شدت اختیار کر رہا تھا۔ اس لئے بھائی جان نے اس حالت میں کراچی والوں کو صحیح صورتحال سے مطلع کرنا پسند نہ کیا' ٹیلیفون پر یہی کہتے رہے کہ طبیعت بحمد اللہ! افاقہ پذیر ہے۔ عاشورہ کے دن حضرت والد صاحب مدظلہم العالی کی پوری ٹانگ میں ایسا شدید درد شروع ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا اور جس کے بارے میں معالجوں کا خیال تھا کہ یہ درد کی شدید ترین قسم ہے' یہاں تک کہ نقل و حرکت بالکل بند ہو گئی۔ اسی حالت میں مغرب کے بعد لاہور سے فون آیا کہ بھائی جان کی تکلیف اب نسبتۃً شدت اختیار کر گئی ہے اور معالجوں کا مشورہ یہ ہے کہ انہیں ہسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ ہرچند کہ بعد میں فون کی کچھ دوسری اطلاعات اطمینان بخش بھی ملیں مگر دل لحظہ بہ لحظہ بے تاب ہو رہا تھا۔ طے یہ کیا گیا کہ ہم میں سے ایک بھائی صبح آٹھ بجے کی پرواز سے لاہور پہنچ جائے گا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ صبح ہونے سے پہلے کیا قیامت گزرنے والی ہے؟ تو بھائی جان ہی کا شعر پھر یاد آگیا۔

ستارے ڈوبنا شبنم کا رونا شمع کا بجھنا
ہزاروں مرحلے ہیں صبح کے ہنگام سے پہلے

بھائی جان کے تیماردار بالخصوص احقر کے چھوٹے بھائی الحاج حافظ شفقت علی صاحب، بھائی جان کے مخلص اور باوفا دوست جناب مصطفیٰ صدیقی صاحب مدیر وفاق، احقر کے بھانجے حکیم سید مشرف حسین صاحب اور دوسرے اعزا و اقربا انہیں ہسپتال لے جانا چاہتے تھے مگر وہ ہسپتال جانے پر راضی نہ تھے اور بضد تھے کہ انہیں گھر ہی میں رکھا جائے۔ ان کے اشعار کہاں تک سناؤں کہ ہر موقع پر ان کا ایک شعر اس طرح یاد آجاتا ہے جیسے وہ اسی موقع کیلئے کہا گیا ہو۔

دل مضطر نے مرنے کی تمنا عمر بھر کی ہے
نہ پوچھو داستان زیست کیونکر مختصر کی ہے
عزیزو تجھ بے فکرو اب چارہ گر کی ہے
یہ سب راز محبت! چوٹ یہ قلب و جگر کی ہے

انہی کے اس اصرار کی بناء پر ہسپتال لے جانے میں تاخیر ہوئی یہاں تک کہ [illegible] بجے کے قریب انہیں ہچکی ہوئی جس سے حالت بگڑ گئی۔ اسی وقت تیمارداروں نے ہسپتال لیجانے کا فیصلہ کر لیا اور انہوں نے بھی ہاں کر دی۔ اگرچہ بڑی احتیاط سے ہسپتال پہنچایا گیا، وہاں بھی اور راستے میں بھی نہ صرف باتیں کرتے رہے بلکہ اپنی کیفیت کو بتاتے رہے، انہیں گلوکوز کا ڈرپ لگایا گیا، اسی حالت میں اچانک انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے سانس رکنے کی شکایت کی گویا پہلے ہی یہ شعر پڑھ رہے ہوں۔

یوں سلسلۂ تار نفس ٹوٹ رہا ہے
محسوس یہ ہوتا ہے قفس ٹوٹ رہا ہے

ڈاکٹروں نے بار بار سانس واپس لانے کی تدبیریں کیں "آکسیجن" تو پہلے ہی لگی ہوئی تھی، مگر کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی وہ عالم بالا کا سفر شروع کر چکے تھے "[illegible] بار [illegible] سے نکلی کی

سی پھرتی سے دو کروٹیں لیں اور اس تماشا گاہ کی سرحد پار کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

بجلی تڑپ کے قصۂ غم ہی چکا گئی
الجھا ہوا میں خار و خس آشیاں میں تھا

ڈاکٹروں نے بڑی محنت سے قلب کی مالش کر کے اسے حرکت میں لانے کی کوشش کی مگر ان کے چہرے پر چھایا ہوا ابدی سکون یہ کہہ رہا تھا کہ ۔

اب کیا بتائیں گی ہمیں دوراں کی گردشیں[1]
ہم اب حدود سود و زیاں سے نکل گئے

بھائی جان ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ کو دیوبند میں پیدا ہوئے تھے' حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا نام "محمد زکی" تجویز فرمایا تھا اور تاریخی نام "سعید اختر" (۱۳۴۵) رکھا گیا تھا (جس میں آٹھ دن حذف کرنے پڑتے ہیں) بعد میں جب انہوں نے شعر و سخن کا سلسلہ شروع کیا تو اپنا تخلص کیفی کر لیا تھا۔ ان کی ذہانت و ذکاوت اور حاضر جوابی بچپن ہی سے حیرت انگیز تھی۔ ہمارے جد امجد حضرت مولانا محمد یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب مدظلہم اور ہمارے دادا "رحمۃ اللہ علیہ" کا دہلی جانا ہوا' بھائی جان اس وقت بہت چھوٹے تھے' والد

---

[1] یہ تمام اشعار بھائی جان ہی کے ہیں اور غور کرنے سے آخری شعر میں عجیب و غریب لطیفہ یہ نظر آیا کہ اگر اس شعر کو اس طرح پڑھا جائے کہ ۔ اب کیا بتائیں گی تمہیں دوراں کی گردشیں
تم تو حدود نفع و زیاں سے نکل گئے
تو پہلا مصرعہ ان کی عیسوی تاریخ وفات ۱۹۷۵ء بن جاتا ہے اور دوسرا مصرعہ (آٹھ دن کے فرق سے) ان کی ہجری تاریخ پیدائش (یعنی ۱۳۴۵ھ) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً ۔

صاحب انہیں ساتھ لے گئے۔ فتح پوری کی مسجد میں کسی نماز کے لئے جانا ہوا' وہاں سے واپسی میں بھائی جان نے حضرت والد صاحب مدظلہم کے جوتے اٹھالئے' مگر دادا مرحوم کے جوتے نہیں اٹھائے' دادا مرحوم نے ازراہِ تفنن پوچھا "کیوں بھئی یہ کیا؟ تم نے میرے جوتے کیوں نہیں اٹھائے؟" بھائی جان نے حضرت والد صاحب مدظلہم کے طرف اشارہ کرتے ہوئے برجستہ جواب دیا "آپ کے جوتے یہ اٹھائیں گے۔"

ہم بھائیوں میں یہ سعادت صرف بھائی جان ہی کے حصے میں آئی کہ انہوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی خدمت و صحبت بلکہ بیعت کا شرف بھی حاصل کیا' حضرت والد صاحب مدظلہم انہیں ہر سال تھانہ بھون ساتھ لیجاتے تھے' اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان سے بہت محبت فرماتے تھے' بارہا حضرت نے انہیں سر کی مالش کرنے کا موقع دیا۔ حضرتؒ پان رکھنے کے عادی نہیں تھے' لیکن کھانے کے بعد بغیر کتھے چونے کا سادہ پتہ کبھی کبھی تناول فرمالیا کرتے تھے۔ بھائی جان اکثر ان کو بروقت پان پیش کردیتے تھے' اس لئے حضرت نے ازراہِ مزاح ان کا نام "پانی" رکھا ہوا تھا۔ جب پان کی ضرورت ہوتی اور بھائی جان پاس نہ ہوتے تو فرماتے "وہ ہمارا پانی کہاں گیا؟" ایک بہت بڑی سعادت انہیں یہ حاصل ہوئی کہ ایک روز انہوں نے حضرت سے درخواست کی کہ "مجھے پند نامہ عطار پڑھا دیجئے۔" حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ کسی بچے کو پند نامہ پڑھائیں لیکن بھائی جان پر غیر معمولی شفقت و محبت کے پیش نظر آپ نے اس معصومانہ درخواست کو ٹھکرانا پسند نہیں فرمایا اور جواب دیا کہ "اور تو میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے لیکن عصر کے بعد میں ہواخوری کے لئے جاتا ہوں' اسوقت کتاب لیکر میرے ساتھ چلا کرو میں اس فرصت میں تمہیں پند نامہ پڑھا دونگا۔"

چنانچہ عصر کے بعد بھائی جان کتاب لیکر پہنچ گئے اور درس شروع ہو گیا۔ اس وقت حضرت کے اکابر خلفاء بھی موجود تھے' انہیں اطلاع ہوئی تو انہیں بڑا رشک آیا۔ اور انہوں نے بھی اس درس میں شامل ہونے کی اجازت چاہی۔ حضرتؒ نے اجازت دیدی' اس کے بعد اس پر کیف درس میں حضرت والد صاحب مدظلہم' حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ' حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ اور حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب مدظلہم بھی شامل ہو گئے اور یہ درس رمضان بھر میں جاری رہا۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھائی جان سے

اکثر اس واقعہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم تو ہمارے ہم سبق ہو اور تمہارے طفیل ہمیں حضرتؒ سے پند نامہ پڑھنے کی سعادت ملی ہے"۔

بھائی جان نے جب بچپن میں لکھنا سیکھا تو حضرت والد صاحب مد ظلہم نے ان سے سب سے پہلا خط حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھوایا۔ اس خط کا جو جواب حضرتؒ نے مرحمت فرمایا وہ ایک مستقل سبق بھی ہے اور بھائی جان کے لئے ایک عظیم سرمایہ سعادت بھی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ "برخوردار سلمہ السلام علیکم مع الدعا تمہارے حروف دیکھ کر دل خوش ہوا۔ تمہاری علمی و عملی ترقی کی دعا کرتا ہوں۔ خط ذرا اور صاف کر لو' اس سے مکتوب الیہ کو بھی سہولت و راحت ہوتی ہے اس نیت سے ثواب بھی ملتا ہے۔ دیکھو! میں تم کو بچپن سے صوفی بنا رہا ہوں' درد سر کا یہ تعویذ سر میں باندھ لو' سب گھر والوں کو سلام ہو دعا۔ اشرف علی۔

عام لوگ سوچیں گے کہ خط صاف کرنے کا تصوف سے کیا واسطہ؟ لیکن یہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیت تھی کہ انہوں نے شریعت و طریقت کے اہم ترین تقاضوں یعنی آداب معاشرت' اخلاق اور صفائی معاملات کی طرف اپنے متعلقین کو اس وقت بطور خاص متوجہ فرمایا جب دین کے ان شعبوں کو دین سے خارج سمجھ لیا گیا تھا' اوراد و وظائف یا نوافل میں سستی پر حضرتؒ نے کبھی عتاب نہیں فرمایا' لیکن اگر کوئی شخص آداب معاشرت یا معاملات وغیرہ میں کوتاہی کرتا یا ایسا کام کرتا جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے تو اس پر سخت گرفت فرماتے تھے۔

حضرتؒ کی اسی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ بھائی جان ہمیشہ اپنی نقل و حرکت میں اس بات کا خاص اہتمام کرتے تھے کہ اس سے کسی دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

حضرت حکیم الامتؒ سے بھائی جان کے بیعت ہونے کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ بھائی جان اس وقت تک نابالغ تھے' حضرتؒ کی شفقتوں اور عنایتوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ایک دن خود ہی حضرتؒ سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت عموماً بلوغ سے پہلے بیعت نہیں فرماتے تھے اس لئے ازراہ خوش طبعی فرمایا کہ بیعت خالی ہاتھ تھوڑے ہی ہوتے ہیں' امرود لے کر آؤ تو بیعت کریں۔ وہ موسم ایسا تھا کہ بازار میں امرود نہیں آرہے تھے' اس لئے حضرتؒ نے یہ بات انہیں ٹالنے کے لئے فرمائی تھی اور خیال یہ تھا کہ اس موسم میں وہ امرود

نہیں دیکھیں گے۔ لیکن بھائی جان نہ جانے کہاں سے تلاش کر کے امیدوار بنے آئے! حضرتؒ نے دیکھا تو بڑا تعجب ہوا اور چونکہ وعدہ فرما چکے تھے اس لئے بیعت کے لئے راضی ہو گئے۔ لیکن حضرتؒ کی برابر شرعی احکام کی رعایت کون کرے گا؟ بھائی جان اس وقت نابالغ تھے اور نابالغ سے بیعت قبول کرنا والدین کی اجازت کے بغیر شرعاً جائز نہیں تھا اس لئے بھائی جان کو واپس بھیجا کہ جا کر اپنے والدین سے پوچھ کر آؤ۔ بھائی جان اجازت لے آئے تو اس کے بعد بیعت فرمایا۔

اس واقعہ کے بعد ۷ ربیع الثانی ۵۳ھ کو حضرت والد صاحب مدظلہم نے حضرت حکیم الامت کے نام ایک خط تحریر فرمایا جس میں لکھا کہ:

"محمد زکی سلمہ کے لئے الحمد للہ مرید ہونے کی کھلی ہوئی برکت ظاہر ہوئی کہ نماز کا بہت ہی شوق ہو گیا عشاء کی نماز کے وقت پہلے سو جاتا تھا اب بیٹھا ہوا انتظار کرتا رہتا ہے۔"

حضرت حکیم الامتؒ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"ماشاء اللہ! بھائی مجھ کو بھی اس بے گناہ بچے کی برکت نصیب ہو اور ہمت عمل اور استقامت واخلاص میں عطا ہو۔"

بھائی جان کے بچپن کے بہت سے معاملات حضرت حکیم الامتؒ ہی کے مشوروں سے انجام پاتے۔ ۱۰ رجب ۵۵ھ کے مکتوب میں حضرت والد صاحب مدظلہم نے حضرت تھانویؒ کو لکھا:

"محمد زکی سلمہ سال بھر سے زائد ہوا کہ اس کو حفظ قرآن مجید شروع کرایا تھا مگر کچھ عرصہ چھ ماہ سے وہ دبلا ہوتا جاتا ہے۔۔۔ اب بعض اقرباء کا مشورہ یہ ہے کہ حفظ قرآن کی محنت یہ برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔ سخت تردد میں ہوں کیا کروں؟"

حضرتؒ نے جواب دیا:

"اگر زکی میرا بچہ ہوتا تو حفظ چھڑا دیتا، پھر جب کسی موقع پر قوت ہوتی (گو بعد فراغ درسیات سہی) پھر تکمیل کرا دیتا۔ اس وقت بہت سہولت ہو جاتی ہے۔"

اس طرح بھائی جان اٹھارہ سال کی عمر تک حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایات اور عنایات سے فیضیاب ہوتے رہے۔ اسی دوران حضرت والد صاحب مدظلہم کو ایک مرتبہ ایک خط حضرت تھانویؒ کے پاس تھانہ بھون بھیجنا تھا۔ والد صاحب چاہتے تھے کہ

یہ خط آج ہی حضرت کو پہنچ جائے۔ ادھر سہارنپور سے تھانہ بھون جانے والی گاڑی میں سفر کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ بھائی جان نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی، دیوبند سے مظفر نگر اور مظفر نگر سے شاملی پہنچے، خیال تھا کہ شاملی سے تھانہ بھون جانے والی گاڑی مل جائے گی، مگر شاملی پہنچے تو گاڑی نکل چکی تھی۔ بھائی جان نے وہاں سے ایک سائیکل کرائے پر لی اور شاملی سے تھانہ بھون تک کا طویل راستہ اسی سائیکل پر طے کر کے مکتوب بروقت حضرت کو پہنچا دیا۔

حضرت تھانویؒ کے علاوہ دیوبند میں حضرت میاں صاحبؒ (حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ) بھی بھائی جان سے نہایت شفقت فرماتے تھے، اور بھائی جان کو ان کی خدمت و صحبت کا بھی خوب خوب موقع ملا۔ انہیں بچپن ہی سے بزرگوں سے فیضیاب ہونے اور ان کی خدمت و صحبت سے فائدہ اٹھانے کا خاص ذوق تھا اور اس لحاظ سے انہیں یہ شعر کہنے کا واقعی حق پہنچتا تھا کہ۔

اس وقت سے میں تیرا پرستار حسن ہوں
دل کو مرے شعور محبت بھی جب نہ تھا

اور بزرگوں کی اسی صحبت کا اثر تھا کہ ان پر دین اور فہم دین کا ایک ایسا پختہ رنگ چڑھا ہوا محسوس ہوتا تھا جو کسی ماحول میں کبھی مغلوب یا مرعوب نہیں ہوا، وہ جس ماحول میں رہے ہمیشہ اپنا رنگ دوسروں پر چھوڑ کر آئے۔

رنگیں ہے ہم سے قصہ مہر و وفا کہ ہم
اپنی وفا کا رنگ ترے رخ پہ مل گئے

(بھائی جان)

انہوں نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں شروع کی، اور فارسی و ریاضی کی تکمیل کے بعد درس نظامی شروع کیا۔ مگر بعض حالات کی بنا پر چوتھے سال کے بعد درس نظامی کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ اس کے باوجود بزرگوں کی صحبت اور وسیع مطالعہ نے ان کو علم و عمل کی وہ دولت نصیب فرمائی جو بسا اوقات اچھے اچھے فضلاء میں نظر نہیں آتی۔ مطالعہ کی وسعت کا عالم یہ تھا کہ دین و مذہب، شعر و ادب اور تاریخ و سیاست کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا

جو اپنے مطالعہ کی حدود سے خارج ہو۔ خاص طور سے بزرگانِ دیوبند کی کوئی کتاب یا چھوٹا سا رسالہ بھی ایسا نہ ہو گا جو ان کی نظر سے نہ گزرا ہو۔ کتب سے انہیں عشق تھا اور نئی کتاب کو دیکھ کر اسے پڑھے بغیر چھوڑنا ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ خاص طور سے تاریخ اور تصوف پر ان کا مطالعہ قابلِ رشک تھا۔ وہ بڑے بڑے اہلِ علم و فکر کی مجالس میں بیٹھتے اور محفلوں پر چھائے رہتے۔ برصغیر کی دینی شخصیات اور ان کے ضروری حالات انہیں ازبر تھے۔ حضرت تھانویؒ کے مواعظ و ملفوظات اور حضرت والد صاحب مدظلہم کی تصانیف حتی الامکان حرف بحرف پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا حافظہ لطائف و ظرائف اور عجائب و نوادر کا خزانہ تھا اور تقریباً ہر ملاقات میں ان کی زبان سے کچھ نئے واقعات یا علمی و ادبی فوائد سننے میں آتے تھے۔

شعر و سخن کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ ۱۹۴۵ء سے باقاعدہ شعر کہنے لگے تھے اور نو مشقی کے اس دور میں بھی اس انداز کے شعر کہتے تھے۔

تیرے شوقِ ستم میں کمی نہ ہو
اٹھے جو دل [illegible] تو گلستاں کہیں جلے
[illegible] سے آتش گیا ہے اب
یہ دور ہے کہ دہر کا حال کہیں تھے
ہم میں تھیں اک بہت نازک خوبیوں کے
ترے روزگار ذرا دیکھ جہاں کے !

مقام عاشق ہے یوں ہی تو فکر کیوں اڑائے [illegible] رہی ہے
چمن پہ گل ہی فدا ہے مانا، وہاں کلی بھی چٹک رہی ہے

اسی زمانے میں ایک غزل انہوں نے خواب میں کہی تھی جسکا ایک شعر سن لیجیے۔

اف تصور کی تیرے رعنائی
تجھ سے بھی کچھ سوا حسیں نکلا

جگر مراد آبادی مرحوم سے بھائی جان کے بڑے اچھے تعلقات تھے' انہیں جب پہلی بار بھائی جان نے اپنی غزل کا یہ مطلع سنایا کہ۔

ہم ہیں قتیل اک محبت نازک خیال کے
آلام روزگار ذرا دیکھ بھال کے

تو جگر مرحوم چونک اٹھے' بڑی داد دی' اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ مشق سخن ضرور جاری رکھیں اس کے بعد بھائی جان کے ذوقِ شعر گوئی نے بڑی ترقی کی' ملک کے تمام نامور شعراء ان کی غزلوں کے نہایت مداح تھے۔ وہ بلاشبہ اپنے فکر و فن کے لحاظ سے دور حاضر کے گنے چنے شعراء میں سے تھے۔ انہوں نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا اور اس میدان میں پامال راہوں سے ہٹ کر نئے نئے راستے تلاش کئے۔ اس کے باوجود وہ عوامی مشاعروں میں شریک ہونے سے کتراتے تھے۔ ملک کے مشہور شعراء میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس سے ان کے خوشگوار مراسم نہ ہوں اور جو ان کا قدردان نہ ہو' لیکن دوستوں کے اصرار کے باوجود انہوں نے عام مشاعروں میں بہت کم شرکت کی۔ البتہ شعر و سخن کی مخصوص نشستوں میں وہ بکثرت شریک ہوتے۔ بارہا ہمیں بھی ساتھ لے گئے لیکن ان مجالس میں نماز باجماعت کا ہمیشہ اہتمام کرتے۔ بھری ہوئی محفل کے عین درمیان جب نماز کا وقت آ جاتا تو وہ اپنے چند ساتھیوں کو لیکر نماز ادا کرتے' اور جہاں منتظمین کی طرف سے اس میں کوتاہی محسوس ہوتی وہاں جانا چھوڑ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے شعراء میں ایک ایسا حلقہ بنا لیا تھا جو نظری اعتبار سے پکا مسلمان تھا اور شاعری میں مقصدیت کو پیش نظر رکھتا تھا۔

انہوں نے فارسی اور اردو شاعری کا انتہائی وسیع و عمیق مطالعہ کیا تھا' اور اس مطالعے

میں بھی وسعت مطالعہ میں ان کی ہمسری بہت کم لوگ کرتے تھے۔ فارسی اور اردو کے بلا مبالغہ ہزارہا اشعار انہیں یاد تھے اور جب سنانے پر آتے تو گھنٹوں سناتے رہتے تھے۔ فارسی میں حافظ اور سعدی کے علاوہ نظیری اور عرفی کے بڑے مداح تھے۔ اردو کے قدیم شعراء میں داغ، میر اور غالب سے اور زمانۂ مابعد کے شعراء میں فانی، حسرت، اصغر اور جگر سے بہت متاثر تھے۔ اقبال کا کما حقہ مطالعہ انہوں نے کافی بعد میں کیا۔ (اور شاید میرے اصرار کو بھی اس میں دخل ہو) چنانچہ آخری دنوں میں ان کی بہت تعریف کرنے لگے تھے۔

ان کی شاعری کا اصل میدان غزل تھا لیکن متعدد نظمیں بھی انہوں نے بڑے معرکے کی کہی ہیں جن میں سے "دارالعلوم کراچی" پر ان کی نظم اس لحاظ سے ایک شاہکار ہے کہ اس قسم کی نظموں میں عموماً شاعری کی لطافت باقی نہیں رہا کرتی لیکن یہ نظم شاعری کے لحاظ سے بھی بے نظیر ہے۔ اس کے علاوہ ۶۵ء اور ۷۱ء کے جہاد پاکستان کے موقع پر انہوں نے دسیوں ولولہ انگیز نظمیں کہی ہیں جن میں سے بعض البلاغ میں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ ان کی تمنا تھی کہ اب ان کی شاعری نعت کے لئے مخصوص ہو جائے، انہوں نے کہا بھی تھا کہ ؎

یہ ربِ محمد سے دعا ہے مری کیفی
ہو نعتِ محمد مرے اشعار کی دنیا

چنانچہ تقریباً ڈیڑھ سال سے انہوں نے غزل کہنی چھوڑ دی تھی اور مسلسل نعتیں کہہ رہے تھے۔ ان میں سے متعدد نعتیں البلاغ میں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ کچھ عرصے سے انہوں نے روزنامہ وفاق لاہور میں حالات حاضرہ پر روزانہ ایک قطعہ لکھنا شروع کیا تھا جو اجتماعی، سیاسی اور معاشرتی مسائل میں ان کی گہری سوچ کا مظہر ہوتا تھا۔

میں نے بارہا ان سے مجموعہ کلام مرتب کر کے شائع کرنے کی فرمائش کی مگر وہ ہر مرتبہ ٹال گئے، البتہ ان کی بیاض تقریباً مرتب شکل میں محفوظ ہے جس کا عنوان انہوں نے خود "کیفیات" تجویز کر رکھا ہے۔ اللہ نے توفیق دی تو ان شاء اللہ اسے مرتب کر کے شائع کرانے کا ارادہ ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں ان کا تجارتی کتب خانہ "ادارۂ اسلامیات" کتابوں کی دکان نہیں علم و ادب کا ایک مرکز اور علم و فن کا ایک گہوارہ تھا۔ ملک بھر کے علماء، فضلاء، دانشور،

ادبا، شعراء اور صحافی وہاں نظر آتے، باغ و بہار مجلسیں جمتیں...... اور علم و ادب کے پروانوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا۔ بھائی جان لاہور بلکہ پنجاب میں حضرت والد صاحب مدظلہم کے نمائندے کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ حضرت والد صاحب مدظلہم کو ان اطراف میں کوئی کام پیش آتا تو انہیں سے فرماتے اور وہ انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ والد صاحب کے احباب اور متعلقین لاہور جاتے تو بھائی جان کے یہاں ٹھہرتے اور لوگوں کو کسی مسئلہ میں والد صاحب کی رائے معلوم کرنی ہوتی تو "ادارہ اسلامیات" کا رخ کرتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ بھائی جان سے انتہائی شفقت و محبت فرماتے اور مؤخر الذکر ایک زمانے میں دیر دیر تک ادارہ اسلامیات میں بیٹھے رہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں ذکاوت و ذہانت، فہم و فراست، معاملات کی سمجھ بوجھ اور اس کے ساتھ ملکی و ملی مسائل کی خاص لگن عطا فرمائی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا ان کے یہاں دینی اور سیاسی رہنماؤں کے بکثرت اجتماعات ہوتے رہتے، اور خاص خاص اجتماعی تحریکات کے موقع پر ان کا مکان عوام و خواص کا مرجع بن جاتا تھا۔ ملک و ملت کے مخلص رہنماؤں کو اپنے یہاں ٹھہرا کر اور ان کی خدمت و ضیافت کر کے انہیں نہایت مسرت ہوتی اور وہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں ملک و ملت کے مسائل میں بھرپور عملی حصہ لینے کا موقع تو بہت کم ملتا ہے اس لئے یہ خواہش رہتی ہے کہ "جو حضرات ملت کی مخلصانہ خدمات انجام دے رہے ہیں ان کی کچھ خدمت کا موقع مل جائے" اور پھر وہ ظاہری خدمت کے علاوہ ان کے مشوروں میں پوری طرح شریک رہتے اور بہت سے مواقع پر اپنی عملی مداخلت سے مختلف الجھنیں دور کر دیتے تھے۔

مختلف زمانوں میں کئی وزراء اور بہت سے اونچے سرکاری عہدہ داروں سے ان کے قریبی تعلقات رہے لیکن انہوں نے کبھی اپنی ذات کے لئے کوئی مادی منفعت حاصل نہیں کی، انہیں اس قسم کی موقع پرستی سے گھن آتا تھا اور اپنی خودداری کی بدولت انہوں نے کبھی ایسے مواقع سے فائدہ نہیں اٹھایا، جب کسی ناجائز کام کے ارتکاب کے بغیر انہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ بعض اوقات مختلف مسائل میں ان کی ذاتی رائے حکومت کے موافق ہوتی لیکن اس کا اظہار صرف اپوزیشن کے لوگوں کے سامنے کرتے تھے اور ایسے لوگ تو نہ

جانے کتنے ہوں گے جنہیں ان کی ذات سے فائدہ پہنچا مگر انہیں پتہ بھی نہ چل سکا کہ یہ فائدہ پہنچانے والا دراصل کون تھا؟

قدرت نے انہیں انتہائی فیاض طبیعت دی تھی' ان کی مہمان نوازی خاندان بھر میں ضرب المثل تھی۔ ایسے دن ان کی زندگی میں شاید بہت کم ہوں گے جب ان کے دستر خوان پر صرف ان کی بیوی بچے بیٹھے ہوں یا ان کے گھر میں کوئی مہمان مقیم نہ ہو۔ اس کے علاوہ نہ جانے کتنے افراد تھے جن کا انہوں نے باقاعدہ وظیفہ مقرر کیا ہوا تھا جن میں سے بعض کا علم گھر والوں کو بھی وفات کے بعد ہوا۔ ان پر مالی اعتبار سے انتہائی سخت اور کٹھن اوقات بھی گزرے ہیں اور بعض اوقات یہ سلسلہ کافی دنوں تک دراز رہا ہے' لیکن ان کی فیاضی' دریا دلی اور مہمان نوازی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ خرچ کے معاملہ میں نہایت کشادہ دست تھے اور یہ جملہ بکثرت کہا کرتے تھے کہ "خدا بے حساب دیتا ہے' میں حساب کیوں رکھوں؟" عزیز و اقارب کے حقوق کی ادائیگی اور معاملات کی صفائی کا خاص ذوق انہوں نے حضرت والد صاحب مدظلہم سے حاصل کیا تھا۔ دور پرے کے رشتہ داروں کے دکھ درد میں بھی شریک رہتے اور ان کے کام آنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ حضرت والد صاحب مدظلہم نے ایک مرتبہ مجھے کوئی چیز بازار سے لانے کا حکم دیا' میں نے وہ چیز لا کر دیدی لیکن آٹھ آنے بچ گئے تھے وہ والد صاحب کو نہ دیئے' حضرت والد صاحب نے کچھ انتظار کیا' اس کے بعد بلا کر حساب لیا اور پوچھا کہ "باقی آٹھ آنے کہاں ہیں؟" میں نے وہ آٹھ آنے والد صاحب کو دیدیئے انہوں نے پہلے وصول فرمالئے' اس کے بعد مجھے واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ "میرا مقصد یہ سمجھانا تھا کہ آئندہ حساب ہمیشہ صاف رکھنے کی عادت ڈالو' اب حساب صاف ہوگیا' یہ پیسے اب تمہارے ہیں" بھائی جان فرماتے تھے کہ اس کے بعد سے یہ سبق ایسا ذہن نشین ہوگیا کہ جب تک معاملہ صاف نہ ہو طبیعت بے چین رہتی ہے۔

بھائی جان کی خوش مذاقی' خندہ پیشانی اور حسن اخلاق کا عالم یہ تھا کہ جو شخص ان سے ملا گرویدہ ہو گیا۔ وہ بچوں میں بچے' جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔ ہنسی مذاق سے لیکر فکر و تدبر کی باوقار مجلسوں تک ہر قسم کے ماحول میں وہ اپنے آپ کو اسی طرح پیش کرتے جیسے اسی محفل کے آدمی ہیں' اور ہر محفل میں انکی شمولیت سے آب و رنگ پیدا ہو جاتا۔

ہم ہیں کیفیؔ ایک ابر و بہار
جس طرف گزرے، گہر برسا گئے

وہ غم اور تشویش کے دشمن تھے، غمزدہ سے غمزدہ ماحول کو اپنی ظرافت اور خوش طبعی سے گل و گلزار بنا دیتے تھے اور کسی فکر و غم کی بات کو زیادہ دیر تک موضوعِ گفتگو نہ رہنے دیتے، سخت سے سخت حالات میں بھی وہ مسکراتے رہتے اور دوستوں کا غم و فکر بٹانے کی کوشش کرتے، باوقار انداز میں ہنستا ہنساتا ان کی وہ خصوصیت تھی جو ان کے تمام متعلقین میں مشہور و معروف تھی اور آج اب یہ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ شعر انہوں نے اپنے ہی لئے کہا تھا کہ۔

فرصتِ خندہ لبی تھی کتنی
پھول ہنسنے کے ہوا کیا کرتے

خوش طبعی و ظرافت اور بھی بہت لوگوں میں ہوتی ہے لیکن بعض اوقات یہ صفت دین سے غفلت پیدا کر دیتی ہے، خاص طور سے ہنسی مذاق کی محفلوں میں شرعی حدود کی رعایت و حفاظت عموماً مشکل ہوتی ہے لیکن یہ بھائی جان پر اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ ایسی بے تکلف مجلسوں میں بھی ان کے قلب کو دین سے غافل نہیں پایا۔ غلطیاں کس انسان سے نہیں ہوتیں؟ لیکن اپنی غلطیوں پر ندامت اور تنبہ کے بعد فوراً توبہ و استغفار کی طرف رجوع وہ خصلت ہے جو گناہوں کو بھی باعث رحمت بنا دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ دولت نصیب فرمائی تھی۔ انہوں نے کتنا پیارا شعر کہا ہے اور یہ محض قول نہیں ان کا حال تھا۔

عجب کیا؟ شانِ رحمت ڈھانپ لے میرے گناہوں کو
خطا کی ہے، مگر تیری عطا کو دیکھ کر کی ہے

بزرگوں کی صحبت کی برکت سے انہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق نصیب ہوا تھا وہ دعا مانگتے تو اس طرح مانگتے کہ ان پر رشک آتا تھا، اللہ تعالیٰ کی ذات پر اتنا بھروسہ اور ایسا توکل کم لوگوں میں ہوتا ہے وہ معمولی غور و فکر اور مشورے کے بعد بڑے بڑے فیصلے کر لیتے اور اللہ پر بھروسہ کرتے، ایسے مواقع پر "اللہ مالک ہے" اور "انشاء اللہ اسی میں خیر

ہو گی" ان کا تکیہ کلام تھا۔ تلاوت قرآن کا انھیں خاص ذوق تھا، رمضان المبارک میں ایک دن میں دس دس پاروں کی تلاوت کر لیتے تھے۔ روزانہ تلاوت، ادعیہ ماثورہ اور بعض دوسرے وظائف و اوراد کے پابند تھے، شب و روز کے مختلف معمولات میں مسنون دعائیں ورد زبان تھیں اور اپنے بزرگوں اور عزیزوں کو روزانہ کچھ نہ کچھ ایصال ثواب کا معمول تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں بڑا خوش نصیب بنایا تھا۔ ان کے والدین، مشائخ اور عزیز ان سے ہمیشہ نہ صرف خوش بلکہ ان کے مداح رہے۔ وہ بزرگوں کے لاڈلے تھے اور ان سے سدا دعائیں لیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں موت بھی اتنی خوش نصیبی کی عطا کی کہ باید و شاید۔ اپنی عمر کے ٹھیک بیچوں بیچ انھوں نے پہلا حج کیا اور عمر کے بالکل آخر میں دوسرے حج سے سرفراز ہوئے، انشاء اللہ گناہوں سے پاک صاف ہو کر لوٹے، عاشورہ کے دن اور جمعہ کی رات میں آخرت کا سفر شروع کیا، جمعہ کے متصل بعد نماز جنازہ ادا کی گئی، اور عصر کے بعد سپرد خاک کئے گئے۔

ان کی وفات پر بڑے بڑے علماء، اولیاء اور صلحاء کو اشک ریز پایا۔ حرمین شریفین میں ان کے لئے قرآن کریم ختم ہوئے اور بعض حضرات نے ان کی طرف سے عمرے ادا کئے۔ دور دراز کے دینی مدارس میں ان کے لئے از خود ختم قرآن اور ایصال ثواب کیا گیا۔ آج ہی دارالعلوم دیوبند سے مولانا معراج الحق صاحب (نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند) کا مکتوب گرامی موصول ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہاں بھی ان کے لئے ختم قرآن کیا گیا ہے۔ صرف اہل دیوبند ہی نہیں، مختلف مکاتب فکر کے دینی رسائل و جرائد نے ان پر اداریے لکھے اور ان کے حسن عمل کی شہادت دی۔ حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں سے ایک صاحب کشف بزرگ نے وفات سے اگلے روز انھیں بیداری کی حالت میں دیکھا کہ بڑے خوش و خرم ہیں اور اس مفہوم کی کوئی بات کہہ رہے ہیں کہ میں بڑے آرام سے ہوں، لوگ کیوں پریشان ہیں؟

دار فانی سے کوچ کرنے کے بعد ایک بہت بڑی خوش نصیبی صالح اولاد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس جہت سے بھی خوش نصیب بنایا ہے۔ ماشاء اللہ ان کے تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں اور سب بحمد اللہ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور دینی ماحول کے پروردہ ہیں۔ بڑے

لڑکے عزیزم مولوی محمود اشرف سلمہ، حافظ، قاری اور جامعہ اشرفیہ سے فارغ التحصیل عالم ہیں اور دارالعلوم کراچی میں ایک سال فتوی کی تربیت حاصل کر چکے ہیں اور اب تقریباً ڈیڑھ سال سے مدینہ طیبہ کے جامعہ اسلامیہ میں زیر تعلیم تھے وہیں انھیں اس حادثے کی اطلاع ہوئی اور سب سے پہلے اپنے والدین کی طرف سے عمرہ کر کے پاکستان آئے ہیں۔ دوسرے لڑکے مسعود اشرف سلمہ انٹر کام کر چکے ہیں ماشاء اللہ سعید نوجوان ہیں اور اپنے والد ماجد کے صحیح معنی میں دست و بازو رہے ہیں۔ تیسرے لڑکے سعود اشرف سلمہ میٹرک کرنے کے بعد پہلے سال میں زیر تعلیم ہیں۔ اور ذہانت و فطانت میں اپنے والد کی یادگار ہیں۔ اللہ تعالی ان سب کو اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

جس وقت اس جاں گداز حادثے کی اطلاع ملی ہے، اس وقت حضرت والد صاحب مد ظلہم کی ٹانگوں میں اسقدر کرب کی تکلیف تھی کہ عمر بھر ایسی تکلیف یاد نہیں ہے، کروٹ لینا تو بڑی بات ہے، پاؤں کو ذرا سا سرکانا دوسرے کی مدد کے بغیر ناممکن تھا۔ ادھر والدہ محترمہ مد ظلہا سات سال سے صاحب فراش ہیں، اس لئے ان دونوں کے لاہور پہنچنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں اور بڑے بھائی جناب مولانا محمد رفیع صاحب بھی وہاں نہ پہنچ سکے اس طرح ہم ان کی نماز اور تجہیز و تکفین میں بھی شامل نہیں ہو سکے۔ ہم نے ابھی تک ان کی آخری آرام گاہ تک بھی نہیں دیکھی اور جب یہاں کوئی قبر نظر آتی ہے تو متمم بن نویرہ کے وہ اشعار یاد آتے ہیں جو اس نے اپنے بھائی مالک کے مرثیہ میں کہے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا صحیح مطلب بھی پہلی بار ہی سمجھ میں آیا ہے۔

لقد لامنی عند القبور علی البکا　　رفیقی لتذراف الدموع السوافک
فقال أتبکی کل قبر رأیتہ　　یقرب اللوی بین الثوی فالدکادک
فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا　　فدعنی فھذا کلہ قبر مالک

اس صدمے۔ اور عظیم صدمے۔ نے البتہ ایک تنبہ ضرور پیدا کیا ہے اور وہ یہ کہ اس جیسے المناک موقع پر رنج و غم تو فطری چیز ہے، لیکن صدمے کی یہ شدت جو ناقابل برداشت ہونے لگتی ہے، ہماری ایک بہت بڑی بھول کا نتیجہ ہے۔ بھائی جان ہی نے کہا تھا کہ۔

یہ دنیا کھیل ہے اور کھیل بھی ہے چند لمحوں کا
نظر جو کچھ بھی آتا ہے اسے خوابِ گراں سمجھو

ہم اس سبق کو عقلی اور نظری طور پر تو مانتے رہے لیکن اس حقیقت کا ہر وقت استحضار ہم سے نہ ہو سکا۔ عملی طور پر یہاں رہتے ہوئے ہم بار بار یہ بات بھول جاتے ہیں کہ یہ ایک مسافر خانہ ہے منزل نہیں' یہاں جو ملتا ہے بچھڑنے کے لئے ملتا ہے۔ نہ یہاں کی ملاقات دائمی ہے نہ جدائی دائمی۔ نہ یہاں کی کوئی مسرت پائیدار ہے نہ غم مستقل۔ ناقابل تلافی صدمہ اور صبر نا آشنا اضطراب اس کو ہو جو اس دنیا ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتا ہو' جسے مرنے کے بعد کسی دوسری زندگی کا یقین نہ ہو' جس نے دنیوی زندگی کے بلبلوں پر امیدوں کے محل بنا رکھے ہوں۔ لیکن جس شخص کو اللہ کی ذات و صفات اس کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ پر ایمان ہو' جو آخرت کی ابدی زندگی پر یقین رکھتا ہو' جس کو اس بے ثبات دنیا کی حقیقت مستحضر ہو اس کے لئے دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا صدمہ ناقابل برداشت نہیں ہو سکتا۔ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ دو محبت کرنے والے ہمیشہ ایک ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہوا کریں' ان میں سے کسی نہ کسی کو دوسرے کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہی پڑیگا' لیکن اگر اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط ہے' اگر آخرت پر ایمان مستحکم ہے اور اس دنیا کی حقیقت نظروں کے سامنے ہے تو یہ جدائی ایک وقتی اور عارضی جدائی ہے۔ اس کے بعد ایک ایسی ابدی زندگی آنے والی ہے جسکو فنا اور زوال نہیں۔ اصل ملاقات وہاں کی ملاقات ہے جس کے بعد کبھی جدائی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ان صدمات میں محو ہو جانے اور ہر وقت یادوں میں کھوئے رہنے سے بہتر یہ ہے کہ اس ملاقات کی تیاری کرو' اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط کر لو تو تمام دنیوی تعلقات اعتدال پر بھی آ جائیں' ان کی حقیقت بھی مستحضر ہو جائے' اور آخرت میں ان کے بقائے دوام کی ضمانت بھی مل جائے' اس دنیا میں اللہ سے لَو لگانے کے سوا سکون و عافیت کا کوئی راستہ نہیں۔ اور بھائی جان ہی کے بقول۔

وہ آشنا اگر ہے تو عالم ہے آشنا
وہ آشنا نہیں' تو کوئی آشنا نہیں

میرے جذبات و واردات کی یہ بے ربط سی کہانی میرے اندازے سے زیادہ طویل ہو گئی، اور اب اسے مختصر کرنے کی از سر نو محنت اٹھانے کا دماغ نہیں۔ لہٰذا قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن آخر میں حضرت والد صاحب مدظلہم کی ایک بات آپ تک پہنچا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں جسے اس پورے مضمون کا حاصل سمجھنا چاہئے اور جو آب زر سے لکھنے کیا؟ لوح دل پر نقش کرنے اور رکھنے کے لائق ہے۔

ظاہر ہے کہ بیٹے اور ایسے بیٹے کے حادثۂ وفات کا صدمہ باپ سے زیادہ کس کو ہو گا؟ اور صدمہ بھی ایسے ضعف اور ایسی کرب انگیز علالت کے عالم میں کہ کروٹ لینا ایک پہاڑ تھا۔ لیکن شرعی حدود میں اظہار رنج و غم کے باوجود جس صبر و ہمت سے انہوں نے یہ جانکاہ حادثہ برداشت کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جسمانی اور روحانی اذیت کا یہ اجتماع عمر بھر کبھی پیش نہیں آیا تھا، لیکن اس پیکر تسلیم و رضا نے اس عالم میں بھی ہم لوگوں کو جو سبق دیا ہے وہ بے مثال ہے۔ وہ اظہار غم و الم سے زیادہ ہم سب کی تسلی کے لئے ایک عجیب و غریب مضمون بیان فرماتے رہے جو آخر میں انہوں نے مرحوم کے بچوں کے نام ایک مکتوب میں قلمبند بھی کرا دیا۔ یہ مکتوب چونکہ بڑی قیمتی نصائح پر مشتمل ہے اس لئے بجنسہٖ نقل کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان حقائق کے ہمہ وقت استحضار کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

نور نظر لخت جگر مولوی محمود، مسعود، سعود، حمیرا، زہرا، سمیرا اور بہو صالحہ اللہ تعالیٰ تم سب کو بعافیت رکھے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

داغ ہی داغ نظر آتے ہیں
کس طرح قلب و جگر کو دیکھوں
نہ وہ محفل ہے نہ وہ پروانے
خاک اے شمع سحر کو دیکھوں

میرے عزیز از جان بچو! آج حادثہ جانکاہ کو انیسواں دن ہے۔ ان ایام میں تم سب سے ملنے اور باتیں کرنے خط لکھنے کی کتنی تمنائیں دل میں گزرتی ہوں گی، اس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ مگر اس حادثہ اور اس سے پہلے پیش آنے والی بیماری نے کہ عمر بھر میں مجھے کبھی ایسی

شدید بیماری پیش نہیں آئی' اس مجموعے نے ایسا نیم جان شروع کر دیا کہ آج سے پہلے چند سطریں لکھنے کی بھی ہمت نہ ہو سکی۔ آج بمشکل قلم اٹھایا تو چل نہ سکا۔ اب برخوردار مولوی امین اشرف کے قلم سے لکھوا رہا ہوں!

میرے عزیز بچو! یہ واقعہ جیسا کرب انگیز' حسرت ناک و جانکاہ ہے' اس کا اثر مرحوم ہو جانے والے نوجوان صالح کے ماں باپ' بچوں اور بیوی اور بھائی بہنوں پر درجہ بدرجہ جو کچھ ہوتا تھا وہ ایک طبعی اور فطری امر ہے اور جب تک حدود سے تجاوز نہ ہو شرعاً مذموم بھی نہیں۔ لیکن یہ سب کرب انگیزی اور غم و صدمہ کا ایک طرفہ پہلو صرف اس بنیاد پر ہے کہ ہم واقعات کو الٹا پڑھتے ہیں اور یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ ایک پچاس سالہ نوجوان جس کے ساتھ ایک ایک عزیز کی ہزاروں امیدیں وابستہ تھیں یکایک ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس کا اثر ظاہر ہے کہ بے چینی اور شدید ترین صدمہ ہی ہو سکتا ہے۔

آؤ! اب واقعات کو ذرا سیدھا پڑھو کہ صبر آئے' بلکہ شکر کا موقع ملے۔

ذرا سمجھو کہ ہر مومن کا عقیدہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والے انسان کی عمر کی گھڑیاں اور سانس اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ کے دفتر میں لکھے ہوتے ہیں۔ جانے والا لخت جگر پچاس سال ستر دن کی زندگی لے کر اس دنیا میں آیا تھا۔ زمین و آسمان اپنی جگہ سے ٹل سکتے تھے۔ قضاء و قدر کے اس فیصلے میں ایک منٹ' ایک سیکنڈ فرق نہیں آ سکتا تھا۔ اس لئے یہ تو ہم سب کا ایمان ہونا چاہئے کہ یہ حادثہ یوں ہی ہونا تھا کہ جس طرح ہوا' لیکن اب ذرا یہ سوچو کہ اس حادثہ جانکاہ کو ہم سب پر آسان کرنے کے لئے حق تعالیٰ جل شانہ نے کیسے کیسے انعامات فرمائے۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ الحمد للہ اپنی تمام ہی اولاد کو وہ اس حالت پر چھوڑ گئے جب کہ وہ کسی کے محتاج نہ تھے۔ وہ سب اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو چکے تھے۔ ذرا سوچو اگر معاملہ اس کے خلاف ہوتا تو کیسی ایک مصیبت اور دردسری بن جاتی۔

دوسری بات یہ دیکھو کہ مرحوم کو جس قدر گہرا تعلق اپنی بیوی اور اولاد سے تھا' ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بھی اس سے کچھ کم نہ تھا۔ لاہور رہنے کی بنا پر ہم سے جدائی کے دو طرفہ تاثرات قدم قدم پر ظاہر ہوتے تھے' لیکن وہاں کے مشاغل اور ضروریات کی بنا پر مشکل سے سال بھر میں ایک ہی مرتبہ وہ کراچی آ سکتے تھے۔ اس سال جبکہ اللہ جل شانہ کو

اس دنیا سے ان کی جدائی ہمیشہ کے لئے منظور ہوئی تو غیر شعوری طور پر چار مرتبہ ایسے حالات پیدا فرمادیے کہ ان کو بار بار کراچی آنا پڑا اور ایک مرتبہ سب بچوں کے ساتھ آنے کا موقع بھی مل گیا۔ یہ کس کو معلوم تھا کہ یہ بار بار کی پیش آنے والی ملاقات اللہ تعالیٰ کے انعامات اور آئندہ پیش آنے والے صدمہ پر تسلی کے سامان تھے۔

تیسری بات یہ دیکھو کہ سب سے بڑا ہونہار بیٹا مولوی محمود سلمہ تین ماہ پہلے ان سے جدا ہو چکا تھا۔ جس سے ملنے کی اس حادثہ جانکاہ سے پہلے بظاہر کوئی امید نہ تھی۔ قدرت نے غیبی سامان فرما دیا۔ امسال ان کے لئے حج کا سامان ہو گیا اور اس طرح وہ حج و زیارت کے فرائض اور حرمین شریفین کی برکات سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ اور سعادت مند بیٹے کو بھی اٹھارہ دن ان کی مکمل خدمت کا موقع مل گیا۔

پھر یہ بھی سوچو کہ عادتاً حج و زیارت میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو لگ ہی جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خوش نصیب بندے کو صرف اٹھارہ دنوں میں حج و زیارت کے تمام مراحل سے گزار کر ایسے وقت کراچی واپس پہنچا دیا جبکہ ان کی وفات میں صرف سترہ دن باقی تھے۔ اگر مواصلاتی نظام میں ذرا بھی تاخیر ہوتی تو مرحوم اپنے بیوی بچوں، ماں، باپ، بہن بھائیوں سے جدا رہتے ہوئے بحالت غربت اس دنیا سے سفر کرتے۔ ذرا یہ سوچو اس وقت ماں باپ اور اولاد و بیوی پر کیا گزرتی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام مراحل سفر کو آسان فرمایا اور پوری تندرستی کے ساتھ واپس والدین کے پاس کراچی اور پھر اہل عیال کے پاس لاہور خوش و خرم پہنچا دیا۔ حج کی خوشی میں احباب کی دعوت بھی کر لی۔

اور ان تمام انعامات سے بڑھ کر سب سے بڑا انعام یہ کہ آخری عمر میں ان کو حج و زیارت سے مشرف فرما کر گناہوں سے پاک فرما دیا۔ اور پاک و صاف اپنی بارگاہ میں بلا لیا۔

اب غور کرو۔ اگر جانے والے مرحوم کو سال بھر پہلے یہ قطعی اطلاع ہو جاتی کہ عاشورہ محرم ۹۵ھ ان کی عمر کا آخری دن ہے اور وہ خود اپنے مرنے کے سامان کرتے تو اس سے بہتر اور مرنے کا کیا سامان ہوتا۔ بس اسوقت مشکل سے یہ سطور ہی لکھوا سکا ہوں اور کچھ بولنے کی ہمت نہیں۔ والسلام بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ ۲۹؍ محرم ۱۳۹۵ھ

شاہ فیصل مرحوم

پچھلے مہینے سعودی عرب کے فرماں روا شاہ فیصل مرحوم کی ناگہانی شہادت نے پورے عالم اسلام میں یکایک صف ماتم بچھا دی۔ اس دنیا سے نہ جانے کتنے افراد روزانہ آخرت کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں، لیکن ایسے لوگ خال خال ہی ہوتے ہیں جن کی وفات کو اسلامی دنیا کے ہر خطہ میں اپنا حادثہ اور اپنا نقصان سمجھا جائے جن کی جدائی سے ہر مسلمان اپنے دل میں ٹیس محسوس کرے اور جن کے اٹھ جانے سے وہ لوگ بھی اشک بار ہوں جو کبھی زندگی میں مرحوم کی صورت تک نہ دیکھ سکے۔ اللہ تعالیٰ شاہ فیصل مرحوم کو درجات بلند عطا فرمائے وہ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ ان کی وفات صرف سعودی خاندان یا سعودی عرب کا نہیں، پورے عالم اسلام کا عظیم حادثہ ہے۔ اور اس کی خبر سن کر ہر وہ مسلمان تڑپ اٹھا ہے جس کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی محبت کی ادنیٰ رمق موجود ہے۔

شاہ فیصل مرحوم کی وفات کا سانحہ محض اس لحاظ سے اندوہناک نہیں ہے کہ وہ ایک مسلم ریاست کے فرماں روا، ایک دولت مند بادشاہ اور ایک صاحب اقتدار شخصیت کے حامل تھے۔ کیونکہ نہ جانے کتنے حکمران اس دنیا سے اس طرح اٹھتے ہیں کہ ان کے سوگ میں صرف پرچم سرنگوں ہوتا ہے اور ان کی یاد میں صرف پرشکوہ مقبرے تعمیر ہو جاتے ہیں، ورنہ جہاں تک عام لوگوں کے دل کا تعلق ہے اس میں کسی قابل ذکر غم واندوہ کی پرچھائیاں بھی نہیں پڑتیں، اور بعد میں یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ کون آیا تھا اور کون چلا گیا؟ لیکن حرمین شریفین کے اس خادم عالم اسلام کے اس بطل جلیل اور صحرائے عرب کے اس درویش بادشاہ کا حال دنیا کے عام حکمرانوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی وفات پر نہ سعودی عرب کا پرچم سرنگوں ہوا[1] اور نہ اس کے لئے کوئی عالیشان مقبرہ تعمیر ہوا۔ اس کی قبر کی تصویر

---

[1] سعودی عرب کے پرچم پر چونکہ کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے اس لئے اسے کسی بھی بڑے سے بڑے حادثے پر سرنگوں نہیں کیا جاتا۔

ساری دنیا نے دیکھی ہے کہ لق و دق ریگستان کے بیچ میں اس کے گرد کچی اینٹوں کی کوئی چار دیواری بھی نہیں ہے۔ ایک سادہ ' کچی اور ریتلی قبر جس پر صحرا کی ہواؤں نے پوری مٹی بھی باقی نہیں چھوڑی لیکن مسلمانوں کے دل سے پوچھئے کہ اس کی وفات کا صدمہ کیسا انمٹ ' اس کی یاد کیسی زندہ جاوید ' اس کی محبت و عظمت کیسی پائیدار اور اس کا ذکر کتنا ناقابل فراموش ہے۔

یہ محبت و عظمت اور یہ عقیدت و مقبولیت دنیا کے ہر حکمران کو نصیب نہیں ہوتی ' بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایک ایسے خطہ زمین کے فرماں روا تھے جس سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات عقیدت وابستہ ہیں ' کیونکہ اسی خطے کی تاریخ میں شریف مکہ جیسے حکمران موجود ہیں۔ بلکہ بات للّٰہیت ' اس سوز و گداز ' اس مجاہدانہ جذبے اور اس تدبر کی ہے جو اللہ نے شاہ فیصل کو اس طرح ودیعت فرمایا تھا کہ ماضی قریب کے حکمرانوں میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے اور جس کی بدولت ان کی حکومت ایک محدود رقبہ زمین پر نہیں ' مسلمانوں کے قلب و روح کی وسعتوں پر تھی۔

انہوں نے ۱۹۶۴ء میں سعودی عرب کا اقتدار سنبھالا تھا ' اور ایک ایسے وقت میں اتحاد عالم اسلامی کا نعرہ بلند کیا تھا ' جب دنیا بھر کی طاقتیں اس نعرے کی مخالف تھیں اور پرائے تو پرائے اپنے بھی اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن وہ انتہائی خاموشی اور تدبر و وقار کے ساتھ اس راہ کی جدوجہد میں مصروف رہے اور دھمکیوں ' طعنوں اور تمسخر و استہزاء کے اوچھے ہتھیار ان کے پائے استقامت میں جنبش پیدا نہ کر سکے۔ ان کے دل میں وحدت اسلامی کی مچلتی ہوئی آرزو نے پہلے رابطہ عالم اسلامی ' پھر اسلامی سیکریٹریٹ اور بالآخر مسلم سربراہ کانفرنسوں کی شکل اختیار کر لی۔ اور جہاں چند عرب سربراہوں کا سر جوڑ کر بیٹھنا ناممکن نظر آرہا تھا وہاں چشم فلک نے یہ ایمان افروز نظارہ بھی دیکھا کہ شاہی مسجد لاہور کے فرش پر انڈونیشیا سے مراکش تک کے سربراہ ایک ساتھ بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز تھے۔ اس نظارہ میں شاہ فیصل کی شخصیت سب سے الگ سب سے ممتاز اور سب سے زیادہ دلآویز تھی۔ مسجد کی ہیبت و جلال سے ان کی جھکی ہوئی نگاہیں ' ان کا متواضع انداز خرام ' ان کا منفرد طرز بندگی اور

دعا کے وقت ان کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ محض کسی سیاسی ضرورت سے نہیں بلکہ اپنے دل کے جذبۂ بیتاب کی تسکین کے لئے یہاں تک پہنچے ہیں۔

سربراہ کانفرنس کے موقع پر ان کی خاموشی ان کی متانت اور بھیڑ بھاڑ سے علیحدگی کا تاثر ہر شخص پر یہ تھا کہ وہ اس موقع کو اپنی شخصیت ابھارنے کے لئے نہیں' بلکہ مقصد کو قریب کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اور پھر ایک اسلامی سکریٹریٹ کے پلیٹ فارم ہی سے نہیں اور نہ جانے کتنے راستوں سے وہ اسلامی وحدت کے لئے دن رات کام کر رہے تھے' اور نہ جانے کتنے اسلامی ملکوں کے درمیان علاقائی چپقلش کو انہوں نے اپنی دردمندی اور دلسوزی اور اپنی سوجھ بوجھ سے ختم کرایا تھا۔ اسلامی دنیا کے ہر خطے کے مسائل ان کے اپنے مسائل تھے اور وہ ہر مسلمان ملک کے دکھ درد میں برابر کے شریک تھے۔ اللہ نے انہیں دولت کے ساتھ اسے خرچ کرنے کے لئے دل بھی عطا کیا تھا اور صرف سعودی عرب ہی نہیں تمام عالم اسلام ان کی دریا دلی کا گواہ ہے۔

حرمین شریفین کی خدمت اور حجاج و زائرین کو سہولت بہم پہنچانے کے لئے انہوں نے جو کارنامے انجام دیئے وہ بلاشبہ تاریخی یادگار اور صدقات جاریہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے عہد میں سعودی عرب نے مادّی اعتبار سے بڑی ترقی کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ترقی کے ساتھ اس خطے میں بعض ایسے منکرات بھی داخل ہو گئے جنہیں دیکھ کر دل کڑھتا ہے لیکن یہ شاہ فیصل کی شخصیت ہی تھی جس نے مغربی طرز زندگی کے اس سیلاب پر اپنی حکمت و دوراندیشی اور تدیّن اور خودداری سے بڑی حد تک بند باندھے تھے' جو آجکل مادّی ترقیات کے ساتھ لازم ہو کر رہ گیا ہے۔ انہوں نے اسلام اور اسلامی شعائر کو ڈر ڈر کر جھینپ جھینپ کر اختیار نہیں کیا بلکہ پوری خود اعتمادی اور عزت و وقار کے ساتھ اختیار کیا اور آخر دم تک اپنی یہ آن برقرار رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے کی عام رفتار کے تحت مادّی ترقیات کے ساتھ مغربیت کا جتنا زہر معمولاً ہر اسلامی ملک میں پھیلا ہوا ہے سعودی عرب اس سے سب سے کم متاثر ہوا۔

جس وقت شاہ فیصل نے اقتدار سنبھالا اس وقت سعودی عرب کا تمام ترقی انحصار امریکہ پر تھا اور اسکے اثرات سے آزاد رہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن شاہ فیصل نے

بڑی حکمت' تدبر اور تدریج کے ساتھ اس صورتحال کو بدلنے کی کوشش کی جو اب تک جاری ہے اور اسی حالت میں جب عرب اسرائیل جنگ چھڑی تو انہوں نے مسلمانوں کی فتح' بیت المقدس کی اور عرب علاقوں کی واگذاری کیلئے اپنی ساری پونجی بلکہ اپنے وجود و بقا تک کو داؤ پر لگا کر تمام مغربی طاقتوں سے ایسی ٹکر لی جو ہمیشہ یادگار رہے گی۔ تیل کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا کام جتنا موثر تھا اتنا ہی نازک خطرناک اور جرأت و ہمت کا متقاضی تھا۔ شاہ فیصل نے اپنی جان پر کھیل کر یہ اقدام کئے اور پورے عالم اسلام کے دل موہ لئے۔

شاہ فیصل عالم اسلام کے وہ واحد سربراہ تھے جن سے مسلمانوں نے بہت سی توقعات قائم کی تھیں دینداری اور شجاعت و ہوش مندی کا جو امتزاج اللہ نے انہیں عطا فرمایا تھا اسے مسلمان اپنے قائدین میں عرصہ دراز سے ترس رہے ہیں۔

شاہ فیصل کی زندگی عالم اسلام کے حکمرانوں کے لئے ایک سبق کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی فرماں روا خواہ اس نے اپنے سطوت و جلال کے کتنے ہی پرچم لہرائے ہوں بالآخر اسکا انجام وہی خاک ہے جس میں آج شاہ فیصل محو آرام ہیں۔ دنیا میں اقتدار و اختیار کبھی کسی کا قائم نہیں رہا لیکن جو شخص اس اختیار و اقتدار کو اللہ کی رضا اور ملت کی فلاح و بہبود میں استعمال کرے' اس پر دنیا میں تعریف و تحسین اور آخرت میں اللہ کی رحمتیں برستی ہیں۔ اور جو شخص اس اقتدار کو محض اپنی ذاتی ہوس کی تسکین کا ذریعہ بناتا ہے قبر کے انجام تک پہنچنے کے بعد نہ دنیا میں اس کی یاد باقی رہتی ہے اور نہ آخرت میں اس کا کوئی نصیب۔ شاہ فیصل کوئی قرون اولیٰ کے حکمران نہیں تھے اور نہ انہیں اسلام کا پورا آئیڈیل کہا جا سکتا ہے' لیکن ماضی قریب کے حکمرانوں میں وہ اسلام سے شاید سب سے زیادہ قریب تھے۔ اسی قرب نے انہیں حیات جاوید بخش دی ہے اور آج اگر سارا عالم اسلام اس طرح رو رہا ہے جیسے اسکا شفیق باپ اور مخلص بزرگ سر سے اٹھ گیا ہو تو یہ اسی دین سے قرب کا نتیجہ ہے۔ عالم اسلام کی اس عدیم المثال سوگواری میں ہمارے موجودہ حکمرانوں کے لئے یہ سبق سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ جو حکمران اسلام سے جتنا قریب ہوگا ملت اسلامیہ اتنا ہی اسے گلے لگانے کے لئے تیار رہے۔

آج ہر مسلمان کے قلب و روح کی گہرائیوں سے یہ دعائیں بلند ہو رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ شاہ فیصل مرحوم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیں' انہیں جنت الفردوس میں مقام بلند عطا

فرمائے اور ان کے جانشین شاہ خالد بن عبدالعزیز کو یہ توفیق بخشے کہ وہ پوری جرأت، وحدت اور فہم و تدبر کے ساتھ وحدت اسلامی کے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔ اللہ تعالیٰ سعودی عرب اور ہمارے تمام عالم اسلام کو داخلی اور خارجی فتنوں اور دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے اور اسلامی دنیا کو ایسی قیادت نصیب فرمائے جو سنن نبوی کے مطابق ملت کی کشتی کو پار لگا سکے۔ آمین ثم آمین۔

البلاغ جلد ۵ شمارہ ۴

حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ

پچھلے دنوں برصغیر کے جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ دہلی میں انتقال فرماگئے۔ موصوف آخری عہد کے علماء دیوبند میں ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ جمعیت علماء ہند کے معروف رہنما اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے معتمد خاص تھے۔ احقر کے جدّ امجد حضرت مولانا محمد یاسین صاحبؒ کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے اور موصوفؒ کے پاس ان کی آمدورفت بالکل گھر کے بچوں کی طرح رہتی تھی۔ علم و فضل میں مقام بلند پر فائز تھے اور تحریر انتہائی عالمانہ، سلیس اور شگفتہ تھی۔ ان کی تصانیف میں "علماء ہند کا شاندار ماضی" ان کے شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے جس میں انہوں نے اکبر کے زمانے سے لے کر تقسیم ہند تک کے اہل علم کی دعوت و عزیمت کی تاریخ نہایت محنت سے دلچسپ انداز میں مرتب فرمائی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال سے متعلق بھی انہوں نے پہلی بار ایسے حقائق کا انکشاف کیا جو ہنوز پردہ میں تھے اور دیگر بہت سے موضوعات پر بھی ان کی تحریریں نہایت گراں قدر ہیں۔ آخر عمر میں سیاست سے کنارہ کش ہوگئے تھے اور دہلی میں علمی خدمات انجام دے رہے تھے۔ راقم الحروف کو کبھی ان کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن البلاغ ان کے پاس پہنچتا تھا اور وہ ناچیز کی تحریروں کی ہمت افزائی خطوط کے ذریعے کرتے رہتے تھے۔ والد ماجد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہم چند سال پہلے حرمین میں موجود تھے تو وہ اپنی معذوری اور ضعف کے باوجود انہیں تلاش کرتے ہوئے پہنچے اور ملاقات ہوئی جو حضرت والد صاحب مدظلہم سے ان کی آخری ملاقات تھی۔ ان کی وفات سے علمی دنیا کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرماکر انہیں جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

البلاغ جلد ۹ شمارہ ۱۱۔ ۱۲

آغا شورش کاشمیری صاحبؒ

اس عرصے میں یہ دوسرا حادثہ ہفت وار "چٹان" کے مدیر شہیر آغا شورش کاشمیری مرحوم کی وفات کا ہوا۔ ادبی اور صحافتی حلقوں میں ان کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ وہ ایک منفرد انداز تحریر کے مالک تھے۔ شعر گوئی میں مولانا ظفر علی خان مرحوم اور خطابت میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کے جانشین تھے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی شخص میں نثر و نظم اور خطابت تینوں کی مہارت بیک وقت جمع ہو جائے، لیکن شورش کی ذات میں یہ تینوں ملکات حیرت انگیز طور پر جمع تھے۔ انھوں نے سیاست میں قدم رکھا تو اس کی خاطر قید و بند کی ناقابل بیان صعوبتیں برداشت کیں، جن کی تفصیل ان کی کتاب "پس دیوار زنداں" میں موجود ہے۔ ذہنی اور قلبی طور پر وہ آخر تک اسلاف دیوبند کے شیدائی رہے اور اس کے اظہار میں نہ صرف انھوں نے کبھی تامل نہیں کیا، بلکہ اس کی خاطر انھوں نے بہت سے رنج کے مول لئے۔ انسان سے غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی ہے چنانچہ ان سے بھی سرزد ہوئیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی وہ دین کے خادم اور حق و صداقت کے سپاہی تھے۔ پچھلے دنوں جب راقم الحروف کے بڑے بھائی مولانا زکی کیفی مرحوم کا وصال ہوا تو وہ تعزیت کے لئے حضرت والد صاحب مدظلہم کے پاس تشریف لائے تھے اور دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ اس حادثہ میں دار العلوم اور ادارہ البلاغ مرحوم کے اہل خاندان کے غم میں شریک ہے، اور دل سے دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

البلاغ جلد ۹ شمارہ ۱۱-۱۲

مولانا انوار الحسن شیر کوٹیؒ

ایک اور المناک حادثہ جس کی اطلاع البلاغ میں کافی تاخیر سے دی جارہی ہے ' مولانا انوار الحسن شیر کوٹی رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کا حادثہ ہے۔ علمی حلقوں میں مولانا مرحوم کا نام محتاج تعارف نہیں ' وہ خود دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ تھے ' اور اکابر دیوبند کے عاشق زار۔ وہ لائل پور کے ایک کالج میں استاذ تھے ' لیکن نجی طور سے ہمہ وقت تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ علماء دیوبند کی سوانح حیات ان کا خاص موضوع تھا ' اور انہوں نے متعدد علمائے دیوبند کی سوانح بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے مرتب فرمائی ہیں۔ جن میں سے "حیات امداد" "سیرت یعقوب و مملوک" اور "انوار قاسمی" شائع ہو چکی ہیں اور "حیات ذوالفقار" زیر طبع ہے۔ خاص طور سے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمتہ اللہ علیہ سے انہیں عشق تھا ' اور ان پر انہوں نے تین ضخیم کتابیں لکھی ہیں "تجلیات عثمانی" علامہ عثمانی " کے معاصر علماء کا مفصل تذکرہ ہے "انوار عثمانی" ان کے خطبات و مکاتیب کا مجموعہ ہے ' اور یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں ' ایک تیسری کتاب انہوں نے "حیات عثمانی" کے نام سے لکھی تھی جو ابھی مسودے کی شکل میں ہے ' اور اس میں انہوں نے علامہ عثمانی " کی مفصل سوانح قلم بند کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کے علمی مکاتیب کا مجموعہ "قاسم العلوم" اپنے اردو ترجمہ اور تشریحات کے ساتھ شائع کر کے بڑی گراں قدر خدمت انجام دی ہیں۔

ابھی شعبان ۹۶ھ میں راقم الحروف کا لائل پور جانا ہوا تو انہوں نے بڑی محبت سے "حیات عثمانی " کا مسودہ دکھایا۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ کتاب مکتبہ دارالعلوم سے شائع ہو اور احقر نے اس کا وعدہ بھی کر لیا تھا ' اس کے علاوہ وہ اس وقت مقدمہ فتح الملہم کا اردو ترجمہ بھی کر رہے تھے ' معلوم نہیں کہ وہ کتنا ہو سکا؟ علماء دیوبند کے حالات پر وہ معلومات کا خزانہ تھے اور انہوں نے اس سلسلے میں بڑا نادر مواد جمع کر رکھا تھا اس کے باوجود وہ بڑے متواضع ' منکسر المزاج ' خلیق ' ملنسار اور نرم خو تھے۔ ان سے آخری ملاقات شعبان میں ان

کی قیام گاہ پر ہوئی، وہ لاہور تک میرے ساتھ شریک سفر ہونا چاہتے تھے مگر بروقت اسٹیشن نہ پہنچ سکے، اس کے بعد ۹ شوال ۹۶ھ کو (یعنی حضرت والد ماجد کی وفات سے ایک روز پہلے) وہ اچانک بیمار ہوئے اور آناً فاناً زندگی کے سارے مراحل طے کر کے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں مقامات عالیہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین۔

البلاغ جلد ۱۱ شمارہ ۲

والد محترم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ
مفتی اعظم پاکستان

اپنی زندگی میں احقر کو کوئی مضمون اور کوئی تحریر کبھی اتنی صبر آزما معلوم نہیں ہوئی جتنا صبر آزما آج کا اداریہ ہے۔ کوئی پیچیدہ سے پیچیدہ بات لکھنے میں اتنی دشواری پیش نہیں آئی جتنی دشواری بظاہر صاف اور سیدھی سی حقیقت بیان کرنے میں محسوس ہو رہی ہے کہ میرے والد ماجد، میرے استاذ و معلم، میرے شیخ و مربیؔ، میرے ہادی و رہنما، میرے مرشد و آقا اور میرے غم خوار و غمگسار، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

زندگی میں کبھی کسی واقعے یا حقیقت کے تسلیم کرنے سے کلیجہ اس بری طرح نہیں ٹوٹا جس طرح اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ٹوٹ رہا ہے کہ جس منور چہرے کا دیدار غم و تشویش کا مداوا تھا، اب زندگی بھر کیلئے روپوش ہو چکا ہے۔ جس مقدس آواز کو سنکر ہر مشکل آسان معلوم ہوتی تھی، اب جیتے جی سنائی نہیں دے گی۔ جس مبارک وجود کے سہارے پر ہم وقت کے ہر طوفان سے لڑ سکتے تھے، اس کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے، اور زندگی اب تک جس ذات کے گرد گھوم رہی تھی، اب وہ جلوہ افروز نہیں رہی۔ علم و فضل کی وہ محفل اجڑ گئی۔ اصلاح و ارشاد کی وہ مسند ویران ہو گئی۔ تقویٰ اور تدین کا وہ آفتاب روپوش ہو گیا، اصابت رائے اور دینی بصیرت کا وہ سرچشمہ چھن گیا۔

اب تک جو ذاتی، اجتماعی اور علمی الجھنیں ایک "اباجی" کا محبوب ترین خطاب استعمال کرکے سلجھ جاتی تھیں، انہیں اب کون سلجھائے گا وہ اعتدال و توازن اور رعایت حقوق اب کہاں میسر ہو گی جس سے اب تک زندگی کا لمحہ لمحہ فیضیاب تھا۔ یا رب یہ کیسا انقلاب ہے؟ یہ کیسی آزمائش ہے؟ یہ کیسا صدمہ ہے؟ خدایا! تو ہی اس صدمے پر صبر دیگا، تیرے سوا کوئی نہیں جو دستگیری کر سکے۔ اَللّٰھُمَّ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا اِلَّا اِلَیْکَ۔

لوگ اپنے بڑوں کے نام کے ساتھ طرح طرح کی دعائیں لکھا کرتے ہیں، کوئی "دامت

پر کا تمہ" لکھتے ہوئے کوئی "دامت فیوضہم" کوئی "زید مجدہم" لیکن میں جب بھی اپنے والد ماجد کا اسم گرامی لکھتا تو ان سب سے کوئی دعا مجھے اپنے مقصود دعا پر صریح نہ معلوم ہوتی۔ اس لئے میں نے حضرت والد صاحبؒ کے لئے پوری طرح سوچ کر بلکہ ان تمام قسموں کے بجائے "مدظلہم" کی دعا اختیار کی تھی، چنانچہ میں ہمیشہ ان کے اسم گرامی کے ساتھ یہی جملہ لکھا کرتا تھا۔ اور اگرچہ قلم کو اس جملے کی عادت سی پڑ گئی تھی، لیکن مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان کے لئے یہ جملہ بھی محض عادۃً لکھ دیا ہو، اور اس کے معنی کی طرف دھیان نہ گیا ہو، بلکہ جب بھی میں یہ جملہ لکھتا، دل کی گہرائیوں کی آواز ہوتی۔ میں اور کوئی لفظ بے خیالی میں لکھ جاتا تھا، مگر یہ جملہ شاید کبھی بے خیالی کے عالم میں قلم سے نہیں نکلا۔ حد یہ ہے کہ کسی تحریر میں اگر بار بار حضرت والد صاحبؒ کا نام لکھنا ہوتا تو میں ہر بار پورے اہتمام کے ساتھ یہ جملہ لکھا کرتا تھا، یہاں تک کہ یہ دعا ان کے نام کے ساتھ لازم و ملزوم سی ہو گئی تھی۔

آج اسی ذات کے نام سے "مدظلہم" کا یہ جملہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ رہا ہے۔ آج اس جملے کے بجائے ان کے نام کے ساتھ "رحمۃ اللہ علیہ" لکھتے ہوئے جو کچھ دل پر بیت رہی ہے، زبان و قلم میں طاقت نہیں ہے کہ اس کی ادنیٰ سی کیفیت کا ہزارواں حصہ بھی کاغذ پر منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

اپنی زندگی کے اس سب سے بڑے حادثے پر ——— جس کے بعد سے زندگی شب و روز کے ایک کرب انگیز تسلسل کا دوسرا نام ہے ——— کیا لکھوں؟ کس طرح لکھوں؟ کس کے لئے لکھوں؟ اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے الفاظ ڈھونڈتا ہوں تو اپنی حالت اس بچے سے مختلف معلوم نہیں ہوتی جس کی آنکھوں کی ساری کائنات لٹ چکی ہو، اس کے دل میں درد و فغاں کے طوفان ہوں، لیکن اسے ایک لفظ بولنا نہ آتا ہو۔ فرق یہ ہے کہ وہ بچہ کبھی کھل کے رو لیتا ہے تو اسے زبان کی حاجت نہیں رہتی، اور یہاں آنکھوں کا عالم یہ ہے کہ وہ آنسوؤں کو ترس ترس کر پتھرا چکی ہیں۔ کسی کو اپنے مقدس والد ماجد کی وفات پر قلم اٹھانا پڑے، دیکھتا ہوں تو حیرانی ہوتی ہے کہ اس پر مضمون کیسے لکھیں گے۔

مظلوم ! تجھے اجازت اظہار غم تو ہے
تو خوش نصیب ہے کہ تری آنکھ نم تو ہے

اب جو کچھ بیت رہی ہے اسے جھیلنے کے لئے صرف دل ہے، جو نہ جانے کس طرح دھڑک رہا ہے، اور خدا جانے کب تک دھڑکتا رہے گا؟

بات صرف ایک باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی نہیں ہے، اگر بات صرف اتنی ہوتی تو یہ صدمہ ایسا گمبھیر نہ ہوتا، دنیا میں کسی باپ کا سایہ ہمیشہ باقی نہیں رہتا اور بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جنہیں یتیمی سے سابقہ نہ پڑتا ہو۔ لیکن یہاں معاملہ ایسا ہے کہ ان کے سفر آخرت سے نہ جانے کتنے سائے اس غمزدہ سر سے اٹھ گئے ہیں، باپ کا سایہ، استاد کا سایہ، شیخ و مربی کا سایہ، ہادی و رہنما کا سایہ اور ایک ایسے غم خوار و غم گسار کا سایہ جس کے اٹھنے کے بعد زندگی میں پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ غم اور صدمہ کسے کہتے ہیں؟ ورنہ سخت سے سخت صدمہ اور بڑی سے بڑی فکر ان کے قدموں میں پہنچ کر بے نشان ہو جاتی تھی، اور ان کی پائنتی بیٹھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کائنات میں ہمارے لئے محبت و شفقت کے سوا کچھ نہیں۔

اب بھی جب صدمہ ناقابل برداشت ہونے لگتا ہے تو پاؤں بے ساختہ ان کے کمرے کی طرف اٹھ جاتے ہیں، وہاں ان کی چارپائی اسی طرح بچھی ہے جس پر لیٹ بیٹھ کر انہوں نے اپنی عمر کے آخری چار سالوں میں گوناگوں امراض و آزار کے عین درمیان نہ جانے کتنے بے شمار دلوں کے لئے شفا کا سامان کیا، کتنے تشنگان علم و معرفت کی پیاس بجھائی، کتنے ٹوٹے دلوں کو دلاسے دیئے۔ ان کے لبوں سے نکلی ہوئی ان گنت دعاؤں اور بے شمار اذکار و تسبیحات کی مہک آج بھی اس کمرے میں بسی ہوئی ہے۔ اسی چارپائی کے سامنے بچھے ہوئے تخت پر ان کے سجدوں کے انوار آج بھی جگمگا رہے ہیں۔ دیوار پر وہ گھنٹہ اب بھی نصب ہے جس پر ہر دس پندرہ منٹ بعد ان کی نگاہیں پڑتی تھیں، اور وقت کی قدر پہچاننے کا عملی سبق دیتی تھیں۔ چارپائی کے سامنے وہ کرسیاں اسی طرح رکھی ہیں جن پر وزیر امیر سے لیکر چپراسی اور مزدور تک یکساں حیثیت میں بیٹھتے اور اس مرد درویش کے جاہ و جلال سے یکساں طور پر مرعوب ہو کر رہتے تھے جس کے کپڑوں میں بعض اوقات ایک سے زائد پیوند ہوا کرتے تھے۔

غرض اس کمرے کی بیشتر چیزیں آج بھی اسی طرح موجود ہیں لیکن اگر نہیں ہے تو وہ

شخصیت جس نے ہمارے گھر اور اس کی ہر چیز کو دلکشی عطا کر کے اسے ہمارے لئے سامانِ قرار بنا دیا تھا۔ اپنی مختصری زندگی میں بفضلہ تعالیٰ دنیا کے بڑے بڑے علماء و صلحاء اور عابد و زاہد شخصیتوں کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اور "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کے مصداق بلند کردار کی مختلف مثالیں سامنے آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو جدا خصوصیات کا حامل بنایا ہے اور ان میں سے خدانخواستہ کسی کی ناقدری نہ کبھی کی جاسکتی لیکن اپنے اس تاثر کو چھپانا میں خلافِ دیانت سمجھتا ہوں کہ کردار و عمل کی جو بعض خصوصیات اپنے مقدس والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں درخشاں دیکھیں وہ اپنی بے نظیر اور بے مثال تھیں کہ صرف نسبی تعلق کی محبت نہیں بلکہ علم اور بزرگی کی عقیدت بھی روئے زمین پر ان کے برابر کسی سے نہ ہو سکی۔

یہ تو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے احقر کو عمر کے چونتیس سال حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں رہنے کی سعادت عطا فرمائی۔ اس طویل عرصے میں یوں تو بحمد اللہ ہم سب بھائیوں کو ان کے قریب رہنے کی سعادت حاصل رہی لیکن خاص طور پر حضرت مولانا محمد رفیع صاحب اور احقر کو جدائی کی نوبت بہت کم آئی۔ کیونکہ ہم دونوں حضرتؒ ہی کے ساتھ ایک مکان میں رہتے تھے، آخر میں بیشتر سفروں میں بھی معیت نصیب ہو جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ دو دو ماہ کے لئے مفارقت ہوئی۔ ایک مرتبہ ۶۳ء میں احقر کے سفرِ عمرہ کے وقت اور دوسری بار ۶۵ء میں حضرت موصوفؒ کے سفرِ افریقہ کے وقت کہ اس سفر میں محترم حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم ان کے ساتھ تھے۔ ان دو مواقع کے علاوہ کبھی دو ماہ کی جدائی سے زیادہ سابقہ نہیں پڑا اور ان دونوں مواقع پر بھی میں ہی جانتا ہوں کہ اس مفارقت کو کس طرح برداشت کیا ہے۔

اور آخری پانچ سال میں تو شب و روز کے بیشتر اوقات حضرت علیہ الرحمۃ کے قدموں ہی میں گزرتے تھے۔ ان کی علالت کی بنا پر احقر نے اپنا متعلقہ چیزوں کا سارا کام سمیٹ کر اپنا دفتر ان کی پائنتی سے متصل ایک چھوٹے سے کمرے میں بنالیا تھا، جس سے ہر وقت ان کی زیارت سے مشرف ہونے کے علاوہ ان کی صحت کے ہر اتار چڑھاؤ سے باخبر رہ سکوں، چنانچہ میں اپنا سارا کام ان کے سامنے انجام دیتا اور جہاں کوئی الجھن پیش آئی فوراً ان سے رجوع کرتا اور وہ کافور ہو جاتی۔ وہ بھی اپنے تقریباً ہر کام سے اصالتاً یا ضمناً احقر کو مطلع

فرماتے رہتے تھے۔ یہ حضوری کی عادت اس قدر راسخ ہو گئی تھی کہ جمعہ کے روز چند گھنٹوں کے لئے شہر جانا بھی بھاری معلوم ہوتا تھا اور ہم دونوں بھائی کسی دوسری جگہ کے سفر سے تو حتی الامکان پرہیز ہی کرتے تھے۔ بعض مرتبہ احباب اور کرم فرما اس پر برا بھی مناتے، لیکن شدید مجبوری کے بغیر ہم سفر نہیں کرتے تھے، اور اگر چند روز کا سفر پیش آ بھی گیا تو روزانہ فون پر بات کئے بغیر چین نہ آتا تھا اور جلد از جلد واپسی کی فکر رہتی تھی۔

ابھی پچھلے شعبان کی بات ہے کہ میں ایک بزرگ کے شدید اصرار پر ایک ہفتے کے لئے لائل پور اور لاہور کے سفر پر چلا گیا، لیکن ادھر تو میرا عالم یہ تھا کہ دل و دماغ ہر وقت حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف لگا رہتا تھا، ادھر جب میں واپس آیا تو حضرتؒ نے اس ناکارہ سے فرمایا کہ اس مرتبہ بطور خاص تمہاری طرف بہت دھیان لگا رہا اور اسی حالت میں قرآن کریم کی ایک آیت کا مطلب سمجھ میں آیا، میں سورۂ یوسف کی تلاوت کر رہا تھا کہ یہ آیت آئی :

"إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ وَأَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ"

"مجھے یہ بات رنجیدہ کرے گی کہ تم اس (یوسفؑ) کو (میرے پاس سے) لے جاؤ، اور مجھے اندیشہ ہے کہ اسے بھیڑیا نہ کھا جائے۔"

فرمایا کہ یہاں ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے دو چیزوں کا ذکر الگ الگ فرمایا ہے۔ ایک جدائی کا رنج، دوسرے بھیڑیے کے کھا جانے کا اندیشہ۔ ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کے جدا کرنے میں صرف بھیڑیے کا خوف نہ تھا بلکہ ایک مستقل رنج یہ تھا کہ اتنی دیر کے لئے وہ جدا ہو جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ جس سے انسان کو محبت ہو، اس کا محض نظروں سے دور ہو جانا مستقل باعث رنج ہے، خواہ کوئی اور اندیشہ نہ ہو۔

غرض بات دور نکل گئی، عرض یہ کر رہا تھا کہ اگرچہ اپنی نااہلی اور نالائقی کی بنا پر یہ ناکارہ حضرتؒ سے حاصل کچھ نہ کر سکا جس کی حسرت آج دل کا مستقل داغ بنی ہوئی ہے، لیکن اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ بفضلہ تعالیٰ ان کے اتنے قریب رہنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی کم از کم آخری دور میں ہمہ وقت ان کے اتنا قریب شاید کوئی اور نہیں رہا۔

اتنے قرب کی حالت میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ محبت خواہ کتنی بڑھ جائے، لیکن عقیدت

بعض اوقات اتنی نہیں رہتی جتنی دور دور سے کسی بزرگ کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ کیونکہ قرب کی وجہ سے زندگی کا ہر گوشہ سامنے آتا ہے اور یہ ہم جیسے کی طبعی خصلت ہے کہ وہ خود بے علمی کے جس تحت الثریٰ میں ہوں، کسی بزرگ کی کوئی کمزوری سامنے آئے تو اس کی عقیدت میں کمی ضرور واقع ہو جاتی ہے۔

لیکن حضرت والد ماجد علیہ الرحمۃ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس یہ تھا کہ ان سے جتنا جتنا قرب بڑھتا گیا، اسی نسبت سے ان کی عقیدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ شروع شروع میں ان سے بس ایسی ہی محبت تھی جیسی ایک بیٹے کو باپ سے ہونی چاہئے، لیکن جوں جوں ذرا ہوش آیا اور کارزار حیات میں ان کے بے مثال طرز فکر اور حیرت انگیز طرز عمل پر غور کرنے کی توفیق ہوئی، اسی نسبت سے محبت کے ساتھ ساتھ عقیدت بڑھتی ہی چلی گئی۔ جب بھی کبھی نجی یا اجتماعی زندگی کا کوئی واقعہ پیش آتا، ان کے ایک نئے کمال کا انکشاف ہوتا اور آخر میں تو عقل اور اندازوں نے ہار مان لی تھی کہ ہم جیسے لوگ اس مقام کا ادراک کر ہی نہیں سکتے جہاں سے وہ سوچتے اور عمل کرتے ہیں۔

لہٰذا آج جس قدر صدمہ ایک شفیق ترین باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کا ہے، اتنا ہی بلکہ اس سے بھی زائد صدمہ اس بات کا ہے کہ دنیا ایک ایسی ہستی سے محروم ہو گئی جس نے اسلاف کے کتابی واقعات کا جیتی جاگتی زندگی میں اپنے عمل سے مشاہدہ کرایا تھا۔ ان کا وجود ــــــ اور صرف وجود بھی ــــــ نہ جانے کتنے فتنوں کے لئے آڑ بنا ہوا تھا، اور نہ جانے کتنے سہمے ہوئے دلوں کو سہارا دے رہا تھا۔

البلاغ کے بہت سے قارئین نے جہاں احقر کو تعزیت کے ہمدردانہ پیغامات بھیجے ہیں، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ ہم حضرت علیہ الرحمۃ کے بارے میں تمہاری تحریر کے منتظر ہیں۔ میں ان حضرات کی محبت و شفقت کا ممنون ہوں لیکن انہیں یہ کیسے بتاؤں کہ جس شخص کی تحریروں کی وہ ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں آج اس موضوع پر اس کا قلم ٹوٹ چکا ہے۔

"سانس لینا مجھے مشکل ہے فغاں کیسے ہو"

اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باقی ماندہ زندگی حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی

ملاقات کے انتظار سے عبارت ہے اگرچہ یہ انتظار کچھ طویل ہوا' اللہ نے دل کو قرار عطا فرمایا اور حوادث روزگار سے فرصت ملی تو انشاء اللہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مفصل سوانح اپنی بساط کے مطابق مرتب کرنے کی کوشش کروں گا لیکن بحالات موجودہ اس موضوع پر لکھنا احقر کے لئے ایک ناقابل برداشت آزمائش ہے۔

الحمد اللہ! یہ حقیقت ہر آن مستحضر ہے کہ اللہ تبارک تعالی کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ دنیا کے اس مسافر خانے میں بھی کوئی ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آتا۔ ساری غلطی یہاں سے لگتی ہے کہ ہم اس راہ گذر کو منزل سمجھ بیٹھتے ہیں اور یہاں کے تعلقات اور حاصل شدہ راحتوں کو اپنا دائمی حق قرار دے لیتے ہیں۔ حضرت والدماجد رحمۃ اللہ علیہ چند سالوں سے قرآن کریم کی یہ آیت نہایت کثرت سے اور شاید روزانہ کئی کئی بار پڑھا کرتے تھے کہ

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ

تمہارے پاس جو کچھ ہے فنا ہو جائیگا اور اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔

اور یہی وہ قرآنی حقیقت ہے جس سے غفلت کے نتیجے میں یہاں کی تکالیف پہاڑ معلوم ہوتی ہیں' اور صدمے ناقابل برداشت ہونے لگتے ہیں۔

جب پونے دو سال پہلے احقر کے برادر مرحوم مولانا محمد زکی صاحبؒ کی وفات ہوئی' اس وقت حضرت والدماجد رحمۃ اللہ علیہ نے جیسا پیکر صبر و استقامت بن کر دکھایا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اسی موقع پر حضرتؒ نے بار بار یہ حکیمانہ بات فرمائی تھی کہ انسان حادثات کے موقع پر دنیا کے واقعات کو الٹا پڑھتا ہے' اور اس کے نتیجے میں بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مثلاً وہ یہاں سے سوچنا شروع کرتا ہے کہ اس حادثے میں سے میرا کیا کیا نقصان ہو گیا؟ اور یہ حادثہ ابھی پیش نہ آتا تو کیا تھا؟ حالانکہ وہ واقعات کو سیدھا پڑھے تو اس کی سمجھ میں آئے کہ یہ حادثہ تو کسی نہ کسی وقت پیش آنا تقدیر میں لکھا تھا لیکن اللہ تعالی نے یہ حادثہ ہمیں کتنا نرم کر کے دکھایا اور اس کے لئے کیا کیا اسباب جمع فرمائے؟ اگر انسان ان باتوں کو سوچے تو اسے صبر و سکون آئے۔

آج جب حضرت والدماجد رحمۃ اللہ علیہ کے کھولے ہوئے اس راستے پر ذہن سوچتا ہے تو بے ساختہ اللہ تبارک تعالی کا شکر زبان پر آتا ہے' اور احساس ہوتا ہے کہ جس واقعے کو ہم صبر کا موقع سمجھ رہے ہیں' وہ در حقیقت شکر کا موقع ہے۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا یہ سانحہ کبھی نہ کبھی پیش آنا ہی تھا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام سے زیادہ دنیا کو کس کی ضرورت ہو سکتی ہے؟ جب وہ حضرات وفات سے مستثنیٰ نہ ہو سکے تو کون ہے جسے اس سے مستثنیٰ سمجھ لیا جائے؟ لہٰذا یہ وقت تو آنا ہی تھا۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس حادثے کو ہمارے لئے ہلکا کرنے کے لئے کتنے تسلی کے سامان جمع فرمائے؟

کتنے لوگ ہیں جن کے باپ بچپن ہی میں سر سے اٹھ جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت رحمۃ اللہ کو اس وقت اس دنیا سے اٹھایا جب کہ ان کی اولاد کا سب سے کمسن فرد یعنی احقر عمر کے چونتیس سال پورے کر چکا تھا اور ابھی انتقال سے صرف پانچ دن پہلے کی تو بات ہے، ۵ شوال کا دن گزر چکا تھا اور ہم عشاء کے بعد حضرتؒ کے کمرے میں جمع تھے، اچانک مجھے خیال آیا کہ آج ۵ شوال تھی اور یہ میرا یوم پیدائش ہے، اس لئے بیساختہ میرے منہ سے نکل گیا "ابا جی آج میری سالگرہ ہے۔" حضرتؒ کے چہرۂ انور پر محبت کی چھا گئی اور انتہائی دلآویز تبسم کے ساتھ پوچھا:

"اچھا؟ ماشاء اللہ! اب تمہاری عمر کتنی ہو گئی؟"

"چونتیس سال پورے ہو گئے۔" میں نے عرض کیا۔

اس پر ایک لمحہ توقف کے بعد فرمایا "الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی عمر میں بہت سے مراحل سے گزار دیا۔"

پھر کتنے مصنفین ہیں جو اپنا کوئی خاص شروع کیا ہوا کام ادھورا چھوڑ گئے، لیکن حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے تقریباً سارے ہی کام اللہ تعالیٰ نے پورے کرا دیئے۔ ان کی کوئی تصنیف جسے مکمل کرنے کا ارادہ ہو، نامکمل نہیں رہی بلکہ کوئی تصنیف ایسی نہیں رہی جو ان کی زندگی ہی میں شائع نہ ہو گئی ہو۔

پھر اگر ان کی وفات کا حادثہ بالکل یک بارگی پیش آتا تو خدا جانے ہماری حالت کیا ہوتی؟ لیکن گزشتہ چار سال میں قدرتی طور سے ان پر امراض و عوارض کا ایسا سلسلہ چل رہا تھا کہ ہر شخص کو ہر وقت دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ہر روز بیم و رجا کی کیفیت رہتی تھی، اس عرصے میں ان کا گھر سے باہر نکلنا تقریباً ختم ہو چکا تھا اور بہت سی ذمہ داریاں ہمیں انجام دینے کی عادت پڑنے لگی تھی۔

غرض یہ تو صرف چند پہلو ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس حادثے کو نرم کرنے کے لئے ایسے غیر معمولی اسباب ہمارے لئے پیدا فرمائے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ یہ تمام حقائق اپنی جگہ ہیں، اور یقیناً ان پر غور کرنے سے بڑا سکون بھی ملتا ہے، لیکن جس پیکر شفقت و رحمت کی آغوش میں عمر کے چھتیس سال اس طرح گزرے ہیں کہ دنیا کے تفکرات کا کبھی احساس نہیں ہوا، اس کی یاد ایسی چیز نہیں ہے جسے آسانی سے کم کیا جا سکے۔ اس یاد کی ٹیسیں ختم کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ گھر کی ہر ہر چیز اور دارالعلوم کے ایک ایک کام سے ان کی سینکڑوں یادیں وابستہ ہیں، اور ہر قدم پر نہ جانے کتنے نشتر دل میں چبھوتی رہتی ہیں، گھبرا کر قرآن مجید کی تلاوت شروع کرتا ہوں تو اس میں بھی کسی نہ کسی آیت کے بارے میں ان کی بتائی ہوئی کوئی بات یاد آتی ہے، لہٰذا یادوں کی اس کائنات سے کہاں اور کس طرح بھاگ سکتا ہوں؟

اس عالم اضطراب میں حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح سے متعلق کوئی باربط اور مفصل تحریر احقر کے بس کی بات نہیں۔ اس اداریے میں حضرت کے آخری ایام کے کچھ حالات لکھنے کا خیال تھا، لیکن ذہن شل اور قلم کند رہا۔ اور اللہ تعالیٰ احقر کے بڑے بھائی جناب محمد ولی رازی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس موضوع پر ایک مفصل مضمون سپرد قلم کر دیا جو شامل اشاعت ہے۔

اب میں قارئین سے معذرت کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں، اور اس بات کے لئے بھی معذرت خواہ ہوں کہ کئی صفحات کے اس اداریے میں اپنے جذبات کے بے ربط اظہار کے سوا کوئی کام کی بات ان کی خدمت میں پیش نہیں کر سکا۔

ہاں! ایک ضروری بات یاد آ گئی۔ رمضان المبارک میں حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ پر پے در پے دل کی تکلیف کے حملے ہوتے رہے اور طبیعت بہت خراب رہی، عید کے بعد جب کیفیت بہتر ہوئی تو ایک روز فرمانے لگے:

"رمضان میں جب میری طبیعت زیادہ خراب تھی تو یہ امید تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ مجھے رمضان نصیب فرما دے۔ یہ فرما کر وہ کچھ رکے، اور میں سوچنے لگا کہ وہ رمضان کی موت کی آرزو کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، مگر معاً یہ محسوس ہوا کہ وہ جو کچھ اور کہنا چاہتے ہیں، اور تردد ہو رہا ہے کہ یہ بات کہوں یا ۔۔۔۔۔۔ نہ کہوں! پھر ذرا سے توقف کے بعد رک رک کر فرمایا:

"لیکن میرا حال بھی عجیب ہے، لوگ تو رمضان میں مرنے کی تمنا کرتے ہیں، لیکن میں تمنا نہ کر سکا، اس لئے کہ مجھے یہ خیال لگا رہا کہ اگر رمضان میں یہ واقعہ ہوا تو اوپر والوں (گھر والوں اور تعزیت کرنے والوں) کو بڑی تکلیف ہوگی اور ان کے روزوں اور تراویح وغیرہ کے معمولات میں دشواری پیش آئے گی۔"

اللہ اکبر! میں اپنے کانوں سے یہ الفاظ سن رہا تھا اور اس ایثار مجسم کو تک رہا تھا جس کی پرواز فکر ہمارے تصور کی ہر منزل سے آگے تھی۔ عبادت و زہد کے شیدائی بحمد اللہ آج بھی کم نہیں، لیکن احترام مراتب پر ان رعایتوں کا پاس کرنے والے اب کہاں ملیں گے؟

ان کا یہ بے ساختہ جملہ ان کی پوری زندگی کے طرز فکر کی تصویر ہے، وہ خود اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری
کہ آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

آخر میں قارئین سے اس دعا کا خواستگار ہوں کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے اس سب سے بڑے حادثے پر صبر جمیل کی توفیق بخشے، قلب کو سکون و قرار نصیب ہو اور باقی ماندہ زندگی جس کا ایک ایک لمحہ پہاڑ معلوم ہو رہا ہے، حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے نقش قدم کے مطابق اپنی مرضیات میں صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ایسے صدمے کے ساتھ ذمہ داریوں کا جو بار گراں برادر بزرگ جناب مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہم اور اس ناکارہ کے ناتواں کندھوں پر آپڑا ہے اس کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس مختصر سے وجود نے ۔ جو برسوں سے بظاہر اپنے جسم کا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا ـــــ کتنے بڑے پہاڑ اٹھا رکھے تھے! لہٰذا قارئین براہ کرم یہ دعا بھی فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان ذمہ داریوں سے صدق و اخلاص کے ساتھ اپنی رضا کے مطابق عہدہ برآ ہونے کی توفیق کامل مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

دارالعلوم اور البلاغ کے سر سے ایک ایسا عظیم سایہ اٹھ گیا جس سے ان کی ساری رونق قائم تھی۔ اب وہ رونق تو کہاں سے آئے گی؟ لیکن ان کا مشن بحمد اللہ زندہ ہے، ان کی

تعلیمات وہدایات آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ دارالعلوم اور البلاغ کے خدام اپنی پوری فرومائیگی اور عاجزی کے باوجود یہ عہد کرتے ہیں کہ جب تک دارالعلوم اور البلاغ زندہ ہیں، وہ انشاء اللہ ان کے مشن ان کے طرزِ فکر اور ان کی قائم کی ہوئی راہِ اعتدال کو اپنی بساط کے مطابق زندہ اور سربلند رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی ہمت و توفیق اور اس کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

البلاغ جلد ۱۰ شمارہ ۱۱۔۱۲

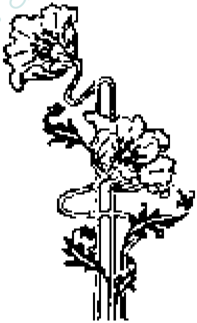

حضرت مولانا اطہر علی صاحبؒ

یہ قدرت کا عجیب و غریب نظام ہے کہ جس رات حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا، اسی رات چند گھنٹے پہلے ان کے عظیم رفیق حضرت مولانا اطہر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میمن سنگھ میں واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی طرح وہ بھی کسی ایک ملک یا خاندان کی نہیں، پوری امت مسلمہ کی گرانقدر متاع تھے، اور ان کی وفات کے صدمے نے امت مسلمہ کے لئے حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے حادثۂ وفات کا صدمہ دوچند کردیا ہے۔ ہمارے پاس اس حادثے پر بھی اظہار غم کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ حکیم الامتؒ کے دو عظیم خلفاء کا بیک وقت دنیا سے اٹھ جانا ایک سانحۂ عظیم ہے، اللہ تعالیٰ اس امت کو شرور و فتن سے محفوظ رکھے، حالات انتہائی پر خطر نظر آتے ہیں اور بے ساختہ زبان پر یہ کلمات جاری ہے: اللھم لا تحرمنا اجرھم ولا تفتنا بعدھم۔

بلاغ جلد ۱۰ شمارہ ۱۰

مولانا محمد احمد تھانویؒ

اللہ والوں کے قافلے تیزی سے عالم آخرت کی طرف جا رہے ہیں، پچھلے تین چار مہینے سے کیسی کیسی عظیم ہستیاں اُٹھ گئیں، ابھی انہی کے فراق سے دل و دماغ متاثر اور آنکھیں اشکبار تھیں کہ پچھلے مہینے حضرت مولانا محمد احمد صاحب تھانویؒ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

البلاغ کے پچھلے شمارے ہی میں تو ان کے قلم سے حضرت مولانا اطہر علی صاحبؒ اور حضرت بابا نجم احسن صاحبؒ کی تاریخ وفات شائع ہوئی تھیں، کسے خبر تھی کہ البلاغ کا اگلا شمارہ انکی وفات کی خبر لے کر نمودار ہوگا اور یہ ساری تاریخ وفات صرف ایک ہندسے کے اضافے سے خود ان کی تاریخ وفات بن جائیں گی۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ تھانہ بھون کے منتسبین میں معروف عالم تھے، وہ حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہم کے چھوٹے بھائی تھے جو حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی اہلیہ محترمہ کے داماد ہیں۔ انہوں نے سکھر میں مدرسہ اشرفیہ کی بنیاد ڈالی جو اپنے علاقے کی ممتاز ترین دینی درسگاہ ہے، اور اس خطے میں اس نے علم و دین کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، وہ نہایت وجیہ، باوقار اور فعال شخصیت کے مالک تھے، ادا ادا سے ذہانت مترشح ہوتی تھی۔ قرآنی آیات سے تاریخ کے استخراج میں ان کو حیرت انگیز حد تک ملکہ حاصل تھا، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ اور احقر کے برادر بزرگ مولانا محمد زکی کیفی صاحبؒ کی وفات پر انہوں نے جو تاریخیں نکالیں، وہ البلاغ میں شائع ہو کر نہایت مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے ملاقات کے لئے آئے تو حضرتؒ نے ان سے ازراہ مزاح فرمایا:

"آپ کی تاریخیں دیکھ کر تو ہمارا بھی دل چاہنے لگا ہے کہ جلدی سے مر جائیں، تاکہ آپ ہماری بھی ایسی اچھی تاریخیں نکالیں۔"

تو آگے یہ مزاح کی بات حقیقت بن گئی، انہوں نے حضرت والد صاحبؒ کی تاریخ

وفات کا استخراج کیا، جو ذی قعدہ و ذی الحجہ کے مشترکہ شمارے میں شائع ہوئی، اگلے شمارے میں انہی کے قلم سے حضرت مولانا اطہر علی صاحبؒ اور حضرت بابا نجم احسنؒ کی تواریخ وفات شائع ہوئیں، اور اس زیر نظر شمارے کے مرتب ہونے تک وہ خود ایک تاریخ بن گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی، وہ بمشکل پچپن ساٹھ کے لگ بھگ ہوں گے، لیکن چند سال سے انہیں قلب کا عارضہ لگ گیا تھا، ایک ایکسیڈنٹ میں ان کے ہاتھ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی اور بینائی بھی کمزور ہو گئی تھی۔ چند سال پہلے تک وہ بڑے توانا اور طاقت ور لگتے تھے، لیکن پھر ایک دم سے انکی صحت گرتی چلی گئی یہاں تک کہ چہار شنبہ ۷ محرم ۹۷ھ کی صبح انہیں جو قلب کا دورہ ہوا اس نے انہیں اس جہان فانی کی کشاکش سے آزاد کر دیا۔

وہ آخر وقت تک مصروفِ عمل رہے۔ حضرت والد ماجدؒ کی وفات کے بعد ان کے کئی خطوط آئے جن سے صحت متوحش تھی، پھر ابھی چند روز پہلے انہوں نے اپنے صاحبزادے کی شادی پورے اہتمام سے کی، لیکن اسی فرض سے سبکدوش ہو کر خود ہی اپنے خالق سے جا ملے۔ اللہ تعالےٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

مدرسہ اشرفیہ سکھران کا صدقۂ جاریہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے صاحبزادگان اور متعلقین کو توفیق بخشے کہ وہ اس امانت کی ٹھیک ٹھیک حفاظت کر کے اسے دین کا مضبوط حصار بنا سکیں۔ آمین۔

البلاغ جلد ۱۱ شمارہ ۳

حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ

جانا تو سبھی کو وہاں ہے جہاں سے کوئی لوٹ کر دنیا میں نہیں آتا' لیکن پچھلے چند سال سے اور بالخصوص گزشتہ چند مہینوں سے ایسی ایسی شخصیتیں اٹھ رہی ہیں جن کا صدمہ کسی ایک فرد' انجمن یا ادارے کا نہیں بلکہ پوری ملت کا صدمہ ہوتا ہے۔ ابھی رمضان سے محرم تک کے حادثات پر آنسو خشک نہیں ہوئے تھے کہ اسی مہینے جناب مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا دریا بادیؒ کی ذات برصغیر میں کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب' بلند پایہ صحافی' صاحب تصنیف' فلسفی اور اردو انگریزی کے مشہور مفسر قرآن تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی فلسفے کے "گماں آباد" میں بسر ہوئی اور وہاں سے وہ دین اور دینی عقائد کے بارے میں شکوک و شبہات میں ایسے مبتلا ہوئے کہ مدتوں الحاد و تشکیک کا شکار رہے۔ لیکن پھر اللہ نے ایسی توفیق دی کہ قرآن و سنت کی صداقت و حقانیت واضح ہوئی۔ فلسفے کا خمار اترا' عقل و عقلیت کے فریب کھلے' تصوف کا رنگ چڑھا اور بالآخر عقل اور انگریزی کا یہ شیدائی خانقاہ تھانہ بھون کے ایک بوریہ نشین (حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ) کے آگے دوزانو ہوگیا۔

مولانا دریا بادیؒ اس لحاظ سے بھی ایک مثالی شخصیت تھے کہ انہوں نے بیعت تو حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کے ہاتھ پر فرمائی لیکن حضرت مدنیؒ ہی کی اجازت بلکہ ایماء پر تربیت کا تعلق آخر تک حکیم الامت تھانویؒ سے قائم رکھا۔ یہ پوری داستان انہوں نے اپنی کتاب "حکیم الامت" میں جس دلنواز انداز سے بیان کی ہے اور حضرت تھانویؒ کی پہلی ملاقات سے لیکر تربیت کے مختلف مراحل تک کے حالات جس دلکشی کے ساتھ قلم بند کئے ہیں وہ مولانا دریا بادیؒ ہی کا حصہ تھا۔

ان کا شمار حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں تو نہیں لیکن ممتاز متوسلین میں ضرور تھا۔ وہ حضرت تھانویؒ کے عاشق تھے اور اپنی تحریروں میں جگہ جگہ حضرت کو 'مرشد تھانوی' کے لقب سے یاد کرتے ہیں' لیکن بہت سے معاملات میں ان کی رائے حضرت تھانویؒ سے مختلف رہی

ہے۔ حضرتؒ سے متعدد مسائل پر سوال و جواب ہوئے اور مولانا دریا بادیؒ حضرتؒ کی فہمائش کے بعد بھی اپنی رائے پر قائم رہے، اسکے باوجود تعلق اور عقیدت میں فرق نہیں آیا۔ ان کا اخبار جو پہلے "سچ" پھر "صدق" اور آخر میں "صدق جدید" کے نام سے نکلتا رہا اپنے طرز کا منفرد اور نرالا جریدہ تھا، جسے کتابت و طباعت کی عصری خوشنمائی عمر بھر نصیب نہ ہو سکی، لیکن مولانا دریا بادیؒ کے قلم کی حلاوت ایسی تھی کہ اسے شروع کر کے ختم کئے بغیر چھوڑ دینا اہل ذوق کے لئے مشکل تھا۔ وہ اپنے اداریہ میں (جو "سچی باتیں" کے زیر عنوان ہوا کرتا تھا) عموماً کسی کا موضوع پر لکھنے کی بجائے دنیا بھر کے اخبارات و رسائل کے تراشے نقل کرتے اور ہر تراشے کے ساتھ اپنا مختصر تبصرہ ایک دو سطروں میں کر دیتے، لیکن یہ ایک دو سطریں مفصل اداریوں پر بھاری ہوتی تھیں۔ ان کا قلم صحیح معنی میں بے باک اور نڈر تھا۔ انہوں نے جس بات کو درست سمجھا اس کے اظہار میں انہوں نہ کبھی حکومت کا خوف دامن گیر ہوا، اور نہ عوام یا رائے عامہ کا۔ وہ آخر تک اپنی رائے کا اظہار بے خوف و خطر کرتے رہے خواہ اس کے نتائج کچھ ہوں۔

قادیانیت کے مسئلے میں ان کا نرم گوشہ پوری امت کے خلاف تھا اور بلاشبہ یہ ان کی سنگین ترین غلطی تھی جس پر اللہ ان کی مغفرت فرمائے لیکن وہ پوری امت کی مخالفت کے باوجود اپنے اس موقف پر قائم رہے۔ عفا اللّٰہ تعالیٰ عنہ وغفرلہٗ

اردو اور انگریزی زبان میں انکی تفسیریں خاصی مقبول ہوئیں اور مسلمانوں کو ان سے کافی فائدہ پہنچا۔ چونکہ انہوں نے دینی علوم زیادہ تر مطالعے سے حاصل کئے تھے، اس لئے تفسیر میں بعض باتیں جمہور کے خلاف بھی آگئیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے وہ ایک مفید تفسیر ہے جس میں عصری معلومات کا بھی بڑا ذخیرہ ہے، خاص طور سے فرق عیسائیت کے مباحث بے نظیر ہیں۔

دوسروں پر تنقید کے معاملے میں مولانا دریا بادیؒ بڑے معتدل اور متوازن مزاج کے مالک تھے، کسی کی مخالفت کے جوش میں حد سے گزر جانا ان کا طریقہ نہ تھا، وہ اختلاف رائے کے باوجود دوسروں کی اچھی باتوں کی تعریف میں بخل سے کام نہ لیتے تھے۔

راقم الحروف کو مولانا سے بالمشافہ تو کبھی نیاز حاصل نہ ہو سکا لیکن خط و کتابت کافی رہی۔ وہ غائبانہ ہی اس ناکارہ پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ "البلاغ" بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور اس کے مضامین کو "صدق جدید" میں نقل کر کے ناچیز کی عزت افزائی فرماتے

رہتے تھے۔ صدق میں جب بھی البلاغ کا ذکر فرماتے تو دو چار تعریفی جملے ضرور لکھ دیتے تھے۔ بارہا البلاغ کو انہوں نے "پاکستان کا بہترین دینی ماہنامہ" قرار دیا۔ "تفسیر ماجدی" کی جلد اول طبع ہوئی تو انہوں نے ازراہ شفقت احقر کے پاس بھیجی، اور اس پر تبصرہ لکھنے کا بھی حکم دیا۔ احقر نے اس پر جو تبصرہ لکھا اس میں تعریف کے ساتھ بعض باتوں پر ادب کے ساتھ تنقید بھی تھی۔ احقر ان کے سامنے طفل مکتب کی بھی حیثیت نہیں رکھتا، لیکن یہ ان کی بڑائی کی بات تھی کہ انہوں نے پوری وسعت قلب کے ساتھ اسے گوارا فرمایا۔ البلاغ میں احقر کی کوئی تحریر انہیں پسند آتی تو اکثر ہمت افزائی فرماتے، اور کبھی کبھی احقر کی غلطیوں پر متنبہ فرمادیتے تھے۔ عرصے سے وہ فالج کی بناء پر بالکل صاحب فراش تھے، اور اس کی وجہ سے "صدق" بھی مختصر اور غیر مرتب سا ہونے لگا تھا۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی وفات پر انہوں نے بمشکل ایک سطر کا تعزیت نامہ بھیجا اور بالآخر ریڈیو سے یہ اطلاع مل ہی گئی کہ وہ دنیا کے جھنجھٹ سے نجات پاکر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کی زلات سے درگزر فرماکر انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین۔

افسوس ہے کہ احقر کے پاس مولانا دریا بادیؒ کے تمام خطوط محفوظ نہیں رہ سکے لیکن معمولی تلاش سے دو خط مل گئے وہ ذیل میں حاضر ہیں۔

مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۶۷ء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، البلاغ برابر پہنچتا رہتا ہے۔ ماشاءاللہ وبارک اللہ رد تجدد میں بہت سی کوششیں آپ کے ملک میں ہورہی ہیں اور جوش و خروش ان میں اچھا خاصا ہوتا ہے لیکن جتنی سنجیدہ، پر مغز، متین و محکم اور ساتھ ہی مہذب و شائستہ البلاغ کی تحریریں ہوتی ہیں وہ اسی کا مخصوص حصہ ہے۔

ایک ہلکی سی فروگزاشت البتہ عرض کردینے کے قابل ہے حضرت مسیح کے سلسلے میں باربار جو "پھانسی" کا لفظ آپ کے ہاں آتا ہے، اس کے بجائے "سولی" ہونا چاہیے دونوں کے درمیان فرق عظیم ہے۔ رومی قانون میں رواج صرف سولی کا تھا۔ والسلام دعاگو و دعا خواہ، عبدالماجد۔

۱۳ اگست ۱۹۷۶ء

برادرم محترم۔ السلام علیکم

جولائی کا البلاغ پہنچا۔ آپ کا مقالہ "عبدیت یا ترقی" پر مشتمل ہے۔ انشاء اللہ دو ہفتہ بعد صدق میں نقل شروع ہوگی اور دو تین قسطوں میں ہو جائے گی۔ صدق خود ہی بہت مختصر ہو گیا اور بالکل منتشر اور غیر مرتب ہو گیا ہے۔

فالج میں مدت سے مبتلا ہوں۔ سماعت، بصارت کی بیحد کمی میں گرفتار ہوں، نسیان وغیرہ۔ خدا کرے مولانا شفیع صاحب صحیح و تندرست ہوں۔ مولانا عبدالباری ندوی مرحوم ہو چکے۔ میں اپنا لکھا خود نہیں پڑھ سکتا ہوں۔ والسلام۔ دعاگو و دعا خواہ۔ عبدالماجد

البلاغ جلد ۱۱ شمارہ ۳

حضرت مولانا محمد سلیم صاحبؒ

پچھلے مہینے مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مہتمم حضرت مولانا محمد سلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دار فانی سے کوچ کر کے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ موصوف حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے، اور انہوں نے مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ کے نام سے جس مدرسے کی بنیاد ڈالی تھی، آخر وقت تک اس کی پاسبانی کرتے رہے۔ شروع میں حضرت مولانا سلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی سے ماہنامہ "ندائے حرم" کے ذریعے عرصے تک دین کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ اس کے بعد وہ مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت فرما گئے، اور آخر وقت تک مدرسہ صولتیہ کے انتظام و انصرام میں مصروف رہے۔ یہ مدرسہ تعلیمی خدمات انجام دینے کے علاوہ مکہ مکرمہ میں حجاج اور زائرین کو گوناگوں سہولیات فراہم کرنے کی خدمت بھی انجام دیتا ہے۔

حضرت مولانا محمد سلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، اور ضعیف سن کے باوجود اپنے دفتر میں روزانہ بڑی محنت سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ راقم الحروف پر نہایت مہربان تھے اور جب بھی مکہ مکرمہ حاضری ہوتی، ان کی شفقتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملتا تھا۔ مکہ مکرمہ میں اکثر قیام ان کے پاس ہی رہتا اور ان کے زیر سایہ بالکل اپنے گھر کی سی راحت میسر آتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک دردمند دل عطا فرمایا تھا جو ہر خطے کے مسلمانوں کے دکھ درد سے بے چین ہوتا اور ان کے مسائل کے حل کے لئے متفکر رہتا تھا، مکہ مکرمہ میں چونکہ عالم اسلام کے تمام اطراف سے اہل علم و فکر کی آمد و رفت رہتی ہے اسلئے وہ ہر خطے کے مسائل سے باخبر رہتے تھے اور ان کے بارے میں لوگوں کو مشورے بھی دیتے رہتے تھے۔ وہ اتحاد مسلمین کے داعی تھے، اور مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں کو روکنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ بلاشبہ ان کی وفات علمی و دینی حلقوں کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں مقام بلند عطا فرمائے۔ آمین

اب موصوف کے فرزند ارجمند مولانا محمد شمیم صاحب مدرسہ صولتیہ کے امین ہوگئے۔ بفضلہ تعالیٰ وہ اپنے مزاج ومذاق اور اخلاق وعادات کے اعتبار سے اپنے والد ماجدؒ کی صحیح یادگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ دارالعلوم کراچی کے تمام اساتذہ، طلبہ اور کارکن اس صدمے میں ان کے ساتھ شریک ہیں اور دلی تعزیت پیش کرتے ہیں۔

البلاغ جلد ۱۱ شمارہ ۱

حضرت علامہ سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

بقیۃ السلف، استاذ العلماء، شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف صاحب بنوری (رحمۃ اللہ علیہ) بھی راہی آخرت ہو گئے۔ گزشتہ شمارے میں ان کے حادثۂ وفات کی اطلاع کے ساتھ ان پر قدرے تفصیل کے ساتھ لکھنے کا وعدہ کر چکا ہوں، لیکن آج جب اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہوں تو یادوں کا ایک طویل سلسلہ قلب و ذہن میں اس طرح مجتمع ہے کہ اکٹھا کرنے کے لئے میرا ہاتھ نہیں آتا۔

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایسی دلنواز، ایسی حیات افروز، ایسی باغ و بہار اور ایسی پہلو دار بھر پور شخصیت تھی کہ اس کی خصوصیات کا ایک مختصر مضمون میں سمانا مشکل ہے۔ ان کی ذات اپنے شیخ حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ قدس سرہٗ کی مجسم یادگار تھی۔ علم حدیث تو خیر ان کا خاص موضوع تھا جس میں اس وقت ان کا ثانی ملنا مشکل تھا، لیکن اپنے شیخ کی طرح وہ ہر علم و فن میں معلومات کا خزانہ تھے، ان کی قوت حافظہ، ان کی وسعت مطالعہ، ان کا ذوق کتب بینی، ان کی عربی تقریر و تحریر، ان کا پاکیزہ شعری مذاق، اکابر و اسلاف کے تذکروں سے ان کا شغف، علماء دیوبند کے صحیح مسلک پر تصلب کے ساتھ ان کی وسعت نظر اور رواداری، دین کے لئے ان کا جذبۂ اخلاص و للّٰہیت، زندگی میں نفاست، سادگی اور بے تکلفی کا امتزاج، ان کا ذوق مہمان نوازی، ان کی باغ و بہار علمی مجالس، ان کے عالمانہ لطائف و ظرائف، ان میں سے کونسی ایسی چیز ہے جسے بھلایا جا سکتا ہو؟

دنیا کا تجربہ شاہد ہے کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے کسی کو علم کے حقیقی ثمرات حاصل نہیں ہوتے بلکہ اس کے لئے "پیش مردے کاملے پامال شو" پر عمل کی ضرورت ہے۔ حضرت مولانا بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے جو مقام بلند نصیب فرمایا وہ ان کی ذہانت و ذکاوت اور علمی استعداد سے زیادہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے فیض صحبت اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے فیض نظر کا

نتیجہ تھا۔ انہوں نے تحصیل علم کے لئے کسی ایک مدرسے میں صرف کتابیں پڑھ لینے اور ضابطے کی سند حاصل کر لینے پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ اپنے اساتذہ کی خدمت و صحبت سے استفادہ کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ وہ ایک ایسے وقت دارالعلوم دیوبند پہنچے تھے جب وہاں امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ، عارف باللہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب ؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ؒ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب ؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب ؒ اور حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب ؒ جیسے آفتاب و ماہتاب مصروف تدریس تھے۔ حضرت مولانا بنوری ؒ اپنے تمام ہی اساتذہ کے منظور نظر رہے، لیکن امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو جو خصوصی تعلق رہا اس کی مثال شاید حضرت شاہ صاحب ؒ کے دوسرے تلامذہ میں نہ ملے۔ مولانا مرحوم ؒ نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت و صحبت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔ چنانچہ وہ ایک عرصہ تک سفر و حضر میں اپنے شیخ کی نہ صرف معیت سے مستفید ہوتے رہے، بلکہ ان کی خدمت اور ان سے علمی و روحانی استفادے کی خاطر مولانا ؒ نے نہ جانے کتنے مادی اور دنیوی مفادات کی قربانی دی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جن غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا، ان کے پیش نظر اگر وہ چاہتے تو تحصیل علم سے فراغت کے بعد نہایت خوشحال زندگی بسر کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے حضرت شاہ صاحب ؒ کی صحبت اور علمی مذاق کی تسکین پر ہر دوسرے فائدے کو قربان کر دیا۔ اور یہ بات خود انہوں نے احقر کو سنائی تھی کہ "جب میرا نکاح ہوا تو بدن کے ایک جوڑے کے سوا میری ملکیت میں کچھ نہ تھا۔"

علم و دین کے لئے مولانا کی یہ قربانیاں بالآخر رنگ لائیں، حضرت شاہ صاحب ؒ کی نظر عنایت نے علمی رسوخ کے ساتھ ساتھ ان میں للّٰہیت اور اخلاص عمل کے فضائل کی آبیاری کی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ دین کے خدام میں اللہ تعالیٰ نے انہیں مقبولیت، محبوبیت اور ہردلعزیزی کا وہ مقام بخشا جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کے اساتذہ، ان کے ہم عصر اور ان کے چھوٹے، تقریباً سب ان کے علمی مقام اور ان کی للّٰہیت کے معترف رہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ جیسے مردم شناس بزرگ کی خدمت میں مولانا کی حاضری تین چار مرتبہ سے زیادہ نہیں ہوئی، لیکن انہی تین چار ملاقاتوں

www.alhaq.org

کے بعد حضرت تھانویؒ نے ان کو اپنا مجاز صحبت قرار دیدیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کو اس دور میں علمی و دینی خدمات کے لئے نہ صرف چن لیا تھا، بلکہ ان کے کاموں میں غیر معمولی برکت عطا فرمائی تھی۔ ان کے علم و فضل کا سب سے بڑا شاہکار ان کی جامع ترمذی کی شرح "معارف السنن" ہے جو تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ چونکہ پچھلے سات سال سے دارالعلوم کراچی میں جامع ترمذی کا درس احقر کے سپرد ہے، اس لئے بفضلہ تعالیٰ موصوف کی اس کتاب کے مطالعے کا خوب موقع ملا ہے، اور اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ احقر کو اس کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ لہٰذا میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے محدثانہ مذاق کی جھلک کسی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے تو وہ معارف السنن ہے۔ افسوس ہے کہ علم و فضل کا یہ خزانہ تشنۂ تکمیل رہے گا، اور کتاب الحج کے بعد اس کی تصنیف آگے نہ بڑھ سکی۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نہ جانے کتنی بار مولانا سے اس کی تکمیل کی طرف توجہ دینے کی خواہش ظاہر فرمائی، لیکن مولانا کی مصروفیات اس قدر بڑھ چکی تھیں کہ وہ اس خواہش کو پورا نہ فرما سکے۔ اب اول تو اس کی تکمیل کی ہمت کون کرے؟ اور اگر کوئی کرے بھی تو حضرت شاہ صاحبؒ کا وہ فیضان علمی اور حضرت مولانا بنوریؒ کا وہ اسلوب بیان کہاں سے لائے؟

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو عربی تقریر و تحریر کا جو ملکہ عطا فرمایا تھا وہ اس عجم میں شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ خاص طور سے ان کی عربی تحریریں اتنی بے ساختہ، سلیس، رواں اور شگفتہ ہیں کہ ان کے فقرے فقرے پر ذوق سلیم کو حظ ملتا ہے، اور ان میں قدیم و جدید اسالیب اس طرح جمع ہو کر یک جان ہو گئے ہیں کہ پڑھنے والا جزالت اور سلاست دونوں کا لطف ساتھ ساتھ محسوس کرتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں اہل زبان کے محاورات، ضرب الامثال اور استعارے ایسی بے تکلفی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں کہ بہت سے عربوں کی تحریروں میں بھی یہ بات نہیں ملتی۔ "نفحۃ العنبر" تو ایک طرح سے خالص ادبی تصنیف ہے، لیکن "معارف السنن" اور "یتیمۃ البیان" جیسی ٹھوس علمی اور تحقیقی تصانیف میں بھی ادب کی چاشنی اس انداز سے رچی بسی ہوئی ہے کہ وہ نہایت دلچسپ اور شگفتہ کتابیں بن گئی

ہیں۔

حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے حق کے معاملے میں غیرت و شدت کا خاص وصف عطا فرمایا تھا' وہ اپنی انفرادی زندگی اور عام برتاؤ میں جتنے نرم' خلیق اور شگفتہ تھے' باطل نظریات کے بارے میں اتنے ہی شمشیر برہنہ تھے' اور اس معاملہ میں نہ کسی مداہنت یا نرم گوشے کے روادار تھے' اور نہ مصالح کو اہمیت دیتے تھے۔ بعض اوقات ان کی کسی تحریر یا تقریر کے بارے میں یہ شبہ گزرتا تھا کہ شاید یہ عام دینی مصالح کے خلاف ہو' لیکن چونکہ ان کے اقدامات کا محرک للّٰہیت اور اخلاص کے سوا کچھ نہ تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ ان کے اقدامات میں برکت عطا فرماتے' ان کے بہتر نتائج ظاہر ہوتے' اور "لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سربکف" کا عملی مشاہدہ ہوتا' چنانچہ باطل فرقوں اور نظریات کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے مولاناؒ سے بڑا کام لیا۔ انکار حدیث کا فتنہ ہو یا تجدّد اور قادیانیت کا' مولانا ہمیشہ ان کے تعاقب میں پیش پیش رہے۔ اس کے علاوہ جس کسی نے بھی قرآن و سنت کی تشریح میں جمہور امّت سے الگ کوئی راستہ اختیار کیا' مولانا سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ اس کے نظریات پر سکوت اختیار کیا جائے۔ مولانا کو خاص طور سے اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ علمائے دیوبند کا مسلک کسی غلط نظریے سے ملتبس نہ ہونے پائے' اور سیاسی سطح پر کسی شخص کے ساتھ علمائے دیوبند کے اتحاد و تعاون سے یہ مطلب نہ لے لیا جائے کہ علمائے دیوبند اس شخص کے نظریات کے ہم نوا ہیں۔

مثلاً مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے آزادیٔ ہند کے لئے جو جدوجہد کی' مقتدر علمائے دیوبند کی ایک جماعت نہ صرف اس کی مداح رہی بلکہ ان کے ساتھ اتحاد و تعاون بھی کیا' اور خود مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی اس جہت سے ان کی بعض خوبیوں کے معترف تھے لیکن اس سیاسی اشتراک کی بنا پر یہ خطرہ تھا کہ مولانا آزاد مرحوم نے جن مسائل میں جمہور امّت سے الگ راستہ اختیار کیا ہے' انہیں علمائے دیوبند کی طرف منسوب نہ کیا جانے لگے' یا کم از کم علمائے دیوبند کی خاموشی کو ان نظریات کی تائید نہ سمجھ لیا جائے۔ اس لئے مولانا آزاد مرحوم کے ان نظریات کی علمی تردید کے لئے حضرت مولانا بنوری صاحب قدس سرہ نے ایک مفصل مقالہ لکھا جس پر بعض لوگوں نے برا بھی منایا' لیکن مولاناؒ نے اس معاملہ میں کسی "لومۃ لائم" کی پروا نہیں کی۔ مولانا کا یہ مقالہ "مشکلات القرآن" کے مقدمے میں شامل

ہے' جواب" بتیمۃ البیان" کے نام سے الگ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے رکن رکین رہے ہیں' اور آزادیٔ ہند کے لئے انہوں نے بے مثال قربانیاں دی ہیں' اس لئے علمائے دیوبند نے اس جہت سے ہمیشہ انکی قدر دانی کی ہے' اور جہاں آزادیٔ ہند کے لئے علماء دیوبند کی جدوجہد کا ذکر آتا ہے وہاں مجاہدین کی فہرست میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کا نام بھی شامل ہوتا ہے' لیکن مولانا سندھی مرحوم دار العلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ نہ تھے' اور ان کے نظریات میں دینی اعتبار سے وہ تصلّب نہ تھا جو علماء دیوبند کا طرۂ امتیاز رہا ہے' اسی لئے وہ بعض عقائد و احکام میں وقتاً فوقتاً جادہ اعتدال سے ہٹ جاتے تھے۔ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کسی ایسے ہی نظریے کا اعلان کر دیا تھا جو جمہور علمائے امت کے خلاف تھا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو فہمائش کی' اور بات سمجھ میں آنے پر انہوں نے دار العلوم دیوبند کی مسجد میں علی الاعلان اپنی غلطی کا اعتراف اور ندامت کا اظہار کیا۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد کوئی شخص ایسا نہ رہا جو نظریاتی طور پر ان کی رہنمائی کر سکے۔ اس کے علاوہ ان کے مزاج میں مسلسل مصائب جھیلنے سے تشدّد بھی پیدا ہو گیا۔ چنانچہ آخری دور میں انہوں نے پھر بعض ایسے نظریات کی تبلیغ شروع کر دی جو جمہور علمائے امت کے خلاف' بلکہ نہایت خطرناک اور زائغانہ تھے۔ ادھر چونکہ علمائے دیوبند کی جدوجہد آزادی میں برابر مولانا سندھی مرحوم کا نام آتا تھا' اس لئے خطرہ تھا کہ ان کے نظریات علماء دیوبند کی طرف منسوب نہ ہوں' اس لئے حضرت مولانا بنوریؒ نے نہ صرف مولانا سندھیؒ کے ان نظریات کی تردید کی' بلکہ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس طرف متوجہ کیا جو سیاسی جدوجہد میں مولانا سندھی مرحوم کے رفیق رہے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا مدنی قدس سرہ نے مولانا سندھی مرحوم کے ان نظریات کی تردید میں ایک مضمون لکھا جو اخبار مدینہ بجنور میں شائع ہوا۔ مولانا سندھی مرحوم کی تردید کے بارے میں یہ تمام تفصیلات احقر نے خود حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہیں۔ اور گذشتہ سال دوبارہ مولاناؒ نے احقر سے ان کی توثیق فرمائی۔

جماعت اسلامی کے حضرات سے اجتماعی معاملات میں مختلف مراحل میں علماء

دیوبند کا اشتراک عمل جاری رہا، یا مجلس دستوری نکات کی ترتیب اور تحریک ختم نبوت وغیرہ میں خود مولانا نے ان کے ساتھ مل کر کام کیا، لیکن جہاں تک مولانا مودودی صاحب کے نظریات کا تعلق ہے، مولانا نے ان پر مفصل تنقید فرمائی، اور حال ہی میں عربی زبان میں یکے بعد دیگرے تین کتابچے تحریر فرمائے، جن میں سے دو شائع ہو چکے ہیں، اور تیسرا زیر طبع ہے۔

غرض یہ مولانا کا خاص مزاج تھا کہ وہ جمہور علمائے سلف کے خلاف کسی نظریئے کو خاموشی سے برداشت نہ کر سکتے تھے۔ عام مجلسوں میں بھی ان کا یہی رنگ تھا کہ غلط بات پر بروقت تنقید کر کے حق گوئی کا فریضہ ادا کر دیتے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں جب ادارۂ تحقیقات اسلامی کی طرف سے ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی (جس کا اہتمام ادارہ تحقیقات کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب نے کیا تھا) تو اس کے پہلے ہی اجلاس میں ایک مقرر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اولیات کو غلط انداز میں پیش کر کے متجددین کے آزاد اجتہاد کے لئے گنجائش پیدا کرنی چاہی اور اس کے لئے انداز بھی ایسا اختیار کیا کہ جیسے قوت اجتہادیہ میں حضرت عمرؓ کے اور ہمارے درمیان کوئی خاص فرق نہیں۔ اس محفل میں عالم اسلام کے معروف اور جید علماء موجود تھے۔ لیکن اس موقع پر اس بھرے مجمع میں جن صاحب کی آواز سب سے پہلے گونجی، وہ حضرت مولانا بنوریؒ تھے، انہوں نے مقرر کی تقریر کے دوران ہی صدر محفل مفتی اعظم فلسطین مرحوم سے خطاب کر کے فرمایا۔

> ـ یا سیدی الرئیس! الا تسکتون او تلجمون هذا الخطیب، [illegible] ماذا یقول؟
>
> جناب صدر! ان مقرر صاحب کو خاموش کیجئے، یا کم از کم ان کو لگام دیجئے، یہ کیا کہہ رہے ہیں؟

ان کے یہ بلیغ الفاظ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں!

مولانا کی رگ رگ میں اس بات کا یقین و اعتقاد پیوست تھا کہ اکابر علماء دیوبند اس دور میں "ما انا علیہ واصحابی" کی مکمل تفسیر تھے، اور ان کا فہم دین اس دور میں خیر القرون کے مزاج و مذاق سے سب سے زیادہ قریب تھا، وہ چاہتے تھے کہ اکابر دیوبند کے افکار اور ان کے علمی و دینی کارناموں کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ چنانچہ جب مولانا ایک طویل عرصے کے لئے پہلی بار حجاز اور مصر و شام کے سفر پر تشریف لے گئے تو وہاں قیام کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ علماء دیوبند کی خدمات اور ان کی علمی تحقیقات سے عالم عرب کو روشناس کرایا جائے۔ چنانچہ مولانا نے علماء دیوبند اور ان کی علمی و عملی خدمات پر مفصل

مضامین لکھے جو وہاں کے صف اول کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ اور ان کے ذریعے مصر و شام کے چوٹی کے علماء مولانا بنوریؒ سے قریب آگئے۔ مولاناؒ نے انھیں مختلف صحبتوں میں اکابر دیوبند کے علوم سے متعارف کرایا اور کم از کم علماء کی حد تک مصر و شام میں علماء دیوبند کے کارنامے اجنبی نہیں رہے۔

اسی دوران ایک مشہور عربی رسالے کے دفتر میں مولانا کی ملاقات علامہ جوہر طنطاوی مرحوم سے ہوگئی' جنکی "تفسیر الجواہر" اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر ہے۔ بعض لوگوں نے تو امام رازی کی تفسیر کبیر پر یہ فقرہ چست کیا ہے کہ "فیه کل شیء الا التفسیر" (یعنی اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) لیکن واقعہ یہ ہے کہ تفسیر کبیر کے بارے میں یہ جملہ بہت بڑا ظلم ہے۔ ہاں اگر موجودہ دور میں کسی کتاب پر یہ جملہ کسی درجے میں صادق آسکتا ہے تو وہ علامہ طنطاوی مرحوم کی تفسیر الجواہر ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب تفسیر کی نہیں بلکہ سائنس کی کتاب ہے اور سائنس کی باتوں کو قرآن کریم سے ثابت کرنے کے شوق میں علامہ طنطاوی مرحوم نے بعض جگہ آیات قرآنی کی تفسیر میں ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔

علامہ طنطاوی مرحوم سے حضرت مولانا بنوریؒ کا تعارف ہوا تو انھوں نے مولاناؒ سے پوچھا کہ کیا آپ نے میری تفسیر کا مطالعہ کیا ہے؟ مولاناؒ نے فرمایا کہ "ہاں! اتنا مطالعہ کیا ہے کہ اس کی بنیاد پر کتاب کے بارے میں رائے قائم کرسکتا ہوں۔ علامہ طنطاوی نے رائے پوچھی' تو مولاناؒ نے فرمایا" آپ کی کتاب اس لحاظ سے تو علماء کے لئے احسان عظیم ہے کہ اس میں سائنس کی بے شمار معلومات عربی زبان میں جمع ہوگئی ہیں۔ سائنس کی کتابیں چونکہ عموماً انگریزی زبان میں ہوتی ہیں اس لئے عموماً علمائے دین ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ آپ کی کتاب علماء دین کے لئے سائنسی معلومات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے لیکن جہاں تک تفسیر قرآن کا تعلق ہے اس سلسلے میں آپ کے طرز فکر سے مجھے اختلاف ہے۔ آپ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ عصر حاضر کے سائنس دانوں کے نظریات کو کسی نہ کسی طرح قرآن کریم سے ثابت کردیا جائے اور اس غرض کیلئے آپ بسا اوقات تفسیر کے مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سائنس کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ آج آپ جس نظریئے کو قرآن سے ثابت کرنا چاہتے ہیں ہوسکتا ہے کہ کل وہ خود سائنس دانوں کے نزدیک غلط ثابت ہوجائے' کیا اس صورت

میں آپ کی تفسیر پڑھنے والا شخص یہ نہ سمجھ بیٹھے گا کہ قرآن کریم کی بات "معاذاللہ" غلط ہوگئی!

مولانا نے یہ بات ایسے مؤثر اور دلنشیں انداز میں بیان فرمائی کہ علامہ طنطاوی مرحوم بڑے متاثر ہوئے اور فرمایا "ایھا الشیخ! لست عالما ھندیا وانما انت ملک انزل اللہ من السماء لاصلاحی" (مولانا! آپ کوئی ہندوستانی عالم نہیں ہیں بلکہ آپ کوئی فرشتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے میری اصلاح کے لئے نازل کیا ہے)۔ یہ واقعہ میں نے مولانا سے بارہا سنا اور شاید "بینات" کے کسی شمارے میں بھی مولاناؒ نے اسے نقل بھی کیا ہے۔

احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا بنوریؒ سے بڑی محبت تھی اور ان کے اخلاص و للّٰہیت اور علمی و عملی صلاحیتوں کی بڑی قدر فرماتے تھے۔ اگرچہ دارالعلوم کے جلسوں میں کئی بار مولاناؒ نے تقریر کے دوران فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب میرے استاد ہیں اور میں نے مقامات حریری آپ ہی سے پڑھی ہے، لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولاناؒ کے علمی و عملی کمالات کی بناء پر ان کا نہایت اکرام فرماتے تھے، چنانچہ یہ دونوں بزرگ علمی اور اجتماعی مسائل میں ایک دوسرے سے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ ملاقاتیں اور مشورے تو پہلے بھی رہتے تھے لیکن جب سے مولانا کراچی میں قیام پذیر ہوئے، اس وقت سے تو دونوں بزرگوں کے درمیان آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس وجہ سے ہم خدام کو گزشتہ بیس سال میں حضرت مولانا بنوریؒ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور جتنا جتنا قرب بڑھتا گیا، اسی نسبت سے مولانا کی محبت و عظمت اور عقیدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولاناؒ نے جدید فقہی مسائل کی تحقیق کے لئے مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن اور دارالعلوم کراچی کے علماء پر مشتمل ایک "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" قائم فرمائی تھی جس کا اجلاس ہر ماہ دارالعلوم کورنگی یا مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن میں منعقد ہوا کرتا تھا۔ یہ مجلس عام طور سے صبح کو شروع ہو کر شام تک جاری رہتی، بیچ میں کھانے اور نماز کا وقفہ ہوتا، پیچیدہ فقہی مسائل زیر بحث آتے، کتابوں کا اجتماعی طور سے مطالعہ ہوتا۔ تمام شرکاء مجلس اپنا اپنا نقطہ نظر آزادی سے پیش کرتے۔ ہم جیسے فرومایہ خدام بھی اپنے طالب علمانہ شبہات کھل کر پیش کرتے، اور یہ بزرگ

کمال شفقت کے ساتھ انہیں سنتے اور جب تک تمام شرکاء مطمئن نہ ہو جاتے، فیصلہ نہ ہوتا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا بنوری دونوں کی طبیعت ان مجلسوں میں کھل جاتی تھی اور ہم خدام دونوں کے علمی افادات سے نہال ہو جاتے، اور پھر یہ مجلسیں خشک علمی مسائل تک محدود نہ تھیں، بلکہ دونوں بزرگوں کی شگفتہ مزاجی اور علمی و ادبی مذاق نے ان مجلسوں کو ایسا باغ و بہار بنا دیا تھا کہ مجلس کا دن آنے سے پہلے ہی بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کا انتظار لگتا تھا۔ علمی تحقیقات کے علاوہ یہ مجلسیں نہ جانے کتنے لطائف و ظرائف اور دلچسپ و سبق آموز واقعات سے معمور ہوتی تھیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذہن اکابر علمائے دیوبند کے واقعات کا خزانہ تھا، اور کوئی بھی موضوع چھڑ جائے، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبند کے بزرگوں میں سے کبھی حضرت تھانوی کا، کبھی حضرت میاں صاحب کا، کبھی حضرت شاہ صاحب کا، کبھی حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحب کا، اور کبھی کسی اور بزرگ کا کوئی واقعہ سنا دیتے اور مجلس کے لئے رہنمائی کا ایک نیا دروازہ کھل جاتا۔ حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا فرمایا کہ مجھے تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کا شوق اس لئے لگتا ہے کہ ان کے پاس پہنچ کر اپنے بزرگوں کے نئے نئے واقعات سننے کو مل جاتے ہیں۔ ادھر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شاہ صاحب سے جو خصوصی صحبتیں رہیں، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے حالات بڑے ذوق و شوق سے باقاعدہ فرمائش کر کے سنا کرتے۔ اور سنانے والے حضرت والد صاحب ہوں یا حضرت بنوری ہم خدام کے لئے تو ہر حال میں چاندی ہی چاندی تھی، اللہ اکبر، یہ پر کیف نورانی مجلسیں کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے خواب و خیال ہو گئیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان محفلوں میں اکثر اپنے اساتذہ کا ذکر فرما کر عجیب کیف کے عالم میں یہ مصرعہ پڑھا کرتے تھے کہ ع

ایک محفل تھی فرشتوں کی جو برخاست ہوئی

کسے خبر تھی کہ چند ہی سالوں میں یہ محفلیں بھی برخاست ہونے والی ہیں!

غرض علمی اور اجتماعی مسائل میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بنوری کا اشتراک عمل ہم خدام کے لئے گوناگوں فوائد کا دروازہ بن گیا۔ اکثر و بیشتر اجتماعی مسائل میں کوئی تحریر لکھی جاتی تو وہ حضرت والد صاحب اور حضرت بنوری کی طرف سے

مشترک طور پر شائع ہوتی، اور اس کا مسودہ تیار کرنے کا مرحلہ آتا تو ہم خدام میں سے کسی کو اس کے لئے مامور کیا جاتا، اور بسا اوقات قرعہ فال احقر کے نام پڑتا، مسودے کو جب ان بزرگوں کے سامنے پیش کیا جاتا اور یہ حضرات اس کی عبارت میں کوئی اصلاح فرماتے تو اس سے نت نئے آداب و فوائد حاصل ہوتے تھے اور جب کسی تحریر پر ان حضرات کی طرف سے دعائیں ملتیں تو ایسا محسوس ہوتا کہ دنیا و مافیہا کی تمام نعمتیں دامن میں جمع ہو گئی ہیں۔

حضرت والد صاحبؒ اور حضرت بنوریؒ کی وجہ سے کراچی کو پورے ملک میں علمی اور دینی اعتبار سے مرکزیت حاصل تھی۔ چنانچہ جب کوئی اجتماعی مسئلہ اٹھتا، اطراف ملک سے اہل علم کراچی کا رخ کرتے تھے، اس طرح ان حضرات کے طفیل ملک بھر کے اہل علم و دین سے نیاز حاصل ہوتا رہتا تھا۔ پچھلے سال جب حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کا حادثہ پیش آیا تو اس مرکزیت کا ایک زبردست ستون گر گیا۔ حضرت بنوریؒ اس وقت عمرہ میں تھے اور تقریباً سو میل کا سفر کر کے کراچی کے لئے طیارہ پکڑنا چاہا، لیکن سیٹ نہ مل سکی، اور نماز جنازہ اور تدفین میں شامل نہ ہو سکے۔ بعد میں جب تعزیت کے لئے تشریف لائے تو وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے، اور زبان پر بار بار بے اختیار یہ جملہ تھا کہ "اب ہم مشورے کے لئے کہاں جائیں گے؟" کسے معلوم تھا کہ مولانا کا یہ اضطراب صرف سال بھر کا ہے، اور آئندہ سال اسی مہینے میں کراچی کی دینی مرکزیت کا یہ دوسرا ستون بھی گر جائیگا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت بنوریؒ کی ذات ہم سب کے لئے ایک عظیم سہارا تھی آہ! کہ اب یہ سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ اب ملک کے دوسرے حصوں کی طرح کراچی میں بھی سناٹا ہی سناٹا ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت بنوریؒ کی وفات یوں تو پوری ملت کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے، لیکن احقر اور برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہم کے لئے یہ ایسا ہی ذاتی نقصان ہے جیسے مولاناؒ کے قریبی اعزہ کے لئے۔ اس لئے کہ وہ ہم پر اس درجہ شفیق اور مہربان تھے کہ الفاظ کے ذریعہ ان کا بیان ممکن نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے بیس سال تک حضرت مولاناؒ کی صحبتیں عطا فرمائیں۔ صرف علمی محفلوں ہی میں نہیں، نجی مجلسوں اور سفر و حضر میں بھی

مولانا کی معیت نصیب ہوئی۔ مولانا کی شفقتوں کا عالم یہ تھا کہ وہ ہماری کمسنی کا لحاظ کرتے ہوئے خود بھی بچوں میں بچے بن جاتے تھے۔

۱۹۶۵ء میں حضرت والد صاحبؒ اور مولاناؒ نے مشرقی پاکستان کا ایک ساتھ تبلیغی سفر کیا، یہ ناکارہ بھی ہمراہ تھا۔ سلہٹ میں ہمارا قیام مجد الدین صاحب مرحوم کے صاحبزادے نبی اللہ صاحب کے یہاں تھا۔ سلہٹ بڑا سرسبز اور شاداب اور خوبصورت علاقہ ہے، لیکن یہاں پہنچنے کے بعد مسلسل علمی اور تبلیغی مجلسوں کا ایسا تانتا بندھا کہ جس کمرے میں جاکر اترے تھے، وہاں سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہ ملا، یہاں تک کہ جب اگلے دن فجر کی نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت والد صاحبؒ اسی کمرے میں اپنے وظائف و اوراد کے معمولات میں مشغول ہوگئے اور حضرت مولانا بنوریؒ نے بھی اپنے وظائف شروع کردیئے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ ذرا مہلت ملے تو حضرت والد صاحبؒ سے اجازت لے کر کہیں ہوا خوری کے لئے باہر چلا جاؤں۔ مولاناؒ نے میرا یہ ارادہ بھانپ لیا اور فوراً ہی پوچھا "کیا باہر جانا چاہتے ہو؟" مجھے مولانا نے بے تکلف بنایا ہوا تھا، میں نے عرض کیا حضرت ارادہ تو ہے مگر آپ بھی تشریف لے چلیں تو بات ہے۔ بس یہ سننا تھا کہ مولاناؒ اپنے معمولات کو مختصر کرکے تیار ہوگئے اور خود ہی حضرت والد صاحبؒ سے فرمایا ذرا میں تقی میاں کو سیر کرالاؤں۔ چنانچہ باہر نکلے اور تقریباً گھنٹہ بھر تک مولاناؒ اس ناکارہ کے ساتھ کبھی چائے کے باغات میں، کبھی شہر کے اونچے اونچے ٹیلوں پر گھومتے رہے، سلہٹ کے علاقے میں نباتات اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ ایک گز زمین بھی خشک تلاش کرنی مشکل ہے۔ مولاناؒ جب کوئی خاص پودا دیکھتے تو اس کے بارے میں معلومات کا ایک دریا بہنا شروع ہو جاتا، "اس پودے کا اردو میں یہ نام ہے عربی میں یہ نام ہے۔ فارسی اور پشتو میں فلاں نام ہے، اور اس کے یہ یہ خصائص ہیں......"
غرض یہ تفریح بھی ایک دلچسپ درس میں تبدیل ہوگئی۔

مجھے بعد میں خیال بھی ہوا کہ مولاناؒ کے گھٹنوں میں تکلیف ہے، اور میں نے خواہ مخواہ مولاناؒ کو زحمت دی، چنانچہ میں نے کئی بار اپنی جسارت پر معذرت کی لیکن مولانا ہر بار یہ فرماتے کہ مناظر قدرت اللہ کا بہت بڑا عطیہ ہیں اور انہیں دیکھ کر نشاط حاصل کرنے کا شوق انسان کا فطری تقاضا ہے۔ تمہاری وجہ سے میں بھی ان مناظر سے محظوظ ہوگیا اور پھر جتنے دن سلہٹ میں رہے، روزانہ فجر کے بعد یہ معمول بن گیا۔ مولاناؒ کے زیر سایہ سلہٹ کی یہ سیر

تفریح کی تفریح ہوتی' اور درس کا درس ہوتا' مولاناؒ کو معلوم تھا کہ احقر کو عربی سے لگاؤ ہے۔ اس لئے مولاناؒ اس دوران عربی ادب کے لطائف و ظرائف بیان فرماتے۔ نادر اشعار سناتے' شعراء عرب کے درمیان محاکمہ فرماتے' اور اس تفریح میں نظروں کے ساتھ قلب و روح بھی شاداب ہو کر لوٹتے تھے۔

اسی طرح ایک مرتبہ برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہم (مہتمم دارالعلوم کراچی) ڈھاکہ میں حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ تھے' مولاناؒ بھی تشریف فرما تھے' مولاناؒ نے خود بھائی صاحب سے فرمایا کہ چلو تمہیں چاٹگام کی سیر کرالاؤں۔ چنانچہ والد صاحبؒ سے اجازت لیکر مولاناؒ اور بھائی صاحب ڈھاکہ سے چاٹگام روانہ ہو گئے' ریل میں جگہ تنگ تھی' اور ایک ہی آدمی کے لیٹنے کی گنجائش تھی۔ مولاناؒ نے بھائی صاحب کو لیٹنے کا حکم دیا' لیکن بھائی صاحب نہ مانے' تو انہیں زبردستی لٹا دیا' اور خود ان کی ٹانگوں کو اس زور سے پکڑ کر ان کے پاؤں کی طرف لیٹ گئے کہ وہ اٹھ نہ سکیں' اپنے ایک شاگرد کے ساتھ یہ معاملہ وہی شخص کر سکتا ہے جسے اللہ نے حقیقی تواضع کے مقام بلند سے سرفراز کیا ہو۔

مولاناؒ کی شفقتوں کا کہاں تک شمار کیا جا سکتا ہے؟ بفضلہٖ تعالیٰ ان کے ساتھ بہت سے سفروں میں بھی رفاقت نصیب ہوئی اور ہر سفر مولاناؒ کی محبت و عظمت اور عقیدت میں کئی گنا اضافہ کر کے ختم ہوا۔ اپنے رفقاء کے ساتھ مولاناؒ کا طرز عمل حیرت انگیز حد تک مشفقانہ ہوتا تھا' اور اس ناچیز کے ساتھ تو مولاناؒ بالکل ایسا معاملہ فرماتے تھے اور احقر کا ایسی باریک بینی کے ساتھ خیال رکھتے تھے جیسے کوئی باپ اپنے کمسن بچے کا خیال رکھتا ہے۔ رمضان ۱۳۹۵ھ میں مولاناؒ جب افریقہ کے سفر پر جانے لگے تو احقر کو بھی رفاقت کا شرف عطا فرمایا۔ پہلے ہم حجاز گئے اور اللہ تعالیٰ نے حجاز تک والد صاحبؒ کی معیت بھی نصیب فرمادی' لیکن حضرت والد صاحبؒ آخر رمضان میں واپس کراچی تشریف لے آئے اور احقر حضرت بنوریؒ کے ساتھ حجاز میں ٹھہر گیا' ان دنوں حضرت والد صاحبؒ کی طبیعت ناساز تھی' اس لئے صبح و شام انتہائی اتنا فکر مند رہتا تھا کہ بھوک اڑ گئی تھی۔ مولاناؒ کو احساس تھا کہ حضرت والد صاحبؒ سے جدائی احقر کے لئے انتہائی صبر آزما ہے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ میں جانتا ہوں' تمہیں اپنے والد صاحبؒ سے عشق ہے' اس لئے مولاناؒ اپنی شگفتہ مزاجی سے میری فکر کو زائل کرنے کی کوشش فرماتے رہتے تھے' اس کے بعد ہم نیروبی پہنچے تو وہاں کی آب و ہوا قدرتی

مناظر اور خشک موسم سے میری صحت پر اچھا اثر ہوا' ادھر حضرت والد صاحبؒ کی صحت کی خبر بھی مل گئی تھی' اس لئے میری طبیعت میں قدرے شگفتگی اور نشاط پیدا ہو گیا۔ اسی دوران ایک دوپہر کو ہم کھانے پر بیٹھے تھے' میرے اور مولاناؒ کے درمیان دو آدمی حائل تھے' کھانے کے بعد جب احقر مولاناؒ کے کمرے میں پہنچا تو فرمانے لگے آج مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ میں نے عرض کیا کیوں' فرمایا "آج کے کھانے پر تم نے رغبت کے ساتھ دو سے زیادہ روٹیاں کھائی ہیں"۔

مولاناؒ کا یہ جواب سن کر میں دنگ رہ گیا۔ اللہ اکبر! مولاناؒ اپنے ایک ناکارہ خادم کے بارے میں یہاں تک خیال رکھتے تھے کہ اس کی بھوک میں کیا کمی اور کیا اضافہ ہو رہا ہے؟ اور یہ تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے' اگر میں مولاناؒ کے ساتھ کئے ہوئے سفروں کے واقعات لکھنے شروع کروں تو ایک مفصل مقالہ صرف اس کے لئے چاہیئے احقر نے افریقہ سے واپسی پر حضرت والد صاحبؒ سے مولاناؒ کی اس قسم کی رعایتوں کا ذکر کیا تو حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا : "یہ وصف صرف کتابیں پڑھنے سے انسان میں پیدا نہیں ہوتا' یہ جوہر بزرگوں کی صحبت سے ملتا ہے"۔

یوں تو احقر مولاناؒ کا شاگرد ہی تھا اور ہر ملاقات میں مولاناؒ سے کوئی نہ کوئی علمی فائدہ حاصل ہو جاتا تھا لیکن ان سے باقاعدہ کوئی کتاب پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ احقر نے کئی بار خواہش ظاہر کی تو مولاناؒ طرح دے گئے۔ افریقہ کے سفر میں احقر نے تہیہ کیا کہ اس موقع سے یہ فائدہ ضرور اٹھانا چاہیے۔ اتفاق سے احقر نے مدینہ طیبہ سے اصول حدیث پر حافظ ابن کثیرؒ کی ایک کتاب "الباعث الحثیث" خرید لی تھی۔ احقر نے عرض کیا کہ میں یہ کتاب آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ مولاناؒ شروع میں اپنی تواضع کے سبب انکار فرماتے رہے' بالآخر احقر نے ایک روز فجر کے بعد مولاناؒ سے عرض کیا کہ میں اس کتاب کی عبارت آپ کے سامنے پڑھتا جاؤں گا کسی موقع پر آپ کا دل چاہے تو کچھ بیان فرما دیں ورنہ میں صرف عبارت پڑھنے پر اکتفا کروں گا۔ اس پر مولاناؒ راضی ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ جب بات چھڑے گی تو مولاناؒ خاموش نہ رہ سکیں گے۔ چنانچہ احقر نے عبارت پڑھنی شروع کی بس پھر مولاناؒ کھل گئے' اور تقریباً کتاب کے ہر فقرے پر کچھ نہ کچھ نئے افادات بیان فرمائے۔ افسوس ہے کہ حضرت والد صاحبؒ کی علالت کی بناء پر مجھے افریقہ سے جلد واپس آنا پڑا اور یہ کتاب مولاناؒ کے سامنے

مکمل نہ ہو سکی، لیکن بحمد اللہ اس طرح ضابطے کا تلمذ بھی مولاناؒ سے حاصل ہو گیا۔ مندرجہ ذیل باتیں جو مولاناؒ نے اس درس میں بیان فرمائی تھیں اب تک یاد ہیں :۔

(۱) حافظ ابن کثیرؒ اگرچہ مسلکاً شافعی ہیں، لیکن علامہ ابن تیمیہؒ کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کے متعدد تفردات میں ان کے ہم نوا ہیں، مثلاً شدِّ رحال کے مسئلے میں۔

(۲) علماء حدیث کا اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے کہ کونسی سند اصح الاسانید ہے۔ امام احمدؒ نے "زہری عن سالم عن ابیہ" کو اصح الاسانید قرار دیا ہے۔ علی ابن المدینیؒ نے محمد بن سیرین عن عبیدة عن علیؓ کو، یحییٰ بن معینؒ نے "اعمش عن ابراہیم عن علقمہ عن ابن مسعودؓ" کو لیکن درحقیقت ان میں سے کسی کو علی الاطلاق اصح الاسانید کہنا مشکل ہے۔ درحقیقت اقوال کا یہ اختلاف اپنے اپنے علاقوں کی وجہ سے ہے۔ امام احمدؒ کا قول اہل مدینہ کے لحاظ سے درست ہے، علی ابن المدینیؒ کا قول اہل بصرہ کے لحاظ سے صحیح ہے، اور یحییٰ بن معینؒ کا قول اہل کوفہ کے لحاظ سے۔ اس کے علاوہ بھی اس درس کی بعض باتیں احقر کے پاس لکھی ہوئی محفوظ ہیں۔

احقر پر حضرت بنوریؒ کے احسانات میں سے ایک عظیم احسان یہ تھا کہ جب سے البلاغ شائع ہونا شروع ہوا، وہ احقر کی تحریروں پر عام طور سے ایک سرسری نظر ضرور ڈال لیتے تھے، اور ملاقات کے وقت کوئی قابل اصلاح بات ہوتی تو اس پر تنبیہ بھی فرما دیتے، اور کوئی بات پسند آتی تو اس پر حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔ اور یہ بات احقر کے لئے مایۂ صد افتخار ہے کہ حضرت مولاناؒ نے البلاغ کی تحریروں پر اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے اپنی تصنیف "معارف السنن" کا ایک سیٹ احقر کو بطور انعام عطا فرمایا جس کی پہلی جلد پر اپنے قلم سے یہ عبارت نہایت پاکیزہ خط میں تحریر فرمائی کہ: "اُهدی هذا الكتاب باجزاءه الستة المطبوعة الى اخى فى الله المولوى الذكى والمتحرك الكاتب الذكى محمد تقى اعجابا بنبوغه فى كتابات مجلته الشهرية "البلاغ" خصوصا فى رده على كتاب "خلافت وملوكيت" ردا بليغا ناجحا حفظه الله ووفقه لامثال امثاله وهو الموفق۔

كتبه محمد یوسف البنوری ۲۶۔۳۔۹۱ھ

جہاں تک کتابی علم کا تعلق ہے، دنیا میں اب بھی اس کی کمی نہیں، نہ جانے کتنے بڑے بڑے محققین آج بھی موجود ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اکابر علماء دیوبند کو جو خصوصیت عطا

فرمائی تھی وہ یہی تھی کہ علم و فضل کا دریائے ناپید اکنار ہونے کے باوجود ان کی ادا سادگی اور تواضع میں ڈوبی ہوئی تھی۔ حضرت مولانا بنوریؒ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے مشائخؒ کی اس میراث سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا' ان کے عظیم کاموں کا راز درحقیقت ان کے اخلاص' ان کی للہیت' ان کی سادگی و بے تکلفی اور ان کی تواضع میں تھا۔

مولاناؒ کے عملی کارناموں میں سب سے نمایاں کارنامہ تحریک ختم نبوت کی کامیاب قیادت تھی۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سالہا سال سے چلا آرہا تھا' اور ۱۹۵۳ء میں ہزارہا مسلمانوں نے اس کیلئے عظیم قربانیاں دی تھیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کو سرکاری اور قانونی سطح پر ۱۹۷۴ء کی جس تحریک کے ذریعے حل کرایا اس کے قائد مولانا بنوریؒ تھے۔ اس تحریک کے دوران احقر کو مولاناؒ کے ساتھ کئی سفروں میں ساتھ رہنے کا موقع ملا' اور احقر نے ان کے جس طرز عمل کا مشاہدہ کیا اس کے پیش نظر احقر کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ انشاء اللہ یہ تحریک ضرور کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔

کوئٹہ کے سفر میں احقر مولاناؒ کے ہمراہ تھا' یہاں مولاناؒ کو کل چوبیس گھنٹے ٹھہرنا تھا جس میں تین مجلسوں سے خطاب کرنا تھا' ایک پریس کانفرنس تھی' گورنر بلوچستان سے ملاقات تھی اور عشاء کے بعد جامع مسجد میں ایک عظیم الشان جلسہ عام تھا۔ سارے دن مولاناؒ کو ایک لمحہ بھی آرام نہ مل سکا' اور رات کو جب ہم جلسہ عام سے فارغ ہو کر آئے تو بارہ بج چکے تھے۔ خود میں تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا' مولاناؒ تو یقیناً مجھ سے زیادہ تھکے ہوئے ہوں گے' میں نے بارہا کوشش کی تھی کہ مولاناؒ کبھی جسمانی خدمت کا موقع دیدیں' لیکن وہ ہمیشہ سختی سے انکار فرما دیتے تھے۔ اس رات احقر نے کچھ ایسے ملتجیانہ انداز میں مولاناؒ سے پاؤں دبانے کی اجازت چاہی کہ مولاناؒ کو رحم آگیا' اور انہوں نے اجازت دیدی' لیکن یہ محض میری خاطر داری تھی' چنانچہ ہر تھوڑی دیر بعد وہ مجھے دعائیں دے کر پاؤں سمیٹنے کی کوشش کرتے' بالآخر میں نے جب محسوس کیا کہ ان کو پاؤں دبوانے کی راحت سے زیادہ طبیعت پر بار ہو رہا ہے تو میں نے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں سو گیا' رات کے آخری حصے میں آنکھ کھلی تو دیکھا کہ مولانا کی چارپائی خالی ہے اور وہ قریب بچھے ہوئے ایک مصلے پر سجدے میں پڑے ہوئے سسکیاں لے رہے ہیں۔ اللہ اکبر! ایسے سفر' اتنے تکان اور اتنی مصروفیت میں بھی ان کا نالۂ نیم شبی جاری تھا' یہ دیکھ کر مجھے ایک تو ندامت ہوئی کہ مولاناؒ اپنے ضعف' علالت اور سفر کے باوجود

بیدار ہیں اور ہم صحت اور تو عمری کے باوجود محو خواب! اور دوسری طرف یہ اطمینان بھی ہوا کہ جس تحریک کے قائد کا رشتہ ایسے ہنگامہ دار و گیر میں بھی اپنے رب کے ساتھ اتنا مستحکم ہو انشاء اللہ وہ ناکام نہیں ہوگی۔

اس زمانے میں ملک بھر میں مولاناؒ کا طوطی بول رہا تھا' اخبارات مولاناؒ کی سرگرمیوں کی خبروں سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ اور ان کی تقریریں اور بیانات شہ سرخیوں سے شائع ہوتے تھے' چنانچہ جب صبح ہوئی تو میزبانوں نے اخبارات کا ایک پلندہ لا کر مولاناؒ کے سامنے رکھ دیا' یہ اخبارات مولاناؒ کے سفر کوئٹہ کی خبروں' بیانات' تقریروں اور تصویروں سے بھرے ہوئے تھے۔ مولاناؒ نے یہ اخبارات اٹھا کر ان پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر فوراً ہی انہیں ایک طرف رکھ دیا' اس کے بعد جب کمرے میں کوئی نہ رہا تو احقر سے فرمایا :

"آجکل جو کوئی تحریک دین کے لئے چلائی جائے اس میں سب سے بڑا فتنہ نام و نمود کا فتنہ ہے۔ یہ فتنہ دینی تحریکوں کو تباہ کر ڈالتا ہے۔ مجھے بار بار یہ ڈر لگتا ہے کہ میں اس فتنہ کا شکار نہ ہو جاؤں اور اس طرح یہ تحریک نہ ڈوب جائے۔ دعا کیا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس فتنے سے ہم سب کی حفاظت فرمائے' ورنہ یہ ہمارے اعمال کو تو بے وزن بنا ہی دے گا' اس مقدس تحریک کو بھی لیکر بیٹھ جائے گا۔"

یہ بات فرماتے ہوئے مولاناؒ کے چہرہ پر کسی تصنع یا تکلف کے آثار نہ تھے' بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والی تشویش نمایاں تھی ....! مولانا بنوریؒ کے علم و فضل اور دین کے لئے ان کی جدوجہد کے حالات تو انشاء اللہ بہت لکھے جائیں گے' لیکن مولانا بنوریؒ کے اصل کمالات یہ تھے جو انہیں اپنے بزرگوں کی خدمت و صحبت سے حاصل ہوئے تھے۔ خوف و خشیت' بیم و رجاء' اخبات و انابت اور اخلاص و للہیت کی یہ صفات تھیں جنہوں نے ان کو مقبولیت کے اس مقام بلند تک پہنچایا اور جنہوں نے ان کے کاموں میں برکت اور ان کی جدوجہد کو کامیابی عطا کی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ و طیب ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ !!

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہم لوگوں کے لئے زندگی کا سب سے بڑا دھکا اور سب سے بڑا حادثہ تھا' اس حادثے پر جن بزرگوں نے سرپرستی فرما کر ہم لوگوں کی ڈھارس بندھائی ان میں ہمارے مرشد و مربی عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی (متعنا اللہ بطول حیاتہ بالعافیۃ) حال صدر دارالعلوم کراچی کے

احسانات تو بے حد و حساب ہیں ہی، اللہ تعالیٰ ان کے فیوض سے تادیر مستفید ہونے کی توفیق کامل مرحمت فرمائے۔ آمین، لیکن مدارس کے ماحول میں حضرت بنوریؒ کی ذات ہمارے لئے بہت بڑا سہارا تھی۔

حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم العالی کو دارالعلوم کے اہتمام کی ذمہ داری قبول کرنے میں بڑا تردد تھا، اس موقع پر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھائی صاحب کو بلا کر باصرار فرمایا کہ یہ فریضہ آپ ہی پر عائد ہوتا ہے، اور آپ ہی اسے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں، اور ساتھ ہی ایک مہتمم مدرسہ پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ان کے بارے میں ایسے زریں رہنما اصول بھائی صاحب مدظلہم کو بتلائے جو مولاناؒ کے تجربات کا نچوڑ تھے، اور اب تک بھائی صاحب کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

حضرت والد صاحبؒ سے مولاناؒ کو جو تعلق تھا، مولاناؒ نے آخر دم تک اس کا حق ادا کیا، وقتاً فوقتاً دارالعلوم تشریف لا کر رہنمائی فرماتے رہے، ایک مرتبہ تو بغیر کسی سابقہ اطلاع کے تشریف لے کر آئے جس کی مسرت و حلاوت اب تک محسوس ہو رہی ہے۔ بلکہ یہ بھی ارادہ ظاہر فرمایا کہ میں مہینے میں کم از کم ایک دن دارالعلوم میں گزارنا چاہتا ہوں۔ گوناگوں مصروفیات کے سبب پھر اس کا تو موقع نہ مل سکا لیکن ان کی توجہات اور عنایتیں مسلسل اہل دارالعلوم کو حاصل رہیں۔ حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد بخاری شریف کا افتتاح بھی مولاناؒ نے کرایا۔

اور ابھی وفات سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے جب دارالعلوم میں تعلیم کا آغاز ہو رہا تھا تو برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی نے مولاناؒ سے فون پر عرض کیا کہ "حضرت! اب تو ہمیں آپ سے بخاری شریف کا افتتاح کرانے کی عادت ہو گئی ہے۔" جواب میں پہلے تو مزاحاً فرمایا کہ : "لیکن التزام تو مستحبات کا بھی واجب الترک ہو جاتا ہے، اور آپ تو فقہاء ہیں۔" بھائی صاحب نے فرمایا۔ "حضرت یہ التزام نہیں" اعتیاد ہے۔" فرمانے لگے کہ "اگر آپ نہ کہتے تب بھی میری یہی خواہش ہوتی۔" بھائی صاحب نے عرض کیا کہ "صبح نو بجے انشاء اللہ گاڑی پہنچ جائے گی، لیکن ہمارے پاس سوزوکی ہے، اور اسے حضرتؒ کے پاس بھیجتے ہوئے ندامت ہوتی ہے کہ اس میں آپ کو (گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے) زحمت ہوتی ہے۔" فرمانے لگے "نہیں نہیں! وہ تو بڑی آرام دہ گاڑی ہے، آپ اس کی بالکل فکر نہ

کریں۔" شام کو بھائی صاحب نے احقر سے فرمایا کہ مولانا سے دوپہر کے کھانے کی بھی درخواست کر دوں، چنانچہ احقر نے فون پر عرض کیا کہ "اگر افتتاحِ بخاری کے ساتھ دوپہر کا کھانا بھی یہیں ہو جائے تو مزید کرم ہو" فرمایا: "کچھ حرج نہیں، البتہ میرے ساتھ مدینہ طیبہ کے شیخ عبدالقادر بھی ہوں گے، ان کے لئے بغیر مرچ کا کھانا بنوا لیا، اور مجھے چونکہ پرہیز ہے اس لئے تھوڑی سی یخنی بنوا لیں، مگر بس تھوڑی سی ہو، لقیمات یقمن صلبہ ("چند چھوٹے سے نوالے لیتے ہیں جو پشت سیدھی رکھ سکیں)" مولانا نے یہ فرمائش کر کے مزید دل خوش کر دیا۔

دوشنبہ ۲۵ شوال ۱۳۹۷ھ کو مولانا تشریف لائے، طبیعت بحال نہ تھی، اور چلنا پھرنا تو عرصے سے دوبھر تھا، لیکن نہایت شگفتگی کے ساتھ تشریف فرما ہوئے، اور فرمانے لگے کہ "محض تعمیلاً للقسم تھوڑا سا بیان کروں گا، زیادہ کی ہمت نہیں، لیکن جب درس شروع ہوا تو طبیعت کھل گئی اور تقریباً ایک گھنٹہ تدوینِ حدیث کے موضوع پر بڑی فاضلانہ تقریر فرمائی، جس کا خلاصہ اسی شمارے میں عزیزم مولوی شیخ رحیم الدین سلمہ کے قلم سے الگ شائع ہو رہا ہے۔ درس کے بعد دیر تک حاضرین کو اپنے علمی لطائف و ظرائف سے محظوظ فرماتے رہے، اسی دوران ہم نے چائے کے لئے درخواست کی تو فرمایا کہ "خفیف قسم کی چائے بنوا لو" لیکن پھر خود ہی فرمایا کہ "خفیف ہونے کا فیصلہ کون کرے گا! لہٰذا چائے بنانے والے سے کہو کہ وہ کیتلی میں پانی جوش دے کر یہیں لے آئے، پتی میں خود ڈالوں گا۔" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور تمام چیزوں کی طرح چائے کے بارے میں بھی مولانا کا ذوق بڑا نفیس تھا، فرمایا کرتے تھے کہ اچھی چائے کی تین خصوصیات ہیں۔ لب دوز ہو، لب سوز ہو اور لبریز ہو۔

چائے کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ مبارک پر تشریف لے گئے، اور واپس آکر دوپہر کا کھانا تناول فرمایا، برادرِ محترم جناب مولانا محمد رفیع عثمانی پاس بیٹھے تھے، وہ جس جس چیز کے تناول فرمانے کی درخواست کرتے، مولانا لے لیتے، کسے معلوم تھا کہ دارالعلوم میں یہ آخری بار مولانا کی خاطر داری ہو رہی ہے، اور ایک ہفتہ بعد ٹھیک اسی دن اور اسی وقت مولانا ملاءِ اعلیٰ کی مہمانی کے لئے تیار ہو رہے ہوں گے!

****

مولاناؒ کا آخری سفر

اسی روز مولاناؒ نے احقر سے پوچھا : "اسلامی مشاورتی کونسل کا اجلاس جمعرات کو ہے' کب چلو گے؟" احقر نے عرض کیا : "جب آپ تشریف لے جائیں" فرمایا : "میں نے جمعرات کی صبح آٹھ بجے کے طیارے سے سیٹ بک کرائی ہے۔" میں نے عرض کیا : "میں بھی اسی سے بکنگ کرالیتا ہوں" اس طرح مولاناؒ کے آخری سفر میں بھی اللہ تعالیٰ نے احقر کو رفاقت کا شرف عطا فرمادیا۔

جمعرات آئی' صبح کو میں ایئرپورٹ پہنچا تو مولاناؒ تشریف نہیں لائے تھے' میں دروازے پر انتظار کرتا رہا' تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لائے' کچھ دنوں سے عام طور پر حضرت بنوریؒ کے ساتھ سفر میں مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب ہوا کرتے تھے' لیکن اس بار وہ صرف پہنچانے کے لئے آئے' اور ساتھ جانے کے لئے حضرتؒ کے صاحبزادے مولانا محمد بنوری صاحب سلمہ تھے۔ طیارے میں ہم ساتھ چڑھے' میں نے اور مولانا محمد صاحب نے مولاناؒ کو اپنے کندھے کا سہارا کرنا چاہا' لیکن وہ جہاز کی سیڑھیوں کی دو رویہ دیواروں سے سہارا لیکر چڑھتے رہے' کسے معلوم تھا کہ یہ مولانا کا آخری سفر ہے' اور اسی لئے قدرت نے اس سفر میں خلاف معمول ان کے صاحبزادے کو ساتھ کردیا ہے۔ بظاہر طیارہ راولپنڈی جارہا تھا اور مولاناؒ کو اسلام آباد جانا تھا' لیکن یہ کون جانے کہ مولاناؒ کی منزل مقصود اسلام آباد سے بہت آگے ہے' اور وہ اس سفر پر روانہ ہورہے ہیں جہاں سے کوئی لوٹ کر دنیا میں نہیں آتا' ہمارے کان تو فضائی عملے کا صرف یہ اعلان سن رہے تھے کہ یہ طیارہ گیارہ ہزار میٹر کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا انشاء اللہ ایک گھنٹہ پچیس منٹ میں اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر پہنچے گا" لیکن یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ مولاناؒ کے لئے یہ کہیں اور سے بلاوا آیا ہے۔

کس نہ دانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

مولاناؒ کو سفر میں چونکہ معاون کی ضرورت ہوتی تھی' اس لئے وہ اسلامی کونسل کے اجلاس میں اپنے کسی رفیق کو اپنے خرچ پر ساتھ لے جاتے تھے' میں نے مولاناؒ سے عرض کیا کہ "حضرت آئندہ آپ کو اپنی خدمت کے لئے کسی کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں' میں ساتھ موجود ہوتا ہوں' اور مجھے علیحدہ کمرے میں قیام کی بھی ضرورت نہیں' میں آپ ہی کے

کمرے میں آپ کے ساتھ ٹھہر جایا کروں گا، اور اس طرح مجھے بھی تحصیل سعادت کا موقع مل جائے گا۔" مولاناؒ اس پر مسرور تو ہوئے، لیکن فرمایا: "آپ کو اس نیت کا ثواب مل گیا، نیۃ المرء خیر من عملہ (انسان کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے) میں ابھی اپنا کام خود کر لیتا ہوں۔" میں نے اس وقت زیادہ اصرار نہ کیا کہ آئندہ سفر کے موقع پر دیکھا جائے گا۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ قدرت یہ الوداعی الفاظ زبان سے ادا کرا رہی ہے، اور احقر کی اس نیت کو نیت ہی رہنا ہے، اس کے مطابق عمل ہونے کی نوبت کبھی نہ آسکے گی۔

جلسے میں موصوف حسب معمول شگفتہ رہے، اور جمعرات کا دن بھی ہشاش بشاش رہ کر گذارا، اس روز کونسل کی دو نشستیں تھیں، مولاناؒ نے دونوں میں بھرپور حصہ لیا، جمعہ کو تیسری نشست تھی۔ اس میں مولاناؒ نے کونسل میں ایک نہایت اصولی، مختصر مگر جامع تقریر فرمائی جو مولاناؒ کی آخری تقریر تھی۔ کونسل کی نشستوں میں ایجنڈے سے باہر کی باتیں بھی بعض اوقات چھڑ جاتی ہیں، اسی سلسلہ میں دراصل ہوا یہ تھا کہ بعض حضرات نے مولاناؒ سے فرمائش کی تھی کہ وہ ٹیلی ویژن پر خطاب فرمائیں، مولاناؒ نے ریڈیو پر خطاب کرنے کو تو قبول کر لیا تھا، لیکن ٹیلی ویژن پر خطاب کرنے سے معذرت فرما دی تھی کہ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ اسی دوران ضمنی طور پر یہ مسئلہ بھی آگیا تھا کہ فلموں کو مخرب اخلاق عناصر سے پاک کر کے تبلیغی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں مولاناؒ نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا خلاصہ یہ تھا:

"اس سلسلہ میں میں ایک اصولی بات کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کے مکلف نہیں ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو لوگوں کو پکا مسلمان بنا کر چھوڑیں، ہاں اس بات کے مکلف ضرور ہیں کہ تبلیغ دین کے لئے جتنے جائز ذرائع و وسائل ہمارے بس میں ہیں ان کو اختیار کر کے اپنی پوری کوشش صرف کر دیں۔ اسلام نے جہاں ہمیں تبلیغ کا حکم دیا ہے، وہاں تبلیغ کے باوقار طریقے اور آداب بھی بتائے ہیں، ہم ان طریقوں اور آداب کے دائرے میں رہ کر تبلیغ کے مکلف ہیں، اگر ان جائز ذرائع اور تبلیغ کے ان آداب کے ساتھ ہم اپنی تبلیغی کوششوں میں کامیاب ہوتے ہیں تو یہ عین مراد ہے، لیکن اگر بالفرض ان جائز ذرائع سے ہمیں مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو ہم اس بات کے مکلف نہیں ہیں کہ ناجائز ذرائع اختیار کر کے لوگوں کو دین کی دعوت دیں، اور آداب تبلیغ کو پس پشت ڈال کر جس جائز و ناجائز طریقے سے ممکن ہو لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کریں۔ اگر ہم جائز وسائل کے ذریعے اور آداب تبلیغ کے ساتھ ہم ایک شخص کو بھی دین کا پابند

بتادیں گے تو ہماری تبلیغ کامیاب ہے" اور اگر ناجائز ذرائع اختیار کرکے ہم سو آدمیوں کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیں تو اس کامیابی کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ کیونکہ دین کے احکام کو پامال کرکے جو تبلیغ کی جائے گی وہ دین کی نہیں کسی اور چیز کی تبلیغ ہوگی۔ فلم اپنے مزاج کے لحاظ سے بذات خود اسلام کے احکام کے خلاف ہے' لہٰذا ہم اس کے ذریعے تبلیغ دین کے مکلف نہیں ہیں۔ اگر کوئی شخص جائز ذرائع اور جائز طریقوں سے ہماری دعوت کو قبول کرتا ہے تو ہمارے دیدہ و دل اس کے لئے فرش راہ ہیں' لیکن جو شخص فلم دیکھے بغیر دین کی بات سننے کے لئے تیار نہ ہو اسے فلم کے ذریعے دعوت دینے سے ہم معذور ہیں' اگر ہم یہ موقف اختیار نہ کریں تو آج ہم لوگوں کے مزاج کی رعایت سے فلم کو تبلیغ کے لئے استعمال کریں گے کل بے حجاب خواتین کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے گا' اور رقص و سرود کی محفلوں سے لوگوں کو دین کی طرف بلانے کی کوشش کی جائے گی' اس طرح ہم تبلیغ کے نام پر خود دین کے ایک ایک حکم کو پامال کرنے کے مرتکب ہوں گے۔"

یہ کونسل میں مولانا کی آخری تقریر تھی' اور غور سے دیکھا جائے تو یہ تمام دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لئے مولانا کی آخری وصیت ہے جو لوح دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔

مولانا کی اس تقریر کے بعد وہ غیر رسمی گفتگو تو ختم ہوگئی' اور پھر ایجنڈے کے مطابق کارروائی ہوتی رہی' جس میں مولانا نے حصہ لیا۔

شام کو کونسل کی چوتھی نشست تھی' اور اس میں بھی مولانا پورے نشاط طبع کے ساتھ تشریف لے گئے' جاتے ہوئے حضرت بنوری کار کی اگلی نشست پر تشریف فرما تھے' اور احقر پچھلی نشست پر تھا' احقر کو اجلاس میں ایک مسودہ پیش کرنا تھا' اس لئے راستے میں اس پر نظر ثانی کرنے لگا۔ عصر کے بعد کا وقت تھا' اور کار سبزہ و گل سے لدے ہوئے پہاڑ کے دامن میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر جارہی تھی' جس کے دونوں طرف سرسبز منظر تھے۔ مولانا نے پیچھے مڑکر میری طرف دیکھا تو میں قلم ہاتھ میں لئے مسودے کی نوک پلک ٹھیک کررہا تھا' مولانا نے فرمایا: "یا ایہا الشیخ الشاب!"[1] (نوجوان بڑے میاں) ذرا اس وقت تو یہ کام رہنے دو' باہر کی طرف دیکھو' کیسے حسین مناظر ہیں؟ ان قدرتی مناظر کا بھی کچھ حق ہے' اور یہ ان کا حق ادا کرنے کا وقت ہے"........ مجھے اپنی کوتاہی کا بھی احساس ہوا' اور مولانا کی

---

[1] مولانا جب [illegible] خطاب فرماتے تھے۔

عظمت کا بھی۔ مذاق ہی مذاق میں حق شناسی کی کیسی تعلیم دیدی' اور ساتھ قدرت سے لطف اندوز ہونے کو بھی عبادت بنا دیا۔

یہ کونسل میں مولاناؒ کی آخری تشریف آوری تھی' نماز مغرب انہوں نے ہی پڑھائی اور دیر تک دعائیں کراتے رہے' مغرب کے بعد بھی دیر تک اجلاس جاری رہا اور وہ اس میں پوری شگفتگی کے ساتھ شریک رہے' عشاء کے بعد ہم واپس گورنمنٹ ہاسٹل آگئے' مولاناؒ اپنے کمرے میں تشریف لے گئے اور میں اپنے کمرے میں آگیا۔

بدھ کی صبح ناشتے کے بعد مجھے مولاناؒ کے کمرے میں جانا تھا۔ برادر محترم مولانا سمیع الحق صاحب مدیر ماہنامہ "الحق" احقر کے بھتیجے مولوی محمود اشرف عثمانی سلمہ' اور عم زادہ جناب زاہد حسین انصاری صاحب بھی میرے پاس آئے ہوئے تھے' اور رات میرے ساتھ رہے تھے' ہم جب مولاناؒ کے کمرے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولاناؒ کے گلے میں کوئی تکلیف ہوئی ہے اور مولوی محمد بنوری صاحب سلمہ ان کو معائنہ کیلئے پولی کلینک لے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مولاناؒ تشریف لے آئے' اور ہمیں دیکھ کر سوال کے بغیر ہی فرمایا کہ صبح میرے گلے میں کچھ عجیب سی تکلیف ہوئی۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد بتایا کہ یہ دل کی تکلیف نہیں ہے' لیکن آرام کی ضرورت ہے' مولوی محمد صاحب نے مجھ سے الگ بتایا کہ ڈاکٹر نے یہ بھی کہا ہے کہ دل پر معمولی دباؤ ہوا ہے۔ مولاناؒ کو چونکہ اس سے پہلے دل کی تکلیف ہو چکی تھی' اس لئے میرا ماتھا ٹھنکا' اور میں نے مولاناؒ سے درخواست کی کہ آج کے تمام پروگرام منسوخ کرکے مکمل آرام فرمائیں' ہم نے عرض کیا کہ ہم کمرے کا دروازہ بند کرکے باہر آدمی بٹھا دیتے ہیں تاکہ کوئی اندر نہ جائے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ کچھ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' انشاء اللہ تھوڑے سے آرام کے بعد طبیعت بحال ہو جائے گی۔ تھوڑی دیر بعد مولاناؒ لیٹ گئے' اور اندازہ ہوا کہ نیند آگئی ہے' چنانچہ ہم باہر چلے آئے۔

اس روز صبح کے وقت کونسل کا کوئی اجلاس نہ تھا' بلکہ ارکان کونسل کو ادارہ تحقیقات اسلامی کا معائنہ کرنے کے لئے جانا تھا۔ چنانچہ دس بجے میں وہاں چلا گیا۔ دو بجے کے قریب میں واپس آکر اپنے کمرے میں کھڑا ہی ہوا تھا کہ مولاناؒ کے صاحبزادے کا فون آیا کہ مولاناؒ کی طبیعت زیادہ خراب ہے' فوراً پہنچئے۔ میں اسی حالت میں مولاناؒ کے کمرے کی طرف لپکا تو مولوی محمد صاحب سلمہ' کمرے سے باہر آبدیدہ کھڑے تھے' ان کی حالت دیکھ کر سخت تشویش ہوئی' قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ مولاناؒ کو شدید درد ہوا ہے' اس وقت مولاناؒ نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے تھے' اور وقفے وقفے سے کراہ رہے تھے۔

اتفاق سے اسلامی کونسل کے چیئرمین جناب جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب بھی اسی وقت مولاناؒ کی عیادت کے لئے پہنچ گئے تھے، میں اور وہ دونوں فوراً پولی کلینک پہنچے، ڈاکٹر صاحب وہاں موجود نہ تھے تو ان کے گھر جاکر ان سے ملاقات کی، جسٹس چیمہ صاحب نے ان سے مختصراً مولاناؒ کی کیفیت بیان کی، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے مولاناؒ سے صبح بھی درخواست کی تھی کہ وہ تین روز کے لئے ہسپتال میں داخل ہوجائیں، مگر وہ نہ مانے اب ان کا ہسپتال میں داخل ہونا ضروری ہے، آپ انھیں پولی کلینک لے آئیں، چیمہ صاحب نے ان سے کہا کہ آپ ایمبولینس کا انتظام کردیں، انھوں نے اس کا وعدہ کیا، اور ہم ہوٹل لوٹ آئے۔ یہاں احقر نے جسٹس چیمہ صاحب سے عرض کیا کہ جب ہسپتال میں داخل کرنا ہے تو پولی کلینک کے بجائے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں داخل کرنا زیادہ مناسب ہوگا، چنانچہ چیمہ صاحب نے مختلف جگہ فون کرکے وہاں داخلے کا انتظام کیا، اور وہاں سے بھی ایک ایمبولینس مولاناؒ کو لینے کے لئے روانہ ہوگئی۔

کافی دیر گزر گئی۔ اور دونوں میں سے کوئی ایمبولینس بھی نہ پہنچی، بار بار فون کرنے کے بعد پولی کلینک کی ایمبولینس چار بجے کے قریب آئی، چونکہ سی ایم ایچ کی ایمبولینس بھی روانہ ہوچکی تھی اور وہ زیادہ آرام دہ ہوتی ہے، اس لئے چیمہ صاحب کی رائے تھی کہ چند منٹ اس کا انتظار کرلیا جائے لیکن مولاناؒ کی کیفیت دیکھ کر لحظہ بہ لحظہ میرا اضطراب بڑھ رہا تھا، میں نے عرض کیا کہ اب مزید انتظار کا تحمل معلوم نہیں ہوتا، اس لئے جو ایمبولینس موجود ہے اسی میں چلنا چاہئے۔ اس دوران برادر محترم مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب (مہتمم جامعہ اسلامیہ راولپنڈی) بھی پہنچ چکے تھے جو ہمیشہ راولپنڈی میں حضرت بنوریؒ کے خصوصی میزبان ہوا کرتے تھے، اور قاری رفیق صاحب بھی آگئے تھے، جو اسلام آباد میں مولاناؒ کے قیام کے دوران ان کی خدمت کا شرف حاصل کرتے تھے۔ جب ہم اسٹریچر لیکر مولاناؒ کے قریب پہنچے تو مولاناؒ بیدار تھے، میں نے جسم کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو وہ برف ہو رہا تھا، اور کپڑے پسینے میں اس بری طرح شرابور تھے کہ انھیں بلا تکلف نچوڑا جاسکتا تھا، مولاناؒ نے میری طرف دیکھا تو ایک عجیب کیفیت کے ساتھ فرمایا :

"آج کی تکلیف بالکل نئی قسم کی تکلیف ہے، اس کو ڈاکٹر نہیں سمجھ سکیں گے۔"

اس سے قبل دورے کی شدت کے عالم میں اپنے صاحب زادے سے بھی مولاناؒ یہی بات فرما چکے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ "اب میں جا رہا ہوں۔"

احقر نے عرض کیا : "حضرت! اللہ تعالیٰ انشاء اللہ ہم پر فضل فرمائیں گے ہم آپ

کو کہا کہ ملٹری ہسپتال لیجانا چاہتے ہیں۔ "مولانا نے فوراً سپردگی کے عالم میں فرمایا۔ "جیسے آپ کی مرضی!" جب مولانا محمد صاحب، قاری سعید الرحمٰن صاحب اور قاری رفیق صاحب مولانا کی دائیں جانب سے انہیں اٹھانے کے لئے جھکے تو فرمایا۔ "میں خود اٹھ جاؤں گا" اور ساتھ ہی کچھ اٹھنے کی کوشش بھی کی لیکن نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ اٹھا نہ گیا، ہم سب نے باصرار عرض کیا کہ "آپ بالکل اٹھنے کی کوشش نہ کریں" چنانچہ مولانا کو اسٹریچر پر اٹھا کر ایمبولینس میں سوار کر دیا گیا، مولانا محمد صاحب، قاری سعید الرحمٰن صاحب اور قاری رفیق صاحب ایمبولینس میں مولانا کے ساتھ بیٹھے، اور مفتی سراج الدین صاحب اور احقر چیمہ صاحب کے ساتھ ان کی کار میں ہسپتال روانہ ہوئے، راستہ بڑا طویل تھا عصر کے قریب ہم ہسپتال پہنچے، وہاں پہلے سے مولانا کی تشریف آوری کی اطلاع ہو چکی تھی، اور انتہائی طبی توجہ کے شعبے (INTERSINE CARE UNIT) میں مولانا کو داخل کر دیا گیا۔ اس شعبے میں کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن باہر مولانا کے متعلقین کی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ برادر محترم مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے مولانا کو راحت پہنچانے کے ممکنہ انتظامات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اگرچہ حضرت سے ملنے کی اجازت کسی کو نہ تھی، مگر قاری رفیق صاحب اور ان کے ایک ساتھی رات کو ہسپتال ہی کے لان میں رہے۔

رات کی میٹنگ کے بعد فون پر احقر نے خیریت معلوم کی تو پتہ چلا کہ بحمد اللہ طبیعت بہتر ہو رہی ہے اور جسم میں گرمی بھی عود کر آئی ہے۔ اس خبر پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، اتوار کی صبح سویرے بھی خیریت ہی کی اطلاع ملی، اور ساتھ ہی ڈاکٹروں کا یہ ارادہ بھی معلوم ہوا کہ وہ انشاء اللہ ایک دو روز میں مولانا کو آئی سی یو سے ہسپتال کے عام کمرے میں منتقل کر دیں گے۔ اس سے مزید اطمینان ہوا، اتفاق سے اتوار کے روز کونسل کا اجلاس صبح ۹ بجے سے رات ساڑھے بارہ بجے تک جاری رہا، سہ پہر کے وقت جو وقفہ ہوا اس میں بھی ایک ذیلی کمیٹی کام کرتی رہی جس میں احقر بھی شامل تھا۔ البتہ بیچ بیچ میں ہسپتال سے مولانا کی خیریت معلوم ہوتی رہی، رات کے وقت قاری سعید الرحمٰن صاحب کو مولانا سے ملاقات کا موقع مل گیا، اس وقت طبیعت کافی بشاش تھی، مولانا نے قاری صاحب سے باتیں بھی کیں، اور انڈے کا کھانا بھی بتایا۔

دوشنبہ کی صبح ناشتے کے بعد میں ہسپتال جانے کی تیاری کر رہا تھا اور خیال یہ تھا کہ انشاء اللہ مولانا کو اچھی حالت میں دیکھوں گا، کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی، یہ جسٹس چیمہ

صاحب کا فون تھا' انھوں نے یہ دلخراش خبر سنائی کہ آج صبح مولانا ہم سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

بیماری کے پہلے دن تشویش تو تھی' لیکن یہ بالکل اندازہ نہ تھا کہ مولانا اتنی جلدی چلے جائیں گے۔ اچانک یہ کرب انگیز خبر صاعقہ بن کر گری' ہوش و حواس قابو میں نہ رہے' افتاں خیزاں ہسپتال پہنچے تو مولانا اس دار محن کی سرحد پار کر چکے تھے' کھلے ہوئے پُرنور چہرے پر ایک عجیب طرح کا سکون طاری تھا جیسے ایک تھکا ہوا مسافر منزل پر پہنچ کر آسودہ ہو گیا ہو ع

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی کہ اللّٰھم اکرم نزله ووسع مدخله وأبدله دارا خيرا من داره واهلا خيرا من اهله ونقه من الخطايا كما ينقى الثوب الأبيض من الدنس وبلغه الدرجات العلى من الجنة۔ امین۔

حضرت بنوری کی وفات کے ساتھ ایک پوری قرن کا خاتمہ ہو گیا' یہ حادثہ صرف مولانا کے اعزہ کا نہیں' پورے ملک کا' پوری ملّت کا' بلکہ پورے عالم اسلام کا حادثہ ہے۔ اس حادثے سے دارالعلوم کراچی بھی اتنا ہی متاثر ہوا ہے جتنا مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن۔ اور احقر کے لئے تو متعدد جہات سے یہ ایک عظیم ذاتی سانحہ ہے' اور شاید یہی وجہ ہے کہ ملک کے بہت سے حضرات نے اس حادثہ پر جہاں مولانا کے اعزہ کے پاس تعزیتی خطوط روانہ کئے ہیں' وہاں احقر اور برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب کو بھی تعزیت کے لئے خطوط لکھے ہیں' میں ان حضرات کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس صدمہ جانکاہ کی نوعیت کو محسوس فرما کر اس مشکل وقت میں اظہار ہمدردی فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا ایک مسلمان کا شیوہ ہونا چاہیے' اس لئے عظیم صدمے کے باوجود جس کے بعد کمر ٹوٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے' اس بات پر ایمان ہے کہ جو کچھ ہوا وہی اللہ تعالیٰ کی حکمت کا مقتضا تھا۔ اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا بنوری قدس سرہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے' ان کے متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے اور ان کے نسبی و روحانی وارثوں اور بطور خاص برادر عزیز مولانا محمد بنوری صاحب کو توفیق عطا

فرمائے کہ وہ اس صدمے پر صبر جمیل کے ساتھ مولاناؒ کے نقش قدم پر چل کر اس مشن کو آگے بڑھائیں جس کا پرچم سربلند رکھنے کے لئے مولاناؒ نے آخر وقت تک جدوجہد جاری رکھی اور جس کی خاطر انہوں نے غریب الوطنی میں جان دی ہے۔

اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ وان فیک عزاء من کل مصیبۃ و خلفا من کل ھالک، ولا حول ولا قوۃ الا بک، ولا ملجأ ولا منجا منک الا الیک۔

البلاغ جلد ۱ شمارہ ۱۲

استاذ محترم حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ

گذشتہ چند سالوں میں علماء صلحاء اس تیزی کے ساتھ دنیا سے اٹھے ہیں کہ اہل علم کی محفل یک بیک سنسان ہو کر رہ گئی ہے۔ کچھ زیادہ دیر کی بات نہیں کہ ملک ان دلآویز شخصیتوں سے مالامال نظر آتا تھا جو علم و فضل اور ورع و تقویٰ میں اکابر علمائے دیوبند کی یادگار تھے جنہوں نے ان نفوس قدسیہ کے جمال جہاں آراء کا نظارہ کیا تھا جو دارالعلوم دیوبند کی چٹائیوں پر بیٹھ کر برصغیر کی علمی، دینی، تبلیغی اور سیاسی تاریخ کے دھارے موڑتے رہے اور جن کے کردار و عمل نے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی۔

لیکن چند سال سے یہ بساط اتنی تیزی کے ساتھ لپٹ رہی ہے کہ جدھر نظر اٹھاؤ، سناٹا نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ، حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا اطہر علی صاحبؒ یہ سارے بزرگ دو ڈھائی سال کے عرصے میں ایک ایک کر کے راہئ آخرت ہو گئے، اور ابھی حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحبؒ کی وفات نے تو ایسا لگتا ہے کہ کمر ہی توڑ دی ہے۔

حضرت مولانا بنوریؒ کی وفات کو ابھی پندرہ دن بھی نہ ہوئے تھے کہ ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ بھی داغ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یوں تو ایک عالم کا دنیا سے اٹھ جانا پورے عالم کے لئے ایک زبردست حادثہ ہوتا ہے لیکن خاص طور سے دارالعلوم کراچی کیلئے یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ اس وقت دارالعلوم کے بزرگ ترین استاذ تھے جنہوں نے مظاہر العلوم سہارنپور کے اکابر علماء سے براہِ راست علم دین حاصل کیا پھر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی عرصہ دراز تک صحبت اٹھائی اور پورے پچاس سال علوم دین کی تدریس میں مصروف رہے وہ ان خوش نصیب اہل علم میں سے تھے جنہیں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ اور حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ کی زیارت اور ان

سے استفادے کی بھی سعادت ملی تھی۔

استاذ محترمؒ سہارنپور کے باشندے تھے اور ۱۳۴۲ھ میں مظاہر العلوم سہارنپور میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے جہاں انہوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم، حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کیمبلپوریؒ، حضرت مولانا منظور احمد خان صاحبؒ، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا زکریا صاحب قدوسیؒ، حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ جیسے بلند پایہ اساتذہ سے علوم دینیہ کی تعلیم حاصل کی اور شعبان ۱۳۵۲ھ میں وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔

حضرت مولاناؒ کی لیاقت اور علمی استعداد کی بنا پر اسی سال شوال میں آپ کو مظاہر العلوم میں بحیثیت معین مدرس مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد آپ مظاہر العلوم کے باضابطہ استاذ کی حیثیت سے مسلسل تیس سال تک علمی و دینی خدمات انجام دیتے رہے۔ مظاہر العلوم میں قیام کے دوران حضرت مولاناؒ کے ہاتھوں اطراف عالم کے ہزارہا شاگرد عالم بنے جو اپنے اپنے حلقوں میں دینی خدمات کے اندر مصروف ہیں۔ اسی دوران آپ وعظ و ارشاد کے لئے بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں تشریف لے جاتے رہے اور ایک مرتبہ اسی سلسلے میں برما کا بھی دورہ کیا۔

اسی عرصہ میں آپ ایک مرتبہ سال بھر کی طویل رخصت لے کر علاج کے سلسلے میں لاہور تشریف لے گئے۔ اسی زمانے میں مولانا ظفر علی خان مرحوم کا مشہور اخبار "زمیندار" ہندوستان بھر میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اس ایک سالہ تعطیل کے دوران مولاناؒ اس اخبار کے شعبہ ادارت سے مدیر معاون کی حیثیت میں وابستہ رہے۔

۱۳۷۶ھ میں جب دارالعلوم کراچی نانک واڑہ کی قدیم عمارت سے کورنگی کے وسیع رقبہ زمین پر منتقل ہوا تو احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی دعوت پر مولانا موصوفؒ نے یہاں فرائض تدریس انجام دینا منظور فرمایا۔ آپ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ میں کراچی تشریف لا کر باضابطہ دارالعلوم میں مصروف تدریس ہوئے، اور گزشتہ بیس سال سے یہیں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔

اس طرح گزشتہ شعبان میں استاذ محترمؒ کی تدریس کو پورے پچاس سال مکمل ہوئے

تھے۔ اس نصف صدی کے دوران بڑے بڑے علماء نے مولاناؒ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ مشاہیر میں سے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز حضرت مولانا ابرار الحق مدظلہم بھی مولاناؒ کے شاگرد ہیں، اور ان کے علاوہ جن معروف اہل علم نے مولاناؒ سے علم حاصل کیا ان میں سے چند کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔

"رئیس التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ سابق امیر جماعت تبلیغ، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب مدظلہم حال امیر جماعت تبلیغ، حضرت مولانا عبیداللہ صاحب مدظلہم ناظم جماعت تبلیغ، حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب امیر تبلیغی جماعت حجاز، حضرت مولانا نسیم احمد صاحب بجنوری، مولانا مفتی منظور احمد صاحب بجنوری سابق ایڈیٹر ماہنامہ نظام کانپور وغیرہ۔ یہ حضرات وہ ہیں جنھوں نے سہارنپور میں مولاناؒ سے کسب فیض کیا۔"

اور دارالعلوم کراچی میں جن اہل علم نے مولاناؒ سے پڑھا ان میں حضرت مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم حال مہتمم دارالعلوم کراچی، مولانا مفتی عبداللہ صاحب مہتمم مدرسہ اسلامیہ منگلوریا، مولانا عبدالرشید صاحب افغانی ناظم جمعیت علماء انگلستان لندن، مولانا مفتی بشیر احمد صاحب قاضی و مفتی تحصیل باغ آزاد کشمیر، مولانا عزیز الرحمان صاحب سواتی استاذ دارالعلوم کراچی وغیرہم بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

یوں تو مولاناؒ کو تحریر و تصنیف سے بھی شغف تھا، اور اظہار الحق کا اردو ترجمہ مولاناؒ کی قابل قدر یادگار ہے، لیکن ان کا اصل میدان تدریس ہی تھا، ان کا انداز تدریس اس قدر دلنشیں ہوتا تھا کہ مشکل سے مشکل بحث پانی ہو جاتی تھی۔ اس ناکارہ نے مولاناؒ سے توضیح، جلالین اور صحیح مسلم شریف پڑھی ہے، اور اس وقت پڑھی جب مولاناؒ کے قویٰ مضبوط اور تدریسی کمال اپنے شباب پر تھا، ہمیں مولاناؒ کے درس میں کبھی کوئی مشکل بحث معلوم نہیں ہوئی۔ "توضیح" اصول فقہ کی بڑی معیاری کتاب ہے اور اسکے مباحث خاصے دقیق ہیں، لیکن مولاناؒ سے پڑھتے وقت ہمیں وہ بالکل سہل ممتنع معلوم ہوئی اور اس میں اور "نور الانوار" میں دقت کے اعتبار سے کوئی فرق معلوم نہیں ہوا، دقت کا اندازہ اس وقت ہوا جب "توضیح" خود پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت پتہ چلا کہ اس کتاب کو ہم جس قدر آسان سمجھتے تھے وہ درحقیقت مولاناؒ کے کمال تفہیم کا اثر تھا۔

تفسیر سے مولاناؒ کو خاص شغف تھا، اور ان کا جلالین کا درس اس قدر سلیس، رواں، شگفتہ اور مفید ہوتا تھا کہ قرآن کریم کے مضامین بڑی خوبی کے ساتھ ذہن نشین ہوتے جاتے تھے۔ مباحث میں تفصیل و اختصار کے لحاظ سے مولاناؒ کے یہاں آغاز سال اور اختتام سال کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا، وہ جس معیار پر شوال میں درس شروع فرماتے اسی معیار پر شعبان تک ثابت قدم رہتے، اور کتابیں اپنے وقت پر ختم ہو جاتی تھیں۔

مولاناؒ کے درس میں خارجی باتیں لطائف اور قصے وغیرہ بہت کم ہوتے تھے، اس کے باوجود وہ زیر درس بحث ہی کو اس قدر دلچسپ اور شگفتہ بنا کر پیش کرتے تھے کہ شروع سے اخیر تک درس کی شادابی برقرار رہتی تھی۔ مولاناؒ کا امتحان بھی تمام طلباء میں بڑا سخت مشہور تھا۔ کیونکہ مولاناؒ عام طور سے مشہور امتحانی مقامات سے ہٹ کر سوالات مرتب کیا کرتے، اور ان کے امتحان میں ذہانت اور استعداد کے ساتھ حافظے کا امتحان بھی ہوتا تھا۔ اسکے علاوہ مولاناؒ نمبر دینے میں بھی محتاط تھے۔ چنانچہ جس کتاب کا امتحان مولاناؒ کے پاس چلا جاتا، اس سے ڈر ہی لگا رہتا کہ خدا جانے نتیجہ کیا ہو؟ چنانچہ احقر کے امتحانات میں دو تلخ یادیں انہی کتابوں سے متعلق ہیں جن کا امتحان مولاناؒ کے پاس تھا کیونکہ ان کتابوں میں ہمارے نمبر توقع کے بالکل برخلاف تیسرے درجے کے نمبر تھے اور پھر دورہ حدیث کے سال میں یہ خوشگوار یاد بھی کہ سنن نسائی کے امتحان میں مولاناؒ نے احقر کو اتنے نمبر دیئے کہ خود مولاناؒ کے ارشاد کے مطابق اپنی تدریس کی تاریخ میں کسی کو بھی اتنے نمبر نہیں دیئے تھے، بلکہ احقر کے پرچے پر ۵۳ نمبر دیکر ایک تاریخی نوٹ لکھا کہ یہ پرچہ مستحق انعام ہے۔

”اظہار الحق“ کا اردو ترجمہ جو ”بائبل سے قرآن تک“ کے نام سے شائع ہوا ہے، مولاناؒ کی گرانقدر یادگار ہے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کی یہ کتاب رد عیسائیت میں بے نظیر کتاب ہے، لیکن دنیا کی پانچ زبانوں میں ترجمہ ہونے کے باوجود اردو کا دامن اس قیمتی علمی سرمائے سے خالی تھا۔ آج سے اٹھارہ سال پہلے جب راقم دورہ حدیث کا طالب علم تھا حضرت مولانا نور احمد صاحب مدظلہم ”سابق ناظم دارالعلوم کراچی“ کی فرمائش پر حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ نے اس کتاب کا اردو ترجمہ شروع کیا اور چھ ماہ کی مسلسل محنت کے بعد اسے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ مولاناؒ کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے یہ ترجمہ کسی مددگار کتاب کے بغیر مکمل فرمایا۔ حد یہ ہے کہ کتب مقدسہ کی عبارتوں کا ترجمہ کرتے وقت بائبل کے

موجودہ اردو ترجمے کو بھی سامنے نہیں رکھا، اور اس کے باوجود بائبل کی دقیق ترین عبارتوں کا ترجمہ انتہائی صحیح اور برمحل کیا۔ بعد میں جب احقر نے بائبل کے دوسرے ترجموں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا تو بعض جگہ حیرت ہوئی۔ کیونکہ اگر بائبل کا مسلسل ترجمہ کیا جاتا تو بھی وہ انتہائی مشکل کام تھا چہ جائیکہ مسلسل کتاب کے بجائے صرف ان اقتباسات کا ترجمہ کیا جائے جو عام طور سے سیاق و سباق کی مدد کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔

بالآخر مولاناؒ کے اس کارنامے کی خدمت کی سعادت مجھ ناچیز کو حاصل ہوئی اور پھر یہ ترجمہ احقر کی تشریح و تحقیق اور مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع ہوا اور اس کام کی تکمیل پر مولاناؒ کی طرف سے بے شمار دعائیں نصیب ہوئیں۔

مولاناؒ کی عمر ستر سے متجاوز ہو چکی تھی لیکن اس ضعف کی حالت میں بھی ان کی ہمت اور جسمانی محنت کا حوصلہ جوانوں کیلئے بھی لائق صد رشک تھا۔ اور وہ اپنی ہمت کی بنا پر بسا اوقات جوانوں کو شرمندہ کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ دار العلوم میں اسباق تقسیم ہو رہے تھے ایک سبق جس کا وقت ظہر کے متصل بعد طے ہوا تھا، کئی نوجوان اساتذہ پر پیش کیا گیا لیکن ہر ایک اسے لیتے ہوئے کسمسا رہا تھا کیونکہ سبق ایسا تھا جس کے لئے اہتمام کے ساتھ مطالعے کی ضرورت تھی، اور ظہر کے متصل بعد کا وقت کسل کا وقت ہوتا ہے۔ جب کئی نوجوان اساتذہ اسے قبول کرنے میں اپنے تأمل کا اظہار کر چکے تو مولاناؒ نے فرمایا: "بھائی اس سبق کیلئے نوجوانوں کو تکلیف نہ دو، اسے مجھ بوڑھے کے نام لکھ دو" اور مولاناؒ کے اس جملے نے ہم سب کو پانی پانی کر دیا۔

مولاناؒ ایک مدت تک تو دار العلوم کے احاطے ہی میں رہے، لیکن تقریباً تین سال پہلے انہوں نے شہر میں اپنا مکان بنوالیا تھا، اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ اس میں منتقل ہو گئے تھے، اس مکان کا فاصلہ دار العلوم سے معتدبہ تھا، میل کے قریب ہوگا، لیکن مولاناؒ اتنی دور سے پوری پابندیٔ وقت کے ساتھ دار العلوم تشریف لاتے اور شام کو واپس جاتے تھے۔ دو ایک سال تک یہ سارا سفر بس میں طے کرتے تھے۔ دار العلوم کی طرف سے بارہا ان سے عرض کیا گیا کہ حسب سابق دار العلوم ہی میں قیام فرمائیں لیکن وہ بعض ذاتی مصالح کی بنا پر اپنی جگہ مقیم رہے اور اس زبردست مشقت کو بخوشی گوارا فرمایا۔ البتہ پچھلے سال جب ضعف بہت بڑھ گیا تو دار العلوم کی طرف سے ان کے لئے یہ انتظام کر دیا گیا

تھا کہ شہر سے جو گاڑی دارالعلوم کے کام سے روزانہ آتی وہ مولانا کو ان کے مکان سے لیکر آیا کرتی تھی۔ اسطرح یہ سفر گاڑی میں ہونے لگا تھا، لیکن اپنے دوسرے کاموں سے انھیں شہر میں جہاں کہیں جانا ہوتا وہ آخر وقت تک بس میں سفر کرتے رہے اور یہ بات ان کے جاننے والوں میں مشہور تھی کہ کھچا کھچ بھری ہوئی بس میں جب مولانا بس کا ڈنڈا پکڑ لیتے تو کوئی کڑیل جوان بھی اسے چھڑا نہ سکتا تھا۔

مولاناؒ بڑے خلیق، منکسار اور وضع دار بزرگ تھے، اور جس کسی سے ایک مرتبہ تعلق مودت قائم ہو جاتا اسے آخر وقت تک نبھاتے تھے۔ انکی شگفتگیٔ مزاج اور حاضر جوابی سے دارالعلوم کے اساتذہ کی محفلیں باغ و بہار بنی رہتی تھیں۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اکثر ان مجلسوں میں مولاناؒ کو چھیڑ دیتے، اور جواب میں ان کے پر لطف فقروں سے محظوظ ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ گفتگو یہ چل رہی تھی کہ آج کے زمانے میں بعض فقہی مسائل ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کیلئے کسی مجتہد کی بصیرت درکار ہے۔ اس سنجیدہ گفتگو کے عین درمیان حضرت والد صاحبؒ نے مولاناؒ سے ازراہ مزاح فرمایا۔

"مولانا اکبر علی صاحب! آپ ہی اجتہاد کا دعویٰ کر دو"

مولاناؒ نے چند لمحے توقف فرمایا، اور چہرے پر بڑی سنجیدگی اور معصومیت پیدا کر کے جواب دیا: "حضرت۔ کرنے کو تو اجتہاد کا دعویٰ کر دوں، لیکن مشکل یہ ہے کہ کوئی تقلید کرنے والا نہیں ملے گا" ـــــــ اور مجلس کشتِ زعفران بن گئی۔

اس سال رمضان کی تعطیلات کے بعد شوال کے آغاز میں مولاناؒ دارالعلوم تشریف لائے، برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم کراچی سے ملے، اور فرمایا کہ کافی دن سے متعدد عوارض چل رہے ہیں، اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر آپ نے آرام نہ کیا تو یا فالج ہو جائے گا یا دل کا حملہ ہو جائے گا۔ بھائی صاحب نے اس پر مولاناؒ کو آرام کا مشورہ دیا اور مولاناؒ نے ایک ماہ کی رخصت علالت لے لی۔ اسی روز احقر کے پاس تشریف لائے تو خلاف معمول معانقہ بھی کیا، اور ساری عمر میں پہلی اور آخری بار احقر کی پیشانی پر بوسہ دے کر یہ دعا دی کہ "اللہ تعالیٰ تم سے اسلامی کونسل میں دین کی صحیح خدمت لے" میں اس غیر معمولی طرز عمل پر حیران بھی تھا اور شرمسار بھی لیکن ایک ہی ہفتے کے بعد معلوم ہو گیا کہ درحقیقت یہ اپنے ایک ناکارہ شاگرد سے الوداعی ملاقات کا خدا ساز اہتمام

تھا۔ چنانچہ عالمِ ہوش میں مولاناؒ سے یہ احقر کی آخری ملاقات تھی۔

ایک ہفتہ بعد جمعہ کے روز جب کہ میں شہر میں تھا، مغرب کے وقت مولاناؒ کا یہ پیغام ان کے صاحبزادے کی معرفت ملا کہ "میری طبیعت زیادہ خراب ہے، ذرا دیر کو آکر مل جاؤ" صاحبزادے سے جو حالات معلوم ہوئی اس سے اندیشہ ہوا کہ یہ دل کا دورہ ہے۔

احقر نے فوراً اپنے کرم فرما ڈاکٹر سید اسلم صاحب کو فون کیا جو حضرت والد صاحبؒ کے خصوصی معالجِ قلب رہ چکے ہیں، انہوں نے مولاناؒ کو فوراً ہسپتال لانے کا مشورہ دیا، چنانچہ سات بجے کے قریب ہم مولاناؒ کے مکان پر پہنچے تو وہ سینے کے شدید درد سے مضطرب تھے اور بات کرنا ممکن نہ تھا، احقر صرف اتنا دریافت کر سکا کہ "کیا اب بھی درد ہے؟" مولاناؒ نے اثبات میں سر ہلا دیا، اس کے بعد انہیں ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر سید اسلم صاحب نے حسبِ معمول بڑی توجہ سے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ مولاناؒ کی حالت نازک ہے اور انہیں فوراً انتہائی طبی توجہ (coronary care unit) کے شعبے میں داخل کر دیا جہاں قلب کے علاج کیلئے تمام جدید ترین وسائل مہیا ہیں۔ رات کو ۱۰ بجے تک احقر مولاناؒ کے پاس رہا، اور برادرِ محترم جناب مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم مولاناؒ کے پاس آنے کیلئے بے چین تھے، اسلئے احقر دارالعلوم چلا آیا، اور بھائی صاحب، حضرت مولانا سبحان محمود صاحب، حضرت مولانا شمس الحق صاحب اور حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہم ہسپتال چلے گئے۔ رات ڈھائی بجے کے قریب یہ حضرات واپس آئے تو قدرے افاقے کی خبر لیکر آئے۔ ہسپتال میں مولاناؒ کے صاحبزادے میاں محمد اسلم صاحب، دارالعلوم کے استاذ مولوی نعمت اللہ صاحب اور ایک طالب علم مولوی فضل الرحمن چترالی رات بھر مولاناؒ کے پاس رہے۔

لیکن مولاناؒ کا وقت آچکا تھا، چار بجے ہسپتال سے یہ جانکاہ خبر ملی کہ مولاناؒ اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

فجر کے بعد حضرت مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم نے پر درد انداز میں اس جانکاہ خبر کا اعلان کیا، پورا مدرسہ غم والم کی فضا میں ڈوب گیا۔ دارالعلوم میں تعطیل ہوئی، اور سارا دن ایصالِ ثواب ہوتا رہا۔ مولاناؒ کے اعزہ سے مشورے کے بعد دارالعلوم ہی کے احاطے میں سپردِ خاک کرنا طے ہوا۔ چنانچہ تجہیز و تکفین کے بعد ظہر کی نماز کے وقت جنازہ دارالعلوم پہنچ گیا۔ کراچی کے ممتاز اہلِ علم، مدارس کے اساتذہ و منتظمین، مولاناؒ کے اعزہ، شاگرد اور

متعلقین بڑی تعداد میں دارالعلوم پہنچے، نماز جنازہ میں کم و بیش تین ہزار آدمی شریک ہو گئے۔ اور اس طرح نماز عصر کے بعد علوم قرآن و سنت کا یہ خادم خدمت دین میں اپنی نصف صدی پوری کرنے کے بعد دارالعلوم کے قبرستان میں آسودہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرما کر انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

مولانا نے اہلیہ کے علاوہ چار صاحبزادے برادرم اختر علی صاحب، میاں محمد اسلم، میاں محمد اجمل، اور میاں محمد اعظم اور چار ہی صاحبزادیاں سوگوار چھوڑی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور انہیں مولانا کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔ مولانا کے اہل خاندان کے علاوہ یہ دارالعلوم کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ قارئین ابلاغ سے درخواست ہے کہ وہ حضرت مولانا کی روح کو ایصال ثواب کرنے کا اہتمام فرمائیں، اور جملہ متاثرین کے لئے صبر جمیل اور نصرت خداوندی کی دعا فرمائیں۔

ابلاغ جلد ۱۲ شمارہ ۱۰

آہ پروفیسر حسن عسکری مرحوم

۷ صفر ۱۳۹۸ھ کی صبح اچانک یہ جانکاہ خبر بجلی بن کر گری کہ میرے محسن' مکرم فرما اور بزرگ دوست پروفیسر محمد حسن عسکری اچانک اس سفر پر روانہ ہوگئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ "بزرگ دوست" کی ترکیب شاید اجنبی اور نامانوس ہو۔ لیکن میرے ساتھ مرحوم کے تعلقات کی جو نوعیت تھی' اس کے اظہار کے لئے مجھے بہت سوچنے کے بعد بھی کوئی اور لفظ نہیں ملا' وہ اپنی عمر' معلومات' تجربے' کہنہ مشقی اور مجھ پر احسانات کی بنا پر میرے بزرگ تھے' لیکن اپنی محبت' بے تکلفی' سادگی' اور میرے ساتھ مجموعی طرز عمل کے لحاظ سے میرے بہترین دوست بھی تھے۔

ان کے اچانک انتقال کی خبر ایسی غیر متوقع اور ناگہانی تھی کہ انھیں خود کندھا دینے' ان کی نماز جنازہ پڑھانے اور انھیں اپنے سامنے قبر میں اتارنے کے باوجود اسکی تصدیق کرنے کو جی نہیں چاہتا' بمشکل پچاس پچپن سال کے درمیان ہوں گے۔ اور ان کے ساتھ میرے گیارہ سالہ تعلق میں کبھی یہ وہم و گمان بھی نہیں ہوا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے بچھڑ جائیں گے' لیکن موت ایسی چیز ہے کہ جس نے اندازوں اور تخمینوں کو ہمیشہ شکست دی ہے' پھر بھی انسان اپنی زندگی میں موت کو وہم اور تخمینوں کو یقین سمجھتا آیا ہے۔ اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھ سے مٹی دینے کے بعد بھی اس کا نفس یہی فریب دیتا رہتا ہے کہ "ابھی تو میں جوان ہوں۔"

بہرکیف! عسکری صاحب اچانک ہم سے جدا ہوگئے' انکی کی موت نے نہ جانے کتنے بڑے بڑے منصوبے' کتنی بڑی بڑی امیدیں اور کتنی خوشگوار آرزوئیں پل بھر میں جلا کر راکھ کردی ہیں' اور آج جب کہ راکھ کے اس ڈھیر میں سے ان کے ساتھ گذرے ہوئے لمحات کی یادیں جمع کرنا چاہتا ہوں تو حیرت و حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

عسکری صاحب مرحوم کے ساتھ میرے تعلق کی کہانی بھی عجیب ہے۔ بظاہر ہم دونوں کی دنیا ایک دوسرے سے بالکل الگ تھی۔ وہ اصلاً افسانوی ادب و شعر و تنقید کے آدمی تھے'

اور میں شروع سے دین کا خشک طالب علم، وہ اپنی ادبی تحریروں کی وجہ سے ملک بھر میں مشہور، اور میں بالکل گمنام، وہ شعر و ادب سے لے کر فلسفہ و سیاست تک ہر کوچے کی خاک چھانے ہوئے، اور میں سدا سے بسم اللہ کے گنبد میں گوشہ نشین۔ اس لئے بظاہر دونوں میں کسی دیرپا تعلق کا سوال نہ تھا۔ کبھی کبھی ادبی پرچوں میں ان کے مضامین ضرور نظر سے گذرتے تھے لیکن کبھی وہم بھی نہ آیا تھا کہ ان سے کوئی قربت قائم ہو سکتی ہے، چنانچہ آج سے گیارہ سال پہلے جب وہ اچانک میرے مکان پر تشریف لائے اور اپنا نام "محمد حسن عسکری" بتایا تو ایک لمحے کے لئے تو ذہن اس "محمد حسن عسکری" کی طرف گیا جس کے تنقیدی شہ پاروں سے ادبی دنیا گونج رہی تھی، لیکن دوسرے ہی لمحے ذہن نے اس خیال کی تردید کر دی، دل نے کہا کہ میں کہاں اور وہ کہاں؟ یقیناً یہ کوئی دوسرے صاحب ہوں گے۔ اور جو سراپا مجھے نظر آیا وہ اس مشہور افسانہ نگار اور نقاد کے تصور سے کوئی مطابقت نہ رکھتا تھا۔ سادہ سی شیروانی اور پاجامہ، سر پر ململ کی وہ دو پلی ٹوپی ادا ادا میں مسکنت اور تواضع۔ آکر بیٹھے بھی تو آدھے گھنٹے کی نشست میں دو چار ضروری باتوں کے سوا کچھ نہ بولے۔ اس کم سخن، مرنجان و مرنج اور مسکین شخصیت میں مجھے ڈھونڈے سے بھی وہ گونجتا گرجتا نقاد نظر نہ آسکا جس کے تیکھے مضامین اور چٹکیلے فقروں سے جدید مغربی ادب کی چھاپ جھلکتی ہے۔

وہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کسی دینی مسئلے میں معلومات حاصل کرنے آئے تھے، اور جب انھیں پتہ چلا کہ میں عیسائیت پر کوئی کتاب لکھ رہا ہوں تو ازراہ عنایت میرے پاس بھی تشریف لے آئے، اور اپنے محبوب فرانسیسی مصنف "رینے گینوں" کی ایک انگریزی کتاب مجھے دے کر چلے گئے۔ اس پہلی ملاقات میں مجھے آخر تک اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ وہی "محمد حسن عسکری" ہیں جو اپنے افسانوں اور تنقیدوں کیلئے مشہور ہیں۔

لیکن اس کے بعد جب ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوا، اور اجنبیت کے حجاب اٹھے تب یہ راز کھلا کہ یہ معروف افسانہ نگار شعر و ادب، تنقید، مصوری اور موسیقی کی سیاحی کے بعد بالآخر دین و مذہب اور تصوف کی آغوش میں آسودہ ہو گیا ہے۔

عسکری صاحب کو شروع ہی سے مطالعے کا شوق تھا، اسی وجہ سے انھوں نے شادی بھی نہیں کی، اور یہی شوق انھیں کشاں کشاں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف اور ان کے مواعظ و ملفوظات تک لے گیا، یہاں پہنچ کر انھیں محسوس ہوا کہ جس علم و حکمت کی تلاش میں انھوں نے اردو، ہندی، انگریزی اور فرانسیسی ادب اور فلسفے کی خاک چھانی ہے وہ تھانہ بھون کے ایک درویش صفت کی بظاہر بے آب و رنگ تصانیف میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی تعداد ایک ہزار تک پہنچتی ہے، عسکری صاحب نے ان میں سے بیشتر کتابوں کا ذوق و شوق سے مطالعہ کیا۔ اس دوران ان کی عملی زندگی میں بھی دینی اعتبار سے بڑا خوشگوار تغیر پیدا ہوا۔ سالہا سال سے وہ نہ صرف نماز باجماعت کے پابند بلکہ بہت سے اذکار و اوراد کے بھی عادی تھے۔ تصوف ان کے مطالعے اور دلچسپی کا خاص موضوع تھا، اور حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی عقیدت کی بنا پر وہ ان سے تعلق رکھنے والے علماء کے پاس آنے جانے لگے، اور میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اتوار کی مجلس میں اکثر وبیشتر پہنچ جاتے تھے۔

جوں جوں عسکری صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، دل میں ان کی محبت و عظمت بڑھتی گئی، وہ صرف اپنے وسیع مطالعے اور وافر معلومات کی بنا پر ہی قابلِ قدر نہ تھے، بلکہ اپنی خوش خلقی، تواضع، ایثار اور سادگی میں اپنی مثال آپ تھے۔ شرافت و متانت کے ایسے پیکر میں نے زندگی میں کم دیکھے ہیں۔ سالہا سال اس طرح گذرے کہ میں اکثر جمعہ کو ان کے یہاں چلا جاتا، اور وہ تقریباً ہر اتوار کو دارالعلوم آجاتے، اور بسا اوقات سارا سارا دن میرے پاس رہتے تھے۔ اس پورے عرصے میں میں نے ان کے اندر ایک تڑپ موجزن پائی، اور وہ یہ کہ ہمارے زمانے میں جو لوگ مغربی افکار کی چمک دمک سے مرعوب ہیں، کسی طرح انھیں قدیم عربی، فارسی اور اردو کتابوں میں چھپے ہوئے لعل و جواہر سے آشنا کیا جا سکے، تاکہ انھیں معلوم ہو کہ بہت سی وہ بحثیں اور وہ الجھے ہوئے مسائل جو متجدد مفکرین کی ہزار کوششوں کے باوجود الجھتے ہی جا رہے ہیں، انھیں ان "دقیانوسی" کتابوں نے کس خوبصورتی سے حل کر دیا ہے۔ اپنے آخری دنوں میں بھی وہ عربی اور فارسی کے علمِ بلاغت کے مطالعے میں مصروف تھے، اور میرے ساتھ ہر نشست میں وہ بلاغت کے کسی مسئلے پر تبادلۂ خیال کرتے تھے، مجھ سے اس موضوع پر کئی پرانی کتابیں لے کر پڑھیں، اور آخری نشست میں شیخ محمد علی تھانوی کی عربی کتاب "کشاف اصطلاحات الفنون" سے "افعال ناقصہ" کی ایک بحث کا خلاصہ میری

زبانی سنا تو اس کے ایک ایک لفظ پر وجد کرتے رہے کہ اس بحث نے ایک ایسے مسئلے کو بالکل صاف کر دیا ہے جو آجکل مغربی علم لغت کے ماہرین میں طویل مباحث کا محور بنا ہوا ہے۔

میرے نزدیک عسکری مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے مغرب کی مرعوبیت بلکہ ذہنی غلامی کے بتوں کو پاش پاش کیا ہے، وہ اپنے وسیع و عمیق مطالعے کے ذریعے اس راز کو پا چکے تھے کہ مغرب کی سب سے بنیادی گمراہی مابعد الطبیعت سے اعراض ہے، اور یہ گمراہی صرف فلسفے اور اخلاق وغیرہ تک محدود نہیں رہی، بلکہ اس نے مغرب کی ایک ایک حرکت و فعل کو متاثر کیا ہے، یہاں تک کہ وہ ادب، شاعری اور تنقید میں بھی ایسے غیر محسوس انداز سے رچ بس گئی ہے کہ سرسری نظر میں اسکا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتداء میں جن مسلمانوں نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا انھوں نے اس کی بہت سی باتیں معصوم اور بے ضرر سمجھ کر اپنا لیں، حالانکہ ان کا رشتہ درحقیقت مغرب کی اسی بنیادی گمراہی سے جڑا ہوا تھا۔ اس ضمن میں عسکری صاحب نے سرسید، حالی اور شبلی مرحوم پر جو تنقیدیں کی ہیں وہ انکی باریک بینی اور سوچ کی گہرائی کی دلیل ہیں۔

میری ادارت میں نکلنے والے ماہنامے "البلاغ" میں انھوں نے بڑے گرانقدر مضامین لکھے ہیں، ان میں سب سے پہلے مضمون کا عنوان تھا "اردو کی ادبی روایت کیا ہے؟" اس مضمون کا بنیادی نقطہ یہی ہے کہ شعر و ادب اور تنقید میں بھی ہم نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مغرب کی تقلید کر کے اپنا رشتہ اپنے اس عظیم سرمائے سے کاٹ لیا ہے، جو نہ صرف مغرب کی فکری اڑان سے بالاتر تھا، بلکہ آج مغرب کے مفکرین جن مسائل کے گرداب میں سرگرداں ہیں ان سے نجات کا واحد راستہ بھی وہیں سے نکل سکتا ہے۔ عسکری صاحب کا یہ مضمون ادبی حلقوں میں عرصے تک موضوع گفتگو بنا رہا، اس پر کچھ لے دے بھی ہوئی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ادب اور تنقید کے شائقین کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولی ہیں۔

عسکری صاحب چونکہ مختلف افکار، فلسفوں اور نظام ہائے حیات کے مشاہدہ نما مطالعے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ دین کی طرف آئے تھے اس لئے ان کی دینی فکر میں دور دور تک معذرت خواہی کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی، انھوں نے دینی فکر کو پورے اعتماد و

یقین کے ساتھ اپنایا تھا اسلئے انہیں وہ مکتب فکر بھی ایک آنکھ نہیں بھایا جو مغربی افکار سے مرعوب ہو کر دین میں کتر بیونت کے درپے ہے چنانچہ وہ دین میں تحریف کی کوششوں کو سیکولرازم سے زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔

ان کی بیشتر زندگی انگریزی ادب پڑھانے میں گزری، اور وہ اردو کی طرح انگریزی کے بھی صاحب طرز ادیب تھے، اس لئے میں نے بارہا ان سے فرمائش کی کہ وہ بعض دینی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کریں، شروع میں یہ کہہ کر عذر کرتے رہے کہ دین کا معاملہ نازک ہے، لیکن پھر انہوں نے خود ہی سب سے پہلے میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مقالے "اسلام کا نظام تقسیم دولت" کا انگریزی ترجمہ کیا جو جناب پروفیسر کرار حسین صاحب کی نظر ثانی کے بعد (Distribution Of Wealth In Islam) کے نام سے چھپا، اور اب تک بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی کتاب "الانتباہات المفیدہ" میری طرح عسکری صاحب کو بھی پسند تھی، کیونکہ اس میں مغرب کی اہم گمراہیوں اور مغربی طرز استدلال کی بنیادی خامیوں کو بڑے مختصر اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ میری فرمائش پر عسکری صاحب نے اس کتاب کا بھی بڑا دلکش ترجمہ کیا۔ اصل کتاب چونکہ بہت مختصر اور اصطلاحات سے پر تھی، اس لئے یہ بڑا مشکل کام تھا، لیکن عسکری صاحب نے اس کے ترجمے میں غیر معمولی فضل و کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ کتاب بھی جناب پروفیسر کرار حسین صاحب کی نظر ثانی کے بعد Answer to Modernism کے نام سے شائع ہو چکی ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ انگریزی ترجمہ مجھے اصل سے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے۔

میری فرمائش پر عسکری صاحب نے اردو میں بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں ارسطو اور افلاطون سے لے کر جدید مغربی فلاسفہ تک تمام مشہور مفکرین کے بنیادی فلسفوں کو بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا تھا، اور مغرب کی فکری گمراہیوں کی ایک جامع فہرست بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کی تھی۔ انہوں نے بارہا یہ کتاب شائع کرانی چاہی مگر وہ نظر ثانی کے ارادے سے ٹلتی رہی۔ ابھی چند ماہ پہلے انہوں نے اس کی اشاعت پر رضامندی ظاہر کردی تھی لیکن ابھی چھپ نہیں سکی تھی کہ وہ رخصت ہو گئے۔ یہ کتاب

ان کے مسودات میں محفوظ ہوئیں۔

پھر اللہ تعالیٰ کو عسکری صاحب سے ایک اور عظیم الشان کام لینا تھا جو انکی زندگی کے تمام دوسرے کاموں پر بھاری تھا۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی ایک اردو تفسیر "معارف القرآن" آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے" اور غالباً عصر حاضر کی اردو تفاسیر میں سب سے زیادہ مفصل اور جامع تفسیر ہے۔ میں نے عسکری صاحب سے فرمائش کی کہ وہ اسکا انگریزی ترجمہ شروع کردیں۔ ابتداء میں وہ عذر کرتے رہے لیکن چونکہ وہ خود اسکی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ انگریزی میں کوئی مستند اور مفصل تفسیر منظر عام پر آئے۔ اسی لئے بالآخر اس شرط پر راضی ہوگئے کہ میں بھی مشورے میں برابر شریک رہوں۔ چنانچہ تقریباً تین سال پہلے ہم دونوں نے ایک عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھالیا۔ وہ ہفتہ بھر تفسیر کا ترجمہ کرتے جمعہ کے دن مغرب کے بعد میں اور عبدالوحید قریشی صاحب ان کے پاس پہنچ جاتے۔ رات گئے تک ہماری نشست رہتی جس میں وہ اپنا لکھا ہوا مسودہ ہمیں سناتے مشورہ طلب امور میں مشورہ کرتے اور مسودہ میرے حوالے کردیتے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ قرآن کریم کی آیات کا ترجمہ میری موجودگی میں کرتے تھے اور اس غرض کیلئے وہ اپنی کتب اٹھالاتے تھے کہ جتنے انگریزی اور فرانسیسی تراجم ان کے پاس موجود تھے ان سب میں سے متعلقہ آیات کا ترجمہ وہ ترتیب وار ایک کاپی میں لکھ لیتے تھے تاکہ سارے تراجم ایک نظر میں سامنے آجائیں۔ اس کے بعد باہمی مشورے سے الفاظ اور ترکیبوں کا انتخاب کرکے آیات کا حتمی ترجمہ لکھ لیتے تھے۔ عسکری صاحب بھی کہا کرتے تھے اور خود میرا تجربہ بھی یہی تھا۔ تصنیف و تحریر کا کوئی کام قرآن کریم کے ترجمے سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔

عسکری صاحب کے ساتھ یہ ہفتہ وار نشست جو تین سال سے تقریباً بلاناغہ ہو رہی تھی اسقدر دلچسپ مفید اور معلومات آفریں ہوتی تھی کہ پہلے سے اسکا انتظار لگا رہتا تھا اور میں بھی اس کا اسقدر اہتمام کرتا تھا کہ بعض اوقات سفر سے کراچی پہنچ کر اپنے مکان کے بجائے سیدھا عسکری صاحب کے یہاں پہنچ جایا کرتا تھا۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ یہ پر کیف مجلس اسقدر جلد اجڑ جائے گی۔ ابھی قرآن کریم کا سوا پارہ "تفسیر کی پہلی جلد کا دو تہائی حصہ" اور انگریزی مسودے کے تقریباً چھ سو صفحات ہوپائے تھے کہ عسکری صاحب رخصت ہوگئے۔

فصل گل دیر رسید و بہار زود گذشت

عسکری صاحب نے تفسیر کا یہ کام اس قدر اخلاص کے ساتھ شروع کیا کہ اس پر کوئی ادنیٰ معاوضہ لینے کا تو ---- میرے اصرار کے باوجود ---------- ان کے یہاں کوئی سوال نہ تھا، انہوں نے اصل اردو تفسیر بھی دام دے کر خریدی تھی، اور اس کو بھی میری ناگواری کے باوجود ہدیۃً لینا گوارا نہیں کیا، ان کا کہنا یہ تھا کہ میں آپ سے کوئی اور کتاب تحفہ میں لے سکتا ہوں لیکن تفسیر تحفہ میں لوں گا تو مجھے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

عسکری صاحب سگریٹ نوشی کے جیسے عادی تھے اسے ان کے سب ملنے والے جانتے ہیں، لیکن تفسیر کے کام کے دوران وہ کبھی سگریٹ نہیں پیتے تھے، حالانکہ ہماری یہ نشست بعض اوقات کئی کئی گھنٹے دراز ہو جاتی تھی۔ "معارف القرآن" کا ترجمہ شروع کرتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کے شروع میں لکھا ہے کہ "قرآن کریم ختم کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایسی چیز ہے جس میں عمر ختم کر دی جائے" میں بھی یہ کام اسی نیت سے شروع کر رہا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ نیت ایسی قبول فرمائی کہ وہ یہی کام کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو گئے، اور سوا پارے کا ترجمہ کر کے پوری تفسیر کا ثواب سمیٹ لے گئے، اور آج معارف القرآن کے مصنف حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بالکل قریب آرام فرما ہیں۔ اور یہ بھی قدرت کا کرشمہ ہے کہ "حرامجادی" جیسے افسانوں کا مصنف بالآخر قرآن کریم اور اس کی تفسیر کا مترجم بن کر رخصت ہوا، اور ایک ویرانے کی فضا میں پاکستان کے مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور عظیم مفسر کے پہلو میں محو آرام ہے۔ میں جب ان کی قبر پر جاتا ہوں تو وہ زبان حال سے یہ کہتی ہوئی محسوس ہوتی ہے کہ؂

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغاز را انجامم نگر

محترم جناب ماہر القادری مرحوم

پچھلے مہینے (۵ر جمادی الثانیہ) کو ملک کے مشہور اور مایہ ناز شاعر، ادیب، نقاد اور صحافی جناب ماہر القادری اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ماہر صاحب جن کو آج مرحوم لکھتے ہوئے قلم جھجک رہا ہے، بڑے پاک دل، مخلص اور دردمند مسلمان تھے۔ احقر کو ان سے سب سے پہلا تعارف ان کے شہرہ آفاق "سلام" کے ذریعے ہوا جس کے یہ اشعار اس وقت بھی ماہر صاحب کے مخصوص لہجے کے ساتھ کانوں میں گونج رہے ہیں۔

سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پر کہ اسرار محبت جس نے سمجھائے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں
سلام اس پر کہ جس کا نام لے کر اس کے شیدائی
الٹ دیتے ہیں تخت قیصریت، اوج دارائی
سلام اس پر کہ جس کی بزم میں قسمت نہیں سوتی
سلام اس پر کہ جس کے ذکر سے سیری نہیں ہوتی

ماہر صاحب کے اس سلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ یہ بچے بچے کے ورد زبان ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ نے اسے لاکھوں مسلمانوں کا ایمان تازہ کرنے کا باعث بنا دیا۔ اس سلام کے بیشتر اشعار مجھے بچپن سے یاد ہیں، اور انہی کی بدولت ماہر صاحب سے تعارف ہوا۔ آج سے تقریباً تیس سال قبل جب میں قرآن شریف ناظرہ ختم کر کے اردو فارسی کی

ابتدائی کتب پڑھتا تھا' ایک روز ماہر صاحب مرحوم حضرت والد صاحبؒ سے ملاقات کے لئے ہمارے مکان پر آئے تو انہیں پہلی بار دیکھا اور ان کی زبان سے سلام سننے کا اشتیاق پورا ہوا۔ اس کے بعد حضرت والد صاحبؒ کے پاس ان کا خاصا آنا جانا رہا' اور ان کا ماہنامہ "فاران" پابندی سے ہمارے ہاں آنے لگا۔ میں اس وقت اتنا چھوٹا تھا کہ "فاران" کا لفظ اور اس کے معنی بھی پہلی بار ان کے رسالے ہی سے معلوم ہوئے۔ (اور پھر اسکے کئی سال کے بعد میں نے لفظ "فاران" اس کے محل وقوع اور تورات میں اس کے ذکر سے متعلق ایک مفصل مقالہ لکھا جو ماہنامہ فاران ہی میں شائع ہوا' اور ماہر صاحب نے اسے غیر معمولی طور پر پسند کیا)۔

جب میں درس نظامی سے فارغ ہوا تو ماہر صاحب اپنی ہر ملاقات میں مجھ سے فرمائش کیا کرتے تھے کہ میں ماہنامہ فاران کے لئے مضامین لکھوں چنانچہ بینات' البلاغ اور الحق کے اجراء سے پہلے احقر کے کافی مضامین "فاران" میں شائع ہوئے' اور ماہنامہ رسائل میں سے قابل ذکر جس رسالے میں میرے مضامین سب سے پہلے شائع ہوئے وہ ماہر صاحب کا فاران ہی تھا۔ بلکہ میری ایک کتاب "تقلید کی شرعی حیثیت" کے تو براہ راست محرک ہی ماہر صاحب تھے' یہ مضمون میں نے انہی کے بے حد اصرار پر "فاران" کے لئے لکھا تھا' جو بعد میں کتاب کی صورت اختیار کر گیا۔

ماہر صاحب بنیادی طور پر شاعر اور ادیب تھے' شعر و ادب کی دنیا میں انہوں نے جو نام پیدا کیا وہ محتاج بیان نہیں' لیکن پھر رفتہ رفتہ انہیں اللہ تعالیٰ نے دین کا قابل رشک جذبہ اور لگن عطا فرمائی' چنانچہ فاران بھی جو ابتداءً ایک ادبی پرچہ تھا رفتہ رفتہ اس پر دینی رنگ غالب ہوتا چلا گیا۔

شروع میں ماہر صاحب اپنے ماحول کی وجہ سے بریلوی مسلک پر کاربند تھے' لیکن بعد میں جب دین کا کچھ مطالعہ کیا تو بدعات کے ایسے کٹر دشمن بنے کہ ان کا ماہنامہ "فاران" ایک زمانے تک بدعات کے خلاف جہاد کرتا رہا' اس رسالے کا غالباً ایک ہی خاص نمبر نکلا' اور وہ "توحید نمبر" تھا۔

میرے سب سے بڑے بھائی مولانا محمد زکی کیفی مرحوم سے ماہر صاحب کے بڑے بے تکلف دوستانہ تعلقات تھے اور لاہور میں وہ ہمیشہ بھائی جان ہی کے مکان پر قیام کرتے تھے۔

بھائی جان کی اس بے تکلف دوستی کی بنا پر ہمارے بھی ان سے تکلف کے حجابات اٹھ گئے تھے اور وہ ہمارے سامنے بڑی بے تکلفی کے ساتھ اپنے "عہد قدیم" کی نظمیں اور غزلیں سناتے، اور بعض اوقات کئی کئی گھنٹے ان کے شعر سنانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

ماہر صاحب اگرچہ کسی بھی جماعت سے باضابطہ وابستہ نہ تھے، لیکن مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے عقیدت مند ہی نہیں بلکہ اس معاملے میں مغلوب الحال ہو گئے تھے اور جماعت اسلامی یا مولانا مودودی پر کوئی تنقید خاموشی سے سننا ان کی مقدرت سے باہر تھا۔ چنانچہ اس معاملے میں ان کے ساتھ بڑے دلچسپ لطیفے پیش آتے رہتے تھے۔ وہ تقریباً ہر ملاقات میں اس موضوع سے متعلق کوئی نہ کوئی بات چھیڑتے تھے، شروع میں جب تک ان کے مزاج کا پورا اندازہ نہ تھا، ہم بھی ان کے ساتھ بحث و مباحثے میں حصہ لے لیتے تھے، لیکن جب ان کے مزاج کا اندازہ ہوا تو حتی الوسع ان کے ساتھ اس موضوع سے پرہیز کرنے لگے تھے، مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے دیکھ کر ان سے یہ موضوع چھیڑے بغیر رہا نہ جاتا تھا۔ گفتگو کے دوران بعض اوقات وہ انتہائی غم و غصہ کا اظہار کرتے، لیکن دوسرے ہی لمحے ایسے شگفتہ ہو جاتے کہ جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہ تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے کہیں زیادہ تھے، لیکن بے تکلفی کے ماحول میں بعض اوقات تحریری یا زبانی طور پر ان سے دو بدو بھی ہو جاتی، اور یہ ان کی بڑائی کی بات تھی کہ وہ کبھی اس کا برا نہیں مانتے۔ ایک روز میں نے ان کے ایک خط کے جواب میں مولانا مودودی کے تفردات کے بارے میں کوئی جملہ لکھ دیا تھا۔ چند روز بعد ان کی طرف سے ایک پارسل ڈاک میں موصول ہوا۔ میں سمجھا کہ یہ کوئی مقالہ ہوگا، لیکن کھولا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کیونکہ وہ میرے اس مختصر خط کا جواب تھا جو ۲۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ مجھے اس کے مندرجات سے تو اتفاق نہ ہو سکا، لیکن اس بات کی بڑی قدر ہوئی کہ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے، صرف ایک آدمی کو اس کی تبلیغ کرنے کے لئے انہوں نے اتنی محنت اور اتنا وقت خرچ کیا۔

یہ ماہر صاحب کے خلوص اور بے لوث پن کا ثمرہ تھا کہ ان سے اختلاف رکھنے والے بھی ان سے محبت کرتے تھے اور وہ ہر طبقہ خیال کے ہر دلعزیز شاعر تھے۔ انہیں سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی وہ ان کی نعتوں سے جھلکتی نظر آتی ہے۔ بعض اوقات آپ کے ذکر مبارک سے ان کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں، اور غالباً یہ اسی محبت و خلوص کا نتیجہ ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے انہیں حجاز مقدس کی اس سرزمین میں موت عطا فرمائی جہاں مدفون ہونا ہر مسلمان اپنی عظیم سعادت سمجھتا ہے، بظاہر تو وہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے جدہ گئے تھے، لیکن درحقیقت اللہ تعالیٰ نے انہیں ابدی آرام کے لئے حرم محترم کے جوار میں بلا لیا تھا، اور آج وہ جنت المعلیٰ میں محو آرام ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور انہیں جنت الفردوس کی راحتیں نصیب فرمائے۔ آمین۔

البلاغ جلد ۱۲ شمارہ ۲

تین حادثے

① حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ

پچھلے دنوں ہندوستان میں تین ایسے المناک واقعات پیش آئے جن سے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کے علمی اور دینی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔

ان میں سے پہلا المناک واقعہ برصغیر کی عظیم دینی درسگاہ مظاہر العلوم سہارنپور کے معروف استاذ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سانحہ وفات ہے۔ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب قدس سرہ مظاہر العلوم کے صف اول کے اساتذہ میں سے تھے اور سالہا سال سے علوم دین کی تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ اس وقت برصغیر کے دینی حلقوں میں جتنے مقتدر علماء کا مظاہر العلوم سے کوئی تعلق رہا ہے وہ تقریباً سب حضرت مولانا کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ علم و فضل کے اس مقام بلند کے ساتھ ساتھ آپ اصلاح و ارشاد کے ایک مرکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے باطنی تربیت حاصل کی تھی اور اس وقت آپ حضرت حکیم الامتؒ کے ان گنے چنے خلفاء میں سے تھے جنہوں نے اپنے ظاہری و باطنی فیوض سے ایک عالم کو سیراب کیا ہے اور مادہ پرستی کے اس دور میں روحانیت، رجوع الی اللہ اور انابت و تقویٰ کے چراغ روشن کئے ہیں۔

حضرت مولانا کا یہ وصف ان سے واقفیت رکھنے والوں میں مشہور و معروف تھا کہ آپ کی نہ صرف جماعت کی نماز، بلکہ تکبیر اولیٰ بھی قضا نہیں ہوتی تھی، اور جن لوگوں کو آپ سے خصوصی تعلق رہا ہے وہ بھی ان کے فیض تربیت کی بدولت نہ صرف مسجد کی جماعت کے غیر معمولی طور پر پابند ہوتے ہیں، بلکہ جماعت میں مسبوق بننا بھی گوارا نہیں کرتے۔

دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کی وہ نمایاں ترین خصوصیت جس نے ان اداروں کو دنیا بھر کی تعلیم گاہوں میں زبردست امتیاز عطا کیا یہی تھی کہ یہاں طلباء کو علم کا

صرف ظاہری خول نہیں دیا جاتا تھا، بلکہ اس میں "عمل صالح"، عبادت و تقویٰ، اتباع سنت اور اخلاق فاضلہ کی روح بھی بھری جاتی تھی۔ یہاں جتنا زور علم و تحقیق پر تھا اس سے زیادہ توجہ اعمال و اخلاق کی اصلاح پر تھی۔ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان عظیم اداروں کی اسی خصوصیت کے امین تھے اور اس دور میں جب کہ ان دینی خصوصیات میں روز بروز انحطاط آرہا ہے، ان کی وفات پوری امت مسلمہ کا ایسا عظیم سانحہ ہے جس پر جتنا افسوس کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو جنت الفردوس میں درجات عالیہ عطا فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے اور ہم سب کو ان کے اعمال صالحہ میں ان کے اقتدا کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

البلاغ، جلد ۱۳ شمارہ ۱۰

② مولانا محمد الحسنی صاحب

دوسرے دو دلگداز حادثات برصغیر کے دوسرے بڑے دینی مرکز دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں رونما ہوئے، پہلے تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہم العالی کے فاضل بھتیجے اور ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے ہونہار اور مایہ ناز مدیر مولانا محمد الحسنی اچانک وفات پاگئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ ان نوجوان اہلِ علم اور اہلِ قلم میں سے تھے جن کا تصور کرکے اپنے زمانے کی مفلسی کا احساس کم ہوتا تھا، وہ اگرچہ نوجوان تھے لیکن ان کی فاضلانہ تحریروں نے دین کی وہ خدمت انجام دی ہے جو بہت سے عمر رسیدہ افراد کے لئے بھی قابلِ رشک ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم اس وقت عالم اسلام کی وہ متاعِ عزیز ہیں جن کا نام آتے ہی، ہر دردمند مسلمان اپنے دل میں محبت و عقیدت کے ہلکورے محسوس کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد الحسنی مرحوم کو ان کی صحبت و تربیت سے نوعمری ہی میں علم و فضل، حسن بیان اور قلب کے سوز و گداز کی اس دولت سے نواز دیا تھا جو بڑے بڑوں کو سالہا سال کی محنت و ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ خاص طور سے ان کی عربی تحریر میں وہ سلاست، شگفتگی، سوز و گداز اور زورِ بیان پایا جاتا تھا جس نے عرب کے مسلم الثبوت انشاپردازوں کو بھی متاثر کیا۔ خود حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہم نے متعدد مواقع پر اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ مولانا محمد الحسنی مرحوم کو ان کے طرزِ تحریر سے سب سے زیادہ مناسبت ہے۔

مولانا محمد الحسنی مرحوم نے اپنے شیخ کی طرح عالم عرب میں دین کی صحیح دعوت کو پھیلانے میں جو کردار ادا کیا اور وہ عربوں کو خود ان کے اسلوب و انداز میں جس سلامت فکر اور دردمندی کے ساتھ آئینہ دکھاتے رہے، وہ ان کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔

عام طور سے تحریر و انشا کی اس درجے کی صلاحیت انسان میں پندار و تعلّی کے امراض پیدا کردیتی ہے خاص طور پر نوعمری میں انسان کی ان صلاحیتوں نے دنیا سے اپنا لوہا منوالیا ہو تو یہ پندار و تعلّی انانیت کی شکل بھی اختیار کرلیتی ہے، لیکن مولانا محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی صحبت و تربیت

نصیب فرمائی تھی جس کی بدولت یہ امراض ان پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ وہ انتہائی سادہ، متواضع اور خلیق انسان تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں سیال قلم کے ساتھ پرسوز دل بھی عطا فرمایا تھا۔

احقر مرحوم سے غائبانہ طور پر ان سے واقف اور ان کی صلاحیتوں کا قدردان تھا لیکن گذشتہ سال جب وہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہم کے ساتھ پاکستان آئے تو ان سے محبت وتعلق خاطر میں بہت اضافہ ہوا اور ان کی تحریر کی طرح ان کی شخصیت زندگی بھی احقر کے لئے قابل رشک ثابت ہوئی۔ کسے معلوم تھا کہ ان کے ساتھ یہ پہلی اور آخری ملاقاتیں ہوں گی اور یہ "شعلہ مستعجل" جس کی ابھرتی ہوئی روشنی سے بہت کچھ توقعات وابستہ تھیں، اتنی جلدی نگاہوں سے روپوش ہو جائے گا۔ اللہم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ۔

گذشتہ سال حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہم کے ساتھ مولانا محمد الحسنی کے علاوہ جو دوسرے رفیق سفر پاکستان تشریف لائے تھے، وہ ہفت روزہ "تعمیر حیات" کے ایڈیٹر مولانا اسحاق جلیس ندوی صاحب تھے۔ مولانا محمد الحسنی مرحوم جس قدر کم گو، کم آمیز اور عزلت پسند معلوم ہوئے مولانا اسحاق جلیس ندوی اسی قدر خوش کلام، ملنسار اور فعال نظر آئے۔ اور اندازہ یہ ہوا کہ اگر مولانا محمد الحسنی مرحوم حضرت مولانا علی میاں مدظلہم کی تحریر میں ان کے جانشین ہیں تو مولانا اسحاق جلیس ندوی عملی زندگی میں ان کے بہترین دست و بازو ثابت ہوں گے۔

البلاغ جلد ۱۳ شمارہ ۱۰

* * *

③ مولانا اسحاق جلیس ندویؒ

ابھی مولانا محمد الحسنی کے سانحہ وفات کو چند ہی دن گزرے تھے کہ اچانک مولانا اسحاق جلیس ندوی نے بھی داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قحط الرجال کے اس دور میں جب کہ ہر شعبہ زندگی میں بالعموم اور دینی حلقوں میں بالخصوص، موثر شخصیتوں کی تیاری تقریباً بند ہو رہی ہے، ایسے حضرات کا اٹھ جانا پوری امت کا شدید نقصان ہے اور خاص طور پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہم کو ان حادثات سے جو صدمہ پہنچا ہے، اس کے تصور ہی سے کرب معلوم ہوتا ہے۔ اللہ کے نیک بندے ہمیشہ راضی برضا رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی مشیت کی حکمتوں کو جانتے ہیں، وہ عالم بھی ہیں اور حکیم بھی، ان کا کوئی فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں، لیکن ان جیسے حوادث پر طبعی صدمہ فطری بات ہے جو اگر اپنی حدود میں ہو تو اس پر شریعت نے کوئی پابندی بھی عائد نہیں کی۔

ادارہ البلاغ اس موقع پر حضرت مولانا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین!

[illegible] جلد ۱۳ شمارہ [illegible]

◆

حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ

سفرِ ہندوستان سے واپسی ہوئی تو لاہور اسٹیشن پر اترتے ہی یہ المناک اطلاع دل پر بجلی کی طرح گری کہ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کو اجلاسِ صد سالہ میں شرکت کے لئے دیوبند تشریف لے جانا تھا لیکن این او سی کے ملنے میں دیر لگی اور آپ بروقت نہ پہنچ سکے۔ لیکن دیوبند ہی میں یہ اطلاع ملی تھی کہ مولانا اجلاس ختم ہونے کے بعد ایک رات کے لئے دیوبند تشریف لائے تھے اور اگلے ہی دن دہلی روانہ ہو گئے۔ احقر دہلی پہنچا تو ایک روز عصر کے بعد احقر جامع مسجد دہلی کے مشرقی دروازے پر کھڑا تھا، وہاں سے سامنے دیکھا تو ایڈورڈ پارک کے کنارے مولانا کسی صاحب سے محو گفتگو تھے۔ وہی خوش وضع لباس، وہی دلکش انداز و ادا، بالکل صحت مند، توانا اور چاق وچوبند! اس وقت احقر رفقاء کے ساتھ تھا اور ایک اور جگہ جانا تھا، اس لئے نیچے اتر کر ملاقات کا موقع نہ تھا۔ خیال تھا کہ انشاء اللہ کسی اور موقع پر ملاقات ہو جائیگی۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ مولانا کی آخری زیارت ہوگی۔ پھر ملاقات تو کجا اس پیکرِ شعر سراپا کی کوئی جھلک نظر نہ آسکے گی۔ مولانا دہلی سے مدراس تشریف لے گئے اور مدراس ہی میں اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہیں پر جمعہ کے دن وفات ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی ذات پاکستان کی ایک تاریخ تھی۔ وہ ان علماء کرام میں سے تھے جو قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ شریک رہے اور قیامِ پاکستان کے بعد جیکب لائنز میں ان کی مسجد اور ان کا مکان مسلسل دینی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ ایک زمانے تک شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت والد صاحبؒ، حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدنیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ اور دوسرے اکابر علماء کی مشاورت اکثر وبیشتر انہی کی قیام گاہ پر ہوتی رہی۔

مولانا نظریہ پاکستان اور دو قومی نظریے کے زبردست مناد تھے۔ وہ کٹر پاکستانی تھے اور

اس معاملے میں انھوں نے کبھی کسی مداہنت یا مصلحت کو گوارا نہیں کیا۔ انھوں نے شرعی احکام کی تشریح کے سلسلے میں بھی ہمیشہ تصلب کا مظاہرہ فرمایا اور شریعت میں تحریف و ترمیم کی کسی کوشش و سازش کو قبول نہیں کیا۔ ۱۹۵۱ء میں ۳۱ علماء کا جو شہرہ آفاق اجتماع ہوا اور جس میں تمام مکاتب فکر کے علماء نے متحد ہو کر ملک کے بائیس دستوری نکات مرتب کئے۔ نیز ۱۹۵۳ء میں انہی علماء کے جس اجتماع نے جو دستوری ترمیمات مرتب کیں وہ ملک میں دینی جدوجہد کی تاریخ کا انتہائی اہم واقعہ تھا۔ ان دونوں اجتماعات کے داعی مولانا تھے اور یہ زیادہ تر مولانا ہی کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ عائلی قوانین پر غور کرنے کے لئے ابتداءً جو کمیشن قائم ہوئے اس میں مولانا تنہا ایک عالم دین تھے جنہوں نے اس میں حق گوئی کا پورا حق ادا کیا' چنانچہ ان کا اختلافی نوٹ تاریخی حیثیت اختیار کر گیا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے عہد حکومت میں وہ ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کے نظریات کے خلاف ڈٹ گئے اور اخبارات کے ذریعے عوام کو تحریف و ترمیم کے اس فتنے سے خبردار کیا۔ رویت ہلال کے مسئلے میں انہوں نے ہمیشہ شریعت کے مطابق جرات مندانہ موقف اختیار کیا اس پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر جب سوشلزم کو روکنے اور عوام کو اس کی دینی حیثیت سے آگاہ کرنے کے لئے مولانا نے جس جانفشانی کے ساتھ ملک کے دورے کئے، وہ مولانا کی ناقابل فراموش خدمت ہے۔

مولانا ملک کے مایہ ناز خطیب تھے۔ وہ خطابت میں ایک دلکش اسلوب بیان کے موجد تھے جو ان سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہو گیا۔ ان کی دل آویز خطابت نے سینکڑوں انسانوں کو دین سے قریب کیا اور شاید ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہوگا جہاں مولانا کی دلکش آواز نہ گونجی ہو۔ ریڈیو پاکستان سے ان کے درس قرآن کا سلسلہ انتہائی مقبول عام ہوا اور بعد میں روزنامہ جنگ کے ذریعے شائع ہو کر وہ محفوظ بھی ہو رہا تھا۔ افسوس ہے کہ مولانا کی وفات سے وہ نامکمل رہ گیا۔

دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہ یار، مولانا کی ایک اور قابل قدر یادگار ہے جس کا شمار ملک کی ممتاز ترین دینی درسگاہوں میں ہوتا تھا۔ خدا کرے کہ وہ پھر ایک بار اپنا سابقہ مقام حاصل کر سکے۔ آمین۔

مولانا کی شخصیت بڑی باغ و بہار، شگفتہ اور دلکش تھی۔ ان کی مجلس میں اکثر وقت کا

گزر نہیں تھا۔ وہ بڑے حاضر جواب، بذلہ سنج اور خوش کلام عالم تھے۔ سیاست میں مولانا کے انداز فکر و عمل سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مولانا کی شخصیت جن خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ انہوں نے پاکستان میں جو دینی خدمات انجام دیں اور ملک کی سیاسی تاریخ پر جو اثرات مرتب کئے ان سے مولانا کے سیاسی مخالفین کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ ان کی وفات سے پورے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا، پوری ایک بساط تہ ہو گئی۔ اور سیاست کا ایک منفرد مکتب فکر بند ہو گیا۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے۔ انہیں جنت الفردوس میں مقامات عالیہ سے نوازے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

البلاغ جلد ۱۳ شمارہ ۷

شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحبؒ

ابھی حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا حادثۂ وفات تازہ تھا کہ اچانک شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر صاعقہ بن کر گزری۔ حضرت مولانا عمرہ کی ادائیگی کے لئے حجاز تشریف لے گئے تھے۔ واپسی میں دوبئی میں قیام فرمایا۔ وہاں ایک جلسۂ سیرت سے بھی خطاب کیا۔ اسی سرزمین پر داعی اجل کو لبیک کہا، اور دین برحق کا یہ بطل شہیر، مبلغ اسلام کا یہ جانباز سپاہی، علمائے دیوبند کا یہ عاشق زار اور گلشن توحید کا یہ عندلیب ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا۔

[illegible]

حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب ان گنے چنے علماء میں سے تھے، جن کا وجود پاکستان کے لئے بہت بڑی ڈھارس کا سبب تھا، وہ توحید و سنت کے داعی تھے اور شرک و بدعات اور اوہام و رسوم کے لئے شمشیر برہنہ۔ جس بات کو انہوں نے حق سمجھا اس کے اعلان و اظہار میں انہوں نے کبھی مداہنت اور کسی مصلحت کو آڑے نہیں آنے دیا۔ اسی حق گوئی و بے باکی کے صلے میں انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، قاتلانہ حملے بھی ہوئے، لیکن ان کے پائے استقامت میں تزلزل نہیں آ سکا۔

حضرت مولانا نے جن اکابر علمائے دیوبند سے فیض حاصل کیا، ان میں امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ جیسی نادرۂ روزگار ہستیاں شامل ہیں۔ لیکن رد بدعات کے خصوصی مشن میں آپ نے اپنے استاذ حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذاق کو اپنایا تھا اور ساری عمر اسی مشن کی تکمیل میں گزار دی۔ اس راہ میں آپ جس قدر محنت اٹھاتے تھے، اس کو دیکھ کر قدماء کے بزرگوں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ راولپنڈی میں آپ کا قائم کیا ہوا مدرسہ تعلیم القرآن ملک کے چوٹی کے دینی اداروں میں سے ہے، اور اس کے درسی انتظام کے علاوہ ایک ایک دن میں کئی کئی جلسوں سے خطاب، مختلف مقامات پر درس قرآن اور مسلسل سفروں کی زندگی آپ کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔

انہی مصروفیات کے درمیان آپ نے تفسیر "جواہر القرآن" جیسی ضخیم کتاب بھی تصنیف فرمائی جو حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیری افادات و نظریات کی بہترین تشریح ہے۔

بعض مسائل میں اکابر علمائے دیوبند سے قدرے مختلف موقف رکھنے کے باوجود اکابر کی عظمت و محبت ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ علمائے دیوبند کے تذکرے سے وہ بے خود ہو جاتے اور جہاں کہیں اس مقدس نام پر کوئی آنچ آتی محسوس ہوتی، وہ اپنے مرتبہ و منصب کی پرواہ کئے بغیر اپنی جان و آبرو کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

بحمد اللہ برادرم محترم حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی مد ظلہم اور اس ناکارہ کو ہمیشہ ان کی شفقت و محبت حاصل رہی، بارہا دار العلوم میں ان کی تشریف آوری ہوئی، یہاں درس و خطاب سے بھی سرفراز فرمایا۔ علمی و عملی کمالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور واقعہ یہ ہے کہ مولاناؒ کی ذات ہم سب کے لئے بہت بڑا سہارا تھی۔

احقر اسلام آباد سے کراچی آنے کے لئے پابہ رکاب تھا کہ مولاناؒ کی وفات کی اطلاع بجلی بن کر گری، احقر نے اپنا سفر ملتوی کیا اور اس طرح بحمد اللہ آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہو گئی۔ نماز جنازہ لیاقت باغ میں ہوئی، اور یہ مولاناؒ کے خلوص، للّٰہیت اور انتھک جدوجہد کا ثمرہ تھا کہ نماز جنازہ میں لوگوں نے جوق در جوق شرکت کی، لیاقت باغ میں نماز جنازہ کے وقت سر ہی سر نظر آتے تھے اور دین برحق کے اس سپاہی کو رخصت کرنے کے لئے لوگ دور دراز کا سفر کر کے یہاں پہنچے تھے۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولاناؒ کو جوار رحمت میں مقامات عالیہ سے نوازے، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے اور ان کا قائم فرمودہ دار العلوم تعلیم القرآن جو ان کا بہترین صدقہ جاریہ ہے، بدستور خدمت دین کا ایک اہم مرکز بنا رہا ہے۔ مولاناؒ کے صاحبزادگان حفظہ تعالیٰ عالم دین اور اپنے والد ماجدؒ کے مشن کے امین ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں خیر و عافیت کے ساتھ قائم رکھے اور بیش از بیش خدمت دین کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین

مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ

چودھویں صدی کے آخری عشرے میں بزم علم و دین کی کتنی بڑی بڑی عظیم شخصیتیں ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہو گئیں، اور آخر میں یہ المناک سانحہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنا مقدر تھا کہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی بزم کو بالکل ویران کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، وہ ایک متبحر عالم دین، ملک کے مقتدر دینی سیاسی رہنما اور دین برحق کے داعی تھے۔ ان کی پوری زندگی جہد مسلسل اور سرگرم عملی خدمات سے عبارت تھی، اور انہوں نے پاکستان کی دینی اور سیاسی بساط پر وہ ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں جو اس خطے کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ـــــــــ ان کی وفات کا سانحہ بالکل ناگہانی اور قطعی غیر متوقع طور پر اس طرح ہوا کہ آنکھوں کے سامنے پیش آیا، اور وہ ہمارے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے کرتے اس طرح بالکل اچانک ہم سے رخصت ہو گئے کہ ان کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات ایک خواب کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کا اسم گرامی میں نے سب سے پہلے اپنے ایک استاذ محترم سے سنا تھا۔ اس وقت حضرت مفتی صاحبؒ مدرسہ قاسم العلوم میں استاذ حدیث اور مفتی کے فرائض انجام دیتے تھے، اور عملی سیاست میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ ہمارے استاذ محترم نے ان کی علمی بصیرت اور فقہی نظر کا تذکرہ اس انداز سے فرمایا تھا کہ مفتی صاحبؒ سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد احقر کو پہلی بار آپ سے ملاقات کا شرف وفاق المدارس کے ایک سالانہ اجلاس میں حاصل ہوا جس میں احقر اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حاضر ہوا تھا، اور پہلی ہی ملاقات میں حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کی علمی بصیرت، ان کی متانت و سنجیدگی اور ان کے دل کش انداز گفتگو کا ایک گہرا نقش دل پر ثبت ہو گیا۔

اس کے بعد بارہا مفتی صاحبؒ سے شرف ملاقات حاصل ہوا اور ہر مرتبہ اس تاثر کی تائید و تقویت ہی ہوتی چلی گئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے میدان سیاست میں آنے کے بعد ان کے سیاسی طرز فکر و عمل کے بعض اجزاء سے اگرچہ اختلاف بھی رہا، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ ان کے علمی مقام بلند کا احترام دل میں ہمیشہ جاگزین رہا، اور اللہ تعالیٰ نے انھیں جن نادر صلاحیتوں سے نوازا تھا ان کی عظمت کا احساس دل سے کبھی محو نہیں ہوا۔ ہم نے انھیں علمی اعتبار سے ہمیشہ اپنا استاذ و مقتدا سمجھا، اور انھوں نے بھی ہمیشہ بزرگانہ شفقت و محبت کا برتاؤ فرمایا۔

۱۹۶۸ء میں جب ادارۂ تحقیقات اسلامی کی سربراہی ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے سپرد تھی، انھوں نے راولپنڈی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جس میں اطراف عالم سے چیدہ اہل علم و فکر جمع تھے، اس کانفرنس میں اس وقت کے ناظم اوقاف صاحب نے جو مقالہ پڑھا وہ اشتراکیت کی تبلیغ و تائید پر مشتمل تھا، اور اس میں بڑے جارحانہ انداز سے علماء کو چیلنج کیا گیا تھا کہ وہ ان دلائل کا جواب دیں۔ مقالہ چونکہ انگریزی زبان میں تھا، اس لیے ہمارے بیشتر علماء اس کے مشتملات سے بے خبر تھے، اس موقع پر ضرورت تھی کہ علماء کی طرف سے کوئی مؤثر شخصیت حقیقت حال کو واضح کرے۔ حسن اتفاق سے اس وقت پاکستان کے معروف علماء میں سے حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کے سوا کوئی ہال میں موجود نہ تھا۔ احقر اور برادر محترم مولانا سمیع الحق صاحب اس موقع پر حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں گئے اور انھیں مقالے کے اہم اجزاء سے آگاہ کیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ یہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے اور "مداخلت" کے لئے صدر سے وقت طلب کیا۔ چنانچہ انھیں وقت دیا گیا، اور انھوں نے ایسی برجستہ اور فاضلانہ تقریر فرمائی جس سے فضا بدل گئی اور شکوک و شبہات بڑی حد تک دور ہو گئے۔

۱۹۷۴ء میں جب "تحریک ختم نبوت" اپنے شباب پر تھی اور اس تحریک کے قائد و سربراہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ملت مسلمہ کی طرف سے اسمبلی میں پیش کیا جانے والا بیان ترتیب دینے کے لیے احقر کو راولپنڈی طلب فرمایا تو ایک دن مجھ سے فرمایا کہ "میری خواہش تو شروع ہی سے یہ تھی کہ اس بیان کی ترتیب تمہارے حوالے کی جائے، لیکن میں چاہتا تھا کہ یہ تجویز کسی اور کی طرف سے پیش ہو

تو بہتر ہے۔" اتفاق سے جب مجلس عمل میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو کئی نام سامنے آئے، لیکن بالآخر مفتی محمود صاحبؒ نے میری کسی تحریک کے بغیر تمہارے نام کی شدت کے ساتھ تائید کی، اور میری دلی مراد پوری ہو گئی"۔ چنانچہ وہ بڑے یادگار دن تھے جب میں اور مولانا سمیع الحق صاحب دن رات اس بیان کی تحریر میں مشغول رہتے، اور شام کو عصر کے وقت دینی جماعتوں کے پارلیمانی سربراہ ہماری قیام گاہ پر جمع ہو کر ہمارا مرتب کردہ بیان سنا کرتے، یہ بڑی دلچسپ مجلس ہوتی اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ اس مجلس کو اپنے علمی چٹکلوں سے باغ و بہار بنائے رکھتے تھے، بعد میں یہ بیان اسمبلی میں حضرت مفتی صاحبؒ ہی نے پیش فرمایا، اور پھر مرزا ناصر پر لاجواب کر دینے والی جرح بھی فرمائی جو اسمبلی کے ریکارڈ میں محفوظ ہو گی۔

پچھلے دنوں جب میں اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن تھا تو کثرت سے اسلام آباد جانا ہوتا تھا، ان دنوں چونکہ جمعیۃ علماء اسلام حکومت میں شامل تھی، اس لیے حضرت مفتی صاحبؒ کی بھی وہاں بکثرت آمد و رفت رہتی تھی۔ ان مواقع پر بارہا ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ ہم لوگ اس زمانے میں حدود کے قوانین، غیر سودی بنکاری اور زکوٰۃ کے مسائل پر کام کر رہے تھے، اس میں بعض مسائل مشورہ طلب آجاتے تھے، ایسے مواقع پر جب بھی حضرت مفتی صاحبؒ راولپنڈی یا اسلام آباد میں ہوتے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، اور وہ باوجودیکہ ملاقاتیوں اور طرح طرح کی مصروفیات میں گھرے ہوئے ہوتے تھے، انتہائی شفقت و محبت سے اس ناکارے کو نہ صرف وقت دیتے بلکہ دوسرے کام چھوڑ کر احقر کی سمع خراشی کو خندہ پیشانی سے برداشت فرماتے تھے۔ اسی زمانے میں مفتی صاحبؒ پاؤں کے انگوٹھے کے آپریشن کے سلسلے میں کافی مدت تک کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں مقیم رہے۔ وہاں مفتی صاحبؒ کی خدمت میں طویل طویل نشستیں رہیں، اور قوانین حدود، قانون زکوٰۃ، عائلی قوانین اور بلا سود بنکاری جیسے مسائل پر خالص فقہی انداز میں گفتگو ہوئی۔ جس سے احقر نے بہت استفادہ کیا، اور ہر مرتبہ احقر یہ تاثر لے کر لوٹا کہ اتنے شدید سیاسی ہنگاموں کے باوجود ان کا علمی استحضار قابل صد رشک ہے۔

اسی دوران حضرت مفتی صاحبؒ کا یہ حیرت انگیز کمال بھی علم میں آیا کہ ان کے انگوٹھے کا کئی انچ گہرا آپریشن اس طرح ہوا کہ مفتی صاحبؒ نے بے ہوش یا سن کرنے والی دوا استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا، ڈاکٹروں نے اصرار بھی کیا کہ یہ خاصا طویل آپریشن

ہے، اور سن کیے بغیر سخت تکلیف ہوگی، لیکن مفتی صاحب نہ مانے، اور بالآخر سن کیے بغیر ہی آپریشن کیا گیا۔ ان کے خصوصی معالج (غالباً ڈاکٹر مرتضیٰ صاحب) ایک مرتبہ میرے سامنے موجود تھے، انہوں نے بتایا کہ "مفتی صاحب کی قوت برداشت حیرت انگیز ہے، اور میں نے اس سے پہلے ایسا آپریشن کرانے والا نہیں دیکھا۔" احقر نے مفتی صاحبؒ سے حیرت کے ساتھ اس کی وجہ پوچھی تو شروع میں طرح دے گئے، لیکن پھر فرمایا کہ "اگرچہ ضرورۃً نشہ آور دوا کا استعمال جائز ہے، لیکن میں نے سوچا کہ اس سے بھی بچ سکوں تو بچ جاؤں۔" احقر سوچ رہا تھا کہ احتیاط و تقویٰ کا یہ مقام اس دور میں قسمت والوں ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ احقر نے اس موقع پر حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ کا حوالہ دیا کہ انہوں نے سن کرائے بغیر اپنی پوری ٹانگ ران پر سے کٹوائی تھی۔ ان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ سرجن کو آپریشن کی اجازت دے کر ذکر اللہ میں مشغول ہو گئے تھے، اس طرح آپریشن کا پورا وقت گزر گیا، اور وہ اطمینان کے ساتھ اپنے ذکر میں محو رہے۔ احقر نے حضرت مفتی محمود صاحبؒ سے عرض کیا کہ "کیا آپ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا؟" ہنس کر فرمانے لگے: "نہیں بھائی! یہ تو بڑوں کی باتیں ہیں، ہمارا یہ مقام کہاں؟"

اسی زمانے کی ایک بات یاد آئی، حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کے درمیان جو سیاسی اختلاف رہا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، لیکن اسی ہسپتال میں ایک روز گفتگو کے دوران حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "مولانا احتشام الحق صاحب سے ہمیں سیاسی معاملات میں بہت اختلاف رہا ہے، لیکن ان کی اس بات کی ہمیشہ قدر دانی رہی ہے کہ انھوں نے کبھی کسی رعب یا لالچ میں آکر دینی مسائل کے بارے میں کوئی مداہنت نہیں کی اور کسی حکومت کے ساتھ ان کا خواہ کتنا اشتراک عمل رہا ہو، لیکن جب بھی کسی دینی مسئلے کا سوال آیا، انھوں نے کبھی مداہنت سے کام نہیں لیا، عائلی کمیشن میں وہ تن تنہا تھے، لیکن انھوں نے وہ اختلافی نوٹ لکھا جو مشہور و معروف ہے۔" اور پھر فرمایا کہ "الحمدللہ، علماء دیوبند کی یہ خصوصیت ہے کہ دینی مسائل کے معاملے میں وہ متحد ہوتے ہیں۔"

پچھلے دنوں جب زکوٰۃ و عشر آرڈیننس نافذ ہوا تو اس پر غور کرنے کیلئے ہماری "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کے کئی اجلاس ہوئے اور تجاویز پر ایک تجزیہ مرتب ہوا تو "البلاغ"

کے رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس موضوع پر ایک فتویٰ تحریر فرمایا تھا۔ ان دونوں تحریروں کے درمیان بعض مسائل میں اختلاف تھا، ہماری خواہش تھی کہ کسی وقت اس مسئلے پر زبانی گفتگو ہو جائے، شوال میں جب مفتی صاحبؒ کراچی تشریف لائے تو ایسی تفصیلی ملاقات کا موقع نہ مل سکا، مفتی صاحبؒ بیمار ہو گئے، اور برادر مکرم حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم اور احقر عیادت کے لئے حاضر ہوئے تو وہاں کسی مسئلے پر گفتگو کا موقع نہ تھا، بات عیادت ہی کی حد تک محدود رہی، اور ہم چلے آئے۔

اب ذیقعدہ کے آخر میں مفتی صاحبؒ سفر حج پر جانے کے لیے کراچی تشریف لائے تو شروع میں ہمیں تشریف آوری کا علم نہ ہوا، ایک رات حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے جناب محمد بنوری صاحب کا فون آیا، انھوں نے مفتی صاحبؒ کی تشریف آوری کی اطلاع دی اور ساتھ ہی حضرت مفتی صاحبؒ کا پیغام پہنچایا کہ انھوں نے ہم دونوں (احقر اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی) کو زکوٰۃ کے مسئلے پر گفتگو کے لیے بلایا ہے۔ اگلے دن بارہ بجے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں ملاقات طے ہو گئی، اور ہم دونوں تقریباً ساڑھے بارہ بجے بنوری ٹاؤن پہنچے تو مفتی صاحب مہمان خانے میں تشریف فرما تھے۔ اس وقت کے معلوم تھا کہ یہ مفتی صاحب کے ساتھ آخری ملاقات ہو گی، وہاں مولانا محمد طاسین صاحب، مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مولانا احمد الرحمان صاحب اور مولانا محمد بنوری پہلے سے موجود تھے۔

حسب معمول حضرت مفتی صاحب بڑی شفقت اور تپاک سے ملے، اٹھ کر معانقہ فرمایا، اور تقریباً بیس منٹ تک بڑے شگفتہ ماحول میں باتیں ہوتی رہیں۔ جناب محمد بنوری نے کہا کہ "یہ تقریباً نصف گھنٹہ تاخیر سے پہنچے ہیں، اس لیے ان پر جرمانہ ہونا چاہئے۔" مفتی صاحب نے فرمایا: "نہیں بھائی! پاکستان میں ایک گھنٹہ تک تاخیر معاف ہے، اور یہ لوگ تو یوں بھی شہر سے دور رہتے ہیں"۔ پھر فرمانے لگے کہ "ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ اگر کوئی شخص پابندیٔ وقت کا اہتمام کرے تو لوگ اسے طعنے دیتے ہیں کہ اس میں "انگریزیت" ہے، حالانکہ یہ تو اچھی صفت ہے، مگر ہم لوگوں نے اچھی باتیں انگریز کے کھاتے میں ڈال دی ہیں، اور پھر وہ اچھی باتیں واپس لینے کو تیار نہیں، اور بری باتیں ان سے لینے کو تیار ہیں۔"

احقر نے طبیعت کا حال پوچھا تو فرمایا کہ "الحمد للہ! اب طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہے، بس دوا اور پرہیز جزو زندگی بن چکے ہیں، اس کی پابندی کروں تو طبیعت ٹھیک رہتی ہے، البتہ دوا یا پرہیز کا ناغہ ہو جائے تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

پھر سفر حج کا ذکر آیا تو فرمایا کہ "ان شاء اللہ کل حج کے لیے روانگی ہے، میں نے اس مرتبہ افراد کا احرام باندھنے کا ارادہ کیا ہے، کیوں کہ ہجوم کے زمانے میں ضعف کی بنا پر طواف میرے لیے مشکل ہوتا ہے، افراد میں پہنچنے کے بعد صرف ایک طواف کرنا ہوگا، اور طواف وداع کے بارے میں بھی میرا ارادہ یہ ہے کہ منی سے واپس آ کر سیدھا مدینہ طیبہ چلا جاؤں گا، اور وہاں سے واپس آ کر طواف وداع کروں گا، کیوں کہ اس وقت ہجوم کم ہو چکا ہوگا۔"

اتنے میں چائے آ گئی، احقر اور بھائی صاحب چونکہ دن میں ایک سے زیادہ چائے نہیں پیتے اس لیے ہم نے چائے سے عذر کیا تو مفتی صاحبؒ نے فرمایا : "میں اگرچہ چائے پیتا ہوں، لیکن جب کسی کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چائے نہیں پیتا تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔" احقر کے ہاتھ میں پان کا بٹوہ تھا، میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا کہ "حضرت! یہی معاملہ ہمارا اس چیز کے ساتھ ہے۔" فرمانے لگے : "ہاں بھائی، یہ تو چائے سے بھی بدتر چیز ہے۔"

غرض تقریباً بیس منٹ تک بڑی شگفتہ باتیں ہوتی رہیں، مفتی صاحبؒ بڑے ہشاش بشاش تھے، چہرے پر نشاط کے آثار تھے اور سنجیدگی کے ساتھ خوش طبعی، جو مفتی صاحب کی عام عادت تھی، بات بات میں جھلک رہی تھی، بلکہ بعض باتیں نہایت بے تکلفی کے ماحول میں ایسی ہوئیں کہ بار بار محفل کشت زعفران بنتی رہی، اس وقت کسی کے حاشیۂ وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ مفتی صاحبؒ اب صرف چند منٹ کے مہمان ہیں، اور اس کے بعد یہ محفل ہمیشہ کے لیے ویران ہو جائے گی۔

ایک بجنے میں دس منٹ تھے جب حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ "اچھا، اب نماز ظہر سے پہلے اصل مسئلے سے متعلق کچھ بات کر لی جائے؟" ہم نے تائید کی اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا "سب سے پہلے تو مجھے عرض کرنا ہے کہ زکوٰۃ کا مسئلہ چونکہ خالص دینی مسئلہ ہے، اس لیے ہمیں اس پر خالص فقہی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنی چاہیے، اور

کسی بھی دوسرے نقطۂ نظر یا کسی قسم کی نفسانیت کو درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔ الحمد للہ، مجھے اس پر اطمینان ہے کہ اگر آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی تو اسے قبول کرنے میں مجھے کوئی عذر نہیں ہو گا، اور یہی امید بحمد اللہ آپ سے بھی ہے کہ اگر میری بات آپ کی سمجھ میں آگئی تو آپ اپنی بات پر اصرار نہیں کریں گے، اور اسی امید پر میں نے زبانی گفتگو مناسب سمجھی ہے، تاکہ اگر فتووں میں اتفاق کی صورت پیدا ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔" ہم نے عرض کیا کہ "ہم خود اس کے خواہش مند ہیں کہ اس مسئلے پر خالص فقہی انداز سے گفتگو کر کے کسی متفقہ نتیجے پر پہنچ جائیں۔" فرمانے لگے کہ "ہاں! پچھلی مرتبہ جب آپ ہسپتال میں آئے تو بیماری اور ہسپتال کے ماحول کی وجہ سے کسی تفصیلی بات کا موقع نہ تھا، اس لیے وہاں یہ بات نہ ہو سکی، بہرحال اب بحمد اللہ اس کا موقع مل گیا ہے، اور اب یہ بات ہو جانی چاہیے۔"

اس کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ "میں نے آپ کی (یعنی مجلس تحقیق مسائل حاضرہ) کی تحریر کو غور سے پڑھا ہے، اور اس پر مجھے صرف تین اشکالات ہیں، اگر وہ تین اشکالات حل ہو جائیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں یہ تینوں اشکالات آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر مفتی صاحبؒ نے پہلے اشکال کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ حضرات نے بینک اکاؤنٹ کو اموال ظاہرہ میں شمار کیا ہے، لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ بینک میں جو رقم رکھوائی جاتی ہے وہ فقہی اعتبار سے امانت نہیں، بلکہ قرض ہوتی ہے، اور جب کسی کو کوئی رقم بطور قرض دے دی جائے تو وہ قرض دینے والے کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت ہو جاتی ہے، لہٰذا بینک کی رقوم اکاؤنٹ ہولڈر کی ملکیت نہیں ہوتیں، اسی لیے ان پر زکوٰۃ اس وقت تک واجب نہیں جب تک اکاؤنٹ ہولڈر اس رقم کو واپس نہ لے لے، لہٰذا بینک کو جو مقروض ہے یہ حق حاصل ہے کہ وہ از خود اکاؤنٹ ہولڈر کی طرف سے زکوٰۃ وضع کر لے، اور نہ مصدق کو یہ حق ہے کہ وہ بینک کی رقم سے جو بینک کی ملکیت ہو چکی ہے، اکاؤنٹ ہولڈر کی زکوٰۃ وصول کرے۔"[1]

---

[1] یہ اشکال بعض دوسرے حضرات نے بھی پیش کیا ہے، اور اس کا جو جواب احقر کے ذہن میں تھا مقام حسرت ہے کہ وہ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں پیش کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا، اس کی تائید یا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت مفتی صاحبؒ نے اس نکتے کی وضاحت بڑی تفصیل کے ساتھ مدلل انداز میں فرمائی' اس پوری گفتگو میں کسی ادنیٰ کمزوری' غائب دماغی یا کسی جسمانی یا ذہنی تکلیف کا مطلق احساس نہیں ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ اپنے پہلے نکتے سے فارغ ہو چکے تھے' اور دوسرے نکتے کو بیان کرنے سے پہلے بات کو سمیٹ رہے تھے کہ احقر نے ـــــ جو ان کے بالکل سامنے بیٹھا تھا ـــــ چہرے پر اچانک معمولی سے کمزوری اور سفیدی محسوس کی' اور چند لمحوں کے لیے ہونٹوں میں ہلکی سی لرزش بھی پیدا ہوئی۔ اسی حالت میں اچانک حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنا بایاں ہاتھ پیشانی اور سر پر رکھا اور کچھ کہے بغیر اپنی بائیں کروٹ پر گر گئے۔

یہ سب کچھ چند ثانیوں میں اس قدر آناً فاناً ہو گیا کہ ہم سب حیران و پریشان رہ گئے' کسی نے منہ میں پانی ڈالا' کسی نے قلب کی مالش شروع کر دی' کوئی ڈاکٹر کی تلاش میں دوڑا' حواس مجتمع کرنے پر اندازہ یہ ہوا کہ دل کا دورہ ہوا ہے' اس کے باوجود کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب صرف چند لمحوں کے سانس باقی رہ گئے ہیں۔ دل کی تکلیف کے وقت جو فوری دوا دی جاتی ہے' وہ بھی زبان کے نیچے رکھ دی گئی' لیکن دیکھتے ہی دیکھتے نبض اور سانس دونوں غائب تھے۔ امراض قلب کے ہسپتال میں فون کیا گیا تو ڈاکٹر صاحبان نے صورت حال سننے کے بعد فوراً ہسپتال لانے کا مشورہ دیا' ہم انھیں لے کر ہسپتال پہنچے' وہاں ڈاکٹر صاحبان ہسپتال سے باہر پہلے سے منتظر تھے' اور انھوں نے گاڑی ہی میں اپنی کارروائی شروع کر دی' بعد میں ایمرجنسی وارڈ میں لے جا کر تقریباً نصف گھنٹے تک ڈاکٹر صاحبان کوشش کرتے رہے۔ یہ نصف گھنٹہ انتہائی امید و بیم کی حالت میں گزرا' لیکن پیغام اجل آ پہنچا تھا' تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر سید اسلم صاحب نے باہر نکل کر افسردہ لہجے میں بتایا کہ کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی' حضرت مفتی صاحبؒ کی روح ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی پرواز کر چکی تھی۔ انا للہ وانا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

تذکرہ ہو جاتی' اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر چیز کا وقت مقرر ہے' حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اس گفتگو کی تکمیل مقدر نہیں تھی' ماشاء اللہ کان وما لم یشا لم یکن۔

بہرحال ارادہ یہ ہے کہ انشاء اللہ مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کا ازسرنو اجلاس منعقد کر کے اس میں اس قسم کے تمام مسائل کو دوبارہ زیر غور لایا جائے گا' اور حضرت مفتی صاحبؒ اس مجلس سے پہلے بھی چونکہ مختلف حضرات کے سامنے یہ تین اشکال بیان فرما چکے تھے' اس لیے ان حضرات سے معلوم کر کے خاص طور پر ان تین اشکالات کو مجلس میں پیش کر دیا جائے گا' اس کے بعد جو فیصلہ ہوگا انشاء اللہ اسے شائع کیا جائے گا۔ (م ت ع)

الیہ راجعون۔

یہ تمام واقعات ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مدت میں اس طرح پیش آ گئے کہ سب کچھ ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے پاس بلانے کے لیے ایسے وقت کا انتخاب فرمایا کہ وہ سفر حج کے لیے پا بہ رکاب تھے، بلکہ ان کا سفر تو شروع ہو چکا تھا، ایک دینی مدرسے کی مبارک فضا تھی، علماء و طلباء کا مجمع تھا، آخر دم تک ایک خالص دینی اور فقہی مسئلے کی تحقیق میں مشغول رہے، اور یہی گفتگو ان کی آخری گفتگو ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا حسین اور مبارک خاتمہ انہیں نصیب فرمایا جو ہر مسلمان کے لیے قابل صد رشک ہے۔ دینِ متین کا یہ خادم و مجاہد جو قال اللّٰہ وقال الرسول کے ماحول میں پروان چڑھا قال اللّٰہ وقال الرسول ہی کی بات کرتا کرتا دنیا سے رخصت ہو گیا، اللّٰھم اکرم نزلہ و وسع مدخلہ وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ و نقّہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس و باعد بینہ و بین خطایاہ کما باعدت بین المشرق و المغرب، آمین!

حضرت مفتی محمود صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے جن صلاحیتوں، اور جن صفات و کمالات سے نوازا تھا ان کا احاطہ ایک مختصر مضمون میں مشکل ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سے خدمت دین کے بے شمار کام لیے، خاص طور سے ان کی زندگی کے آخری بیس سالوں میں ان کی جد و جہد نے ملک کی دینی و سیاسی فضا پر انمٹ اثرات مرتب کیے لیکن ان کی زندگی کے تین پہلو ایسے ہیں جن سے یہ ناکارہ خاص طور پر متاثر ہوا ہے، اور جو ہم سب کے لیے نہایت سبق آموز ہیں۔

سب سے پہلی بات تو دینی علوم میں ان کی فاضلانہ بصیرت و مہارت ہے۔ عام طور سے عملی سیاست میں آنے کے بعد علمی استحضار باقی نہیں رہتا، ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحبؒ نے راولپنڈی میں خود مجھ سے فرمایا تھا کہ "سیاست ایسی بلا ہے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد کوئی بھی صاحب فن اپنے فن کا آدمی نہیں رہتا۔ ڈاکٹر سیاست میں آ جائے تو ڈاکٹر نہیں رہتا، انجینئر سیاست میں آ جائے تو انجینئر نہیں رہتا، فوجی سیاست میں آ جائے تو فوجی نہیں رہتا، اور مولوی سیاست میں آ جائے تو مولوی نہیں رہتا۔ اس لیے مجھے اکثر یہ خطرہ لگا رہتا

ہے کہ یہ سیاست مجھ سے یہ طالب علمانہ ذوق نہ چھڑا دے۔" لیکن یہ حضرت مفتی صاحبؒ کی انتہائی نمایاں خصوصیت تھی کہ سیاسیات میں اس قدر انہماک کے باوجود ان کا علمی استحضار اور علمی ذوق پوری طرح برقرار رہا۔ جب بھی کسی علمی مسئلے کی بات آتی تو معلوم ہوتا کہ اس کے تمام مالہ وماعلیہ پوری طرح حضرت مفتی صاحبؒ کی نگاہ میں ہیں، اور جب اس موضوع پر بات کرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی علمی کتاب کا درس ہو رہا ہے، خاص طور سے احادیث انہیں صرف مفہوماً نہیں لفظاً ومتناً بہت یاد تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے لیے دارالعلوم تشریف لائے تو اپنی تقریر کی تمہید ہی میں مشہور عربی مقولے الامر فوق الادب پر ایسی فاضلانہ تقریر فرمائی اور اس موضوع پر احادیث وآثار سے ایسے متعارض واقعات بیان فرمائے جن کی طرف پہلے کبھی نظر نہیں گئی تھی۔ عربی زبان وادب سے بھی مفتی صاحب کو دلچسپی اور مناسبت تھی، اور عربی میں گفتگو بلا تکلف روانی کے ساتھ فرماتے تھے۔

سیاسی مصروفیات کے باوجود اس علمی ذوق اور علمی پختگی ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ جس ماحول میں گئے، وہاں اپنی ذہانت، طباعی اور علمی وسعت کا لوہا منوا لیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ مفتی صاحبؒ ایک طویل عرصے تک خالص علمی مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہے، پہلے اپنی علمی استعداد کو پختہ کیا، اور معلومات کو وسعت دی، اس کے بعد عملی سیاست میں داخل ہوئے۔ جو لوگ علم میں پختگی حاصل کیے بغیر سیاست ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں، حضرت مفتی صاحبؒ ان سے یکسر مختلف تھے، اور ان کا طرز عمل اس معاملے میں مشعل راہ ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی دوسری اہم خصوصیت جس نے ان کی شخصیت کو نہایت محبوب بنا دیا تھا، ان کی سادہ زندگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اونچے سے اونچے دنیوی مناصب تک پہنچایا، وہ قومی اور صوبائی اسمبلی کے موثر ترین رکن رہے، پھر صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ رہے، حزب اختلاف کے قائد رہے، ۷۷ء کے انتخابات کے موقع پر ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے قومی اتحاد کے سربراہ رہے، لیکن ان کا جو طرز زندگی اور انداز بود وباش قاسم العلوم کے استاذ کی حیثیت میں تھا، وہی طرز وزیر اعلیٰ کی حیثیت میں بھی باقی رہا، اور ان کے انداز وادا میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔

میں جب اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن تھا تو کونسل کا ایک اجلاس پشاور میں منعقد

ہوا۔ اس موقع پر میرا قیام فرنٹیئر ہاؤس میں تھا، جو عبدالقیوم خان صاحب سے لیکر نصر اللہ خٹک صاحب تک بہت سے وزراء اعلیٰ کی قیام گاہ رہ چکا ہے۔ اتفاق سے میرے کمرے پر جو خادم مقرر تھا وہ بہت سے وزراء اعلیٰ کے زمانے دیکھ چکا تھا۔ اور کبھی کبھی ان سب پر تبصرے بھی کرتا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھ سے کہا کہ وزیر تو بہت سے دیکھے، لیکن ایسا وزیر اعلیٰ جو ہم غریبوں کو بھی عزت کا مقام دیتا ہو، مفتی محمود سے زیادہ کوئی نہیں دیکھا۔ وہ غریب لوگ جو اس عمارت میں پر بھی نہیں مار سکتے تھے، انہی کے زمانے میں یہاں اکٹھے رہا کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی تیسری عظیم خصوصیت ان کی سنجیدگی، متانت اور تحمل کی صفت تھی۔ مختلف سرد و گرم مواقع پر انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا، لیکن مجھے یاد نہیں ہے کہ کبھی انہیں مشتعل، چراغ پا یا جذباتی ہوتے دیکھا ہو۔ مخالف سے مخالف بات کو بھی وہ پورے صبر و تحمل سے سنتے، اور پوری متانت سے اس کا جواب دیتے تھے۔ متعدد مواقع پر ان سے ان کے موقف کے خلاف بات کرنے کی نوبت بھی آئی، لیکن ہر موقع پر انہیں انتہائی متحمل، بردبار اور متین پایا۔ یہ صفت آج کی دنیا میں بہت کمیاب ہے۔

اور مفتی صاحبؒ کی چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے سیاسی نقطہ نظر اور طرز عمل سے خواہ کسی کو کتنا اختلاف رہا ہو، لیکن یہ بات ناقابل انکار ہے کہ جس موقف کو انہوں نے درست اور برحق سمجھا اس پر انتہائی سخت حالات میں بھی وہ مضبوطی کے ساتھ جمے، اور کسی قسم کا خوف یا عہدہ و منصب کا لالچ انہیں اپنے موقف سے متزلزل نہ کر سکا۔ وہ اگر چاہتے تو گزشتہ دور حکومت میں بڑے سے بڑا منصب حاصل کر سکتے تھے، لیکن جس موقف کو انہوں نے درست سمجھا، اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔

موجودہ دور میں جب کوئی بڑا آدمی دنیا سے جاتا ہے تو اپنی بہت سی خصوصیات بھی اپنے ساتھ لے جاتا ہے، اور ان خصوصیات کا کوئی دوسرا حامل پھر میسر نہیں آتا۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی اپنی بہت سی خصوصیات اپنے ساتھ لے گئے، اور اپنے پیچھے ایک مہیب خلا چھوڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، انہیں جنت میں مقامات عالیہ سے نوازے، ان کے نسبی اور روحانی پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے، اور ان کی حسنات میں ان کی تقلید اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین ثم آمین!

البلاغ جلد ۱۵ شمارہ ۱

مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد پچھلے مہینے حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ بھی مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ ملک کی ان ممتاز ہستیوں میں سے تھے جن کی زندگی ایک مستقل تاریخ ہے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کے سرچشمہ فیض سے اس وقت استفادہ کیا جب وہاں امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر مسند آرائے تدریس تھے۔ آپ فضلاء دیوبند کی اس قرن سے تعلق رکھتے تھے جس نے احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مد ظلہم، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہ جیسے یگانۂ روزگار اہل علم پیدا کئے۔ فراغت کے بعد آپ نے تدریس و تصنیف کے بجائے اپنے لئے وعظ و خطابت اور سیاست کا میدان منتخب فرمایا اور عمر بھر اسی میدان میں سرگرم رہے۔ آزادیٔ ہند کی تحریک میں گرم جوشی سے عملی حصہ لیا اور باطل فرقوں کے خلاف شمشیر برہنہ بن کر کام کیا۔ مرزائیت کے غلیظ چہرے سے نقاب اٹھانے کے لئے برصغیر کے جن اہل علم اور اہل خطابت نے کارہائے نمایاں انجام دیئے، ان میں حضرت مولانا غوث صاحب ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔

مولانا اپنی عام زندگی میں درویشانہ شان و مزاج کے حامل تھے، وہ قومی اور صوبائی اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ مختلف اوقات میں حزب اختلاف اور حزب اقتدار دونوں کیمپوں کی رکنیت کا ذائقہ چکھا۔ بڑے بڑے امراء و حکام سے قریبی تعلقات بھی رہے، لیکن ان کی زندگی میں فرق نہیں آیا۔ انہیں جب بھی دیکھا، اسی درویشانہ رنگ میں دیکھا، بڑھاپے میں بھی ان کی ہمت اور جدوجہد قابل رشک تھی۔ جس زمانے میں وہ قومی اسمبلی کے رکن تھے، اور عمر بھی اسی سال کے لگ بھگ ہوگی، اس دور میں بھی احقر نے انہیں نہ صرف بسوں میں سفر کرتے بلکہ بسوں کو پکڑنے کے لئے جوانوں سے زیادہ پھرتی اور مستعدی کے

ساتھ لپکتے ہوئے دیکھا۔

جس بات کو مولاناؒ حق سمجھتے پوری قوت و شدت کے ساتھ برملا کہتے تھے' اور جس بات کو باطل سمجھتے تھے اس کے ساتھ رعایت کا ان کے یہاں کوئی خانہ نہیں تھا۔ دونوں طرف مبالغہ تو ہو سکتا تھا لیکن لچک کا سوال نہ تھا۔

۱۳۸۷ھ میں ایک مرتبہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں مولاناؒ کے ساتھ ایک طویل نشست میں شرکت کا موقع ملا۔ مولاناؒ نے بہت جلد اپنے آپ سے بے تکلف کرلیا' یہاں تک کہ احقر نے طالب علمانہ انداز میں عرض کیا کہ :

"حضرت آپ اپنے مخالفین کی تردید جس لب و لہجے اور جس تلخی کے ساتھ فرماتے ہیں' خیال یہ ہوتا ہے کہ اس سے بعض اوقات فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہوتا ہے' خاص طور سے تعلیم یافتہ لوگ اس لب و لہجے کو سننے کے بعد قریب آنے کے بجائے دور چلے جاتے ہیں۔"

احقر نے یہ بات ڈرتے ڈرتے عرض کی تھی' اس لئے کہ مجھ جیسے طفل مکتب کو مولاناؒ جیسی تجربہ کار شخصیت سے اس قسم کی بات کہنے کا حق ہی کیا پہنچتا تھا؟ لیکن مولاناؒ نے یہ بات سن کر کسی ادنیٰ تکدر کے بغیر بڑی شفقت اور بشاشت کے ساتھ جواب دیا' فرمانے لگے :

"بھائی! بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں' لیکن میں تو دیہاتی آدمی ہوں' اور دیہاتیوں کے لئے "نذیر عریان" کی حیثیت رکھتا ہوں' دیہاتی لوگ آپ کے علمی دلائل اور فلسفوں کو نہیں سمجھتے' ان کے سامنے دو اور دو چار کر کے بات کرنی پڑتی ہے۔ آپ تعلیم یافتہ لوگوں کو شوق سے شائستہ انداز میں مخاطب کریں لیکن مجھ دیہاتی کو دیہاتیوں کے لئے چھوڑ دیں' اگر میں "نذیر عریان" بن کر نہ ڈراؤں تو اس گلّے کو بھیڑیے کھا جائیں۔"

مولاناؒ کی زندگی سیاسی اور مناظرانہ نبرد آزمائی کی زندگی تھی اور اس سلسلے میں ان کے طرز فکر و عمل سے اختلاف ہو سکتا ہے' لیکن ان کی درویشانہ زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ ان کے کسی اقدام کے پیچھے ذاتی مفاد کا کوئی جذبہ کار فرما نہیں تھا۔ عمر کے آخری ایام میں انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ سابقہ حکومت کے ساتھ تعاون کے معاملے میں ان کے خلاف جو طرح طرح کی بدگمانیاں مشہور ہوگئی تھیں' سنا ہے کہ ان کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ طعن و تشنیع کے یہ تیر میرے نفس کا علاج کر رہے ہیں کہ وہ کہیں خود پسندی

www.alhaq.org

میں ہلکان ہو جائے۔

بہرکیف! ان اکابر کی وفات ملک کی ملی، سیاسی اور دینی تاریخ کا المناک واقعہ ہے۔ ہم دل سے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، ان کی زلات سے درگزر فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین

اہلحدیث جلد ۱۵ شمارہ ۵

حضرت مولانا مفتی محی الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ

پچھلے مہینے ایک اور اندوہناک سانحہ حضرت مولانا مفتی محی الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ناگہانی وفات کا پیش آیا، جس نے کچھ دیر کے لئے دل ودماغ کو ماؤف کر کے رکھ دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا مفتی محی الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت بنگلہ دیش کے ان اکابر علماء میں سے تھے جن کے ذریعے وہاں علم ودین کے چراغ روشن ہیں۔ وہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کے جاں نثار شاگرد بھی تھے اور آپ کے مجاز بیعت بھی۔ مدتوں سے ڈھاکہ کے مدرسہ اشرف العلوم میں حدیث کی تدریس اور فتویٰ کی خدمت انجام دے رہے تھے، اور اس عرصے میں انہوں نے ہزارہا تشنگان علم کو اپنے فیوض سے سیراب کیا۔ آپ کے شاگرد بھی اس وقت اونچے درجے کے شیخ الحدیث سمجھے جاتے ہیں لیکن تواضع اور فنائیت کا عالم یہ تھا کہ اپنے چھوٹوں کو بھی اپنے سے افضل وبرتر سمجھتے تھے، اور انداز وادا میں خوردبین لگا کر بھی شان وشوکت کا کوئی شائبہ نظر نہیں آسکتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ طبعاً علمی ماحول کے بزرگ تھے، اور مزاج سیاسی نہیں تھا۔ لیکن جب بھی دین کی خاطر ضرورت پیش آئی، وہ میدان عمل میں نکلے اور کسی قربانی سے دریغ نہیں فرمایا۔ قیام پاکستان کے موقع پر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا اطہر علی صاحب سلہٹیؒ اور حضرت والد صاحبؒ وغیرہ کی جدوجہد میں مفتی صاحبؒ گمنام رضاکاروں کی حیثیت میں شامل رہے۔ سلہٹ کے ریفرنڈم میں بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں، پھر پاکستان بننے کے بعد اسلامی دستور کی جدوجہد میں بھی بنگال کے علاقے میں بڑی سرگرمی اور جاں فشانی کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔ جمعیت علماء اسلام اور نظام اسلام پارٹی جو بنگال میں حضرت مولانا اطہر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زیر قیادت کام کر رہی تھی، اس میں حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمات کا نمایاں حصہ رہا، اور سب سے آخر میں جب ۱۹۷۰ء کے انتخابات کا مرحلہ آیا تو انتہائی نامساعد

حالات میں مفتی صاحبؒ نے آخر وقت تک اتحادِ ملت اور پاکستان کی سالمیت کے لئے کام کیا، بلکہ جب ۱۹۷۱ء کی جنگ چھڑی تو مولانا اسی مقصد کے لئے کراچی تشریف لائے ہوئے تھے اور جنگ چھڑ جانے کی اطلاع پا کر عجلت میں یہاں سے ڈھاکہ تشریف لے گئے۔ پھر جو حالات وہاں پیش آئے ان کے تذکرے کے لئے پتھر کا کلیجہ درکار ہے۔ اسلام اور پاکستان سے محبت کی پاداش میں وہاں کے علماء کرام پر جو ستم توڑے گئے مفتی صاحبؒ بھی ان کا نشانہ بنے، اور اس سلسلے میں بہت سی قربانیاں دیں۔ ایک مدت تک یہ معلوم نہ ہو سکا مفتی صاحبؒ کہاں اور کس حال میں ہیں؟ رفتہ رفتہ حالات معمول پر آئے تو انہوں نے پھر سے خط و کتابت شروع کی، معلوم ہوا کہ بدستور اشرف العلوم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت و محبت ہی نہیں، والہانہ عشق تھا۔ والد صاحبؒ جب بھی ڈھاکہ تشریف لے جاتے انہی کے مدرسے میں قیام فرماتے اور جب تک بنگال میں قیام رہتا، مفتی صاحبؒ سائے کی طرح والد صاحبؒ کے ساتھ رہتے تھے، یہاں تک کہ ڈھاکہ میں انہیں حضرت والد صاحب قدس سرہ کا ترجمان اور نمائندہ سمجھا جاتا تھا اور وہ واقعۃً اس کے اہل بھی تھے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی وفات کا جس قدر صدمہ ہم لوگوں کو ہوا یقین ہے کہ مفتی محی الدین صاحبؒ کو اس سے کم صدمہ نہ ہوا ہو گا، ان کے اس زمانے کے خطوط جس کرب کے آئینہ دار ہیں اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد نہ ان کا پاکستان آنا ہوا اور نہ ہم نو سال تک بنگلہ دیش جا سکے، اس لئے اس طویل عرصے کے بعد ان سے پہلی ملاقات پچھلے سال دارالعلوم دیوبند کے "اجلاس صد سالہ" کے موقع پر ہوئی۔ میں اپنے بعض رفقاء کے ہمراہ عصر کے بعد قبرستان قاسمی کی طرف جا رہا تھا، اچانک میری نگاہ مفتی صاحب پر پڑی، میں ان کی طرف لپکا تو انہوں نے بھی آتے ہوئے دیکھ لیا، بس پھر کیا تھا؟ مفتی صاحبؒ عجیب والہانہ انداز میں لپٹ گئے، روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں، اور کچھ دیر تک ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ پھر دیوبند کے قیام میں شدید ہجوم اور مصروفیات کے باوجود بارہا گھنٹوں گھنٹوں ان سے باتیں ہوئیں۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے والہانہ عشق کا عالم ناقابل بیان تھا۔

اسی زمانے میں ایک روز میں دیوبند میں اپنے ماموں مولانا انوار کریم صاحب مدظلہم کے یہاں مدعو تھا، عشاء کے بعد مفتی صاحبؒ نہ جانے کس طرح سراغ لگاتے لگاتے وہاں پہنچ گئے، اندر بلا کے بٹھایا تو بیٹھے بیٹھے دیر تک روتے رہے۔ احقر نے سبب معلوم کرنے کی کوشش کی، مگر گریہ کی شدت سے آواز نہ نکلتی تھی، بالآخر میرے اصرار پر رندھی ہوئی آواز میں فرمانے لگے :

"میں ایک درخواست کرنے آیا ہوں خدا کے لئے اسے رد نہ کرنا۔"

میں نے عرض کیا کہ "حضرت! آپ کا ارشاد میرے لئے حکم کی حیثیت رکھتا ہے، ضرور ارشاد فرمائیں۔" ذرا طبیعت کو سکون ہوا تو فرمانے لگے :

"آج کے اجلاس میں مجھے دارالعلوم دیوبند کی طرف سے دستار فضیلت ملی ہے، اس وقت سے مجھ پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ (یعنی احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ) کی یاد میں ناقابل برداشت اضطراب کی کیفیت طاری ہے، جو دستار میرے پاس استاذؒ کے واسطے سے نہ آئے اس سے اضطراب نہ ہو تو کیا ہو۔ حضرتؒ اپنے دست مبارک سے میری دستار بندی فرماتے تو سکون ہوتا۔"

یہ کہہ کر پھر رونے لگے، اور آخر میں وہ بات ارشاد فرمائی جسے سن کر میں دم بخود رہ گیا۔ فرمایا کہ :

"اگر تم مجھے اس اضطراب سے نجات دلانا چاہتے ہو تو خدا کے لئے یہ دستار اپنے ہاتھ سے میرے سر پر باندھ دو، میں اپنے دل کو تسلی دے لوں گا کہ ابنیت کے رشتے سے حضرتؒ ہی میری دستار بندی فرما رہے ہیں۔"

اس وقت احقر عجیب کشمکش میں پڑ گیا، بہتیرا حضرت مفتی صاحبؒ سے عرض کیا کہ آپ میرے استاذ بلکہ استاذ الاستاذ کے درجے میں ہیں، میں یہ جسارت کیسے کروں؟ حضرت مفتی صاحبؒ کی حالت اور ان کا اصرار دیکھ کر چار و ناچار ان کے حکم کی تعمیل کی، تب انہیں سکون آیا۔

دیوبند کی اس ملاقات کے بعد جلد ہی احقر کو بنگلہ دیش کا سفر پیش آیا۔ ڈھاکہ ایئر پورٹ پر اترتے وقت نگاہیں ہمیشہ مفتی صاحبؒ کو تلاش کرتی تھیں، چنانچہ وہ اپنے رفقاء کے ہمراہ ایئرپورٹ پر سب سے پہلے نظر آتے، اور اس وقت سے لے کر ایک ہفتے بعد واپس

ایئرپورٹ پہنچانے تک ایک لمحے کے لئے بھی اپنے گھر تشریف نہیں لے گئے۔ اب سوچتا ہوں کہ کبھی ڈھاکہ جانا ہوا تو اب وہ شگفتہ مقدس چہرہ کہاں فردوس نظر ہو سکے گا؟

مفتی صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ سالہا سال سے تدریس و افتاء کی مسند پر ہونے کے باوجود ان میں کبھی مخدومیت کا کوئی احساس پیدا نہیں ہوا۔ طالب علمی کے دور میں تو انہوں نے اپنے اساتذہ سے ربط ضبط رکھا' اور اسی زمانے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھانہ بھون بھی آمد و رفت رہی۔ حضرتؒ کی وفات کے بعد حضرت والد صاحب قدس سرہ سے والہانہ تعلق قائم رکھا' لیکن چونکہ حضرت والد صاحبؒ دور تھے' اس لئے اپنے قریب ڈھاکہ میں حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جو (پیرجی حضور کے لقب سے معروف تھے) اپنا مقتدا بنائے رکھا' اور اپنے ہر معاملے میں ان کے مشورے سے کام کرتے رہے۔ سیاسی یا اجتماعی معاملات میں حضرت مولانا اطہر علی صاحب قدس سرہ اور حضرت مولانا شمس الحق صاحب فریدپوری قدس سرہ کے ساتھ وابستہ رہے اور پیرجی حضورؒ کی وفات کے بعد اپنے عام معاملات میں بھی حضرت مولانا اطہر علی صاحبؒ سے رجوع کرتے رہے' اور ان کی بھی وفات ہو گئی تو اب مدت سے حضرت مولانا حافظ محمد اللہ صاحب مدظلہم سے (جو حافظ جی حضور کے نام سے معروف ہیں اور حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں سے ہیں) خدمت و ارادت کا تعلق قائم کئے رکھا اور ساٹھ سال کے قریب عمر ہونے کے باوجود حافظ جی حضور مدظلہم کی خدمت میں ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے حاضر ہوتے رہے۔

انہی بابرکت صحبتوں کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و فضل کے اعلیٰ مقام کے ساتھ اتباع سنت' اخلاص و للہیت' تواضع اور فنائیت کا وہ مقام بخشا تھا جو آج کل مشکل ہی سے کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ دین کے معاملے میں وہ کسی لچک کے روادار نہ تھے۔ پچھلے سال ڈھاکہ میں حکومت بنگلہ دیش کی اسلامک فاؤنڈیشن کی طرف سے معارف القرآن (بنگلہ ترجمہ) کی رونمائی کی تقریب تھی' احقر اس میں بطور مہمان خصوصی مدعو تھا' حضرت مفتی صاحبؒ اجتماع میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوئے۔ لیکن ایک مرحلے پر میں نے مڑ کر دیکھا تو مفتی صاحبؒ اپنی نشست سے غائب تھے' اور پھر آخر تک اجتماع میں نظر نہیں آئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اجتماع کے دوران انہوں نے کسی صاحب کے ہاتھ میں کیمرہ دیکھ لیا

تھا، اور یہ خطرہ ہوا کہ اجتماع کی تصویریں لی جائیں گی، اس لئے محفل سے اٹھ کر چلے گئے۔

ورع و تقویٰ اور تصلب دینی کے اس مقام کے باوجود ان کے مزاج میں خشکی دور دور نہیں تھی، وہ بڑے شگفتہ اور پرمذاق بزرگ تھے۔ جائز حدود میں تفریح اور خوش طبعی کے بھی شوقین تھے۔ اردو ان کی مادری زبان نہ تھی، لیکن ان کی تحریر بڑی برجستہ، شگفتہ اور پرلطف ہوتی تھی، اور ان کی صحبت میں اکتاہٹ کا گزر نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے دن اور کتنی راتیں ان کی پرلطف رفاقت میں بسر ہوئیں۔ میں عمر میں ان کی اولاد کے برابر تھا، اور علم میں ان کے شاگردوں سے بھی فروتر، لیکن انہوں نے مجھے ہمیشہ ایک بھائی کی شفقت اور ایک دوست کی بے تکلفی سے نوازا، اور اسی بے تکلفی کے پردے میں نہ جانے کتنے سبق دیئے، کتنی باتوں کی اصلاح کی اور باتوں ہی باتوں میں نہ جانے کیا کچھ سکھا دیا۔

پچھلے دنوں محترم بزرگ مولانا حکیم محمد اختر صاحب مد ظلہم بنگلہ دیش تشریف لے گئے۔ واپس تشریف لائے تو ان کی طرف سے ایک پیکٹ مجھے موصول ہوا جسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ حضرت مولانا مفتی محی الدین صاحبؒ کا بھیجا ہوا تحفہ ہے۔ اس پیکٹ میں دو کپڑے تھے، ایک برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مد ظلہم کے لئے، اور ایک احقر کے لئے، یہ پیکٹ مجھے رات کو ملا، اور ابھی میں اس کو کھول کر اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ صبح کو مفتی صاحبؒ کے داماد مولانا نورالدین صاحب کا خط ملا، جسے دیکھ کر کچھ دیر کے لئے سکتہ سا ہو گیا۔ خط میں لکھا تھا کہ مفتی صاحبؒ حضرت مولانا حافظ محمد اللہ صاحب مد ظلہم کے ہمراہ کسی جلسے میں نواکھالی تشریف لے گئے تھے، وہاں سے کار میں واپس آ رہے تھے کہ کسی نہر کے پل پر پہنچ کر گاڑی کا توازن بگڑا، اور وہ لڑھک کر نہر میں جا گری، بمشکل تمام مفتی صاحبؒ اور ان کے رفقاء کو نکالا گیا۔ مفتی صاحبؒ کے سر اور چہرے پر شدید چوٹیں آئی تھیں، سامنے کے دو دانت بھی ٹوٹ گئے، اور سر سے خون اتنا گیا کہ مفتی صاحبؒ بے ہوش ہو گئے۔ ہسپتال لے جایا گیا، وہاں ڈاکٹروں نے ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی، لیکن پیغام اجل آ چکا تھا، اسی بے ہوشی کے عالم میں (غالباً) ۲۲ ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۹۸۱ء کو شام سات بجے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بال بال مغفرت فرما کر انہیں جنت الفردوس میں مدارج عالیہ عطا فرمائیں، اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین!

البلاغ جلد ۱۵ شمارہ ۹

میری والدہ ماجدہؒ

۲۳ رجب کی شام کو احقر کی والدہ ماجدہ (رحمہا اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً) اس دارِ فانی سے رحلت فرما کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد احقر کی نجی زندگی کا سب سے بڑا سہارا اور سب سے بڑا سرمایہ والدہ ماجدہ کی ذات تھی' ایک طویل عرصے سے صاحبِ فراش اور دکھوں سے چور ہونے کے باوجود ان کی شفقتوں کی چھاؤں ہمارے ہر دکھ درد کا مداوا تھی' اور ان کی ایک نظرِ شفقت غمِ حیات کی ساری تلخیوں کو بھلا دیتی تھی۔ آج یہ سایہ سر سے اٹھ گیا' یہ دولت بے بہا واپس چلی گئی' اور سکون و عافیت کی دنیوی جنت کا یہ باب بند ہو گیا' انا للہ و انا الیہ راجعون۔

انسان ناشکرا ہے' اور اسے نعمت کی صحیح قدر اس کے زوال کے بعد ہوتی ہے۔ آج سوچتا ہوں کہ ماں زندگی کے ہر مرحلے پر کتنی عظیم نعمت ہے' اور جن لوگوں کو یہ نعمت میسر ہے وہ کتنے خوش نصیب ہیں' یہ وہ ذات ہے جس کے چہرے پر محبت کی ایک نگاہ حجِ بیت اللہ کا ثواب رکھتی ہے' جس کے قدموں کے نیچے سے جنت کو راستہ جاتا ہے اور جس کی خدمت کی بدولت حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے محروم ہونے کے باوجود صحابہ کرامؓ کے لئے بھی باعثِ رشک ثابت ہوئے۔ یہ دولت اللہ تعالیٰ اس دنیا میں تقریباً ہر انسان کو بخشتا ہے' کسی کو یہ دولت کم عرصے کے لئے ملتی ہے' اور کسی کو زیادہ عرصے کے لئے' لیکن جب تک یہ انسان کو حاصل رہتی ہے' وہ اس کی قدر نہیں پہچانتا' قدر' اگر کچھ ہوتی ہے تو اس وقت جب دیکھتے ہی دیکھتے یہ نعمت رخصت ہو جاتی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا کرم تھا کہ اس نے عمر کے اڑتیس سال والدہ کی آغوشِ شفقت و رحمت میں بسر کرنے کی سعادت بخشی' اور پیدائش سے لے کر آج تک بفضلہ تعالیٰ مسلسل انہیں کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنے کی توفیق عطا فرمائی' لیکن آج جب رحمتوں کا یہ پیکر عمر بھر کے لئے رخصت ہو چکا ہے' تو ان کے خالی کمرے میں اپنی غفلت شعاری اور ناقدری پر

حسرتوں کے اظہار کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اب خیال آتا ہے کہ ان تیس سال کی اس طویل مدت میں کتنا وقت ان کی خدمت میں صرف ہو سکا؟ اب ان کی شفقتوں کے مقابلے میں اپنی غفلتیں اور ان کے الطاف و عنایات کے مقابلے میں اپنی کوتاہیاں ایک ایک کر کے یاد آ رہی ہیں، اور دل چاہ رہا ہے کہ اس کائنات کے ہر مسلمان سے جسے ماں کی نعمت میسر ہے، یہ التجا کروں کہ خدا کے لئے اس نعمت کی قدر کرو اور اپنی آخرت کا سامان کر لو۔

مکن ث کروم اثا عذر بکجیہ

اس روئے زمین پر ماں کس کو عزیز نہیں ہوتی؟ اور کون ہے جسے اس نعمت کے زوال پر صدمہ نہ ہو؟ لیکن میری والدہ ماجدہ......... اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں میں ڈھانپ کر ابدی راحتیں نصیب فرمائے۔ اس قرن کی ماؤں میں سے تھیں جن کی آغوش بچے کے لئے صرف ایک گہوارہ نہیں، بلکہ تعلیم و تربیت کا موثر ترین مرکز بھی ہوتا تھا۔ جہاں کتابوں کے بجائے عمل کے ذریعے آداب زندگی سکھائے جاتے تھے۔ وہ کسی کالج، یونیورسٹی یا کسی مدرسے کی تعلیم یافتہ نہیں تھیں، بلکہ ان کی تعلیم گھریلو طور پر قرآن مجید اور اردو دینیات کی حد تک محدود تھی، لیکن سیرت و کردار کی جو عظمتیں، تعلیم و تربیت کا جو انداز اور ملک و ملت کے مسائل سے جو تعلق ان کو حاصل تھا، وہ آج کل اونچی اونچی ڈگریاں رکھنے والی خواتین میں بھی نایاب ہے۔ صبر و قناعت، محنت اور جفاکشی، ایثار و خودداری اور فراست اور بلند حوصلگی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ حضرت والد ماجد قدس سرہ کی پوری زندگی دین کے لئے جہد و عمل سے عبارت تھی، والدہ ماجدہ (رحمہا اللہ تعالیٰ) نے ہر طرح کے سرد و گرم حالات، تنگی و ترشی اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی گوناگوں مصروفیات میں جس طرح ان کا نہ صرف ساتھ دیا، بلکہ گھریلو مسائل سے ان کے ذہن کو بڑی حد تک فارغ رکھا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ انشاء اللہ اس کے ذریعے حضرت والد صاحب قدس سرہ کے تمام اعمال حسنہ اور صدقات جاریہ میں ان کا معتد بہ حصہ ضرور ہوگا۔

اولاد پر ماں باپ کے احسانات کو کون شمار کر سکتا ہے؟ ہم نے تو انہیں جب بھی دیکھا ہمارے ہی کسی فائدے کے کام میں مصروف دیکھا، لیکن بحیثیت ماں کے ان کے جو

بے شمار احسانات احقر پر ہیں، ان کے علاوہ وہ میری استاذ بھی تھیں، میرے بچپن میں جب حضرت والد صاحب قدس سرہ پاکستان تشریف لائے تو یہاں کوئی باقاعدہ دینی درسگاہ نہیں تھی، اس لئے احقر کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، اور اس دوران والدہ صاحبہ (قدس سرہا) سے احقر نے سیرت خاتم الانبیاء اور بہشتی زیور کا معتدبہ حصہ پڑھا اور یہی دو کتابیں میری اردو کی تعلیم کی کل کائنات تھی۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد احقر نے اردو زبان درساً بھی نہیں پڑھی، اس لحاظ سے بھی حرف شناسی کی جو کوئی مقدار احقر کے پاس ہے، وہ بنیادی طور پر والدہ صاحبہ ہی کے واسطے سے ہے، اور انہی کی رہین منت ہے۔

والدہ ماجدہ (رحمہا اللہ تعالیٰ) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے بیعت تھیں، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں عبادت کا ذوق عطا فرمایا تھا۔ جب تک بیماریوں نے انہیں بستر سے لگا نہیں دیا، اس وقت تک روزانہ تلاوت، مناجات مقبول، اذکار و تسبیحات اور نوافل کا معمول کبھی قضا نہیں ہوا۔ وہ صبح کو تڑکے سے لے کر نصف شب تک بغیر کسی وقفے کے گھر کے کاموں، اولاد کی دیکھ بھال، حضرت والد صاحبؒ کی ضروریات کی انجام دہی، ضعیف ساس کی خدمت اور دوسرے حقوق کی ادائیگی میں مشغول رہتی تھیں اور رات گئے تک فرصت و آرام کا ان کی زندگی میں کوئی خانہ نہیں تھا، لیکن ان تمام مصروفیات کے باوجود ان کے معمولات میں فرق نہیں آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو مرتبہ حج اور ایک مرتبہ عمرے کی سعادت سے نوازا، اور وہاں انہوں نے بڑی والہیت کا مظاہرہ فرمایا۔ آخر عمر میں بھی انہوں نے عمرے کے لئے کچھ رقم جمع کی ہوئی تھی کہ ذرا بیماریوں سے مہلت ملے تو ایک مرتبہ پھر اس سعادت سے سرفراز ہوں لیکن پھر موقع نہ مل سکا۔

عمر کے آخری تیرہ سال والدہ صاحبہؒ نے تقریباً مسلسل صاحب فراش ہو کر گزارے۔ ان ایام میں بھی ان کی عبادات کے معمولات جاری رہے، البتہ فالج کے حملے کے بعد جب بالکل معذور ہو گئیں تو شاید مکلف بھی نہ رہی ہوں، لیکن صوم و صلوٰۃ کا فریضہ ادا فرماتی رہیں۔ اور اب کچھ عرصے سے نماز کے وقت قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاتیں، جتنا کچھ پڑھ سکتیں، پڑھ لیتی تھیں۔ دوشنبہ ۲۰ رجب کو پیاس کی شدت کی وجہ سے پانی بہت پیا گیا، یہاں تک کہ پیٹ میں غیر معمولی نفخ ہو گیا، اسی اضطراب کی حالت میں عشاء کی اذان ہوئی تو انہوں نے لیٹنے سے پہلے حسب معمول قبلہ رو ہونا چاہا، اور قبلے کی طرف مڑتی ہوئی اچانک بستر پر گر گئیں۔ برادر

محترم جناب محمد رضی صاحب مدظلہم نے جن کے گھر میں وہ اس وقت مقیم تھیں، اٹھانا چاہا تو اندازہ یہ ہوا کہ فالج کا دوبارہ حملہ ہوا ہے، اسی دوران متعدد بار قے آئی، اور بولنے کی طاقت سلب ہوگئی۔ ابھی یہ عالم اضطراب جاری تھا کہ اچانک والدہ کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی، ایسا محسوس ہوا جیسے وہ تکیے کے نیچے کچھ تلاش کرنا چاہتی ہیں، تکیے کے نیچے ان کی تسبیح رکھی رہتی تھی، احقر نے تسبیح ان کے ہاتھ میں دی تو معلوم ہوا کہ اسی کی تلاش تھی۔ زبان میں تو حرکت نہ رہی تھی، لیکن ہاتھ سے انہوں نے جلدی جلدی تسبیح کو گھمایا، اور اسی طرح تسبیح پڑھتے پڑھتے بے ہوش ہوگئیں۔ عالم ہوش و حواس میں ان کے جسم کی آخری اختیاری حرکت نماز کے لئے اور ہاتھوں کی آخری حرکت تسبیح کے لئے تھی، اس کے بعد ڈاکٹروں کے مشورے سے انہیں ڈیفنس میڈیکل سینٹر میں داخل کیا گیا وہاں دو دن دو رات قیام رہا، اس دوران مختلف ڈاکٹر صاحبان نے اپنی امکانی حد تک تدبیر و علاج میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن والدہ صاحبہ طویل عرصے تک دنیا کی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد اس دنیا سے منہ موڑ چکی تھیں، پیر سے جمعرات تک بے ہوشی ہی کا عالم رہا، جمعرات کے دن چار بجے کے قریب اچانک ان کے سانس میں غیر معمولی اتار چڑھاؤ شروع ہوا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ غم دنیا سے رہائی پانے کی آخری جدوجہد ہے۔ ڈاکٹر اپنی تدبیریں کرتے رہے، احقر نے سرہانے کھڑے ہو کر سورہ یٰسین کی تلاوت کی اور سورت کی آخری آیات ابھی زبان پر تھیں کہ والدہ صاحبہ نے آخری ہچکی لی، اور سالہا سال کی تکلیفوں سے مرجھائے ہوئے چہرے پر اچانک ابدی سکون چھا گیا۔

والدہ صاحبہ اس غمکدے کی سرحد پار کر چکی تھیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللّٰھم اکرم نزلھا و وسع مدخلھا و ابدلھا خیرا من دارھا و اھلا خیرا من اھلھا و نقھا من الخطایا کما نقیت الثوب الابیض من الدنس و باعد بینھا و بین خطایاھا کما باعدت بین المشرق و المغرب۔

وفات تقریباً ساڑھے چار بجے ہوئی تھی، عصر کے قریب انہیں دارالعلوم کورنگی لایا گیا، مغرب کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔ عشاء کے بعد احقر کے شیخ و مربی عارف باللہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی مدظلہم صدر دارالعلوم کراچی نے نماز جنازہ پڑھائی اور رات بارہ بجے سے پہلے ہی پہلے والدہ صاحبہ احقر کے والد ماجد قدس سرہ کے مزار مبارک کے برابر اپنی آرامگاہ میں پہنچ گئیں۔ اگرچہ نماز جنازہ اور تدفین رات کے وقت ہوئی، اور

بہت سے متعلقین کو وفات کی اطلاع وقت کی کمی کے باعث نہ ہو سکی، لیکن اس کے باوجود اطرافِ شہر سے ایک بڑا مجمع نماز میں پہنچ گیا تھا اور علماء، صلحاء اور دیندار مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت نے نمازِ جنازہ میں شمولیت فرمائی۔

یہ ساری باتیں اس بات کی علامت ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے ان کو مقبولیت سے نوازا ہے، تیرہ سال کی صبر آزما تکالیف اور بیماریوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے پاک صاف کر کے انہیں اپنے پاس بلایا ہے، اور ان شاء اللہ اب ہر طرح کی تکلیفوں سے نجات پا کر وہ راحت و سکون اور عافیت و اطمینان کے ساتھ دارِ قرار میں پہنچی ہیں۔ انہیں "سکون" کی بڑی آرزو تھی، وہ کسی دوسرے کو بھی دعا دیتیں تو یہ کہتیں "اللہ تعالیٰ تمہیں سکون عطا فرمائے"۔ ان شاء اللہ اب انہیں سکون مل گیا ہے۔ یا اللہ! تو اپنی اس بندی پر فضل و رحمت کا خاص معاملہ فرما، اس دنیا میں اس نے لوگوں کی جو خدمت کی، جو صدمات اٹھائے اور جو تکلیفیں برداشت کیں، ان سب کا بہترین صلہ اپنی رحمتِ خاص سے عطا فرما، انہیں قبر سے لیکر جنت کے داخلے تک ہر مرحلے پر اپنی مغفرت سے نواز دیجئے، ان کو مقاماتِ قرب میں پیہم ترقی درجات عطا فرمائیے، ان پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائیے اور انہیں آخرت میں اپنے صالح بندوں کے ساتھ بمعیت ملحق فرما دیجئے۔ یا اللہ! ہم پر ان کے جو بے شمار احسانات ہیں، ان سب پر انہیں جزائے خیر عطا فرمائیے، اور ان کی خدمت میں ہم سے جو کوتاہیاں اور غلطیاں ہوئی ہیں ان کو اپنی رحمت سے معاف فرما دیجئے۔ یا اللہ! ان سے راضی ہو جائیے، اور ان کو اپنی رحمتوں سے خوش کر دیجئے۔ آمین، ثم آمین۔ اللّٰھم لا تحرمنا اجرھا ولا تفتنا بعدھا۔

اس دنیا میں ماں باپ کی محبت و شفقت کا کوئی بدل نہیں ہے، یہاں تو ہر ایک محبت میں کوئی نہ کوئی غرض ضرور شامل ہوتی ہے، لیکن اولاد کے لئے صرف ماں باپ کی محبت ایسی ہے جو بالکل بے غرض ہوتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی کسی کے دکھ درد پر اس خلوص کے ساتھ نہیں تڑپ سکتا جس خلوص کے ساتھ ماں باپ اپنی اولاد کے لئے تڑپتے ہیں۔ اس سانحے سے محرومی کوئی معمولی محرومی نہیں، اور آج جب یہ تصور کرتا ہوں کہ اب کہیں "بیٹا" کہنے والا باقی نہیں رہا تو نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔

لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا نظام ہے، اس نظام کی حکمتیں ہماری انفرادی خواہشات

سے بالاتر ہیں۔ یہاں ہر وصل کا انجام فراق ہے، یہاں ہر ملاقات کی انتہاء جدائی پر ہوتی ہے۔ کوئی نہیں ہے جو اس قانون سے مستثنیٰ ہو۔ طبعی صدمہ انسان کی فطرت بھی ہے اور جانے والے کا حق میت بھی، چنانچہ شریعت نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی، لیکن اگر دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان ہوں تو یہ سارے واقعات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اگر دنیا کی حقیقت تمہارے سامنے ہوتی تو یہ صدمات تمہارے لئے ناقابل برداشت نہ ہوتے۔ یہ دنیا تو تمہارے راستے کی ایک منزل ہے، رستے کی منزلوں میں تو مسافروں کے اترنے اور چڑھنے کا سلسلہ رہتا ہی ہے۔ ابدی وصل اگر تمہیں مقدر ہے تو وہ اس سفر کے اختتام پر صرف جنت میں ممکن ہے، جس کے بعد جدائی کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔ تم نے یہ سمجھ ہی کیوں لی کہ یہ دنیا ٹھہرنے اور بسنے کی جگہ ہے؟ روزانہ اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کو چھوٹتے ہوئے دیکھتے ہو، انہیں اپنے ہاتھوں سے مٹی دے کر آتے ہو پھر بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں کہ ایک دن تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا ہے۔ ایک دن تمہیں بھی تمہارے عزیز و قریب اور دوست احباب کاندھے پر اٹھا کر قبرستان میں تنہا چھوڑ آئیں گے۔ ایک دن تمہاری اولاد بھی تمہیں گڑھے میں رکھ کر تم پر مٹی ڈال دے گی۔ اگر یہ حقائق تمہارے ذہن میں مستحضر ہوں تو یہ جدائی کوئی جدائی نہیں ہے، تیاری اس بات کی کرو کہ زندگی کا یہ سفر بخیر و خوبی انجام پذیر ہو، اور جب تمہیں قبر میں رکھ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمتیں تمہیں ڈھانپ لیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان حقائق پر غور کرنے اور ان کے مطابق زندگی استوار کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

والدہ صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کی وفات پر بہت سے احباب و متعلقین نے خطوط اور تاروں کے ذریعے تعزیت کا اظہار فرمایا ہے، احقر اور احقر کے تمام اہل خاندان ان حضرات کے ممنون ہیں اور یہ گزارش کرتے ہیں کہ براہ کرم والدہ صاحبہ کو دعائے مغفرت اور حسب استطاعت ایصال ثواب میں یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین۔

حضرت مولانا محمد شریف صاحب جالندھریؒ

۷ ذی قعدہ کی شام کو مدرسہ خیر المدارس کے مہتمم اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری قدس سرہ کے فرزند گرامی حضرت مولانا محمد شریف صاحب جالندھریؒ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے' اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ابھی چند ہی روز کی تو بات ہے کہ احقر لاہور سے کراچی آرہا تھا تو ملتان کے اسٹیشن پر اچانک مولانا کو دیکھ کر مسرت ہوئی۔ چند منٹ کی مختصر ملاقات میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی اہلیہ محترمہ' اپنی صاحبزادی اور ہمشیرہ کو ساتھ لے کر سفر حج کے لیے تشریف لے جارہے ہیں' اور ایک دوسری گاڑی میں کراچی کے لیے سوار ہوں گے۔ پھر کراچی پہنچ کر حسب معمول مولانا نے کرم فرمایا' دو مرتبہ دارالعلوم تشریف لائے' تقریباً ایک پورا دن ان کے ساتھ گزرا' پھر ہم مرشدی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مد ظلہم صدر دارالعلوم کراچی کی دو شنبہ مجلس میں بھی ساتھ گئے' اور نہایت تندرست اور ہشاش بشاش ان کو رخصت کیا۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ اس درویش منش اور فرشتہ خصلت انسان سے یہ آخری ملاقات ہوگی۔ ابھی ان کی روانگی کو چند ہی دن گزرے تھے کہ اچانک اطلاع ملی کہ مکہ مکرمہ میں عصر کی نماز کے وقت حرم جانے کی تیاری کرتے ہوئے ان کو دل کا دورہ ہوا' اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی آغوشِ رحمت میں بلالیا۔ یہ ناگہانی خبر سن کر یقین نہ آیا' لیکن ملتان فون کرنے پر پتہ چلا کہ خبر درست ہے' اور زندگی کی بے ثباتی کا ایک اور نمونہ اللہ تعالیٰ کو دکھانا منظور تھا۔

حضرت مولانا محمد شریف صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی تواضع' مسکنت' سادگی اور بے نفسی میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار تھے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں اس زمانے میں تعلیم پائی جب وہاں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث تھے' حضرت والد صاحب قدس سرہ سے بھی پڑھا' اور اس دور کے اکابر اساتذہ کی تعلیم و تربیت سے فیض یاب ہوئے' حضرت مولانا خیر محمد صاحب قدس سرہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے اکابر خلفاء میں سے

تھے، اور تھانہ بھون میں ان کی آمد و رفت رہتی تھی، مولانا محمد شریف صاحبؒ بھی اپنے والد صاحب کے ہمراہ تھانہ بھون جاتے رہتے، اور اس طرح بچپن ہی سے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی صحبت و تربیت اور نظر شفقت سے فیض یاب ہوئے، اور شاید حضرتؒ کے دست مبارک پر بیعت بھی کی، بعد میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم سے اصلاح کا تعلق قائم کیا، اور انہوں نے بیعت و ارشاد کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا خدام کے درمیان آپس میں محبت و مودّت اور خلوص و ایثار کا جو تعلق تھا، وہ شاذ و نادر ہی کہیں دیکھنے میں آتا ہے، یہ حضرات ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے والے اور ایک دوسرے کے لئے پیکر خلوص تھے، حضرت مولانا خیر محمد صاحب قدس سرہ نے جالندھر میں خیر المدارس قائم فرمایا تھا اور حضرت والد صاحب قدس سرہ دیوبند سے جب بھی پنجاب کی طرف سفر فرماتے تو حضرت مولانا خیر محمد صاحب قدس سرہ اپنے فرزند ارجمند محمد شریف صاحب کے ہمراہ وپکا پکایا ناشتہ لیکر جالندھر کے ریلوے اسٹیشن پہنچتے اور جب تک گاڑی وہاں رہتی دونوں بزرگوں میں پر کیف ملاقات جاری رہتی۔ اس معمول میں ساری عمر بھی فرق نہیں آیا قیام پاکستان کے بعد حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ ملتان منتقل ہو گئے اور وہاں بھی یہ معمول جاری رہا۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ کو مولانا محمد شریف صاحبؒ سے محبت کا خاص تعلق تھا، بالخصوص حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ کی وفات کے بعد اس تعلق میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ آخر عمر میں جب حضرت والد صاحبؒ بالکل صاحب فراش ہو گئے تو ایک روز احقر سے فرمانے لگے کہ "آجکل اخیر شب میں حسب معمول آنکھ کھل جاتی ہے، دل چاہتا ہے کہ اٹھ کر کچھ پڑھوں، لیکن نقاہت کی وجہ سے ہمت نہیں ہوتی، چنانچہ صبح تک بستر پر لیٹے لیٹے ہی دعائیں کرتا رہتا ہوں، اور اپنے جس کسی عزیز یا دوست کا خیال آجاتا ہے، اس کے لیے دعا کی توفیق ہو جاتی ہے۔ رات بیدار ہو کر حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ کے صاحبزادے مولانا عبید اللہ صاحب اور حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ کے صاحبزادے محمد شریف صاحبؒ کا خیال آیا، بس صبح تک ان دونوں صاحبزادگان کے لیے دعا کرتا رہا"۔

حضرت والد صاحب کے تعلق سے مولانا محمد شریف صاحبؒ کو احقر اور برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم سے بھی خصوصی تعلق تھا۔ جب بھی ملتان

جاتا ہوتا، مولاناؒ کی محبت و عنایت کے عجیب عجیب مناظر سامنے آتے۔ ایک مرتبہ رحیم یار خان میں ایک جلسہ تھا، جہاں مولانا محمد شریف صاحبؒ بھی مدعو تھے اور احقر بھی، مولاناؒ کی تقریر مجھ سے ایک رات پہلے ہو چکی تھی، لیکن جب انہوں نے میری آمد کی خبر سنی تو اپنے سفر کا پروگرام ملتوی کر کے رک گئے۔ احقر اپنے ایک عزیز کے مکان میں مقیم تھا، مولاناؒ سارے دن احقر کی تلاش میں رہے اور تین بجے کے قریب اس مکان کا پتہ لگا کر وہاں پہنچے۔ اتفاق سے میں کچھ دیر کے لئے لیٹ چکا تھا۔ مولاناؒ نے بھی بے تکلفی کے ساتھ اہل خانہ سے کہا کہ اسے اٹھانے کی بجائے مجھے بھی کوئی ایک چارپائی بتا دیجئے جہاں تھوڑی دیر میں بھی آرام کرلوں۔ چنانچہ وہ ایک چارپائی پر لیٹ گئے۔ میں اٹھا تو کسی نے بتایا کہ ملتان سے کوئی صاحب ملنے کے لئے آئے ہیں۔ جاکر دیکھا تو مولاناؒ نہایت سادگی کے ساتھ وہاں لیٹے تھے، دیکھتے ہی بغل گیر ہو گئے، اور مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس مختصر ملاقات کی خاطر مولاناؒ نے کتنی تکلیف اٹھائی کہ سارا دن مکان تلاش کرتے رہے۔ پھر چونکہ اگلے دن ملتان پہنچ کر درس دینا ضروری تھا، اس لیے نصف شب کے وقت رحیم یار خان سے ایک بس میں سوار ہوئے اور ساری رات جاگ کر صبح ہوتے ملتان پہنچے۔ یہ وضع داری اور تعلق نبھانے کی خاطر یہ جفا کشی اب خال خال ہی کہیں نظر آتی ہے۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ کی وفات کے بعد مدرسہ خیر المدارس میں بہت سے نشیب و فراز آئے، اور مولاناؒ نے جس صبر و سکون سے ان تمام ہنگاموں کو جھیلا، یہ انہی کا حصہ تھا۔ انسان کی قدر اس کی زندگی میں کم ہوتی ہے۔ اب خیر المدارس میں جو عظیم خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پر کرنا آسان نہیں ہوگا۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں، ان کو درجات عالیہ سے نوازیں، اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں آمین۔ مولانا محمد شریف صاحبؒ کے صاحبزادے مولوی محمد حنیف صاحب سلمہ پچھلے سال ہی خیر المدارس سے فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلنے اور ان کے مقصد زندگی کو آگے بڑھانے کی توفیق کامل مرحمت فرمائیں۔ آمین۔

حضرت مولانا محمد متین الخطیب رحمۃ اللہ علیہ

پچھلے مہینے پاکستان کے ممتاز عالم دین، تحریک پاکستان کے سرگرم سپاہی اور دارالعلوم کراچی کی نانک واڑہ شاخ کے ناظم حضرت مولانا محمد متین الخطیب رحمۃ اللہ علیہ تقریباً دو ہفتے صاحب فراش رہنے کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی وفات تمام علمی و دینی حلقوں کے لیے بالعموم، اور دارالعلوم کے لیے بالخصوص ایک جان گداز سانحہ اور صبر آزما نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، وہ حاکم بھی ہیں، حکیم بھی، اور ان کے فیصلوں کی حکمتیں ہمارے وقتی جذبات اور خواہشات سے ماوراء ہیں، لیکن پچھلے چند سالوں میں علماء اور بالخصوص علماء دیوبند، کی جو بڑی بڑی شخصیتیں ایک ایک کرکے دنیا سے اٹھی ہیں، اور ان پے در پے حادثات نے علم و عمل کے دوائر میں جو مہیب خلا پیدا کر دیا ہے، اس کا تصور کر کے بے ساختہ یہ دعا زبان پر آتی ہے کہ ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ واعف عنا واغفرلنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین۔

حضرت مولانا محمد متین الخطیب، اکابر علمائے دیوبند کے آغوش میں پلے تھے۔ ان کے والد ماجد حضرت مولانا محمد مبین الخطیب، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ کے جاں نثار شاگرد اور ان کی تحریک جہاد کے سرگرم رفیق تھے۔ سلطنت مغلیہ کے معروف فرماں روا شاہجہاں ایک مرتبہ دیوبند آئے تو اپنے وزیر مالیات دیوان شیخ لطف اللہ کے یہاں قیام ہوا، ان کو شاہجہاں نے ایک عید گاہ تعمیر کرنے کا حکم دیا، اور اس عید گاہ کی امامت و خطابت بھی اسی خاندان کے سپرد کی، مولانا محمد مبین صاحب اسی خاندان سے وابستہ تھے اور سالہا سال سے دیوبند میں عید کی امامت و خطابت اسی خاندان میں چلی آرہی تھی، اور یہ سعادت اسی خاندان کو حاصل ہے کہ حضرت نانوتوی اور حضرت شیخ الہند سے لے کر حضرت مدنی تک دیوبند کے تمام اکابر علماء نے عید کی نماز انہی کی امامت میں ادا فرمائی ہے۔

حضرت مولانا محمد متین الخطیب نے دارالعلوم دیوبند میں حفظ قرآن مکمل کیا، تو ختم

قرآن شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ نے کرایا' اور اسی روز احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ اور حکیم الامت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مد ظلہم العالی حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے۔

درس نظامی کی تعلیم مولاناؒ نے جن اساتذہ سے حاصل کی ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین صاحب مدنیؒ' حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ' حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ' شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہویؒ جیسے بزرگ شامل ہیں۔

مولاناؒ کے والد ماجد انبالہ چھاؤنی میں مدرسہ معین الاسلام کے مہتمم تھے' اور حضرت مولانا محمد مسلم صاحب عثمانی'' اس میں صدر مدرس۔ ابتداءً حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحبؒ نے اسی مدرسے میں تعلیم حاصل کی' اور پھر دورہ حدیث اور دوسرے فنون کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں فرمائی۔ فراغت کے بعد انبالہ کے اسی مدرسے میں تدریس شروع کی' اور بعد میں ان کے والد ماجد نے مدرسے کا اہتمام انہی کے سپرد کر دیا' اور خود انبالہ شہر کی جامع مسجد میں خطابت اختیار کر لی۔

مولاناؒ کا قیام انبالہ میں سترہ سال رہا' اور اس دوران بہت سے حضرات نے آپ سے تلمذ حاصل کیا' جن میں مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب جیسے ممتاز علماء بھی شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مولاناؒ کا تعلق دیوبند اور اکابر علمائے دیوبند سے برابر قائم رہا۔ وہاں عیدین کی امامت و خطابت آپ ہی فرماتے رہے۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد مبین صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے نہ صرف جاں نثار شاگرد تھے' بلکہ ان کی تحریک جہاد کے ایسے ممتاز رفیق تھے کہ حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "تحریک ریشمی رومال" میں بار بار متعدد مقامات پر ان کا تذکرہ موجود ہے' اس لئے برصغیر کی آزادی اور مسلمانوں کی حکومت کے قیام کیلئے جدوجہد کا جذبہ انہیں اپنے والد ماجدؒ سے میراث میں ملا۔ اور جب قیام پاکستان کی تحریک اٹھی تو حضرت مولانا متین خطیب صاحبؒ بعض دوسرے اکابر علماء دیوبند کے ساتھ ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اگرچہ قیام پاکستان کی حمایت میں جو علماء سامنے آئے ان میں سب سے زیادہ جلیل

[illegible] جیسی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی تھی، لیکن ضعف سنی کی وجہ سے ان کی حیثیت ایک سرپرست کی تھی جن کی نظریاتی حمایت، اصلاحی کوششوں اور دعاؤں سے تحریک کو عظیم تقویت نصیب ہوئی، لیکن اس میدان میں علماء کرام کی عملی قیادت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ نے فرمائی جس کی تفصیلات سے ہر باخبر مسلمان واقف ہے۔

حضرت مولانا محمد متین الخطیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے ساتھ اس تحریک میں کام کرنے کا موقع ملا، اور جب تحریک پاکستان کے حامی علماء نے اپنی جدوجہد کے لیے "کل ہند جمعیت علمائے اسلام" کے نام سے ایک مشترک پلیٹ فارم کی بنیاد ڈالی تو آپ اس کے بانی اراکین میں شامل تھے، اور کلکتے کے جس اجتماع میں جمعیت کی بنیاد پڑی تھی، اس میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ چونکہ علالت کی بنا پر شریک نہ ہو سکے تھے، اس لیے حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنا خطبۂ صدارت اجتماع میں سنانے کے لیے جن صاحب کو منتخب فرمایا وہ حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحبؒ ہی تھے۔ چنانچہ اس اہم اور تاریخی اجتماع کے موقع پر حضرت شیخ الاسلامؒ کی طرف سے نیابۃً خطبۂ صدارت پڑھنے کی سعادت بھی آپ ہی کے حصے میں آئی۔

اس وقت سے ۱۹۵۸ء تک آپ مسلسل "جمعیت علماء اسلام" سے نہ صرف وابستہ رہے، بلکہ مدت دراز تک اس کے مرکزی ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس دوران جمعیت نے قیام پاکستان کی کوششوں میں جو ذہنی کردار ادا کیا، اور قیام پاکستان کے بعد اسلامی دستور کے نفاذ کے لیے جتنی جدوجہد کی، اس میں مولاناؒ کے جہد و عمل کا بڑا حصہ ہے۔ مولاناؒ قیام پاکستان کے فوراً بعد لاہور منتقل ہو گئے تھے، اور یہ بھی ایک ستم ظریفی کی بات تھی، جو انشاء اللہ مولانا کے لیے تو ذخیرۂ آخرت ہوگی، کہ قیام پاکستان کے لیے [illegible] قدر جدوجہد کرنے والے مجاہد نے ہجرت کے بعد عرصۂ دراز انتہائی عسرت کی حالت میں گزارا اور ان خدمات کا کوئی صلہ انہیں دنیا میں نہیں ملا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ انشاء اللہ اس کا اجر حقیقی آخرت میں ہی ان کو ملے گا۔

قیام لاہور کے دوران آپ نے دار العلوم الاسلامیہ کے نام سے ایک مدرسے کی بنیاد ڈالنے میں حصہ لیا، جو قرأت و تجوید کے معاملے میں ملک کا معروف ترین مدرسہ تھا، اور جس

میں حضرت مولانا قاری عبدالمالک صاحبؒ جیسے اساتذہ نے درس دیا ہے، اور بفضلہ تعالیٰ اب بھی یہ مدرسہ قائم اور جاری ہے۔

۱۹۵۱ء میں آپ کراچی منتقل ہوئے تو یہاں دارالعلوم کراچی سے بحیثیت نائب ناظم وابستہ ہو گئے۔ اسی دوران ریڈیو پاکستان سے عرصہ دراز تک قرآن کریم کی تفسیر نشر فرماتے رہے۔ بیچ میں اردو کالج کے اسلامیات کے استاذ کی حیثیت سے بھی کئی سال خدمات انجام دیں۔ مختلف نصاب کمیٹیوں کے رکن بھی رہے اور کالج کے طلباء کی درسی ضروریات کے لیے کتابیں بھی لکھیں، لیکن ۱۹۵۲ء سے ۱۹۸۲ء تک متواتر تیس سال دارالعلوم کے ساتھ آپ کی وابستگی ہر حال میں برقرار رہی۔ آخر میں دوسری تمام مصروفیات آپ نے ترک فرما دی تھیں، یہاں تک کہ ناظم آباد کی جس شاندار عیدگاہ کی بنیاد ہی گویا آپ نے ڈالی تھی، اور جہاں وہ ہر سال اپنی خاندانی روایات کے مطابق عیدین کی امامت و خطابت فرمایا کرتے تھے، وہاں کی امامت و خطابت کو بھی ترک کر دیا تھا، لیکن دارالعلوم کے ساتھ آپ کا تعلق آخر تک برقرار رہا۔

مولاناؒ عرصے سے ذیابیطس کے مریض تھے جس نے انھیں بہت کمزور کر دیا تھا۔ پچھلے رمضان میں بعض ڈاکٹروں نے خون کے سرطان کا بھی خطرہ ظاہر کیا، لیکن مولاناؒ نے بڑی ہمت کے ساتھ اپنے معمولات جاری رکھے، تمام کام حسب معمول انجام دیتے رہے، وفات سے صرف دس دن پہلے اچانک اطلاع ملی کہ انھیں نمونیا ہو گیا ہے۔ برادر مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم کے ساتھ احقر عیادت کے لئے گھر پر حاضر ہوا تو وہ بالکل صاحب فراش تھے، معلوم ہوا کہ دو تین روز سخت بے چینی کے گذرے ہیں، کمزوری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، لیکن ہمیں دیکھا تو اسی تپاک کے ساتھ ملنا چاہا، اور اگر ہم زبردستی انھیں روک نہ دیتے تو شاید وہ بستر سے اٹھ ہی بیٹھتے۔ کمزوری اور تکلیف کے وجہ سے باتوں میں ربط نہیں تھا، لیکن آواز میں گھن گرج اسی طرح قائم تھی۔

اس کے بعد ان کی تکلیف بڑھتی ہی چلی گئی، دو دن کے بعد انھیں بقائی ہسپتال میں داخل کیا گیا، اور وہاں وہ آٹھ دن زیر علاج رہے، ابتداءً بیماری میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا، ایک مرتبہ چوبیس گھنٹے سے زائد مکمل بیہوشی اور تقریباً ناامیدی کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہوش عطا فرما دیا، حالت سنبھلنے لگی، لیکن یہ آخری سنبھالا تھا، اور شاید اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی دور

وقفہ وہ صاحبزادی سے ملنے کے لئے عطا فرمایا تھا جو اسی روز بیرون ملک سے ان کے پاس پہنچیں۔ اس کے بعد اس کیفیت میں ترقی نہ ہو سکی' اور بالآخر ۹ فروری ۱۹۸۲ء کو صبح صادق کے وقت وہ اس دنیا سے سدھار کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون .

حضرت خطیب صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے کمالات سے نوازا تھا۔ وہ بڑے خلیق' مجسم ملنسار' خوش ذوق' نفاست پسند اور وضع دار بزرگ تھے۔ جس کسی شخص سے کوئی تعلق قائم ہو گیا اسے آخر وقت تک نبھایا۔ اللہ تعالیٰ نے انتظامی صلاحیت سے نوازا تھا' اور مشکل سے مشکل کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کی توفیق بخشی تھی۔

اگرچہ ابتداء میں سترہ سال تک درس و تدریس ہی کی خدمت انجام دی' اس لیے علمی استعداد یقیناً پختہ رہی ہو گی' لیکن ان کے اس عظیم الشان وصف کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے کہ انہوں نے کبھی کسی دوسرے کے سامنے اپنے علم یا تقدس کا تاثر دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس معاملے میں قابل رشک حد تک پاک نفس انسان تھے۔ جن لوگوں کو ان سے عقیدت و محبت کا تعلق ہوتا وہ بھرے مجمع میں بھی ان سے کوئی فقہی سوال کر لیتے تو انہی کے سامنے ٹیلی فون کر کے حضرت والد صاحبؒ سے اس کا جواب معلوم کرتے' اور ان کو اسی حوالے سے جواب دیتے تھے۔ **"لا ادری"** کہنے کا یہ "علم" آج بڑے بڑے علماء میں مفقود ہوتا جا رہا ہے' اور اس کے لیے بڑے وسیع ظرف اور اونچے حوصلے کی ضرورت پڑتی ہے۔

حضرت خطیب صاحبؒ نے ملک و ملت کی' مسلمانوں کی' طلبائے علم کی' اور دارالعلوم کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے ہاتھوں نہ جانے خیر کے کتنے کام جاری ہوئے' کتنے شرور پر بندش لگی' کتنے دکھی لوگوں کے دکھ دور ہوئے' یہ سارے کام انشاء اللہ ان کے لیے صدقات جاریہ ہیں۔ اور ہم سب پر ان کا یہ حق ہے کہ ان کو دعائے مغفرت اور ایصال ثواب میں یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی زلات و سیئات سے درگزر فرمائیں' ان کے اعمال حسنہ پر انہیں اپنی رحمت خاص سے بیش از بیش جزائے خیر عطا فرمائیں' انہیں جنت الفردوس میں مقامات عالیہ سے نوازیں' اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائیں۔ آمین۔

قارئین البلاغ پر ان کا خصوصی طور سے بہت حق ہے۔ البلاغ کی توسیع اشاعت

اور اس کی مالی انتظام میں انکا بہت بڑا حصہ ہے' انہوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ "اہلحدیث" کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس لئے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ موصوف کے سچے دل سے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا اہتمام فرمائیں۔ آمین۔

اہلحدیث جلد ۱۹ شمارہ ۵

جسٹس کریم اللہ درانی صاحب مرحوم

ابھی حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحب کی وفات کا صدمہ تازہ ہی تھا کہ اچانک ایک اور اندوہناک خبر دل کو تڑپا گئی۔ وفاقی شرعی عدالت میں ہمارے محترم رفیق جناب جسٹس کریم اللہ درانی صاحب مرحوم کار کے ایک حادثے میں شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جسٹس درانی صاحب مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی مختصر ملاقات میں بھی ذہن و دل پر دیرپا نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان سے پہلی ملاقات تو ۱۹۷۹ء میں اس وقت ہوئی تھی جب وہ پشاور ہائی کورٹ کے جج تھے، اور میں اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک میٹنگ میں شرکت کے لئے پشاور گیا تھا۔ پشاور ہائی کورٹ میں چائے کے وقفے کے دوران بہت مختصر سی ملاقات، لیکن تقریباً دو سال بعد قدرت نے ہمیں وفاقی شرعی عدالت کے ارکان کی حیثیت میں ایک ساتھ جمع کر دیا، یہاں بھی ان کے ساتھ رفاقت کا عرصہ زیادہ نہیں رہا، لیکن ان کی خوش اخلاقی، شگفتہ مزاجی، دین سے لگاؤ، اور قابلیت کا یہ ثمرہ تھا کہ یہ مختصر رفاقت سالوں پر محیط معلوم ہوتی ہے۔

وہ پشاور سے تعلق رکھتے تھے! لیکن اردو پر قدرت بہت سے اہل زبان ادباء سے زائد تھی، یہاں تک کہ ان کے لب و لہجہ سے بھی یہ پتہ نہیں لگتا تھا کہ ان کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ وہ تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ کے سرگرم کارکن رہے، اور سرحد ریفرنڈم میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ پاکستان کے لیے کام کیا۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے پشاور یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لی، اور ۱۹۵۸ء سے وکالت کا آغاز کیا۔ پاکستان (کونسل) مسلم لیگ کے جائنٹ سیکریٹری رہے، اور سیاسی جدوجہد کے دوران قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، بعد میں انہوں نے "تحریک استقلال" میں شمولیت اختیار کی، اور اس کے نائب صدر رہے، یہاں تک کہ ۱۹۷۳ء میں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

جولائی ۱۹۷۹ء میں وہ پشاور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے، اور جب مئی ۱۹۸۰ء میں

وفاقی شرعی عدالت کا قیام عمل میں آیا تو انہیں اس عدالت میں بحیثیت رکن (جج) منتخب کر دیا گیا۔ قانون کی اعلیٰ قابلیت کے ساتھ ساتھ انہیں شروع ہی سے دین کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا۔ اور اس موضوع پر بھی ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے سلامت فکر و اعتدال سے بھی نوازا تھا، اس لیے شرعی معاملات میں ان کے فیصلوں کو نمایاں امتیاز حاصل ہوا۔

وہ بڑے علم دوست اور ادب نواز آدمی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خطابت کا بھی دلکش اسلوب بخشا تھا، چنانچہ ان کی تقریریں بڑی مقبول ہوتی تھیں، اور مجلس میں بیٹھتے تو اسے باغ و بہار بنا دیتے۔ میں صفر ۱۴۰۳ھ کے وسط میں عدالت سے طویل رخصت پر کراچی آگیا تھا، پچھلے دنوں ایک مقدمے کی سماعت کے لیے دوبارہ اسلام آباد آنا ہوا، اور رخصت کے وقت جب ان سے معانقہ ہو رہا تھا تو تصور بھی نہ تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہوگی۔ ۱۵ فروری کو وہ اسلام آباد سے اپنے گھر پشاور جا رہے تھے، اور کار بھی خود ڈرائیو کر رہے تھے، پشاور سے ذرا پہلے ترناب کے مقام پر مغرب کا وقت ہو گیا تو کار سے اتر کر ایک مسجد میں نماز مغرب ادا کی، اور دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ دیر تک دعا کرتے رہے، پھر دوبارہ کار میں سوار ہو کر چلے تو سامنے سے ایک تیز رفتار ٹینکر نے جو کسی بس سے آگے نکلنے کی فکر میں تھا، اس زور کی ٹکر ماری کہ کار کا اگلا حصہ بالکل تباہ ہو کر ٹینکر کے پہیوں کے درمیان گھس گیا، کار کی جو حالت تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں نے دیکھی، اسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ درانی صاحب مرحوم پر اس تصادم کے وقت کیا قیامت گذر گئی ہوگی، انہیں بمشکل تمام کار سے نکالا گیا، اور ہسپتال پہنچانے کی بھی کوشش کی گئی، لیکن وہ زبان حال سے یہ کہہ رہے تھے کہ۔

چھپ گیا آفتاب، شام ہوئی
اک مسافر کی رہ تمام ہوئی

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما کر انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامات عطا فرمائیں، اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں۔ آمین۔ قارئین البلاغ سے بھی ان کے لیے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کی درخواست ہے۔

البلاغ جلد ۱۷ شمارہ ۵

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

پچھلے مہینے یہ جانکاہ خبر دلوں پر صاعقہ بن کر گری کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی قدس سرہ رحلت فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ ہمارے عہد کی ان یگانہ ہستیوں میں سے تھے جن کا نفس وجود ہی امت کے لئے رحمتوں اور برکتوں کا باعث ہوتا ہے، اور جن کو اللہ تعالیٰ کسی دور میں فیض رسانی کے لئے منتخب اور موفق فرما لیتے ہیں۔ برصغیر کے علماء میں ان کی ذات اس وقت ایسی تھی کہ مختلف نقطہ ہائے نظر کے لوگ بھی ان کے علم و فضل، تقدس و تقویٰ، جہد و عزیمت اور ملت کے درد کے نہ صرف معترف، بلکہ اس کے آگے سر بہ خم تھے، اور جو مشکلات میں بڑے بڑے علماء کے لئے مرجع بنی ہوئی تھی۔ ان کی مثال ایسے گھنے اور سایہ دار درخت کی سی تھی جس کی چھاؤں میں امت کے تمام افراد، اور خصوصاً اہل علم و دین کو آغوش مادر کا سکون و سرور میسر آتا تھا۔ آج پوری علمی و دینی برادری اس عظیم سائے سے محروم ہو گئی، اور ملت کا یہ سہارا چھن گیا۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ اس قافلۂ دعوت و عزیمت کے ایک فرد تھے جس نے برصغیر میں دین حق کی شمع روشن رکھنے کے لئے اپنی جانیں کھپائیں، اور وقت کی تند و تیز آندھیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ انہوں نے علم کی تحصیل اور دین کی تبلیغ میں جو مشقتیں اٹھائیں، جن حضرات کی صحبت سے فیض یاب ہوئے، اور جن کے کردار و عمل کو اپنی عملی زندگی میں جذب کیا، ان کا دلنشیں اور سبق آموز تذکرہ ان کی دلچسپ اور موثر "آپ بیتی" میں موجود ہے، جس کی ہر سطر ہمارے لئے عبرت و موعظت کا سرمایہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو یوں تو سارے ہی علوم میں دسترس عطا فرمائی تھی، لیکن خاص طور پر علم حدیث کے ساتھ آپ کا تعلق اور اشتغال اس درجہ تھا کہ "شیخ الحدیث" آپ کے اسم گرامی کا جزء، بلکہ اس کا قائم مقام بن گیا، علمی و دینی حلقوں میں "حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ" کا لفظ مطلقاً بولا جائے تو آپ کے سوا کسی اور کی طرف ذہن جاتا ہی نہ تھا،

اور واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں اس لقب کا کوئی حقیقی مستحق تھا تو وہ آپ ہی کی ذات تھی۔ سالہا سال حدیث کا درس، آپ کا جزو زندگی تھا۔ پھر تالیف و تصنیف کے میدان میں علم حدیث کی متنوع خدمات اللہ تعالیٰ نے آپ سے لیں، اس دور میں شاید ان کی نظیر نہیں ہے۔

سب سے پہلے آپ نے اپنے شیخ مکرم حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہ کے ساتھ رہ کر ان کی ابوداؤد کی شرح "بذل المجہود" کی تالیف میں ان کو مدد دی۔ پھر موطأ امام مالکؒ کی عظیم شرح "اوجز المسالک" تالیف فرمائی جو اس صدی کے علمی کارناموں میں سرفہرست ہے۔ اور جس کی قدر اہل علم ہی جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی تقریر ترمذی "الکوکب الدری" پر حضرتؒ نے جو حاشیہ تحریر فرمایا ہے، وہ اپنے اختصار اور جامعیت میں اپنی نظیر آپ ہے۔ پھر آخر میں حضرت گنگوہیؒ کی تقریر بخاری "لامع الدراری" پر جو مفصل تعلیقات آپ نے تحریر فرمائی ہیں، آج صحیح بخاریؒ کا کوئی طالب علم یا مدرس ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ہر ایک علمی خدمت ایسی ہے کہ اگر کوئی شخص ساری عمر میں وہی خدمت انجام دے تو وہ تنہا بھی اس کی علمی عظمت کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

یہ تمام کارنامے تو اہل علم کی رہنمائی کے لئے ہیں، لیکن عام مسلمانوں کے لئے بھی حضرتؒ نے تالیفات کا جو انتہائی مفید ذخیرہ چھوڑا ہے، اس سے آج ایک دنیا سیراب ہو رہی ہے۔ "فضائل" کے سلسلے میں تالیفات جو "تبلیغی نصاب" کے نام سے مشہور ہو گئی ہیں، اپنی سادگی اور تاثیر میں بے مثال ہیں۔ بلا مبالغہ ہزارہا زندگیوں میں ان کے ذریعہ انقلاب پیدا ہوا ہے۔ اور آج مسجد مسجد ان کے اجتماعی مطالعے کا سلسلہ جاری ہے، اور شاید چوبیس گھنٹے میں کوئی وقت ایسا نہ ہو جب وہ دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں پڑھی نہ جا رہی ہوں۔

علم و فضل کے اس مقام بلند اور ان عظیم خدمات کے باوجود شخصیت ایسی کہ علم کے غرّے یا تقدس و تقویٰ کے ناز کی کوئی پرچھائیں بھی وہاں دور دور نظر آنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ سادگی، بے تکلفی اور تواضع و فنائیت کا ایسا پیکر جمیل کہ اللہ اکبر! اپنے سارے مقامات عالیہ کے باوصف چھوٹوں اور احباب کے ساتھ ایسے گھلے ملے کہ کوئی شخص پہچان بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہ "شیخ الحدیث" ہیں جن کی علمی خدمات کے احسان سے دنیا بھر کے اہل علم کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔

عرصہ دراز سے چلنے پھرنے سے قطعی معذور ہو چکے تھے۔ لیکن اس بیماری، معذوری اور ضعف کے عالم میں بھی ان کی مصروفیات ہم جوانوں کے لئے باعث رشک ہی نہیں، حیرت ناک تھیں، اور ان کی تفصیلات کو دیکھنے والا ان کو ایک زندہ کرامت یا قوت ایمانی کے کرشمہ کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا۔ نہ جانے کتنی تصنیفات اس معذوری کے زمانے میں لکھی گئیں۔ کتنے تبلیغی سفر اسی معذوری کی حالت میں ہوئے، کتنی پر مشقت عبادتیں اسی کیفیت میں انجام پائیں۔ دنیا بھر سے اہل علم، اور عام مسلمان اپنی اپنی مشکلات اور مسائل آپ کے پاس لکھ کر بھیجتے، اور اس طرح روزانہ ڈاک کا ایک انبار آپ کے پاس جواب طلب ہوتا، لیکن اس پوری ڈاک کا باقاعدگی کے ساتھ روزانہ جواب دیتے، اور مخاطب کی مکمل تشفی فرماتے۔

ساری عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی خدمت میں صرف کرنے کے بعد آرزو تھی کہ عمر کے آخری لمحات مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بسر ہوں، اور جنت البقیع کی خاک نصیب ہو، اسی آرزو میں ضعیفی، معذوری، اور انواع و اقسام کی بیماریوں کے عالم میں اپنے گھر بار، اور اہل و عیال کو چھوڑ کر سالہا سال سے مدینہ طیبہ میں قیام فرما تھے، لیکن وہاں بھی ہر وقت فیض کے دریا جاری تھے۔ شدید معذوری کے عالم بھی حرم شریف کی حاضری میں فرق نہیں آتا تھا، پھر اس پر مستزاد یہ کہ اصلاح و تبلیغ کا جذبہ بیتاب وہاں بھی آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیتا، چنانچہ وقفے وقفے سے دور دراز کے ممالک کے سفر اسی حالت میں جاری رہتے، کبھی انڈیا کبھی پاکستان کبھی افریقہ، غرض بڑھاپے کے اس دور میں جب انسان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ گوشہ عافیت میں پڑا رہے، اس وقت آپ نے گھر کے آرام و راحت کو تو بالکل خیرباد کہہ ہی دیا تھا، مستقل ایک جگہ کی رہائش بھی میسر نہ تھی بلکہ طویل سفروں کی مشقت بھی برداشت فرماتے تھے۔ غرض آپ کی زندگی، آپ کے کارنامے، آپ کی مصروفیات، اور آپ کے ہاتھوں جاری ہونے والے فیوض ہم جیسوں کے لئے ایک زندہ کرامت سے کم نہیں تھے، اور آپ کی زندگی کا ہر پہلو ہمارے لئے ایک مستقل درس موعظت ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو افادہ خلق کے لئے چنتے ہیں تو اس کے دل میں اپنی مخلوق پر غیر معمولی شفقت و محبت پیدا فرما دیتے ہیں، اسے امت کے ہر فرد کے ساتھ ایسا تعلق خاطر

ہو جاتا ہے کہ وہ ہر شخص کے دکھ کو اپنا دکھ اور ہر شخص کی راحت کو اپنی راحت تصور کرتا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ کا معاملہ بھی یہی تھا، ان کے متعلقین و متوسلین اور محبت کرنے والوں کی تعداد شاید لاکھوں تک پہنچی ہوگی، اتنے انسانوں کے ساتھ تعلق کو نبھانا انہی کا کام تھا۔ ان میں سے ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ انہیں میرے ساتھ زیادہ خصوصی تعلق ہے۔ اور وہ میرے رنج و راحت میں سب سے بڑے شریک ہیں۔

احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے ساتھ حضرت کو بڑا خصوصی تعلق تھا۔ جب کبھی کراچی تشریف آوری ہوتی تو حضرت والد صاحبؒ ہم بھائیوں کو لے کر ان کی خدمت میں تشریف لے جاتے، اور حضرتؒ کے لئے بھی معذوری کے باوجود یہ ممکن نہ تھا کہ دارالعلوم کورنگی میں کم از کم ایک مرتبہ تشریف لائے بغیر کراچی سے چلے جائیں۔ پھر دوری کی حالت میں بھی حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ ان کی خط و کتابت جاری رہتی، اور اس میں ملت کے بہت سے مسائل زیر بحث آتے تھے، اور یہ حضرتؒ کی شفقت بے پایاں تھی کہ ہر خط میں برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم اور اس ناکارہ کا بڑی محبت سے ذکر فرماتے، گرانقدر نصائح سے نوازتے، اور ہماری اصلاح و تربیت کے لئے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو مشورے دیتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ کی کراچی تشریف آوری ایسی حالت میں ہوئی کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ صاحب فراش تھے، دل کی تکلیف کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا بھی ممکن نہ تھا، ادھر حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ کو بھی بخار چڑھ رہا تھا، لیکن اس کے باوجود دارالعلوم تشریف لانے کا معمول ناغہ نہیں فرمایا۔ جب حضرت والد صاحبؒ کے کمرے میں داخل ہوئے تو حضرت والد صاحبؒ نے استقبال کے لئے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی، حضرتؒ نے وہیں سے فرمایا:

"دیکھو مفتی صاحب! اٹھنے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہوگا، سیدھی بات یہ ہے کہ تم بھی بیمار، میں بھی بیمار، بیٹھے رہنے کی طاقت نہ تم میں ہے نہ مجھ میں، میں بھی لیٹ جاؤں گا، اور دونوں لیٹے لیٹے باتیں کریں گے۔"

چنانچہ حضرتؒ برابر کی چارپائی پر لیٹ گئے، اور دونوں بزرگوں میں دیر تک اسی شان سے گفتگو جاری رہی۔ اللہ اکبر! سادگی، بے تکلفی، بے ساختگی اور اخلاص و محبت کے یہ

دلآویز پیکر اب کہاں نظر آتے ہیں۔

اخبارات اور رسائل وغیرہ کیلئے مضمون لکھنا حضرتؒ کا معمول نہ تھا، لیکن جب احقر نے "البلاغ" کے "مفتی اعظم" نمبر کے لئے کچھ تحریر کرنے کی فرمائش کی، تو احقر کے نام ایک مفصل مکتوب کی شکل میں حضرت والد صاحبؒ کے بارے میں اپنے تاثرات بڑے اہتمام کے ساتھ تحریر فرما کر ارسال فرمائے۔ اس طرح حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ اپنے خصوصی تعلق کا بھی حق ادا فرمادیا، چھوٹوں کی فرمائش کی تکمیل بھی فرمادی، اور اس کو بصورت مکتوب لکھ کر اپنے معمول کا بھی تحفظ فرمایا۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ کے بعد احقر کے شیخ و مربی اور دارالعلوم کراچی کے صدر حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم العالی کے ساتھ حضرتؒ کا تعلق بہت بڑھ گیا تھا، دونوں بزرگوں کے درمیان مسلسل خط و کتابت جاری رہتی۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم العالی اپنی تالیفات میں حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ سے مشورے فرماتے رہتے، اور حضرتؒ ان کی بطور خاص قدردانی فرماتے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم کی کوئی نئی کتاب حضرتؒ کی خدمت میں پہنچتی تو اسے اپنی مجلسوں میں باستیعاب خود بھی سنتے اور دوسروں کو بھی سنواتے، اور پھر اپنے تاثرات لکھ کر بھیجتے۔ خصوصی تعلق خاطر کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ اپنے ایک مکتوب میں ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم العالی کو تحریر فرمایا کہ "آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے روضہ اقدس پر اپنا سلام پیش کرنے کے لئے مجھے تحریر نہیں فرمایا"۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم کو چونکہ آپ کی معذوری اور مصروفیات کا اندازہ تھا، اسلئے خط میں روضۂ اقدس پر سلام عرض کرنے کی فرمائش اس لئے تحریر نہ فرمائی تھی کہ اتنی معروف اور معذور شخصیت کو سلام پہنچانا یاد رکھنے کا مکلف کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ حضرت شیخ الحدیثؒ کا جذبۂ عشق بھی تھا اور ہمارے حضرتؒ کے ساتھ خصوصی تعلق کا کرشمہ بھی کہ یہ جملہ لکھ کر اس ذہنی رکاوٹ کو ہمیشہ کے لئے دور فرمادیا۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم العالی کے متعلقین میں سے کوئی شخص بھی کبھی مدینہ طیبہ پہنچتا، اور حضرتؒ کو معلوم ہو جاتا کہ ان کا تعلق حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم العالی سے ہے تو اس کے ساتھ خصوصی اکرام اور محبت کا معاملہ فرماتے، اور ہمارے حضرتؒ کی

خیریت اور حالات اس سے دریافت فرماتے رہتے تھے۔ کراچی میں حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کے جو متوسلین ہیں، ان میں سے بہت سوں کو یہ ہدایت فرمائی ہوئی تھی کہ وہ حضرت ڈاکٹر صاحب مد ظلہم کی مجالس میں حاضر ہو کر استفادہ کیا کریں، چنانچہ ایسے بہت سے لوگ جو حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہٗ سے بیعت ہیں، ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب مد ظلہم کی مجلس میں بھی حاضر ہوتے ہیں۔

یہ تو ہماری شامت اعمال ہے کہ ایسے ایسے عظیم بزرگوں کا جلوہ جہاں آرا دیکھا، ان کے کردار و عمل کی عظمتوں کا مشاہدہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی نصائح سے مستفید ہونے کا موقع بخشا، لیکن اپنی عملی حالت زار جوں کی توں رہی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا تصور کرتا ہوں کہ اس نے کسی استحقاق کے بغیر ایسے بزرگوں کی محبت و توجہ خاص کا مورد بنایا تو اس پر ادائے شکر کے لئے الفاظ نہیں ملتے، اور ندامت کے ساتھ یہ امید بھی بندھتی ہے کہ شاید ان بزرگوں کی محبت و توجہ کے طفیل بیڑا پار ہو جائے۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہٗ نے برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی اور اس ناکارہ کے ساتھ جس خصوصی شفقت کا معاملہ فرمایا وہ انہی کا حصہ تھا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کی حیات میں ان کو ہماری تربیت کے بارے میں تقریباً ہر خط میں مشورے تحریر فرماتے رہتے، پھر حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد ہمارے شیخ و مربی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مد ظلہم کو بھی تقریباً ہر مکتوب میں ہمارے بارے میں تحریر فرماتے رہتے تھے، اور ایک مرتبہ تو یہاں تک لکھ دیا کہ ان دونوں کی اصلاح و تربیت میں اپنا پورا زور لگا دیجئے۔

دارالعلوم کے ساتھ تعلق کا یہ عالم کہ شہر سے باہر ہونے کی بنا پر یہاں آنا جوانوں اور تندرستوں پر بھی شاق گزرتا ہے، لیکن حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد کراچی آنا ہوا تو معذوری اور ضعف کے باوجود یہاں تشریف لائے اور نصیحتیں فرمائیں، پھر ہمیں خلوت میں کی مسجد بلایا، اور گراں قدر نصیحتوں سے نوازا۔

حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد پہلی بار احقر کی مدینہ طیبہ حاضری ہوئی تو مغرب کا وقت تھا، مغرب سے عشاء تک حضرتؒ کا معمول یہ تھا کہ حرم شریف میں مراقب رہتے تھے، احقر کو معلوم تھا کہ حضرتؒ حرم شریف میں کسی سے بات چیت نہیں کرتے، اس لئے

اس وقت حاضری کی ہمت نہ ہو رہی تھی' لیکن حضرتؒ کے خدام میں سے کسی نے بتا دیا تو اسی وقت اپنے پاس بلایا' گلے لگایا' اور فرمایا :

"جتنے دن یہاں ہو' کھانا میرے ساتھ کھانا' دوپہر کا کھانا ظہر کے فوراً بعد' اور رات کا عشاء کے فوراً بعد ہوتا ہے' لیکن اگر کوئی دعوت کرے تو قبول کر لینا' پابندی بھرنے کی ضرورت نہیں' اب عشاء کے بعد ملاقات ہوگی' السلام علیکم"۔

یہ محبت بھرے مختصر جملے سن کر میں حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا کہ چند لمحوں میں کتنے متضاد حقوق ادا فرما دیئے' بقدر ضرورت بات بھی کر لی' اور حرم شریف میں مصروف عبادت رہنے کا معمول بھی باقی رکھا' حضرت والد صاحبؒ کے تعلق سے احقر کے ساتھ محبت کا حق بھی ادا فرما دیا' کھانے کی دعوت کے ذریعے عزت افزائی بھی فرما دی' لیکن ساتھ ہی یہ خیال ہوا ہوگا کہ اگر کوئی دوسرا شخص اس کی دعوت کرے گا تو کھانے کی اس پابندی کی بنا پر یہ کشمکش میں پڑے گا' اس طرح یہ مستقل دعوت کہیں زحمت نہ بن جائے' اس لئے دعوت قبول کرنے کی اجازت بھی دے دی' اپنے آپ کو بھی فارغ رکھا' اور احقر کو بھی فارغ فرما دیا۔ حقوق و حدود کی یہ رعایت اللہ تعالیٰ اپنی توفیق خاص ہی سے اپنے خاص بندوں کو عنایت فرماتے ہیں۔

پھر جتنے دن احقر مدینہ طیبہ میں مقیم رہا' اپنے ساتھ کھانے میں شریک فرماتے' خود چیزیں اٹھا اٹھا کر دیتے' اور شفقتوں کی وہ انتہاء فرماتے کہ احقر بعض اوقات پانی پانی ہو جاتا۔

احقر کبھی کبھی حضرتؒ کو خط لکھتا رہتا تھا' اور زیادہ خط لکھنے سے اس لئے حجاب ہوتا تھا کہ حضرتؒ پر جواب دینے کا بار نہ ہو' ایک مرتبہ اپنی اس کشمکش کو خط میں لکھ دیا تو جواب میں تحریر فرمایا۔ "تم اس بات سے نہ گھبرایا کرو' مجھے تو خود تمہیں خط لکھنے کو کھاج اٹھے۔"

پچھلے سال جب وفاقی شرعی عدالت کی خدمت ناگہانی طور پر احقر کے سپرد ہو گئی تو احقر دو وجہ سے پریشان تھا' ایک اس لئے کہ دارالعلوم کی خدمات سے علیحدگی طبعاً احقر کو ناقابل برداشت معلوم ہوتی تھی' دوسرے یہ بھی تردد تھا کہ نہ جانے احقر کے لئے دینی اعتبار سے یہ مناسب بھی ہے یا نہیں؟ اگرچہ اپنے شیخ و مربی حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم العالی سے استصواب کے بعد دوسری جہت سے اطمینان ہو گیا تھا' اور اسی کے بعد اس خدمت کو عبوری طور پر احقر نے قبول کیا' لیکن طبعاً دارالعلوم کی ذمہ داریوں کی بنا پر ایک ہمہ وقتی تردد

لاحق تھا، اسی حالت میں حضرت شیخ الحدیث کا ازخود گرامی نامہ آیا جس میں اس خدمت پر مبارکباد اور دعائیں تحریر تھیں۔ اس موقع پر ان کے مکتوب نے احقر کی بہت ڈھارس بندھائی، اور کام کا حوصلہ بڑھایا۔

اب حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر مصروف شخصیت کی نگاہ کس طرح اپنے ایک ایک دور افتادہ خادم کے حالات پر رہتی تھی، اور وہ کیسے کیسے مراحل پر اپنے خدام کی دستگیری فرماتے تھے۔

نہ جانے کتنی مدت سے حضرت شیخ وصل کے انتظار، بلکہ اشتیاق میں تھے۔ ایک مرتبہ احقر نے خط میں لکھا کہ "اللہ تعالیٰ آنجناب کے سایہ شفقت کو ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھے" اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ "اب تو میرے لئے طول عمر کی دعا کے بجائے خاتمہ بالخیر کی دعا کیا کرو۔"

ایک مرتبہ حضرت والد صاحبؒ کے نام اپنے ایک خط میں اپنے اشتیاق کا اظہار اس طرح فرمایا کہ "طویل مدت کے لئے مدینہ طیبہ آکر مقیم رہتا ہوں، لیکن یہاں کی مٹی مجھے قبول نہیں کر رہی، پھر کسی کام کی وجہ سے واپس جانا پڑتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں رکھ کر دینی فیض جاری کرنے منظور تھے، اس لئے کئی سال وہاں آپ کا فیض جاری رہا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی دیرینہ آرزو پوری فرمائی، مدینہ طیبہ کی مقدس سرزمین اور اپنے آقا و مولیٰؐ کے قدموں میں آپ نے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ انشاء اللہ اس نے اپنے اس خاص بندے کے ساتھ رحمت کا خصوصی معاملہ فرمایا ہوگا، لیکن آپ کی ذات والا صفات سے محرومی پورے عالم اسلام کا عظیم نقصان ہے، عالم اسلام کا ہر فرد اس وقت تعزیت کا مستحق ہے۔

اللّٰهم اكرم نزله، ووسع مدخله، وابدله دارا خيرا من داره، واهلا خيرا من اهله، ونقه من الخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس، وباعد بينه وبين

فضلاء کی جماعت بین المشرق والمغرب۔ اللہم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔
یوں تو عالم اسلام کا ہر فرد اس صدمے پر مستحق تعزیت ہے لیکن دارالعلوم اور البلاغ کے خدام خاص طور پر حضرتؒ کے اہل و عیال کی خدمت میں پیغام تعزیت پیش کرنے کے بعد دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کو مقعد صدق میں پیہم ترقی درجات عطا فرمائیں، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں، اور حضرتؒ نے اپنی تصانیف کے ذریعے تعلیمات و ہدایات کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے ہم سب کو اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

البلاغ جلد ۲ شمارہ ۹

* * *

حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی ؒ

ابھی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ کی وفات پر آنسو خشک نہیں ہوئے تھے کہ پاکستان میں حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی ؒ بھی داغ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا افغانی قدس سرہ ایک عرصے سے اپنے ضعف و علالت کی بناء پر اپنے آبائی گاؤں ترنگ زئی میں گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے تھے، لیکن ماضی میں انہوں نے بھرپور علمی اور عملی زندگی گزاری، اور وہ ملک کی ان گنی چنی شخصیتوں میں سے تھے کہ جب بھی ملک میں کسی علمی اور تحقیقی کام کا تصور آتا تو نظریں خود بخود ان کی طرف اٹھتی تھیں۔

حضرت مولانا افغانی ؒ نے دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم دینی ادارے سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہیں پر تدریسی خدمات انجام دیں، یہاں تک کہ وہاں شیخ التفسیر کے منصب پر فائز ہوگئے۔

۱۹۲۳ء میں ہندوستان میں ہندوؤں کی شدھی تحریک کے زیر اثر فتنہ ارتداد زوروں پر تھا، دارالعلوم دیوبند نے اس موقع پر اس فتنے کی روک تھام کیلئے پچاس مبلغین راجپوتانہ بھیجے، اس تبلیغی وفد کا سربراہ حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی قدس سرہ کو بنایا گیا۔ حضرت مولانا نے "شدھی" تحریک کے خلاف اپنا تبلیغی مرکز آگرہ میں قائم کیا، اور پھر راجپوتانہ کے طول و عرض میں اپنی تبلیغی مساعی کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی موثر جدوجہد کے نتیجے میں بفضلہ تعالیٰ ہزاروں ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوئے، ہزاروں مسلمان جو اپنی جہالت کی بناء پر ارتداد کے دہانے پر کھڑے تھے، انہیں ارتداد کے خطرے سے نجات ملی۔ شدھی تحریک کے رہنما مذکورہ علاقوں سے جان چھڑا کر بھاگنے پر مجبور ہوئے، اور جن ہندوؤں کو قبول اسلام کی توفیق ہوئی ان کی کٹی ہوئی چوٹیوں کے بال سیروں کے حساب سے بطور یادگار دارالعلوم دیوبند روانہ کئے گئے۔

حضرت مولانا کی اس کامیاب جدوجہد پر خراج تحسین پیش کرنے کیلئے دارالعلوم دیوبند میں ایک جلسہ ہوا جس میں امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی جیسے بزرگوں نے مولانا کے اس کارنامے پر انہیں داد و تحسین سے نوازا، اور ان کو دلی دعائیں دیں۔

۱۹۳۹ء میں قلات کی طرف سے آپ کو ریاست قلات میں وزیر معارف (وزیر تعلیم) کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ آپ نے یہ منصب اکابر دارالعلوم کے مشورے پر قبول فرمایا۔ اس زمانے میں قلات کے اندر قضاء شرعی کا نظام نافذ تھا اور یہ نظام وزارت معارف کے تحت کام کرتا تھا، حضرت مولانا نے اس نظام کو فعال بنایا، اور پوری ریاست میں مقدمات کے فیصلے شریعت کے ماتحت ہونے لگے۔ اس نظام کی آخری عدالت مرافعہ خود حضرت مولانا کی عدالت تھی، چنانچہ سالہا سال آپ نے قلات میں قضاء شرعی کا عملی تجربہ فرمایا، اور اس دوران اسلامی قوانین اور قضاء شرعی پر متعدد کتابیں تالیف فرمائیں، جن میں "معین القضاۃ والمفتین" عربی زبان میں ہے، اور اس نے متعدد عرب ممالک میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ اردو زبان میں "شرعی ضابطہ دیوانی" کے نام سے آپ نے اسلام کے دیوانی قوانین کو دفعات کی صورت میں مرتب فرمایا۔

۱۹۵۵ء میں جب قلات کے اس نظام قضاء کو سیکولر عدالتوں کے تابع کر دیا گیا تو اس وقت آپ "وزارت معارف" سے مستعفی ہو گئے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ پاک و ہند میں قضاء شرعی کا جتنا تجربہ مولانا کو تھا، برصغیر میں کسی اور کو نہ تھا۔

غیر منقسم ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے بعد دینی تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تھا، وہاں بھی حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کی برکت سے اصحاب علم و فضل کا جتنا بڑا اجتماع ہوا، دارالعلوم دیوبند کے بعد برصغیر کے کسی مدرسے میں نہیں ہوا۔ حضرت مولانا افغانیؒ عرصہ دراز تک وہاں بھی صدر مدرس رہے، اور بخاری شریف کا درس دیتے رہے۔

قیام پاکستان کے کافی عرصہ بعد جب جامعہ عباسیہ کی جگہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا قیام عمل میں آیا تو حضرت مولانا اس میں شعبہ تفسیر کے صدر رہے، اور اس حیثیت میں خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ آپ مختلف زمانوں میں کراچی کے مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ، لاہور

کے مدرسہ قاسم العلوم اور (ٹھٹھہ) کے دارالفیوض الہاشمیہ میں بھی صدر مدرس کے عہدے پر فائز رہے، اور درس کے ذریعے ایک عالم کو سیراب کیا۔

۱۹۷۷ء میں جب موجودہ حکومت نے اسلامی نظریاتی کونسل کی از سر نو تشکیل کر کے اسلامی قوانین کی تدوین کا کام اس کے سپرد کیا تو ابتداءً علماء دیوبند میں سے حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کو اس کا رکن نامزد کیا تھا، لیکن حضرت بنوریؒ صرف چند مجلسوں ہی میں شامل ہو سکے تھے کہ ان کا وقت موعود آ پہنچا، اور کونسل ان کی خدمات سے محروم ہو گئی۔ ان کی جگہ پر کرنے کیلئے کوئی اسی معیار کی شخصیت ضروری تھی، حضرت مولانا افغانی قدس سرہ اگرچہ اس وقت کافی ضعیف ہو چکے تھے، لیکن ان کے علم اور تجربے کے پیش نظر اس منصب کیلئے انہیں کا انتخاب عمل میں آیا، اور آپ کئی سال کونسل کے رکن کی حیثیت میں خدمت انجام دیتے رہے۔

احقر کو اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے طفیل حضرت مولانا افغانیؒ سے نیاز تو بہت پہلے کا حاصل تھا، زیارت بھی بار بار ہوئی تھی، لیکن قریب سے استفادہ کی نوبت اسی وقت آئی جب آپ کونسل کے رکن بنے۔ احقر بھی اس وقت کونسل کا رکن تھا، اور اس طرح حضرت مولاناؒ کے علم، تفقہ اور بصیرت سے استفادے کا بکثرت موقع ملتا رہتا تھا۔ اگرچہ حضرت مولاناؒ اپنے ضعف اور علالت کی بنا پر مجلس میں فعال حصہ لینے سے معذور ہو گئے تھے، لیکن ہم لوگوں کو جہاں کوئی علمی مشکل پیش آئی، ہم حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے، اور اکثر و بیشتر گرہ کھل جاتی۔

اس ضعف کے عالم میں بھی مولاناؒ کا علمی استحضار اور آپ کی قوت تحمل ہم جوانوں کیلئے قابل رشک اور سرمہ بصیرت تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ ہم کسی مسئلے کو کتابوں میں تلاش کرنے کی فکر میں تھے، اور مطلوبہ کتابیں میسر نہ آ رہی تھیں، مولاناؒ سے مسئلے کا ذکر آیا تو انہوں نے اس طرح اس مسئلے کی تقریر فرمادی جیسے رات مطالعہ کر کے تشریف لائے ہوں۔

احقر کے ساتھ حضرت مولاناؒ جو خصوصی شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں ہے۔ میں جب بھی حاضر خدمت ہوتا، آپ انتہائی شفقت اور خندہ پیشانی سے پیش آتے، احقر کی بات انتہائی توجہ سے سنتے، اور اسے نہ صرف وزن دیتے، بلکہ بارہا مجلس میں اس بات کا اظہار فرمایا کہ جس مجلس میں تم ہوتے ہو، مجھے اس میں حاضر ہونے

کی زیادہ فکر نہیں ہوتی کیونکہ میں تمہاری رائے سے آنکھ بند کرکے بھی اتفاق کرسکتا ہوں۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت، حسن ظن اور اعتماد کا یہ انداز بعض اوقات احقر کو پانی پانی کردیتا تھا۔

علماء دیوبند میں تمام بزرگوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انہوں نے صرف حروف و نقوش کے علم پر کبھی اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ تزکیہ نفس کے لئے کسی شیخ کامل سے وابستگی کو ہمیشہ ضروری سمجھا۔ حضرت مولانا افغانی قدس سرہ نے بھی تحصیل علم کے بعد اس غرض کے لئے متعدد مشائخ سے رجوع فرمایا، بالآخر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ اجل حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ سے اجازت حاصل ہوئی۔

قحط الرجال کے اس دور میں جب علم راسخ رکھنے والے حضرات ناپید ہورہے ہیں، حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانیؒ کی حیثیت ایک روشن چراغ کی سی تھی، جس کے تصور سے بھی دل کو اطمینان و تسلی کی دولت نصیب ہوتی تھی۔ افسوس کہ یہ چراغ آج گل ہوگیا، اور ملت اسلامیہ اپنے ایک عظیم محسن سے محروم ہوگئی۔ ان کی وفات کسی ایک فرد، یا ایک خاندان کا نہیں، بلکہ پورے ملک، پوری ملت اسلامیہ کا نقصان عظیم ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی روح پر فتوح پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین، ثم آمین۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

یہ دلگداز خبر اب تک پرانی بھی ہو چکی ہوگی کہ دارالعلوم دیوبند میں سلف کی آخری یادگار حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیں داغ مفارقت دیکر اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ لیکن اس سانحے کی ٹیس نہ جانے کب تک دلوں میں تازہ رہے گی، اس لئے کہ یہ صرف کسی ایک شخص کی وفات نہیں، یہ ایک پورے عہد کا، اس کے مزاج ومذاق کا، اور اس کی دلآویز خصوصیات کا خاتمہ ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تھدما

حضرت قاری صاحب قدس سرہ کی ذات گرامی دارالعلوم دیوبند کے اس بابرکت دور کی دلکش یادگار تھی جس نے حضرت شیخ الہندؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور ان جیسے دوسرے حضرات کا جلوہ جہاں آرا دیکھا تھا۔ جس ہستی کی تعلیم و تربیت میں علم و عمل کے ان مجسم پیکروں نے حصہ لیا ہو، اس کے اوصاف و کمالات کا ٹھیک ٹھیک ادراک بھی ہم جیسوں کیلئے مشکل ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ علم کے پیکر میں معصومیت، حسن اخلاق اور علم و عمل کے جو نمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں ان کے نقوش دل و دماغ سے محو نہیں ہو سکتے۔

حضرت قاری صاحب قدس سرہ، بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے پوتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے حکمت دین کی جو معرفت حضرت نانوتوی قدس سرہ کو عطا فرمائی تھی، اس دور میں حضرت قاری صاحبؒ اس کے تنہا وارث تھے۔ حضرت نانوتویؒ کے علوم کو جن حضرات نے اپنے مزاج و مذاق میں جذب کرکے انہیں شرح و بسط کے ساتھ امت کے سامنے پیش کیا، ان میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے بعد حضرت قاری صاحبؒ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

حضرت قاری صاحب قدس سرہ کو تعلیم سے فراغت کے بعد تدریس اور تصنیف کے

لئے باقاعدہ وقت بہت کم ملا، اور نو عمری ہی میں دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم الشان ادارے کے انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آگئیں۔ ان ذمہ داریوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو عموماً علمی مشاغل سے دور کرکے اس کی علمی استعداد پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں، لیکن حضرت قاری صاحب قدس سرہ کا معاملہ اس لحاظ سے بھی حیرت انگیز تھا۔ انتظامی بکھیڑوں میں جکڑا رہنے کے باوجود ان کا علمی مذاق ہمیشہ تازہ اور ان کی علمی استعداد سدا بہار رہی۔

احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ، اور حضرت قاری صاحب قدس سرہ بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی اور زندگی کے ہر مرحلے میں ایک دوسرے کے رفیق رہے، دونوں نے دارالعلوم دیوبند میں ساتھ پڑھا، ساتھ فارغ ہوئے، ساتھ ہی پڑھانا شروع کیا، دونوں ایک ہی وقت حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے دست مبارک پر بیعت ہوئے، اور پھر حضرتؒ کی وفات کے بعد ایک ہی ساتھ تھانہ بھون حاضر ہو کر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، اور تقریباً ساتھ ہی ساتھ دونوں کو حضرت تھانویؒ کی طرف سے خلافت عطا ہوئی۔ ۱۳۳۵ھ میں سب سے پہلا حج بھی دونوں نے ساتھ کیا، غرض ظاہری تعلیم، اور باطنی تربیت سے لیکر سیرو تفریح تک ہر چیز میں دونوں کی رفاقت مثالی رفاقت تھی۔

پھر جب قیام پاکستان کی تحریک شروع ہوئی، اور آزادئ ہند کے طریق کار سے متعلق علماء دیوبند کے درمیان اختلاف رونما ہوا تو حضرت والد صاحبؒ کی طرح حضرت قاری صاحبؒ کا نقطہ نظر بھی حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی رائے کی طرف مائل تھا، لیکن حضرت قاری صاحبؒ نے اپنے آپ کو عملی سیاست سے بالکلیہ یکسو کرکے ہمہ تن دارالعلوم دیوبند کی خدمت کیلئے وقف کیا ہوا تھا، اس لئے یہ نقطہ نظر اسٹیج پر نہ آسکا، حضرت والد صاحبؒ قیام پاکستان کے بعد یہاں تشریف لے آئے، اور حضرت قاری صاحبؒ کیلئے دارالعلوم کی گراں بار ذمہ داری کے پیش نظر دیوبند چھوڑنے کا سوال ہی نہ تھا، لیکن یہ بات میں نے حضرت قاری صاحبؒ سے بارہا سنی کہ جس روز حضرت مفتی صاحب دیوبند سے پاکستان کیلئے روانہ ہوئے، اس روز میں دن بھر روتا رہا۔ آپ نے حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی مکتوب ارسال فرمایا، اس میں بھی لکھا تھا کہ :-

"تقسیم ملک کے بعد جب آپ نے پاکستانی قومیت اختیار فرمائی، اور یہاں سے ہجرت فرما کر پاکستان تشریف لے گئے تو میں کسی مرنے والے کے لئے بھی اتنا کبھی نہیں رویا تھا جتنا آپ کے فراق پر رویا تھا، یہ حالت دیکھ کر سب گھر والے پریشان ہو گئے تھے کہ آخر کیا حادثہ پیش آیا جو اتنا گریہ طاری ہے، یہ تعلق کی بنا پر تھا کہ ابتدائے عہد سے ہم رفیق رہے تھے"۔

(البلاغ "مفتی اعظم" نمبر ص ۳۰)

اس کے بعد سے وہ ہمہ وقتی رفاقت چھوٹ گئی، لیکن قلب و روح کا رشتہ کسی مرحلے پر نہ ٹوٹا، ایک مرتبہ حضرت قاری صاحب قدس سرہ نے خط میں حضرت والد صاحبؒ کو لکھا :۔

"کل میاں متحسن صاحب فاروقی کے ساتھ مولوی ظہور احمد صاحب نے میری بھی دعوت کی تھی، آپ ہی کے مکان سے متصل منشی بشیر احمد صاحب مرحوم کے مکان میں کھانا کھلایا، مکان دیکھ کر مکینوں کی یاد تازہ ہو گئی، اور دیر تک اس تصور میں استغراق رہا"

یہ لکھنے کے بعد حضرت قاری صاحب قدس سرہ نے متمم بن نویرہ کے ان اشعار سے تمثل فرمایا کہ۔

وكنا كندماني جذيمة حقبة
من الدهر حتى قيل لن يتصدعا
فلما تفرقنا كأني ومالكا
لطول اجتماع لم نبت ليلة معا

قیام پاکستان کے بعد بارہا حضرت قاری صاحب قدس سرہ کراچی تشریف لائے، اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کراچی تشریف لانے کے بعد آپ دارالعلوم تشریف نہ لائیں۔ چنانچہ ہر بار خدام دارالعلوم کو اپنی شفقتوں سے بہرہ ور فرماتے، طلباء اور اساتذہ سے خطاب بھی ہوتا، اور پھر حضرت والد صاحبؒ اور ان کے درمیان جو باغ و بہار مجلس ہوتی، اس میں علمی تبادلہ خیال کے علاوہ ماضی کے تذکرے، زمانۂ طالب علمی کی یادیں، اساتذہ کے واقعات، اور نہ جانے کتنے موضوعات پر گفتگو آتی، اور ہم خدام کو افادات کا نہ جانے کتنا خزانہ ہاتھ آجاتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحب قدس سرہ کو تصنیف اور خطابت دونوں میں کمال

رہا فرمایا تھا، اگرچہ انتظامی مشاغل کے ساتھ سفروں کی کثرت بھی حضرت کی زندگی کا جزو لازم بن کر رہ گئی تھی، حساب لگایا جائے تو عجب نہیں کہ آدھی عمر سفر ہی میں بسر ہوئی ہو، لیکن حیرت ہے کہ ان مصروفیات کے باوجود آپ تصنیف و تالیف کیلئے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ چنانچہ آپ کی درجنوں تصانیف آپ کے بلند علمی مقام کی شاہد ہیں، اور ان کے مطالعہ سے دین کی عظمت و محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

جہاں تک وعظ و خطابت کا تعلق ہے، اس میں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آجکل ہوا کرتے ہیں، حضرت قاری صاحب کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے، نہ جوش و خروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پُر تکلف لسانی، نہ لہجہ اور ترنم، نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر موثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے، مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ، لیکن انداز بیان اتنا سہل کہ مشکل مباحث بھی پانی ہو کر رہ جاتے۔ جوش و خروش نام کو نہ تھا، لیکن الفاظ و معانی کی ایک نہر تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی، اور قلب و دماغ کو نہال کردیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں۔ ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا جو انسان کو زیر و زبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔

حضرت قاری صاحب نے مخالف فرقوں کی تردید کو بھی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا، لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی، اور کتنے غلط عقائد و نظریات سے تائب ہوئے۔

لاہور میں ایک صاحب علماء دیوبند کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے سے بہت متاثر اور علماء دیوبند سے بری طرح برگشتہ تھے، غرض طرح طرح کی بدگمانیاں تھیں حتیٰ کہ ان کو کفر و ایمان کا معیار قرار دینے والے، اتفاق سے قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ لاہور تشریف لائے، اور وہاں ایک مسجد میں آپ کے وعظ کا اعلان ہوا، یہ صاحب خود سناتے ہیں کہ میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ان کے وعظ میں اسی نیت سے پہنچا کہ انہیں اعتراضات کا نشانہ بناؤں گا،

اور موقع ملا تو اس مجلس کو خراب کرنے کی کوشش کروں گا۔

لیکن اول تو ابھی تقریر شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت قاری صاحبؒ کا معصوم اور پر نور چہرہ دیکھ کر ہی اپنے عزائم میں زلزلہ سا آگیا، دل نے اندر سے گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی بے ادب گستاخ یا گمراہ کا نہیں ہو سکتا، پھر جب وعظ شروع ہوا اور اس میں دین کے جو حقائق و معارف سامنے آئے تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ علم دین کسے کہتے ہیں؟ یہاں تک کہ تقریر کے اختتام تک میں حضرت قاری صاحبؒ کے آگے موم ہو چکا تھا، میں نے اپنے سابقہ خیالات سے توبہ کی، اور اللہ تعالیٰ نے بزرگان دین کے بارے میں ایسی بدگمانیوں سے نجات عطا فرمائی۔

برصغیر کا تو شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں حضرت قاری صاحبؒ کی آواز نہ پہنچی ہو، اس کے علاوہ افریقہ، یورپ، اور امریکہ تک آپ کے وعظ و ارشاد کے فیوض پھیلے ہوئے ہیں، اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا منصبِ اہتمام کوئی معمولی چیز نہ تھی، حضرت قاری صاحبؒ نے پچاس سال سے زائد اس منصب کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا، اس دوران دارالعلوم پر نہ جانے کتنے کٹھن اور نازک دور آئے، لیکن حضرت قاری صاحبؒ نے ان تمام جھمیلوں کو نمٹایا، اور اپنی ساری زندگی دارالعلوم کی خدمت کیلئے وقف کر دی، سخت سے سخت مرحلوں پر بھی انہیں پر سکون ہی دیکھا۔ اجلاس صد سالہ کا ہنگامہ دارالعلوم کے منتظمین کے لئے ایک کڑی آزمائش کی حیثیت رکھتا تھا، دیوبند جیسی مختصر جگہ میں لاکھوں افراد کے اجتماع کا انتظام انتہائی مشکل کام تھا، کوئی اور ہوتا تو اس موقع پر سراسیمگی سے نجات حاصل نہ کر سکتا، لیکن ٹھیک اجلاس کے افتتاح کے روز حضرت قاری صاحبؒ کے پاس حاضری ہوئی تو حسب معمول انہیں متبسم اور پُر سکون دیکھا، چہرے پر تھکن ضرور تھی، لیکن گھبراہٹ اور پریشانی نام کو نہ تھی۔

افسوس ہے کہ اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم میں باہمی اختلافات نے جن طوفانی ہنگاموں کی شکل اختیار کی، انہوں نے ماضی کے تمام ہنگاموں کو مات کر دیا، دور ہونے کی وجہ سے ہمیں تمام حالات و واقعات سے واقفیت تو نہ تھی، لیکن اس بات سے دل بے چین تھا کہ اس آخری عمر میں حضرت قاری صاحبؒ پر ان ہنگاموں کی وجہ سے کیا بیت رہی ہوگی؟ اس

زمانے کے حالات اس قدر پیچیدہ اور ان کے بارے میں ملنے والی اطلاعات اتنی متضاد ہیں کہ اب حق و باطل کا فیصلہ تو شاید آخرت ہی میں ہو سکے گا، لیکن اتنی بات واضح ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کے چھوٹوں نے ان کی نصف صدی سے زائد کی خدمات کا جو صلہ اس آخری عمر میں ان کو دیا ہے، وہ انتہائی تکلیف دہ ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی تک ایک خفیف سی امید باقی تھی کہ شاید اس بحران کا کوئی مناسب حل نکل آئے، لیکن اب ان کی وفات نے اس امید کو بھی خاکستر کر دیا۔ حضرت قاری صاحبؒ کے دم سے دارالعلوم میں بزرگوں کی روایات زندہ تھیں، اور اس کے مخصوص مزاج و مذاق کی جھلک باقی تھی، اب دارالعلوم کی ان روایات کا اللہ ہی حافظ ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کی وفات بلاشبہ پوری امت کیلئے عظیم سانحہ ہے، اور ہم میں سے ہر شخص پر ان کا حق ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق انہیں ایصال ثواب کریں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں درجات عالیہ عطا فرمائیں، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی دولت سے نوازیں۔

اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

مولانا قاضی سعد اللہ صاحبؒ

اسی مہینے ملک و ملت کا دوسرا عظیم نقصان حضرت مولانا قاضی سعد اللہ صاحبؒ کی وفات کی صورت میں رونما ہوا۔ حضرت مولانا قاضی سعد اللہ صاحبؒ کو بلوچستان میں بجا طور پر حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی قدس سرہ کا جانشین کہا جا سکتا ہے۔

وہ بلوچستان کے ان جلیل القدر علماء میں سے تھے جن کو حضرت مولانا افغانیؒ نے اپنی وزارت معارف کے زمانے میں قضاء شرعی کیلئے منتخب فرمایا تھا۔ انہوں نے عرصہ دراز تک حضرت مولانا افغانیؒ کی نگرانی میں قضاء کی خدمت انجام دی' یہاں تک کہ آپ کا شمار قلات کے نظام قضاء میں وہاں کے قابل ترین قاضیوں میں ہونے لگا' اور بالآخر ان کو قلات کی "مجلس شوریٰ" کا رکن نامزد کیا گیا' جو وہاں کی عدالت اپیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

قاضی صاحب مرحوم سے غائبانہ تعارف سب سے پہلے اس وقت ہوا جب برادر مکرم حضرت مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی مد ظلہم نے اپنے ایک دورہ بلوچستان کے دوران مستونگ میں قاضی صاحب سے ملاقات کا ذکر کیا' اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ میں نے وہاں ان کے تحریر کردہ بعض فیصلے دیکھے' اور اس بات پر بہت مسرت ہوئی کہ بحمد اللہ ابھی قضاء شرعی کے جاننے والے ملک میں موجود ہیں۔

اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ سے قاضی صاحبؒ کا تذکرہ آیا تو انہوں نے بھی قاضی صاحبؒ کی پختہ علمی استعداد' فقہی نظر اور قضاء شرعی کے کام میں ان کی مہارت کی تعریف فرمائی۔ میں اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن تھا' اس لئے حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ آپ حضرات کونسل کے کام میں ان سے بھی مشورہ اور تعاون لیا کریں تو بہتر ہے۔ چنانچہ احقر کی درخواست پر انہیں ایک مرتبہ کونسل کے اجلاس میں خصوصی طور پر بحیثیت مشیر مدعو کیا گیا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اس اجلاس کے دوران میری درخواست پر انہوں نے قیام دارالعلوم ہی میں فرمایا' اور اس طرح ان سے تبادلہ خیال اور استفادہ کا خوب موقع ملا' جس نے ان کے علمی رسوخ' فہم

سلیم اور اصابت فکر کا ایک نقش دل پر قائم کر دیا۔

بعد میں احقر کونسل سے مستعفی ہو گیا' اور اس کے تقریباً سال بھر کے بعد جب کونسل کی از سر نو تشکیل ہوئی تو قاضی صاحب اس کے باقاعدہ رکن بن گئے۔ اس نامزدگی میں احقر کی خواہش اور کوشش کو بھی دخل تھا' اس لئے ان کی اس رکنیت سے مجھے بڑی مسرت اور طمانیت حاصل ہوئی۔

توقع کے مطابق قاضی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے کونسل کی کارروائیوں میں نمایاں خدمات انجام دیں' یہاں تک کہ کونسل کا مرتب کردہ "قانون شہادت" جس کی موافقت اور مخالفت کا پچھلے دنوں ملک میں بڑا شور رہا' اس کا ابتدائی مسودہ بنیادی طور پر قاضی صاحب مرحوم نے ہی تیار کیا تھا' اس مسودے کی تیاری کے دوران قاضی صاحبؒ ہمارے دارالعلوم ہی میں قیام پذیر رہے' اور یہاں کے کتب خانے سے استفادہ فرماتے رہے۔ اتفاق سے میں اپنے گوناگوں مشاغل کی وجہ سے اس کام میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں بٹا سکا' بلکہ اب تک اس مسودے کے مطالعے سے بھی محروم رہا' لیکن قاضی صاحب کے علم اور تجربے سے یہی امید تھی کہ انشاء اللہ وہ اس کام کو مطلوبہ قابلیت کے ساتھ انجام دیں گے۔

مدت دراز سے احقر کی خواہش تھی کہ ملک میں کوئی ادارہ ایسا ہونا چاہیے جہاں قضاء شرعی کی تربیت کا مناسب انتظام ہو۔ چنانچہ کئی سال قبل میں نے قاضی صاحبؒ سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے چند ماہ کا کورس دارالعلوم میں شروع کرنے پر آمادگی ظاہر فرمائی' اور کئی سال کی حیص بیص کے بعد بالآخر گزشتہ سے پیوستہ سال دارالعلوم میں چار ماہ کا تربیتی کورس شروع کیا گیا۔ اس میں قاضی صاحب کو سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل تھی۔ انھوں نے ہی مولانا قاضی محمد ہارون صاحب مینگل کو بھی اس خدمت پر آمادہ فرمایا' اور بفضلہ تعالیٰ چار ماہ کا یہ تربیتی کورس اپنی مختصر مدت کے باوجود نہایت کامیاب رہا۔ پھر ہم نے اپنے عزیز دوست مولانا قاضی بشیر احمد صاحب کو بھی آزاد کشمیر سے مدعو کر لیا جنھوں نے اس میں مزید جان ڈال دی۔

لیکن اس چار ماہ کے دوران قاضی صاحبؒ نے بیشتر وقت دارالعلوم میں گزارا اور اس دوران "قانون شہادت" کی ابتدائی تسوید کا کام بھی کرتے رہے' بلکہ اس طویل مدت تک غیر حاضری کے سلسلے میں انھیں اپنے ضابطے کے افسران بالا کا معتوب بھی بننا

پڑا، یہاں تک کہ وہ ان کے طرز عمل سے دل برداشتہ ہو کر مجلس شوریٰ کی رکنیت سے مستعفی بھی ہو گئے۔

قاضی صاحب جس عمر اور جن قُویٰ کے بزرگ تھے، ان کے پیش نظر کبھی یہ تصور بھی نہ آسکتا تھا کہ وہ اتنی جلد ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔ مارچ ۱۹۸۳ء میں ایک دن اچانک مجھے ان کا پیغام ملا کہ میں کوئٹہ سے آکر جناح اسپتال کراچی میں داخل ہوں، اور ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ احقر اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مد ظلہم کے ہمراہ ہسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ ان پر فالج کا معمولی اثر ہوا ہے، حالت بظاہر قابل اطمینان تھی، اور طبیعت صحت کی طرف مائل۔ لیکن وہ ہمیں دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے، دیر تک ہمارا ہاتھ اپنے سینے پر رکھے رہے، اس وقت ان پر فکر آخرت کا غلبہ تھا، ہم نے تسلی دی، مگر ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اپنا وقت قریب دیکھ رہے ہیں۔

اتفاق سے اگلے ہی دن مجھے سعودی عرب کا سفر درپیش تھا، میں وہاں چلا گیا، اور واپسی کے بعد تصور یہ رہا کہ وہ صحت یاب ہو کر جا چکے ہوں گے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کافی عرصہ کراچی میں رہنے کے بعد واپس تشریف لے گئے، علاج مسلسل جاری رہا، لیکن ان کی صحت بحال نہ ہو سکی۔ اچانک ایک دن میں اسلام آباد میں تھا تو وہاں اخبار میں ان کی وفات کی خبر نظر آئی۔ دل کو شدید دھکا لگا، لیکن حقائق کو جھٹلانا ممکن نہ تھا۔ ان کے صاحبزادے ہمارے دارالعلوم میں زیر تعلیم ہیں، میں نے فون کیا تو خبر کی تصدیق ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں وہ حاکم بھی ہیں، حکیم بھی، ان کا ہر فیصلہ حکمت کے عین مطابق ہے۔ ہماری سمجھ آئے، یا نہ آئے، لیکن ہم کوتاہ بینوں کے لئے تو بظاہر یہ ایک عظیم نقصان ہے۔ ابھی ان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں، اور ملک کو بظاہر ان کی خدمات کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ ساری باتیں کوتاہ بینی کی ہیں۔ حکمت کا تقاضہ یقیناً وہی تھا جو مشیت باری کے تحت عمل میں آیا۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں درجات عالیہ سے نوازے، ان کی دینی خدمات کو قبول فرمائے، اور پسماندگان کو اس صدمے کے سہنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین۔

البلاغ جلد ۱۸ شمارہ ۲

پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب

پچھلے دنوں پے درپے ملک و ملت کی کئی مقتدر شخصیتوں کی وفات کا حادثہ پیش آیا جن کا تذکرہ "البلاغ" میں اس سے قبل نہ ہو سکا، اس مرتبہ ان حضرات کا ذکر خیر مقصود ہے۔ حدیث مبارک ہے کہ:

اذکروا موتاکم بالخیر

(اپنے مرنے والوں کی بھلائیاں یاد کیا کرو)

اس لئے یہ تذکرہ صرف ایک رسمی کاروائی نہیں، بلکہ اس حدیث مبارک کی تعمیل ہے جس میں بہت سی حکمتیں پنہاں ہیں۔

جن حضرات کا اس وقت تذکرہ مقصود ہے، ان میں سب سے پہلے جن صاحب کی وفات ہوئی، وہ جناب پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب مرحوم تھے، جو برصغیر کی تاریخ کے موضوع پر ہمارے ملک کی گرانقدر ترین متاع کی حیثیت رکھتے تھے۔

ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جنہیں "عاشق العلم" کہا جاسکے، اور جن کی نشست و برخاست سے لیکر سوچ بچار تک کا محور علم ہی علم ہو۔ مادہ پرستی کے اس دور میں علم محض ایک ذریعہ معاش ہو کر رہ گیا ہے جس کا تعلق پیسہ کمانے سے ہے، ذاتی دلچسپی سے نہیں۔ اس علمی کساد بازاری کے دور میں اگر کوئی شخص ایسا نظر آتا ہے جو علم کی تڑپ واقعی رکھتا ہو، تو اس سے بے اختیار محبت ہو جاتی ہے۔

مرحوم پروفیسر ایوب قادری صاحب اپنے موضوع کے تعلق سے ایسے ہی افراد میں سے تھے۔ برصغیر کی علمی اور ادبی تاریخ ان کے مطالعے اور تحقیق کا خاص موضوع تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اس موضوع پر انہیں بے مثال عبور عطا فرمایا تھا۔ اللہ نے ان کو حافظہ بھی بڑا قوی بخشا تھا۔ اور اپنے موضوع پر بے حد وسیع مطالعے کی توفیق خاص بھی مرحمت فرمائی تھی، چنانچہ آپ ان کے سامنے علم و ادب سے تعلق رکھنے والی برصغیر کی کسی بھی ایسی شخصیت کا نام لے دیجئے جس نے کوئی معمولی کام کیا ہو، وہ شخصیت خواہ کتنی ہی غیر معروف کیوں نہ ہو،

مرحوم ان کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچادیتے، اور بسا اوقات ان کے سن ولادت ووفات تک زبانی بتادیتے تھے۔

خود ناچیز کو برصغیر کی تاریخ یا اس کی شخصیتوں کے متعلق جب کبھی کوئی الجھن پیش آتی، اور معمولی تلاش وجستجو سے حل نہ ہوتی تو اکثر مرحوم سے رجوع کرتا۔ اگر خط لکھتا تو فوراً جواب آتا، اور تشفی ہوجاتی۔ ٹیلی فون پر بات ہوتی تو مختصر معلومات وہیں حاصل ہوجاتیں، اور کبھی کبھی وہ کرم فرماتے تو خود بہت سا مواد لے کر تشریف لے آتے تھے۔

احقر کے ساتھ ان کو خصوصی محبت وشفقت کا تعلق تھا۔ "البلاغ" کے لئے متعدد مضامین انہوں نے لکھے۔ بہت سے دوسروں سے لکھوائے، اور احقر کے علمی کاموں میں ہر ممکن مدد فرمائی۔ میں جس زمانے میں عیسائیت کے موضوع پر "اظہار الحق" کی تشریح وتحقیق میں مشغول تھا، اس وقت نہ جانے میری ضرورت کی کتنی کتابیں مرحوم نے خود مہیا کیں، اور کتنی اپنی معرفت دوسروں سے حاصل کرائیں۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی قدس سرہ کا تذکرہ لکھنے میں انہوں نے بطور خاص مدد فرمائی، اور یہ ان کی علم دوستی اور اخلاقی عظمت تھی کہ اکثر اس تعاون کیلئے خود سفر کرکے دار العلوم تشریف لائے، اور بہت کم ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے ان کے پاس جانا پڑا ہو۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ علم دوستی عطا فرماتے ہیں، وہ ظاہری تکلفات سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

پروفیسر ایوب قادری صاحب مرحوم نے بہت سی کتابیں اور درجنوں مقالے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب اور ہر مقالہ برصغیر کی تاریخ کے کسی پہلو پر ٹھوس مواد کا خزینہ ہے، جو اس موضوع پر کام کرنے والوں کیلئے انشاء اللہ بہترین رہنما کا کام دے گا۔

ابھی غالباً دو تین ماہ پہلے کی بات ہے کہ دار العلوم میں عراق کے ایک عالم تشریف لائے جو ہندوستان کے علماء کے تذکرے پر مشتمل ایک کتاب عربی میں تالیف کررہے ہیں، انکو اس موضوع پر مواد کی ضرورت تھی، لیکن عربی زبان کے سوا دوسری زبان ان کے لئے قابل فہم نہ تھی۔ عربی میں جو معروف کتابیں "نزہۃ الخواطر" اور "رجال السند والہند" اس موضوع پر ہیں، ان کی نشاندہی کردی گئی، لیکن وہ مزید کتب چاہتے تھے، میں نے پروفیسر صاحب مرحوم کو فون کیا، مگر ملاقات نہ ہوسکی، اگلے دن ان کا خود فون آیا، پوچھنے لگے کہ کیا بات تھی؟ میں نے ان کو عراقی عالم کی ضرورت سے آگاہ کیا، اس موضوع پر کچھ دیر بات چیت ہوتی رہی،

اور پھر فون بند ہو گیا۔ اس وقت کسی کو اندازہ تھا کہ یہ ان سے آخری گفتگو ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد میں اسلام آباد میں تھا تو اخبار میں یہ دلدوز خبر نظر سے گزری کہ مرحوم شمالی ناظم آباد کی ایک سڑک پر پیدل جا رہے تھے کہ کسی گاڑی کی وحشیانہ ڈرائیونگ کا نشانہ بن گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بسوں، ٹرکوں اور کاروں میں تیز رفتاری اور لاقانونیت کا رجحان روز بروز شدید تر ہوتا جا رہا ہے، اور چند لمحوں کی بے مقصد بچت کا یہ بچگانہ شوق روزانہ نہ جانے کتنے گھروں کے چراغ بجھا دیتا ہے۔ وہ گاڑی والا کیا جانے کہ اس نے اپنا یہ شوق پورا کر کے قوم و ملت کو کتنے قیمتی آدمی سے محروم کیا ہے؟

موت ہر ایک کو آنی ہے، اور پروفیسر ایوب قادری صاحب مرحوم اپنے لئے اتنی ہی زندگی لیکر آئے تھے، کاش! کہ ہم ان حادثات سے اپنی زندگی کے لئے کوئی سبق لے سکیں، اور دنیا کی اس زندگی کی حقیقت پہچان لیں جس کا کوئی لمحہ یقینی نہیں۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدمات کو قبول فرما کر ان کی مغفرت فرمائیں، انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں، اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں۔ آمین۔

البلاغ جلد ۱۸ شمارہ ۵

حضرت مولانا عبدالسلام صاحب نوشہرویؒ

(خلیفۂ اجل حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

دوسرے بزرگ جن کی وفات کی اطلاع دوسرے نمبر پر ہوئی، حضرت مولانا عبدالسلام صاحب نوشہروی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ حضرت موصوفؒ پاکستان میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ کے ان خلفاء میں سے تھے جن کی تعداد اب گھٹتے گھٹتے ان کی وفات کے بعد کل تین رہ گئی ہے۔ حفظہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت مولانا کا قیام چونکہ نوشہرہ میں تھا، اور وہ ان بزرگوں میں سے تھے جو سیاسی جھمیلوں اور اسٹیج کی زندگی سے ہمیشہ کنارہ کش رہے، اس لئے سفر کی نوبت بھی بہت کم آتی تھی، وہ زیادہ تر اپنے وطن میں رہ کر ہی دعوت و اصلاح کا فریضہ انجام دیتے رہے، اور شہرت کے فتنوں سے اپنے آپ کو بچائے ہی رکھا۔ چنانچہ راقم الحروف کو ان سے زیادہ نیاز حاصل نہ ہوسکا۔ البتہ اللہ تعالیٰ ہمارے محترم بھائیوں جناب مولانا مشرف علی تھانوی، اور مولانا وکیل احمد صاحب شیروانی کی جدوجہد کو قبول فرمائے، کہ انہوں نے کچھ عرصے سے مجلس صیانۃ المسلمین کے تحت لاہور میں ایسے اجتماعات کا سلسلہ شروع کیا، جن میں حضرت حکیم الامت کے بیشتر متوسلین سال میں کم از کم ایک مرتبہ یکجا جمع ہوجاتے ہیں۔

انہی اجتماعات میں حضرت مولانا کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ صورت ایسی کہ دیکھ کر خدا یاد آئے، صحبت پرانوار اور پرتاثیر، سادگی اور تواضع ادا ادا سے نمایاں، اپنے مرشد سے حاصل کئے ہوئے فیوض حرزِ جان، حق کی صراط مستقیم پر پوری طرح ثابت قدم، اور اس ثابت قدمی پر سکینت و طمانیت کی دولت سے سرشار۔ غرض ان تمام آثار کے امین جو اتباع سنت اور انابت الی اللہ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے بزرگوں کا طرۂ امتیاز ہوتے ہیں۔ حضرتؒ سے زیادہ استفادے اور صحبت اٹھانے کا موقع تو نہ مل سکا، لیکن جن چند مختصر ملاقاتوں کی دولت حاصل ہوئی ان کا نقش جمیل ناقابل فراموش ہے۔

مگر فتنوں کے اس دور میں ایسے خدا رسیدہ بزرگوں کا نفسِ وجود بھی امت کیلئے مجسم رحمت ہوتا ہے، اور نہ جانے کتنے فتنوں کے لئے آڑ بنا رہتا ہے، اس لئے ان کی وفات پوری امت کا عظیم نقصان ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں مقاماتِ عالیہ سے نوازے، ان کے متوسلین کو ان کے فیوض عام کرنے کی توفیق بخشے، اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔ آمین۔

البلاغ جلد ۱۸ شمارہ ۵

* * *

جناب مولانا نورالحسن صاحب بخاریؒ

۵ جنوری کو میں اسلام آباد میں تھا، وہیں جناب مولانا نورالحسن صاحب بخاریؒ کی وفات کی اطلاع ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا بخاریؒ ہمارے ملک کے ان نامور علماء میں سے تھے جنہوں نے ساری عمر باطل کے فتنوں کے خلاف حق کا دفاع کرنے میں گذاری۔ یوں تو وہ تمام باطل نظریات کے خلاف سینہ سپر رہے، اور ختم نبوت کی تحریک میں بھی انہوں نے نمایاں حصہ لیا، اور اس راہ میں قیدوبند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں، لیکن شیعیت ان کا خاص موضوع تھا، جس پر ان کا مطالعہ بھی نہایت وسیع تھا، اور اس موضوع پر ان کی تقریر و تحریر بھی بڑی پر مغز اور عالمانہ ہوتی تھی۔ شیعہ مذہب کی بنیادی کتابوں کے حوالے انہیں ازبر تھے، اور اس موضوع پر علمی اور عملی جدوجہد کے لئے انہوں نے "تنظیم اہل سنت" کے نام سے ایک جماعت بھی قائم کی ہوئی تھی جس نے شیعیت کے مقابلے میں اہل سنت کے عقائد کی وضاحت میں خاص طور پر پنجاب کے اندر کافی کام کیا ہے۔

یوں تو مولانا نے بہت سی کتابیں تالیف فرمائیں، لیکن احقر کو ان کی ایک ہی کتاب سے استفادے کا موقع ملا۔ اور وہ مولانا مودودی صاحب مرحوم کی "خلافت و ملوکیت" کے جواب میں ان کی کتاب "عادلانہ دفاع" ہے۔ انداز بیان اور بعض مسائل میں اختلاف کی گنجائش سے قطع نظر یہ کتاب قیمتی علمی مواد پر مشتمل ہے، جو اس موضوع پر مطالعہ اور تحقیق کرنے والوں کے لئے بڑی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

مولانا کی وفات علمی اور دینی حلقوں کیلئے ایک افسوسناک خلا ہے، اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی زلات و سیئات سے درگذر فرما کر ان کی کامل مغفرت فرمائیں، اور پس ماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائیں۔ آمین۔

البلاغ جلد ۱۸ شمارہ ۵

مولانا تاج محمود صاحبؒ

اور اب تازہ ترین اندوہناک سانحہ جناب مولانا تاج محمود صاحبؒ کی وفات کا حادثہ ہے جو اسی مہینے نہ صرف اپنے احباب و اعزہ، بلکہ ہزارہا متعلقین اور محبت رکھنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جناب مولانا تاج محمود صاحبؒ ——— جن کو آج رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہوئے دل پر آرے چل رہے ہیں ——— قحط الرجال کے اس دور میں ملک و ملت کیلئے ایک گرانقدر متاع کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی پوری زندگی تحفظ ختم نبوت کے مقدس مشن کی انجام دہی میں گذری، اور اس راہ میں انہوں نے دل و جان سے مجاہدانہ خدمات انجام دیں۔ وہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے مقتدر رہنما اور ہفت روزہ "لولاک" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے عمر بھر عقیدہ ختم نبوت کے دفاع میں سینہ سپر رہے اور اسی کیلئے انہوں نے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔

تقریر و خطابت میں وہ احرار کی روایات کے پاسبان تھے، اور ان گنے چنے مقررین میں سے تھے جنہیں اسٹیج کی رونق اور مائیک کی آبرو کہنا چاہیے۔ ان کی تقریر میں بیک وقت دلکشی اور شکوہ دونوں کا حسین امتزاج ہوتا تھا جو سننے والوں کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔

"ختم نبوت" ان کا بنیادی موضوع تھا، لیکن اس کے علاوہ ملک و ملت کا کوئی دینی اور اجتماعی مسئلہ ایسا نہ تھا جس میں وہ بھرپور حصہ نہ لیتے ہوں۔ یہ ان کے اخلاص اور ملی درد کا نتیجہ تھا کہ وہ ملک و ملت کے اجتماعی مسائل میں مختلف الفکر اصحاب کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے اور ان کو دین کے بنیادی مسائل کے لئے جوڑے رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے گروہی اور جماعتی حد بندیوں کو دین کے اجتماعی مسائل کی جدوجہد میں خود کو بھی آڑے آنے نہیں دیا، اور دوسروں کو بھی حتی الامکان اسی روش پر قائم رکھنے کی کوشش کی۔

مولانا سے خصوصی تعلق ۱۹۷۴ء کے تحریک ختم نبوت کے دوران پیدا ہوا، اس تحریک

میں تقریباً دس روز احقر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ کے ساتھ راولپنڈی میں مقیم رہا۔ اس دوران مولاناؒ کے ساتھ کافی وقت گزارنے کا موقع ملا ان کی تقریریں بھی سنیں اور ان کے ساتھ مجلسیں بھی رہیں جن میں تحریک ختم نبوت کیلئے ان کے پرجوش جذبے کے ساتھ ساتھ اصابت رائے اور توازن فکر کا بھی اندازہ ہوا۔

تحریک کی اس رفاقت کے بعد مولاناؒ اس ناچیز پر بہت شفقت فرمانے لگے اور ہر ملاقات کے بعد اس محبت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ پھر بہت سے اجتماعی معاملات میں مولاناؒ کے ساتھ صلاح مشوروں اور عملی کام کی نوبت آئی' اور ہر موقع پر ان کے خلوص اور جذبے کا نقش دل پر قائم ہوا۔ احقر کی کنارہ کشی کے باوجود جن علماء کرام نے احقر کو وفاقی شرعی عدالت میں بطور جج کام کرنے کے لئے باصرار آمادہ' بلکہ کسی حد تک مجبور فرمایا' ان میں دوسرے حضرات کے علاوہ مولانا تاج محمود صاحبؒ بھی شامل تھے۔

ابھی چند ماہ قبل میرا فیصل آباد جانا ہوا تو وہاں برادر گرامی جناب مولانا نذیر احمد صاحب مدظلہم نے اپنے مدرسے میں ایک نشست طے کردی' اور مجھے کچھ عرض کرنے کے لئے مجبور فرمایا۔ جناب مولانا تاج محمود صاحبؒ نے اپنی علالت کے باوجود اس نشست کی صدارت فرمائی۔ یہ ان کی شفقت تھی کہ میری سمع خراشی کو محبت اور صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرکے اس ناچیز کیلئے حوصلہ افزائی کے کلمات ارشاد فرمائے۔

یکم ربیع الثانی کو اسلام آباد کے علماء کنونشن میں ان سے ملاقات ہوئی۔ وہی شگفتہ اور شاداب چہرہ' ملاقات کا وہی دلنواز انداز' پچھلے سال کے دل کے شدید دورے کے بعد سے ان کے چہرے پر نقاہت کے آثار اکثر محسوس ہونے لگے تھے' لیکن بات میں وہی گھن گرج بڑی حد تک باقی تھی۔

ان کی ان دونوں ملاقاتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قادیانیت کی حالیہ سرگرمیوں پر بے حد مضطرب اور بے چین ہیں۔ دونوں مواقع پر ان کا گفتگو موضوع یہی تھا' اور بلا تکلف محسوس ہوتا تھا کہ یہ اضطراب ان کی رگ رگ میں بسا ہوا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہوگی' بس اس واقعے کے چند دن بعد ہی ان کی وفات کی اطلاع ملی اور پتہ چلا کہ ع

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

اللہ تعالیٰ ان کی دینی، تبلیغی اور مجاہدانہ خدمات کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائیں، انھیں جنت الفردوس میں درجات عالیہ سے سرفراز فرمائیں، اور ان کے اخلاف کو ان کا مشن زندہ رکھنے اور اسے آگے بڑھانے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین۔

ایضاً جلد ۱۸ شمارہ ۵

* * *

حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحبؒ

علمی حلقوں کے لئے حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحبؒ کا اسم گرامی محتاج تعارف نہیں وہ ان علمائے حقانی میں سے تھے کہ۔ ع

جن کو دیکھے سے خدا یاد آئے

اکابر علمائے دیوبند سے فیض پانے کی بناء پر ان کی علمی استعداد' اور خاص طور پر فقہ سے انکی خصوصی دلچسپی قابل رشک تھی۔ درس و تدریس کے علاوہ فتویٰ اور تصنیف کے بھی شناور تھے' لیکن انداز زندگی اس قدر سادہ' درویشانہ اور متواضع تھا کہ دیکھنے والا سمجھ بھی نہ سکتا کہ یہ کوئی بڑے عالم ہونگے۔

انہوں نے اپنی عمر کا ایک طویل حصہ درس و تدریس اور فتویٰ کی خدمت میں گذارا۔ ملتان کے خیر المدارس اور قاسم العلوم دونوں مدرسوں سے ان کا تعلق رہا' لیکن جہاں تک احقر کو یاد ہے' اس دینی خدمت پر انہوں نے کبھی تنخواہ وصول نہیں کی۔ تدریس اور فتویٰ کی خدمت ہمیشہ لوجہ اللہ انجام دی' اور معاش کیلئے اپنے تجارتی کتب خانہ "مکتبہ صدیقیہ" کو وسیلہ بنایا۔ دین کے ایسے بے غرض خدام اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

ایک زمانہ تک وہ ملتان سے ماہانہ رسالہ "الصدیق" نکالتے رہے' جو اپنے زمانے میں علماء دیوبند کی طرف سے نکلنے والا شاید واحد رسالہ تھا۔ جس نے عرصہ دراز تک دین اور علم دین کی ترجمانی کا حق ادا کیا اس کے بعض بڑے معرکے کے خاص نمبر بھی شائع ہوئے۔ جب منکرین حدیث کے زیر اثر "پوتے کی وراثت" کا مسئلہ اٹھا اور پنجاب اسمبلی میں اس غرض سے ایک مسودہ قانون پیش ہوا تو پاکستان کے بہت سے علماء نے اس موضوع پر مفصل مقالے لکھے' لیکن اس سلسلے میں شاید سب سے زیادہ مبسوط' مدلل اور کافی و شافی تحریر "الصدیق" کے "ارث الیتیم نمبر" میں شائع ہوئی۔

درس' تدریس' فتویٰ' تصنیف اور تجارت کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ موصوف اپنے اخلاص کے بناء پر ملک کے اجتماعی مسائل میں بھی دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے رہے' اور

ملک گیر پیمانے پر جب علماء کا کوئی اجتماع ہوتا تو وہ ہمیشہ اس کے رکن رکین ہوتے تھے، پچھلے دنوں انہوں نے حجاز کی طرف ہجرت کا ارادہ فرمایا تھا، اور اس کے پہلے مرحلے کے طور پر کراچی منتقل ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی یہ ارادہ تشنۂ تکمیل ہی تھا کہ وطن اصلی سے بلاوا آگیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موصوف کو حضرت والد صاحب قدس سرہ سے خاص تعلق تھا، اور اسی نسبت سے برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہم اور اس ناکارہ پر بھی بہت شفقت فرماتے تھے۔ دارالعلوم میں بارہا تشریف لائے، یہاں کے علمی دینی کاموں کو دیکھ کر اظہار مسرت فرمایا، دعائیں دیں، اور جب کبھی ضرورت پیش آئی تعاون سے بھی دریغ نہیں کیا۔

ایسے مخلص، وضع دار، بے لوث اور پیکر تواضع بزرگ اب کہاں نظر آتے ہیں؟ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے مقام قرب میں پیہم ترقی درجات عطا فرمائیں، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی دولت سے نوازیں۔ آمین۔ قارئین سے بھی ان کے حق میں دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کی درخواست ہے۔ اللھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

البلاغ جلد ۵ شمارہ ۔

جناب مولانا محمد شریف جالندھریؒ

پچھلے مہینے دوسرا المناک حادثہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے ناظم اعلیٰ جناب مولانا محمد شریف جالندھری (رحمۃ اللہ علیہ) کی وفات کا پیش آیا۔

مولانا محمد شریف جالندھری رحمۃ اللہ علیہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اُن خاص رفقاء میں سے تھے، جنھوں نے اپنی زندگی تحفظ ختم نبوت کے مشن کیلئے وقف کردی تھی۔ انھوں نے اس مشن اور اس مقصد کیلئے بڑی قربانیاں دیں، منکرین ختم نبوت کی سازشوں کا ہر محاذ پر مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کی تحریکوں میں وہ صف اول کے رہنماؤں میں شامل تھے۔

احقر کو ان سے سب سے پہلے نیاز ۱۹۷۴ء کی ختم نبوت تحریک کے دوران حاصل ہوا۔ حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری قدس سرہ کے حکم سے احقر ان دنوں مسلمانوں کی طرف سے اسمبلی کیلئے بیان مرتب کرنے کیلئے راولپنڈی میں مقیم تھا۔ مولانا جالندھری اس وقت تحریکی امور میں بھی مصروف رہتے اور کبھی کبھی اس تحریر کی دیکھ بھال کیلئے ہمارے پاس بھی تشریف لاتے، ان کی سنجیدگی، متانت، تدبر اور ان تمام اوصاف کے باوجود انتہادرجے کی سادگی نے بڑا متاثر کیا۔ اس کے بعد بھی متعدد مواقع پر ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا، اور ہر بار اس تاثر کی مزید تائید ہوتی گئی۔

۱۹۷۴ء کے بعد مولانا موصوفؒ نے اپنی توجہات کا مرکز قادیانیوں کے سب سے بڑے گڑھ ربوہ کو بنایا تھا۔ انہی کی جدوجہد کے نتیجے میں ربوہ کے اندر ایک عظیم جامع مسجد تعمیر ہوئی، مسلم کالونی کے نام سے مسلمانوں کی ایک بستی آباد ہوئی۔ اور تحفظ ختم نبوت کے مراکز بھی قائم ہوئے۔ مجھے صرف ایک ہی مرتبہ ربوہ جانے کا موقع ملا ہے، اور وہ مولاناؒ ہی کی دعوت اور تحریک پر۔ اس وقت مسلم کالونی اور اس کی مسجد ابتدائی مراحل میں تھی، اور یہ دیکھ کر دل بہت متاثر ہوا کہ ربوہ میں ختم نبوت کے کام کو پھیلانے کی خاطر مولاناؒ نے اس ویرانے میں ڈیرہ ڈالا ہوا تھا، اور مخالفین کی ہمہ جہتی سازشوں کا نشانہ بنکر پورے عزم اور

استقامت کے ساتھ اپنے مرکز پر ڈٹے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی مخلصانہ کوششوں میں اتنی برکت عطا فرمائی کہ آج ربوہ جیسے شہر میں مسلمانوں کے باوقار مراکز قائم ہیں۔

میں ۵ فروری ۱۹۸۵ء کو راولپنڈی میں تھا، وہیں اخبار کے ذریعے مولانا کی وفات کی اچانک اطلاع ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائیں، ان کی خدمات کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازیں، اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین اور قارئین سے بھی موصوف کیلئے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کی درخواست ہے۔

البلاغ جلد ۱۹ شمارہ ۲

مولانا محمد محترم فہیم عثمانیؒ

اور احقر کیلئے اس مہینے کا سب سے المناک حادثہ اپنے عم زاد بھائی مولانا محمد محترم صاحب فہیم عثمانی کا حادثۂ وفات ہے، جن کے ساتھ "رحمۃ اللہ علیہ" لکھتے ہوئے آج کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم دیوبند کے معروف علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد محمد مسلم صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند کے اکابر علماء میں سے تھے جو تقسیم ہند سے پہلے عرصہ دراز تک لائل پور (فیصل آباد) میں علمی و دینی خدمات انجام دیتے رہے اور کچھ عرصہ ڈابھیل کے شہرہ آفاق مدرسے میں بھی استاذ حدیث رہے، قیام پاکستان کے بعد انہوں نے لاہور کو اپنا وطن بنالیا، اور وہاں "دارالعلوم الاسلامیہ" کی بنیاد رکھی، جو تجوید و قراءت کی درسگاہ کے طور پر ملک بھر میں مشہور ہے، اور جہاں حضرت عبدالمالک صاحبؒ جیسے امام فن نے تجوید و قراءت کا درس دیا، اور آج یہ مدرسہ برادر محترم جناب مولانا مشرف علی تھانوی صاحب مدظلہم کے زیر اہتمام بحمد اللہ کامیابی کے ساتھ مصروف خدمت ہے۔

مولانا محمد محترم فہیم عثمانی انہی حضرت مولانا محمد مسلم صاحب عثمانی قدس سرہ کے فرزند ارجمند تھے، انہوں نے شروع میں انگریزی تعلیم حاصل کی، اور والد ماجدؒ کی وفات کے بعد عمر کا ایک بڑا حصہ مختلف محکموں کی ملازمتوں میں بسر کیا۔ اس دور میں ان کی دلچسپی کا محور علم دین کے بجائے شعر و ادب رہا۔ نوجوانی کے دور میں ایک بینک میں ملازم ہوگئے، لیکن اس ملازمت کے دوران ایک بزرگ نے ملاقات کے وقت یہ جملہ کہا کہ "تم بینک کی ملازمت کیلئے پیدا نہیں ہوئے" بس یہ جملہ ان کی زندگی کیلئے انقلاب کا نقطۂ آغاز بن گیا۔

والد ماجدؒ کی صحبت کے زیر اثر دینی جذبات رگ و پے میں سمائے ہوئے تھے، لیکن حالات نے کسی اور رخ پر ڈال دیا تھا، اس جملے نے اندر چھپے ہوئے ان جذبات کو ابھار کر کے انہیں عملی زندگی میں برسرکار کردیا۔ انہوں نے معاشی مشکلات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بینک کی ملازمت ترک کردی، اور دنیوی اعتبار سے ایک باعزت ملازمت کو چھوڑ کر ایک پرچون

کی دکان لیکر بیٹھ گئے۔ اس دوران معاشی مشکلات سے گذرے' لیکن پائے استقامت میں جنبش نہ آنے دی۔ دکان میں نقصان ہوا تو ایک محکمے میں ملازمت کرلی۔

اس محکمے میں بعض افسران نے کوئی غلط حساب و کتاب رکھنا چاہا' اور اس کام کے لئے ان کو مامور کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے حرام کمائی سے پرہیز کی خاطر بینک کی اچھی ملازمت چھوڑی ہے' اور اب حرام آمدنی سے تائب ہو چکا ہوں" لہٰذا یہ کام نہیں کر سکتا"

شدہ شدہ ان کی امانت و دیانت کی خبر واپڈا کے بعض افسران کو پہنچی تو انہوں نے قحط الرجال کے اس دور میں ایسے امانت دار شخص کی قدر پہچانتے ہوئے انہیں واپڈا میں ایک اچھی ملازمت کی پیشکش کی' جہاں وہ ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچ گئے۔

اسی ملازمت کے دوران ان کے دل میں حصول علم دین کا جذبہ پیدا ہوا' اور ایک بڑے عیال کی کفالت اور ملازمت کی ذمہ داریوں کے ساتھ انہوں نے باقاعدہ عربی زبان اور اسلامی علوم کی تحصیل شروع کردی۔ پہلے یہ تعلیم نجی طور پر بعض اساتذہ سے حاصل کی' پھر باقاعدہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں تفسیر' حدیث' اور فقہ کی کتابیں ماہر اساتذہ سے پڑھیں۔ اور اسلامیات اور پھر عربی میں نمایاں حیثیت کے ساتھ ایم اے کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ذہانت و فطانت اور خوش ذوقی سے نوازا تھا اور علمی مزاج اپنے والد ماجدؒ سے ورثے میں پایا تھا۔ اس لئے بہت جلد ان علوم میں اچھی استعداد حاصل کرلی' اور اس کے بعد خدمت دین ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد ان کے زیادہ تر اوقات تحریر و تقریر کے ذریعے دین کی تبلیغ و اشاعت ہی میں صرف ہوتے تھے۔ اپنے محلے کی "مسجد مقدس" میں نماز بھی پڑھاتے تھے' اور وہیں دینی کتابوں کا ایک دارالمطالعہ قائم کر رکھا تھا۔ جمعہ کی نماز شادمان کالونی کی ایک بڑی مسجد میں پڑھاتے' جہاں ان کی ہفتہ وار تقریر نہایت مقبول اور مفید خاص و عام تھی' اور جس کی بدولت بہت سے لوگوں کو راہ ہدایت نصیب ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے تحریر و انشاء کا بھی خاص سلیقہ بخشا تھا' چنانچہ قلم کے ذریعے بھی انہوں نے دین کی بڑی خدمت انجام دی۔ ابتداء میں انہوں نے دینی رسائل میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ پھر رفتہ رفتہ متعدد ضخیم کتابیں بھی لکھیں" "حجیت حدیث" کے موضوع پر ان کی

مفصل کتاب "حفاظت و حجیت حدیث" (جو تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے) شاید اپنی جامعیت کے لحاظ سے اس موضوع پر اردو میں مفصل ترین کتاب ہے جس میں انہوں نے منکرین حدیث کے تمام دلائل و اعتراضات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں۔

اس کے علاوہ نماز کے احکام و مسائل پر انہوں نے جو کتاب تالیف فرمائی ہے وہ بھی اپنے موضوع پر اردو کی شاید جامع ترین کتاب ہے' اور پھر خود ہی اس کا انگریزی ترجمہ کر کے اس کی افادیت کو عالمگیر بنا دیا ہے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ کی کتاب "احکام حج" کا انگریزی ترجمہ بھی برادر موصوفؒ ہی نے کیا ہے جو "How to perform hajj" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ بھی انہوں نے ایک درجن سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں تالیف فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک مواد کی صحت و جامعیت اور شگفتہ اسلوب تحریر کے لحاظ سے' اردو کے ذخیرہ کتب میں بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

پچھلے دنوں ملک میں عورت کی دیت کا مسئلہ اٹھا تو برادر موصوفؒ نے اس مسئلے پر بھی ایک مفصل مقالہ تحریر فرمایا جو چند ہی ماہ پہلے البلاغ میں قسط وار شائع ہوا ہے۔

احقر نے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی قدس سرہ کی کتاب "اظہار الحق" کا اردو ترجمہ اپنی شرح و تحقیق کے ساتھ شائع کیا تھا' حضرت مولانا کی ایک دوسری کتاب "اعجاز عیسوی" کی تحقیق و ترتیب پر بھی احقر نے کام شروع کیا' لیکن مصروفیات کی بنا پر اسکی تکمیل نہ کر سکا۔ اس کی تکمیل کیلئے احقر نے برادر موصوفؒ سے درخواست کی' چنانچہ وہ چند ماہ سے اسی کام میں مشغول تھے اور اس کا معتد بہ حصہ مکمل کر چکے تھے۔ انکے علاوہ انکے والد ماجد قدس سرہ نے طحاوی شریف کی ایک شرح تالیف فرمائی تھی جس کا مسودہ انکے پاس محفوظ تھا' وہ اس مسودے کی تبییض و ترتیب میں مشغول تھے اور شاید اس کا قابل لحاظ حصہ کتابت بھی کرا چکے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں جن غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا' اور ان کے اوقات میں جو برکت عطا فرمائی تھی (کہ واپڈا کی ملازمت اور کثیر عیال کی دیکھ بھال کے ساتھ انہوں نے تقریر اور تحریر کے ذریعے دین کی اتنی خدمت انجام دی) اس کے پیش نظر ان کی زبان و قلم سے بہت کچھ توقعات قائم تھیں۔ ان کی عمر بھی بمشکل پچاس سال ہوئی ہوگی' اور یہ تجویز بھی

زیرِ غور تھی کہ وہ مستقل طور پر کراچی آکر اپنا سارا وقت تبلیغی خدمات کیلئے وقف کر دیں۔ لیکن مشیت ایزدی ہر خواہش پر بالا ہے۔ ان کی دوڑ دھوپ جس منزل کیلئے تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس منزل تک پہنچ گئے۔

جمعہ ۲۲ فروری کو انہوں نے حسب معمول شادمان کالونی کی مسجد میں جمعہ پڑھایا، جمعہ کے بعد ایک صاحب نے انہیں اپنا مکان دکھانے کی دعوت دی، وہ صاحب آگے گاڑی میں جا رہے تھے، اور یہ موٹر سائیکل پر ان کے پیچھے چل رہے تھے، اچانک ایک دوراہے پر برابر کی سڑک سے ایک تیز رفتار سوزوکی نمودار ہوئی، وہ اس نے موٹر سائیکل کو ٹکر ماری، مولانا موٹر سائیکل سے دور جا کر گرے، دماغ پر ضرب آئی، اور اسی کاری ضرب کے موقع پر ہی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

برادر موصوف حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ کے خلیفہ حضرت مولانا حاجی محمد شریف صاحب مدظلہم (ملتان) سے بیعت تھے۔ غالباً ان سے بیعت کی اجازت بھی حاصل تھی، اور اللہ تعالیٰ نے اس فیض صحبت سے ان کو علم و عمل کے ساتھ ہی سوز و گداز اور انابت و خشیت کی خاص کیفیت سے بھی نوازا تھا۔

ان کا دائمی معمول تھا کہ عصر و مغرب کے درمیان وہ احقر کے برادر زادہ عزیز مولانا محمود اشرف عثمانی کے سلسلہ درس ادارہ اسلامیات آجاتے، اور نماز مغرب تک وہیں رہتے تھے۔ دونوں میں بڑی محبت و موانست تھی۔ جب بھی احقر کا لاہور جانا ہوتا تو عموماً وہیں ان سے ملاقات ہوتی، اور ہر ملاقات کے بعد دل میں ان کی سلامت فکر، ان کے حسن اخلاق اور ان کے اخلاص و محبت کا نقش مزید گہرا ہو جاتا۔ ہمارے لئے لاہور جن شخصیتوں سے آباد تھا، ان میں سے ایک وہ بھی تھے، اور کبھی تصور بھی نہ آیا تھا کہ وہ اس قدر جلد ہم سے بچھڑ جائیں گے۔ لیکن تقدیر کے فیصلے ہمارے وہم و گمان کے پابند نہیں، یہ حادثات قدرت کی طرف سے ہمیں غفلتوں کی دلدل سے نکالنے کیلئے تازیانے ہوتے ہیں، کاش کہ ہم ان سے سبق سیکھ کر اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکیں۔

برادر موصوف کا نام قارئین البلاغ کیلئے نیا نہیں، ان کے نہ جانے کتنے مضامین البلاغ میں شائع ہوئے ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ برادر موصوف کو دعائے مغفرت اور ایصال ثواب میں یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ اس پاک نفس انسان کو اپنے جوار رحمت

ہمیں مقامات عالیہ عطا فرمائیں' اور ہمیں ماندگان کو صبر جمیل کی دولت سے نوازیں آمین ثم آمین' ع

خوش درخشید' ولے شعلہ مستعجل بود

[illegible]

حضرت مولانا حاجی محمد شریف صاحبؒ

پچھلے مہینے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا حاجی محمد شریف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حادثۂ رحلت دل پر بجلی بن کر گرا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ پاکستان میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے ان خلفاء میں سے تھے جن کی تعداد اب ایک ہاتھ کی انگلیوں سے بھی کم رہ گئی تھی اور اب ان کے رخصت ہونے کے بعد تو پاکستان میں اس مقدس قافلے کی صرف دو شخصیتیں باقی رہ گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ رحمت و شفقت ہمارے سروں پر تا دیر بعافیت سلامت رکھیں، اور ان کے فیض سے مستفید ہونے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین۔ ایک سیدی و سندی و مولائی حضرت مولانا حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم العالی، اور دوسرے حضرت مولانا فقیر محمد صاحب مدظلہم تعالیٰ متعنا اللہ بطول حیاتہما بالخیر۔

حضرت مولانا حاجی محمد شریف صاحبؒ ملتان میں قیام پذیر تھے جامعہ خیرالمدارس کے سرپرست تھے اور انتہائی سادگی کے ساتھ اپنے شیخ کے مسلک کے مطابق اصلاح و ارشاد کی خدمات انجام دے رہے تھے۔

حضرتؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے شیخ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی مجسم کرامت ہوں کہ انہوں نے مجھے کس ماحول سے نکال کر کہاں پہنچا دیا۔

حضرت حاجی صاحبؒ یکم ستمبر ۱۹۰۱ء کو ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں مہندی پور میں پیدا ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک قصبہ کمیریاں کے اینگلو سنسکرت ہائی اسکول میں آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس اسکول پر آریوں کا غلبہ تھا اس لئے انہوں نے آپ کو اپنا ہم مذہب بنانے کی کوشش کی، لیکن بفضلہ تعالیٰ آپ ایمان پر مضبوطی سے قائم رہے، اگرچہ وضع قطع بڑی حد تک اسی ماحول کے رنگ میں رنگ گئی۔ ۱۹۲۱ء میں آپ نے گورنمنٹ ہائی اسکول جالندھر سے میٹرک پاس کیا، وہاں آپ کا شمار ممتاز طلباء میں ہوتا تھا۔ چودھری محمد علی صاحب

مرحوم سابق وزیر اعظم پاکستان آپ کے ہم جماعت، ہم کمرہ اور خاص دوست تھے۔ وہاں رہتے ہوئے کیمبل فرسٹ الیون کے کھلاڑی بھی رہے۔ غرض وضع قطع سے لیکر مصروفیات تک تمام باتیں ایک مغربی طرز کی درس گاہ کے طالب علم کی سی تھیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بھی ضلع ہوشیار پور کے متعدد اسکولوں میں ریاضی اور انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بالآخر میانی افغاناں ضلع ہوشیار پور میں انگلش ٹیچر کی حیثیت سے تعینات ہوئے تو بیسویں صدی کے ایک آزاد منش نوجوان کی طرح انگریزی لباس، داڑھی سے بے نیاز اور نماز کی پابندی سے محروم تھے۔

لیکن یہاں حضرت مولانا شیر محمد صاحبؒ سے ملاقات ہوگئی جو خط و کتابت کے ذریعہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ سے تعلق رکھتے تھے (اور بعد میں حضرتؒ کے خلیفہ بھی ہوئے)۔ حضرت مولانا شیر محمد صاحبؒ پر خانقاہ تھانہ بھون کا رنگ چڑھ رہا تھا۔ ان کی پاکیزہ اور قابل رشک زندگی آپ پر اثر انداز ہوئی۔ خود فرماتے ہیں کہ "ابتداء میں شرم کی وجہ سے اور بعد میں خلوص سے، پہلے تین وقت کا اور پھر پانچ وقت کا نمازی بن گیا"۔ حضرت مولانا شیر محمد صاحبؒ کی زندگی میں جو کشش تھی اسی نے رفتہ رفتہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے ساتھ خط و کتابت کا تعلق قائم کرا دیا۔ اور پھر اسکول کی بڑی چھٹیاں ہوئیں تو حضرت مولانا شیر محمد صاحبؒ کے ساتھ خود بھی تھانہ بھون تشریف لے گئے اور حضرت حکیم الامتؒ کی زیارت و صحبت سے مشرف ہوئے۔

بس پھر کیا تھا؟ زندگی کی کایا ہی پلٹ گئی، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی فکر پیدا ہوئی، اور اس فکر کی بدولت اپنے بہت سے دنیوی مفادات کی قربانیاں بھی دیں۔ ہر ہر قول و فعل کو دین کے معیار پر جانچنے اور اتباع سنت کے سانچے میں ڈھالنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ وضع قطع بالکل بدل گئی۔ خانقاہ تھانہ بھون میں آمد و رفت بھی رہی اور حضرتؒ کے ساتھ خط و کتابت بھی۔ یہاں تک کہ حضرتؒ نے بیعت و تلقین کی اجازت بھی مرحمت فرما دی، اور حضرتؒ کے خاص متوسلین میں آپ کا شمار ہوا۔

تقسیم ہند کے بعد حضرت حاجی صاحبؒ نے ملتان کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور حضرت حکیم الامتؒ سے مجاز بیعت ہونے کے باوجود آپ نے حضرتؒ کے اکابر خلفاء حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ، حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ اور احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد

شفیع صاحب قدس سرہم سے نیازمندانہ تعلق قائم رکھا اور یہ سب حضرات آپؒ سے نہایت اکرام و محبت کا معاملہ فرماتے رہے۔ بہت سے طالبین نے آپ سے اصلاح و تربیت کا تعلق قائم کیا اور اس تعلق کی برکت اور اثر سے ان کی زندگیوں میں انقلاب پیدا ہوا۔

آپ کی زندگی اس قدر سادہ اور متواضع تھی کہ کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ شیخ طریقت ہوں گے۔ ملتان کے محلہ نواں شہر کے ایک قدیم طرز کے سادہ سے مکان میں مقیم تھے۔ گھر پر نہ کوئی خادم، نہ نوکر۔ کوئی مہمان پہنچ جاتا تو اس کی خاطر و مدارات میں خود ہی سارا کام کرتے، بازار سے کوئی چیز لانی ہوتی تو خود جا کر لاتے۔ مہمان خواہ رتبے اور عمر میں کتنا چھوٹا کیوں نہ ہو، اس معمول میں فرق نہیں آتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی صحبت میں ایسی برکت رکھی تھی کہ ان کی زیارت کرکے اور ان کے پاس بیٹھ کر دل کی دنیا بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی، ان کا چہرہ دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، چہرے بشرے پر ذکر و فکر کے انوار اور انداز و ادا میں اس بلا کی معصومیت کہ دل بے ساختہ کھنچتا تھا۔ گفتگو اتنی جامع، مختصر اور نپی تلی کہ کوئی ضروری بات چھوٹتی نہ تھی اور کوئی زائد بات منہ سے نکلتی نہ تھی۔ عام طور پر، یہاں تک کہ گفتگو اور وعظ و خطاب کے موقع پر بھی، نگاہیں جھکی رہتیں اور منہ سے الفاظ پھولوں کی طرح جھڑتے چلے جاتے۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا ذکر مبارک آجاتا تو طبیعت کھل جاتی، حضرتؒ کے واقعات و ملفوظات یکے بعد دیگرے سناتے رہتے اور اکثر آپ کی مجلس انہی واقعات و ملفوظات سے معمور رہتی تھی۔

احقر ناکارہ پر حضرت حاجی صاحبؒ کی بے پایاں شفقتیں حیطۂ بیان میں نہیں آسکتیں، جب بھی ملتان حاضری ہوتی تو احقر کا معمول یہ تھا کہ قیام گاہ جانے سے پہلے حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، حضرتؒ بھی آنے کی خبر سنتے تو منتظر رہتے تھے اور جب پہنچ جاتا تو مسرت کا ایسا اظہار فرماتے کہ احقر پانی پانی ہو جاتا۔ بس حاضری میں تکلف اس بات پر ہوتا تھا کہ حضرتؒ کی عادت معلوم تھی کہ وہ خود میزبانی کی فکر فرمائیں گے۔ ایک مرتبہ حاضر ہوا تو بڑی شفقت سے بیٹھک میں بٹھا کر اندر تشریف لے گئے۔ جب کچھ دیر گزر گئی تو دوسرے دروازے سے ہاتھ میں شربت کی بوتلیں لئے داخل ہوئے، تب اندازہ ہوا کہ بوتلیں لینے

کے لئے خود بازار تشریف لے گئے تھے۔ ایسے مواقع پر ہم خدام کی ندامت اور شرم کی انتہا نہ رہتی' لیکن ان کو غایت تواضع کی بناء پر احساس بھی نہ ہوتا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔

احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی وفات کے موقع پر اطراف عالم سے جو تعزیتی خطوط آئے' ان کی تعداد شاید سینکڑوں سے متجاوز ہو' ان میں طویل خطوط بھی تھے اور مختصر بھی۔ لیکن ایسے خط گنے چنے تھے جنہیں پڑھ کر خاص تسلی ہوئی۔ اور جو اکثر یاد رہتے ہیں' ان میں سرفہرست حضرت حاجی صاحبؒ کا مکتوب گرامی تھا۔ اختصار کے باوجود اس کے لفظ لفظ میں شفقت و محبت اور حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی تربیت کا خصوصی رنگ رچا بسا ہے۔ تحریر فرمایا :

مکرمی و محترمی جناب مولانا صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' حضرت اقدس مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خبر وفات نے دل مجروح کردیا۔ اس ناکارہ کے تو بہت ہی بڑے محسن تھے' کسی پہلو قرار نہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنا قرب خاص عطا فرمادیں اور ہم سب کو صبر جمیل سے نوازیں۔ یہ ناکارہ دعائیں اور ایصال ثواب انشاء اللہ کرتا رہے گا۔ آپ ہی حضرات سے تو معلوم ہوا ہے کہ اللہ کے حاکم اور حکیم ہونے کا مراقبہ ایسے موقع پر بہت نفع دیتا ہے۔ جواب کی تکلیف نہ فرمائیں آپ کو فرصت نہ ہوگی جوابی لفافہ صرف احتیاطاً بھیجا ہے۔ یہ لفافہ آپ کی ملکیت ہے' لفافہ صرف اس لئے بھیجا ہے کہ شاید کوئی اطلاع ضروری ہو تو دے سکیں ورنہ اپنا قیمتی وقت جواب پر صرف نہ فرمائیں' اسی لئے لفافہ پر اپنا پتہ تحریر نہیں کیا۔

احقر محمد شریف عفی عنہ۔

یہ خاص طور سے حاجی صاحبؒ کے باصرار حکم کا نتیجہ تھا کہ احقر نے اپنی نااہلی کے باوجود خیر المدارس کی مجلس شوریٰ کی رکنیت سے عذر نہیں کیا' اور اس کا نقد فائدہ احقر کو یہ پہنچا کہ اس کی بدولت بار بار ملتان حاضر ہونے اور حضرتؒ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ مجلس شوریٰ کے اجلاسات میں آپ اکثر خاموش رہتے' لیکن جب مدرسے کے مسلک و

مشرب کا سوال آتا تو غیر متزلزل موقف کا اظہار فرماتے، لیکن اس طرح کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ دوسرے معاملات میں احقر جیسے ادنیٰ طالب علم کی بات بھی بلا چوں وچرا مان لیتے۔

احقر نے کئی بار حضرتؒ سے درخواست کی کہ خیر المدارس میں ہفتہ وار مجلس کا سلسلہ شروع فرمادیں، شروع میں حضرتؒ کو متعدد وجوہ سے کچھ تامل سا رہا، لیکن بالآخر تقریباً ایک سال سے دوشنبہ کے دن یہ مجلس شروع فرمادی جو غالباً آخر وقت تک جاری رہی، اور اس کی بناء پر بحمد اللہ بڑا فائدہ پہنچا۔

حضرتؒ کو دل کی تکلیف کافی دنوں سے تھی۔ پچھلے سال قلب کے شدید دورے کی بناء پر ملتان کے نشتر ہسپتال میں داخل تھے۔ انہی دنوں احقر ملتان حاضر ہوا تو ہسپتال میں عیادت کے لئے حاضری ہوئی۔ وہاں ماشاء اللہ احقر کے برادر زادہ عزیز مولانا محمود اشرف عثمانی سلمہ (جو حضرتؒ سے بیعت بھی ہیں، اور ماشاء اللہ ان کو حضرتؒ سے اجازت بھی حاصل ہے اور حضرتؒ کے تعلق سے ماشاء اللہ انہوں نے قابل رشک نفع اٹھایا ہے) اور احقر کے عم زاد بھائی مولانا محمد محترم فہیم عثمانیؒ (جن کا تذکرہ البلاغ کی کسی قریبی اشاعت میں کرچکا ہوں) وہاں دن رات خدمت میں حاضر تھے۔ احقر خدمت سے تو محروم رہا۔ لیکن اس حالت میں بھی زیارت نصیب ہوئی۔ شدید تکلیف کے باوجود چہرے پر غیر معمولی سکون و اطمینان چھایا ہوا تھا۔ حسب معمول احقر کو قریب دیکھ کر کھل گئے، باتیں بھی کرنی چاہیں لیکن معالجین نے گفتگو کرنے سے منع کیا ہوا تھا اس لئے احقر جلدی اٹھ کر باہر آگیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس بیماری سے شفا دی تو کچھ عرصہ کے لئے اپنی صاحبزادی کے مکان پر لاہور تشریف لے آئے۔ اسی زمانے میں احقر کی لاہور حاضری ہوئی، حضرتؒ کو احقر کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی، تواضع اور للہیت کا اس حالت میں بھی یہ عالم تھا کہ احقر کی آمد کا سن کر ائرپورٹ جانے کے لئے تیار تھے، وہ تو برادر زادہ عزیز مولانا محمود اشرف سلمہ اور احقر کے بہنوئی حافظ شفقت علی صاحب نے باصرار روکا، ورنہ وہ اس ضعف کی حالت میں بھی ائرپورٹ جانا طے کئے بیٹھے تھے۔

احقر ہوائی اڈے سے سیدھا حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بے حد مسرور ہوئے اس وقت بفضلہ تعالیٰ صحت کافی بہتر ہو چکی تھی۔ بحمد اللہ باتیں بھی ہوئیں، نصیحتیں بھی فرمائیں اور حسب معمول اپنی شفقتوں سے نہال فرمادیا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ اور زیارت

اور ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ کسے خبر تھی کہ یہ بجھتے ہوئے چراغ کی آخری ضیاء پاشیاں ہیں اور اب اس کے بعد اس روئے زیبا کی زیارت دنیا میں مقدر نہیں۔ ابھی چند روز پہلے عصر کے بعد گھر آیا تو معلوم ہوا کہ لاہور سے ٹیلی فون پر احقر کے بہنوئی حافظ شفقت علی صاحب نے حضرتؒ کی وفات کی جاں گداز خبر سنائی ہے'۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرتؒ کی وصیت تھی کہ انہیں سنت کے مطابق جس شہر یا گاؤں میں انتقال ہو' وہیں کے عام قبرستان میں دفن کیا جائے' نعش کو کسی اور شہر میں منتقل نہ جائے اور تدفین حتی الامکان جلدی کی جائے اور کسی کے انتظار میں تاخیر نہ کی جائے اور تدفین کیلئے عام قبرستان سے الگ کوئی جگہ منتخب نہ کی جائے۔ چنانچہ جس روز وفات ہوئی اسی دن رات ہی کو ملتان ہی میں تدفین عمل میں آئی۔

احقر نے ایک مرتبہ ملاقات کے بعد رخصت کے وقت عرض کیا کہ "حضرت! کوئی نصیحت فرمادیں" حضرتؒ نے ایک لمحہ توقف کے بعد فرمایا! "عمر کے لمحات کو غنیمت سمجھیں' عمر کا ایک ایک لمحہ بڑا گراں قدر ہے' اسے ناقدری سے بچائیں"۔

ایک اور مرتبہ اسی قسم کی درخواست پر فرمایا "دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں' دنیا سے دل لگانے کے بجائے وطن اصلی یعنی آخرت کی فکر کو غالب رکھیں"۔

حضرتؒ نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے ساتھ اپنے تعلق کی سرگزشت اور حکیم الامت قدس سرہ کے مکاتیب کا ایک انتخاب اپنے ایک چھوٹے سے رسالے "مکتوبات اشرفیہ" میں جمع فرمادیا ہے جو برادر مکرم جناب محمد اقبال قریشی صاحب نے ہارون آباد سے شائع کیا ہے' اور بڑا مفید' دلچسپ اور موثر رسالہ ہے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی روح پر فتوح پر اپنی لازوال رحمتیں نازل فرمائیں' انہیں اپنے مقام قرب میں درجات عالیہ سے نوازیں' پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں' اور ہم سب کو ان کے فیوض سے مستفید ہونے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

البلاغ جلد ۱۹ شمارہ ۹

مولانا مفتی محمد عمر بلوچ صاحبؒ

گزشتہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں کراچی کے معروف و ممتاز عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد عمر بلوچ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ریکسر لائن (چاکی واڑہ) کراچی میں حضرت مولانا کریم بخش صاحبؒ نے مدرسہ احرار الاسلام کے نام سے ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی، حضرت مولانا مفتی محمد عثمان صاحب بلوچ رحمۃ اللہ علیہ انہی کے فرزند ارجمند تھے جو اپنے علم و تقویٰ، اور دینی و علمی خدمات کے اعتبار سے کراچی کے گنے چنے علماء میں سے تھے۔ اکثر و بیشتر حضرت والد صاحب قدس سرہ سے مختلف فقہی مسائل میں تبادلۂ خیال کا سلسلہ رہتا تھا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ ان کی فقہی رائے کو بہت وزن دیتے تھے، اور ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ آج کل حال یہ ہو گیا ہے کہ جب علماء سے ملاقات ہوتی ہے تو اکثر ہر طرح کے موضوعات زیر گفتگو آتے ہیں۔ لیکن عام طور سے کوئی علمی مسئلہ گفتگو میں نہیں آتا، لیکن جب بھی حضرت مولانا مفتی محمد عثمان صاحب بلوچ سے ملاقات ہوتی ہے تو خوشی اس لئے ہوتی ہے کہ ان شاء اللہ اس ملاقات میں کوئی نہ کوئی علمی گفتگو ضرور نکلے گی۔

اپنے والد ماجدؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد عثمان بلوچ صاحب قدس سرہ نے مدرسہ احرار الاسلام کا انتظام سنبھالا اور اسے ترقی دی یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی۔ حضرت مولانا مفتی محمد عمر بلوچ صاحبؒ حضرت مولانا محمد عثمان بلوچ صاحبؒ کے بھتیجے تھے اور انکی وفات کے بعد مدرسہ احرار الاسلام کے مہتمم مقرر ہوئے۔ یہ پورا خانوادہ علمی اور دینی خدمات میں ممتاز و معروف تھا اور حضرت مولانا مفتی محمد عمر بلوچ صاحبؒ اپنی ان خاندانی روایات کے سچے امین تھے۔ متین اور باوقار شخصیت، وجیہ اور قد آور سراپا، ادا ادا سے علم و بردباری نمایاں اور علم و فضل کے آثار روشن!

لیاری کے علاقے میں اپنی خدمات اور خاص طور پر حضرت مولانا محمد عمر بلوچ صاحب

www.shiehaq.org

قدس سرہ کی دینی جدوجہد کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ یہ حضرات ہمیشہ شوروشغب اور پبلسٹی کے ذرائع سے بے نیاز ہوکر خاموشی اور سادگی کے ساتھ دین کی مخلصانہ خدمت میں مصروف رہے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ بحمد اللہ اس علاقے میں ان کی خدمت کے بڑے اثرات ہیں، اور لوگوں کو ان سے بے شمار دینی فوائد پہنچے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد عمر بلوچ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا دارالعلوم اور اس کے خدام کے ساتھ بھی بڑا مشفقانہ تعلق تھا۔ افسوس ہے کہ راقم الحروف اعتکاف میں ہونے کی بناء پر ان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کرسکا۔

قحط الرجال کے اس دور میں ایسی مغتنم ہستیوں کی جدائی ملک وملت کے لئے بڑا حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں، اور اس کے بھی آخری عشرے میں اپنے پاس بلایا، اور وہ رمضان کی چھبیسویں شب جو ان کی زندگی کی آخری رات تھی، تمام رات عبادت میں گزار کر اپنے خالق ومالک سے ملے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو اپنے مقام قرب میں درجات عالیہ سے نوازے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے، آمین۔

قارئین البلاغ سے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت وایصال ثواب کی درخواست ہے۔ اب موصوف کے بھائی مولانا محمد علی صاحب بلوچ مدرسہ احرار الاسلام کے ذمہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو یہ ذمہ داریاں بطریق احسن انجام دینے کی توفیق عطا فرمائیں اور ان کی امداد ونصرت فرمائیں۔ آمین البلاغ کے اسی شمارے میں انہی کے قلم سے حضرت مولانا محمد عمر بلوچؒ کے حادثۂ رحلت کی تفصیلات الگ شائع ہورہی ہیں۔

البلاغ جلد ۱۹ شمارہ ۹

دارالعلوم کے شہید طلبہ

مجاہدین افغانستان سالہا سال سے جس جوانمردی اور شجاعت کے ساتھ دنیا کی ایک بڑی مادی طاقت کا مقابلہ کر رہے ہیں، وہ دنیا بھر کیلئے حیرت انگیز ہے۔ یہ جہاد ہماری سرحد کے بالکل کنارے ہو رہا ہے۔ اور بیک رائے کے مطابق مجاہدین کی یہ قربانیاں صرف افغانستان کیلئے نہیں بلکہ پاکستان کے تحفظ کیلئے بھی یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں عوام کو اس جہاد کی اہمیت کا احساس نہیں، اور اس سلسلے میں عوام کے اندر وہ جذبہ اور جوش و خروش نظر نہیں آتا جو ہونا چاہئے۔

لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ اس عالم میں کچھ سعید روحیں ایسی بھی ہیں جو نہ صرف اس جہاد سے قلبی وابستگی رکھتی ہیں، بلکہ اس میں عملاً حصہ لیکر اس کیلئے اپنے جان و مال کا نذرانہ پیش کرتی رہتی ہیں۔

پچھلے دنوں دارالعلوم کراچی کے تقریباً بیس طلباء بھی جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر کسی ضابطے کی کارروائی کے بغیر اپنے طور پر اس جہاد میں عملاً شریک ہوئے۔ اور بعض نے حقیقتاً انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ بسم اللہ کے گنبد میں رہنے والے یہ بوریہ نشین جب سرفروشی اور جاں سپاری پر کمر باندھ لیں تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لے سکتے ہیں۔ انہوں نے بہت مختصر مدت میں جنگ کی تربیت حاصل کی اور بحمد اللہ جہاد میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

اب اطلاع ملی ہے کہ ان میں سے چھ طلبہ ایک شدید معرکے کے دوران شہید ہو گئے ہیں۔

[illegible]

اطلاع کے مطابق ان چھ طلباء کے نام یہ ہیں :

۱۔ امیر احمد ۳۔ عبدالرحمان ۵۔ محمد اقبال
۲۔ محمد سلیم ۴۔ محمد عبداللہ ۶۔ عبدالواحد

یہ سب دارالعلوم کے بڑے ہونہار طالب علم تھے، اور جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ بیتاب انہیں اپنی چھٹیوں کے دوران میدان جنگ تک لے گیا، وہاں انہوں نے جس عزیمت واستقامت کے ساتھ خالص اللہ کے لئے جان دی، وہ ہم سب کیلئے لائق رشک بھی ہے اور قابل فخر بھی۔ انہوں نے گولوں کی شدید بارش میں بھی نہ صرف یہ کہ دشمن کو پشت نہیں دکھائی بلکہ آخر وقت تک شجاعت کے جوہر دکھاتے رہے، اور شہادت کی موت کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ ان میں سے بعض طلبہ کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ جاتے وقت اپنے ساتھیوں سے یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہمارے لئے دعا کرنا کہ ہمیں شہادت نصیب ہو۔

فلستُ اُبالی حین اُقتل مسلما
علی أیّ جنب کان للہ مصرعی
وذلک فی ذات الإلٰہ وإن یشأ
یبارک علی أوصال شلو ممزّع

ان خدامست نوجوانوں نے اپنے خون گرم کا نذرانہ پیش کرکے جہاد افغانستان کی آبیاری کی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ خون معصوم رنگ لاکر رہے گا۔ آج ہمارے دل ان ہونہار جوانان رعنا کی جدائی سے مغموم بھی ہیں، اور ہمارے سر فخر سے بلند بھی کہ بحمد اللہ ابھی ہم میں ایسے جاں نثار موجود ہیں جو نام و نمود سے بے پرواہ ہو کر صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کیلئے اپنی جان دے سکتے ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

انہی میں سے بعض طلبہ زخمی بھی ہوئے۔ ایک طالب علم محمد یونس کی آنکھ بھی شہید ہوئی، اور ایک طالب علم محمد سلیم کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ شہداء کیلئے مغفرت، ان کے پسماندگان کیلئے صبر جمیل اور زخمی طلبہ کیلئے صحت وعافیت کاملہ عاجلہ کی دعا فرمائیں۔

البلاغ جلد ۱۹ شمارہ ۱۲

وفات حسرت آیات
عارف باللہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب عارفیؒ

قارئین کو یقیناً اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع مل چکی ہوگی کہ احقر کے شیخ و مربی، اور ہم سب کے مخدوم بزرگ عارف باللہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی (رحمۃ اللہ علیہ) صدر دارالعلوم کراچی جمعرات ۱۵ رجب ۱۴۰۶ھ کی صبح کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت والا کی وفات پوری ملت کیلئے بالعموم، اور حضرتؒ کے متعلقین اور اہل دارالعلوم کیلئے بالخصوص، ایسا عظیم سانحہ ہے جس پر شدت غم کے اظہار کے لئے تمام الفاظ ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔ اس حادثے کے بعد سے راقم الحروف اپنے آپ کو ایک ایسے چٹیل صحرا میں محسوس کر رہا ہے جس میں دور دور کسی سائے کا نام و نشان نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت والاؒ کو اس دنیا میں اپنی رحمت کا مظہر بنایا تھا، وہ رحمت و رافت اور شفقت کا پیکر مجسم تھے، جس کسی کا آپ سے تعلق ہوا، خواہ مختصر وقت ہی کیلئے کیوں نہ ہو، وہ آپ کے اس وصف جمیل کا گہرا نقش لئے بغیر نہ رہ سکا۔ آپ اپنے سے ادنیٰ تعلق رکھنے والوں کی نجی زندگی کی تفصیلات تک میں اس قدر دخیل تھے کہ آج ان میں سے ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ دنیا میں اس کی سب سے گرانقدر پونجی لٹ گئی۔ یہ عزیز ترین متاع گم ہو گئی، اور زندگی کا محبوب ترین سہارا ٹوٹ گیا۔

اگرچہ یہ احساس ہر اس شخص کو ہے جسے حضرت والاؒ سے نیاز مندانہ تعلق تھا، لیکن ناچیز راقم الحروف، برادر بزرگ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہم اور دارالعلوم کے دوسرے خدام کے ساتھ حضرتؒ کا معاملہ ایسا تھا کہ تعبیر کرنے کیلئے "لطف و کرم" سے لیکر "شفقت و محبت" تک کے تمام الفاظ تشنہ ہی تشنہ معلوم ہوتے ہیں۔

آج سے تقریباً دس سال پہلے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کا حادثہ وفات ہمارے لئے زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا، اس حادثہ کے موقع پر اور اس کے بعد جس ذات کی بے پایاں شفقتوں نے ہمیں اور دارالعلوم کو سہارا دیا، وہ حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ ہی کی ذات بابرکات تھی، آپ نے اس وقت فرمایا تھا کہ میری کوشش جیسے

ہی یہ ہوگی کہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے بعد تمہیں یہ احساس نہ ہو کہ تمہارا باپ سر پر نہیں ہے' اور پھر گذشتہ دس سال کے دوران آپ نے اپنے اس ارشاد کا جس غیر معمولی طور پر حق ادا فرمایا' وہ صرف اور صرف آپ ہی کا حصہ تھا۔

اس لئے حضرت والاؒ کی وفات ہمارے لئے دہرا صدمہ لیکر آئی ہے' ایک طرف آپ کی وفات سے اس شیخ و مربی کا سایہ سر سے اٹھا ہے جس کی زندگی کا ہر سانس خدمت دین اور اپنے متعلقین کی اصلاح کی فکر کیلئے وقف تھا' اور دوسری طرف والد ماجد قدس سرہ کی وفات کا وہ زخم جس پر حضرت والاؒ نے اپنی ناقابل بیان شفقتوں سے مرہم رکھا ہوا تھا' ایک بار پھر اس طرح ہرا ہو گیا ہے جیسے یہ حادثہ بھی آج پیش آیا ہو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

الحمد للہ' اس جاں گداز صدمے کے باوجود انہی بزرگوں کی تعلیم و تلقین سے یہ حقیقت پوری طرح دل نشین ہے کہ اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں' حکیم بھی اور اپنے بندوں پر کائنات کے ہر فرد سے کہیں زیادہ رحیم بھی' ان کا کوئی فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں' اس دنیا میں کوئی ہمیشہ رہنے کیلئے نہیں آتا' موت کے اٹل قانون سے نہ کوئی پیغمبر مستثنیٰ ہوئے' نہ کوئی صحابی یا بڑے سے بڑا ولی' قضاء الٰہی میں ہر شخص کے حصے کے سانس گنے ہوئے محفوظ ہیں جن میں کسی آرزو' کسی تمنا' کسی صدمے اور کسی بڑی سے بڑی کوشش سے کوئی کمی بیشی ممکن نہیں' پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے کہ کس شخص کو کب تک دنیا میں باقی رکھنا قرین حکمت ہے' ہم اور آپ اپنے اپنے ظاہری مفادات اور سطحی آرزوؤں کے محدود دائرے میں رہ کر سوچتے ہیں' لیکن علیم و حکیم کے فیصلے پورے نظام کائنات کی ان ازلی اور ابدی حکمتوں پر مبنی ہوتے ہیں جن تک ہماری محدود سوچ کی رسائی ممکن نہیں۔ اگر کائنات کا یہ نظام جو صدیوں سے چل رہا ہے' اس کو ہماری انفرادی سطحی آرزوؤں کے تابع بنا دیا جاتا تو اس کا ایک دن چلنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا پورا یقین ہے کہ جو کچھ ہوا' وہ حکمت و مصلحت کے عین مطابق تھا' اس فیصلے میں کسی ادنیٰ نقص کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہم کمزور ہیں' ہماری عقل' ہماری فہم' ہماری سوچ ایک تنگ دائرے میں محدود ہے' اور ہمارے غم و مسرت کے جذبات اسی تنگ دائرے سے وابستہ ہیں' لہٰذا مذکورہ بالا حقائق پر مکمل ایمان کے باوجود دل میں سلگنے والی آتش غم کو یکلخت بجھا دینا ہمارے بس سے باہر ہے' یہ آگ تو نہ جانے کب تک لو دیتی رہے گی' لیکن یہ مولائے کریم کا کیسا انعام ہے کہ پارہ پارہ دل اور پرنم آنکھوں کے ساتھ بھی

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون کہہ دیجئے ...... اور صرف کہہ دیجئے ...... پر کتنے عظیم صلے کا وعدہ فرمایا ہے کہ اولئک علیہم صلوات من ربھم ورحمۃ و اولئک ھم المھتدون۔

……

حضرت والاؒ کے ضعف ونقاہت کا سلسلہ تو عرصے سے چل رہا تھا، لیکن شدید ضعف کے باوجود آپ نے اپنے معمولات زندگی کبھی نہیں چھوڑے، اسی طرح آخر شب میں بیدار ہونا، اسی طرح نوافل و اوراد کا اہتمام، اسی طرح آٹھ بجے گھر سے نکل جانا اور ایک بجے دوپہر تک مطب میں اس طرح مشغول رہنا کہ بیچ میں پل بھر کی مہلت نہ تھی، اسی طرح ڈاک کے انبار کا جواب، اسی طرح احباب کے سامنے دینی افادات کا سلسلہ، اسی طرح ایک ایک فرد کے ساتھ حق محبت کی ادائیگی کا اہتمام۔ غرض اس ضعف ونقاہت کے عالم میں ان تمام گراں بار ذمہ داریوں کا پورا پورا حق ادا کرنا ایک ایسی محیر العقول بات تھی جسے حضرت والاؒ کی قوت ایمانی کی کرامت کے سوا کسی اور نام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

اسی ضعف کے عالم میں اتوار ۱۱ رجب ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۸۶ء کو فجر کے بعد معمولی بد ہضمی کی بنا پر درد شکم کی شکایت شروع ہوئی، اتفاق سے اسی دن دارالعلوم میں ختم بخاری شریف کی تقریب تھی، اور حضرتؒ نے یہاں تشریف آوری کا وعدہ فرمایا تھا، خدام نے عرض بھی کیا کہ طبیعت چونکہ ٹھیک نہیں ہے، اس لئے دارالعلوم تشریف لیجانا ملتوی فرما دیں، لیکن فرمایا کہ "الحمد للہ، ابھی ہمت ہے، اور ختم بخاری شریف کی بابرکت مجلس میں شرکت کا معاملہ ہے، اس لئے میں ضرور جاؤں گا .... اللہ اکبر! اس ضعف اور علالت میں بھی سعادتوں کے حصول کی یہ فکر اور دارالعلوم کے ساتھ تعلق کا یہ عالم تھا۔

دارالعلوم تشریف لائے، لیکن یہاں پہنچ کر بھی تکلیف جاری رہی، یہاں تک کہ تکلیف ہی کی بنا پر وقت مقررہ سے پہلے تشریف لے جانے کا فیصلہ فرمایا، اور مکان پر تشریف لے گئے، مکان پر پہنچنے کے بعد بھی تکلیف بڑھتی چلی گئی، متعدد معالجوں کا علاج ہوا، لیکن درد شکم کو افاقہ ہوا تو پیشاب میں رکاوٹ کی تکلیف ہو گئی، منگل کے دن پتہ چلا کہ بلڈ پریشر بہت گر گیا ہے، اور بلڈ یوریا میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔

احقر دو ہفتے پہلے سعودی عرب اور ترکی کے سفر پر گیا ہوا تھا، بدھ کی صبح کو واپس کراچی پہنچا تو حضرتؒ کی علالت کا علم ہوا، حضرتؒ کے مکان پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرتؒ کو ناظم آباد

کے مرتضیٰ ہسپتال میں لیجایا گیا ہے' افتاں خیزاں وہاں حاضر ہوا تو حضرت" چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے' ڈرپ لگی ہوئی تھی' ناک سے آکسیجن دی جارہی تھی' لیکن اس حالت میں بھی ہوش وحواس پوری طرح برقرار تھے۔ حضرت" نے اس ناکارہ کی آمد پر مسرت کا اظہار فرمایا' اور فرمایا کہ "جو سانس بھی اللہ کی یاد میں میسر آجائے وہ بڑی نعمت ہے۔" اس کے بعد کچھ اور باتیں بھی ارشاد فرمائیں' آواز میں بحمداللہ قوت تھی' البتہ دواؤں کے اثر سے بولنے میں قدرے دقت ہوتی تھی' اور جملے پوری طرح سمجھنا مشکل ہوتا تھا۔

تاہم ڈاکٹروں نے اس حد تک اطمینان دلایا کہ بحمداللہ ہسپتال آنے کے بعد بلڈ پریشر تقریباً معمول پر آگیا ہے' بلڈیوریا میں بھی کمی ہوئی ہے' اور پیشاب بھی ہوا ہے' یہ حالات امید افزا تھے' بدھ کا دن اسی حالت میں گذرا' لیکن جمعرات کی شب میں فجر سے پہلے سانس اکھڑنی شروع ہوگئی' فجر کی اذان ہورہی تھی' برادر عزیز ومکرم ممتاز صاحب جو اس وقت سرہانے موجود تھے' ان کا بیان ہے کہ اذان کے وقت زبان میں حرکت محسوس ہوئی' عمربھر اذان کا جواب دینے کا جو اہتمام تھا' اس عالم میں بھی اس سے غفلت نہ تھی' اور بس' یہ اس زبان مبارک کی آخری حرکت تھی۔

بیمار عشق لے کے ترا نام سوگیا
مدت کے بیقرار کو آرام آگیا

اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ، ونقہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس۔

……………………

اللہ تعالیٰ نے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ کو اس آخری دور میں اپنے شیخ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے علوم وفیوض کی تشریح وتوضیح اور ان کی نشرواشاعت کیلئے گویا چن لیا تھا' خاص طور پر اپنی زندگی کے آخری سالوں میں حضرت" پر افادہ خلق کا ایک جذبہ بیتاب طاری تھا' ان کی ہر وقت کی دھن یہ تھی کہ جو کچھ میں نے اپنے شیخ سے حاصل کیا ہے' اسے جلد از جلد اپنے ہر مخاطب کی طرف منتقل کردوں' چنانچہ حضرت" کے یہ افادات کسی باقاعدہ مجلس کے پابند نہیں تھے' بلکہ ان کی حالت یہ تھی کہ

میں جہاں بیٹھ لوں' وہیں میخانہ بنے

چنانچہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ان کی زبان مبارک پر ایک ہی ذکر تھا، اور وہ تھا اتباع سنت کی دعوت و تبلیغ، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے والے اعمال کی تربیت اور اپنے شیخ کے مزاج و مذاق کی تعلیم، چنانچہ آپ جہاں بیٹھ جاتے، خواہ وہ گھر ہو یا مطب، یا کوئی اور جگہ دعوت و تبلیغ کا یہ سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، اور اس جذبۂ بیتاب کا لازمی اثر یہ تھا کہ ملنے والا اگر چند لمحے بھی آپ کی صحبت سے فیض یاب ہو سکا ہے تو وہ اپنی زندگی کیلئے کچھ نہ کچھ لیکر اٹھتا تھا۔

حضرت والاؒ کی اس تبلیغ و دعوت اور تعلیم و تربیت سے سینکڑوں زندگیوں میں انقلاب آیا، اور نہ جانے کتنے لوگوں کی کایا پلٹ گئی۔

آپ نے وکالت کے پیشے کو چھوڑ کر ہومیوپیتھک طریقہ علاج کا مشغلہ اختیار فرمایا تھا، اور آخر وقت تک اس مشغلے کو ترک نہیں فرمایا، مطب میں لوگوں کے رجوع کا عالم یہ تھا کہ جس وقت حضرت مطب میں تشریف فرما ہوتے، اس وقت بعض مرتبہ کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ ہوتی تھی، لیکن اس مشغولیت کے عالم میں بھی دعوت و تبلیغ کا کام چھوٹتا نہیں تھا، اور اس مطب میں جسمانی امراض کے ساتھ ساتھ روحانی امراض کا علاج بھی جاری رہتا تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو حضرتؒ کے پاس اپنے جسمانی امراض کے علاج کیلئے آئے، آتے وقت نہ دین کی کوئی فکر تھی، نہ کسی دینی بات سے دلچسپی، لیکن یہاں سے دین کی فکر لیکر لوٹے جسم کے ساتھ ساتھ اپنی روح کی دوائیں لیکر گئے، اور رفتہ رفتہ اللہ نے ان کی کایا پلٹ دی۔

زبانی وعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ حضرتؒ کے یہاں تصنیف کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور آپ نے ہزارہا صفحات پر مشتمل اپنی ایسی تالیفات کا گرانقدر ذخیرہ چھوڑا ہے جو اپنے اسلوب کے لحاظ سے بالکل منفرد ہے، اور طالبان حق کے لئے انشاء اللہ رہتی دنیا تک مشعل راہ بنے گا۔ "اسوۂ رسول اکرمؐ" "آثر حکیم الامت" "بصائر حکیم الامت" "معارف حکیم الامت" "اصلاح المسلمین" اور "معمولات یومیہ" میں سے ہر کتاب ہم سب کیلئے ایک گرانقدر سرمایہ اور علوم و معارف کا انمول خزانہ ہے، جس کے ذریعے انشاء اللہ حضرت والاؒ کا فیض ہمیشہ جاری رہے گا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

……

حضرت والاؒ کا تذکرہ در حقیقت ایک مستقل تالیف چاہتا ہے، اور اس وقت حضرت

کے تمام متوسلین اس قدر دل شکستہ ہیں کہ کسی کو تفصیل سے اس موضوع پر قلم اٹھانے کا یارا نہیں، لیکن ارادہ یہ ہے کہ انشاء اللہ "البلاغ" کی ایک خصوصی اشاعت عنقریب حضرتؒ ہی کے تذکرے کیلئے مخصوص کی جائے گی جس میں حضرتؒ کی سوانح حیات، آپ کے افادات، آپ کے معمولات زندگی اور آپ کے خصوصی مزاج و مذاق پر انشاء اللہ تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ اس غرض کے لئے متعدد حضرات سے مضامین لکھنے کی درخواست بھی کردی گئی ہے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ آئندہ شمارے میں اس خاص نمبر کی تاریخ کا اعلان کردیا جائے گا۔؎

اس وقت تو قارئین سے درخواست ہے کہ وہ حضرت والاؒ کیلئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کامل مغفرت فرما کر آپ کو اپنے مقامات قرب میں پیہم ترقی درجات عطا فرمائیں، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں اور ہم سب کو حضرتؒ کی ہدایات و تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں۔

اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔ آمین۔ البلاغ جلد ۲۰ شمارہ ۸

؎ یہ خاص نمبر حضرت عارفی نمبر کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ محمد زبیر

حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ

۲ جمادی الثانیہ ۱۴۰۷ھ مطابق یکم فروری ۱۹۸۷ء کو میں بفضلہ تعالیٰ عمرے کی ادائیگی کے بعد جدہ سے خرطوم (سوڈان) جانے کیلئے روانہ ہو رہا تھا کہ جدہ میں پاکستان کے قونصل ظفر اللہ شیخ صاحب نے مجھے ایک ٹیلیکس کا پیغام دیا۔ اس پیغام میں یہ جانکاہ خبر دی گئی تھی کہ "آپ کے بہنوئی جناب مولانا نور احمد صاحب گزشتہ رات انتقال فرما گئے۔" پہلے جب شیخ صاحب نے زبانی یہ خبر سنائی تھی تو یقین نہیں آیا تھا، اور میں نے دل کو یہ تسلی دینے کی کوشش کی تھی کہ شاید پیغام سمجھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہوگی، اس لئے کہ ابھی پرسوں جمعہ کے دن میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ پوری طرح صحت مند ہمیشہ کی طرح فعال اور چاق و چوبند تھے، اور کسی بیماری یا کمزوری کے دور دور کوئی آثار نہ تھے، لیکن جب شیخ صاحب نے تحریری پیغام دیا تو دل پر ایک بجلی سی گری، اس المناک خبر کو سچ مانے بغیر چارہ نہ تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ احقر کے بہنوئی بھی تھے اور استاذ بھی، اور اس لحاظ سے ان کی وفات میرے لئے ایک زبردست اور گھریلو حادثہ تو ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسلام کے ان خاموش رضا کاروں میں سے تھے جن کی پوری زندگی علمی، تعلیمی، اجتماعی اور سیاسی میدانوں میں کسی نہ کسی جہت سے خدمت دین میں بسر ہوئی، لیکن وہ نام و نمود اور شہرت کے معروف ذرائع سے ہمیشہ دور رہے۔ قیام پاکستان کی تحریک سے لے کر روز وفات تک ملک و ملت کے نہ جانے کتنے اہم کاموں میں انہوں نے مؤثر حصہ لیا، لیکن اس طرح کہ جب ان کاموں کی تاریخ مرتب کرنے والے تاریخ مرتب کریں گے تو شاید ان کاموں میں ان کا نام نہ آئے، یا آئے تو سرسری اور مختصر انداز میں، اور اسی طرح دینی خدمات کے ساتھ اس دور میں شہرت و منفعت کے جو وسائل ہر وقت لگے رہتے ہیں، مولانا ان سے اپنا دامن بچاتے ہوئے دنیا کی سرحد پار کر گئے۔ لیکن برصغیر کے اندر ہی نہیں بلکہ بیرونی دنیا کا شاید کوئی دینی حلقہ ایسا نہیں ہوگا جو ان سے اور ان کی خدمات سے واقف نہ ہو، لہٰذا ان کی وفات محض

ایک شخصی اور گھریلو حادثہ ہی نہیں، علم وملت کا ایک عظیم سانحہ ہے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

مولاناؒ اپنے وطن سے علوم دین کی تکمیل کیلئے دارالعلوم دیوبند آئے تھے، اپنی ذہانت وذکاوت اور مضبوط علمی استعداد کی بنا پر اپنے تمام اساتذہ کے منظور نظر رہے، اور ہمیشہ امتحانات میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ اساتذہ کی خدمت اور ان کے علمی وعملی کاموں میں ہاتھ بٹانے کا خاص ذوق تھا، اس لئے تعلیم سے فراغت کے بعد بھی دیوبند ہی میں مقیم ہو گئے۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ سے خصوصی تعلق قائم کیا، اور جب ۱۹۴۸ء میں حضرت والد صاحبؒ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے تو اگلے ہی سال مولاناؒ بھی کراچی تشریف لے آئے۔ حضرت والد صاحبؒ کا ذاتی کتب خانہ دیوبند میں رہ گیا تھا، اور حضرت والد صاحب کی عمر بھر کی پونجی تھی، اسے پاکستان منتقل کرنے میں مولاناؒ نے بڑی محنت کی جس کی حضرت والد صاحب قدس سرہ کے دل میں بڑی قدر تھی۔

یہ احقر کے بچپن کا بھی بالکل ابتدائی زمانہ تھا، میں نے دیوبند میں قاعدہ بغدادی شروع کیا تھا کہ پاکستان منتقل ہونے کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ کراچی میں اس وقت دور دور تک کوئی ایسا مدرسہ نہ تھا، جس میں میری عمر کے بچے تعلیم حاصل کر سکیں۔ چنانچہ احقر کی ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ نے قبول فرمائی، اور مجھے قاعدہ بغدادی پڑھانا شروع کیا، ابھی قاعدہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ خاندان کے کچھ بچوں کے بارے میں یہ اطلاع ملی کہ وہ پارہ عم بھی ختم کر چکے ہیں، اس اطلاع پر انہوں نے احقر کو قاعدہ بیچ میں چھڑوا کر پارہ عم شروع کرا دیا، اور ابتدائی چند پارے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ پڑھا دیئے، اس وقت حضرت والد صاحبؒ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ کے ساتھ علمی وملی خدمات میں مصروف رہتے تھے، اور حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ بھی ان کا ہاتھ بٹانے کیلئے ہمہ وقت انہی کے ساتھ رہتے تھے، اس لئے میری پڑھائی کا نہ کوئی وقت مقرر تھا، نہ دن، جب بھی مولاناؒ کو موقع مل گیا، مجھے لے کر بیٹھ گئے، اور یہ ان کے انداز تعلیم اور والدین کی دعاؤں کی برکت تھی کہ اس طرح بے قاعدگی سے پڑھنے کے باوجود میں نے سات پارے پورے کر لئے، اور ناظرہ پڑھنے کے لائق ہو گیا۔

اس مرحلے پر مولاناؒ نے مجھ سے فرمایا کہ اب باقی ماندہ قرآن کریم تم خود نکال سکتے ہو،

روزانہ تھوڑا تھوڑا خود پڑھ لیا کرو، چنانچہ اب انہوں نے مجھے قرآن کریم کے بجائے بہشتی گوہر اور سیرت خاتم الانبیاء شروع کرا دی، اور ان دونوں کتابوں کے بعد حمد باری۔ اتنے عرصہ میں پہلے جامع مسجد جیکب لائنز کے اندر اور پھر مسجد باب الاسلام آرام باغ میں چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم ہو گئے جن میں ابتدائی فارسی کی تعلیم کا انتظام تھا، پھر احقر نے وہاں پڑھنا شروع کر دیا۔

لیکن اس ناکارہ کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حرف شناسی کی جو مقدار بھی حاصل ہوئی، وہ ظاہری اسباب میں حضرت مولانا نور احمد صاحب قدس سرہ کی رہین منت ہے، اور اس لحاظ سے بھی وہ احقر کے بہت بڑے محسن ہیں۔

پاکستان منتقل ہونے کے بعد ابتدائی چند سالوں میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کی زیادہ تر توجہ ملک میں اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے کاموں پر مرکوز رہی، اور اس مقصد کیلئے زبان و قلم سے لیکر تحریکی اور ہنگامی انداز کی جدوجہد تک ہر قسم کے کام حضرت والد صاحب کو کرنے پڑے۔ اس دور میں حضرت والد صاحبؒ کے ان تمام کاموں میں حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ آپ کے دست و بازو اور خصوصی معاون بنے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو مہم جوئی اور مشکلات کو سر کرنے کا نہ صرف ملکہ، بلکہ اس کا خاص ذوق و شوق عطا فرمایا تھا، وہ اس معاملے میں غیر معمولی عزم و ارادے اور حوصلے کے مالک تھے، جو کام سادہ، آسان اور معمولی ہو وہ کر ضرور لیتے تھے، لیکن ان کی اصل جولانیاں ایسے مواقع پر ظاہر ہوتی تھیں جب کوئی ایسا مشکل اور سخت محنت طلب کام سامنے آجائے جس سے عام لوگ پیچھے ہٹ رہے ہوں، ایسے مواقع پر وہ آگے بڑھ کر بڑے ذوق و شوق سے اس کام کو سنبھالتے اور جب تک وہ کام اپنی انتہا کو نہ پہنچ جاتا اس کے لئے تن من کی بازی لگائے رکھتے، اس معاملے میں رات دن کو ایک کرکے بظاہر ناممکن کو ممکن کر دکھانا ان کا خاص وصف تھا جس سے ان کے ساتھ جو رفاقت رکھنے والا پوری طرح آگاہ ہے۔

چنانچہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کے مذکورہ بالا کاموں میں وہ اسی دھن اور جذبے کے ساتھ مصروف رہتے تھے، اور اس طرح اس دور کی حضرت والد صاحبؒ کی بیشتر خدمات میں ان شاء اللہ وہ عظیم اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ کو کراچی منتقل ہونے کے بعد اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس بھرے پرے شہر میں، جو اس وقت ملک کا دارالحکومت بھی تھا، کوئی معیاری دینی درسگاہ موجود نہیں ہے۔ چنانچہ وہ یہاں ایک معیاری دارالعلوم قائم فرمانا چاہتے تھے۔ شروع میں مسجد باب الاسلام آرام باغ میں ایک چھوٹا سا مدرسہ "امداد العلوم" اور اسی کے ساتھ ایک کمرہ تعمیر کر کے ایک "دارالافتاء" قائم فرمایا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی نگرانی میں ان اداروں کا عملی انتظام حضرت مولانا نور احمد صاحب قدس سرہ نے ہی سنبھالے رکھا۔

۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب قدس سرہ کی آرزو اس طرح پوری فرمائی کہ محلہ نانک واڑہ میں ہندوؤں کے ایک متروکہ اسکول کی عمارت مدرسے کے قیام کیلئے مہیا ہو گئی۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ نے اس عمارت میں بنام خدا تعالیٰ وہ مدرسہ قائم فرمایا جو آج بحمد اللہ دارالعلوم کراچی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عمارت بڑی میلی کچیلی اور کباڑ خانے کی سی حالت میں ملی تھی، حضرت والد صاحب قدس سرہ اور حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ نے اپنے ہاتھوں سے اس کی صفائی کر کے اس مدرسے کا آغاز فرمایا۔ حضرت والد صاحبؒ نے مدرسے کے امور کی اصولی نگرانی کیلئے ایک مجلس منتظمہ قائم فرمائی جس میں متعدد علماء اور شہر کے دیندار معزز افراد شامل تھے، حضرت والد صاحبؒ اس مجلس کے صدر قرار پائے، اور حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ کو دارالعلوم کا ناظم مقرر کیا گیا اور اس حیثیت میں بھی مولاناؒ نے اپنی فعال اور متحرک شخصیت کے جوہر دکھلائے۔

اللہ تعالیٰ نے مدرسے کو مقبولیت عطا فرمائی، اور طلباء کا رجوع بڑھا، یہاں تک کہ وہ عمارت تنگ محسوس ہونے لگی۔ ۱۹۵۵ء میں اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم کو شہر سے باہر اس علاقے میں ایک وسیع قطعہ اراضی عطا فرمایا جہاں آج کورنگی انڈسٹریل ایریا آباد ہے۔ اس وقت کورنگی کی آبادی کا نہ کوئی نام ونشان تھا، نہ اس کا کوئی تصور۔ اس علاقے سے نزدیک ترین شہری آبادی لانڈھی کی تھی۔ رسل ورسائل کے ذرائع مفقود تھے، اور شہر سے اتنی دور جگہ پر مدرسے کی تعمیر بڑا کٹھن مرحلہ تھا، لیکن حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ کی مہم جویانہ طبیعت نے اس کٹھن مرحلے کو بڑی خوبی کے ساتھ مردانہ وار طے کیا، اور مختصر سی مدت میں یہاں تین عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہو گئیں جن میں ایک درسگاہوں اور دو طلبا کی قیام گاہوں

پر مشتمل تھیں چنانچہ ۱۹۵۷ء میں دارالعلوم اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کو مولاناؒ سے دارالعلوم سے باہر بھی مختلف جہات میں کام لینا تھا، چنانچہ حالات ایسے پیدا ہوئے کہ وہ (تقریباً ۱۹۶۹ء کے آغاز میں) دارالعلوم سے مستعفی ہو گئے۔ اور انہوں نے "مجلس دعوۃ الحق" کے نام سے ایک تبلیغی ادارہ قائم کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں پہلی بار سوشلزم کے قیام کی تحریک پوری قوت سے اٹھ رہی تھی۔ چنانچہ اس موقع پر انہوں نے مجلس دعوۃ الحق کے ذریعے سوشلزم کی تردید کو اپنا ہدف بنا کر ہر طرح کی علمی اور عملی جد و جہد شروع کی، اور اس سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ سوشلزم کے بارے میں ۱۱۳ علماء کا وہ فتویٰ جس نے اس دور میں بہت شہرت حاصل کی، درحقیقت مولاناؒ ہی کی جد و جہد کا نتیجہ تھا، اور مختلف مکاتب فکر کے علماء سے اس پر دستخط حاصل کرنے کیلئے انہوں نے چند روز کے اندر کراچی سے پشاور تک کا طوفانی سفر کیا تھا۔

جب افغانستان میں روسی افواج کے داخلے کی بنا پر افغان مجاہدین نے گوریلا جنگ شروع کی، تو ان مجاہدین کو مادی اور اخلاقی امداد فراہم کرنے میں بھی مولاناؒ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ افغان مجاہدین کی مختلف تنظیموں سے مولاناؒ کے بڑے گہرے روابط تھے، اور وہ سب ان کی خدمات کے احسان مندی کی حد تک معترف ہیں۔ اس سلسلے میں متعدد مرتبہ مولاناؒ نے سرحد تک سفر بھی کیا، پاکستان میں مختلف طبقوں سے مل کر انہیں جہاد افغانستان کے متعلق ان کے فرائض کا احساس دلایا، اور لاکھوں روپے کا چندہ جمع کر کے افغان مجاہدین تک پہنچایا، اور ایک زمانہ ایسا گزرا کہ مولاناؒ کی شب و روز کی مصروفیات اسی جہاد سے متعلق تھیں۔

اسی جہاد کے سلسلے میں مولاناؒ کا رابطہ مؤتمر عالم اسلامی سے قائم ہوا، اور مؤتمر نے آپ کو نشر و اشاعت اور دعوت و ارشاد کا ناظم بھی مقرر کر دیا۔ اور اس حیثیت میں بھی انہوں نے ملک اور بیرون ملک خدمات جلیلہ انجام دیں۔

آخر عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان سے دینی علوم کی جو عظیم خدمت لی، وہ اپنی پائیداری اور اثرات کے لحاظ سے ایسی خدمت ہے کہ اگر ان کی زندگی میں صرف یہی ایک کارنامہ انجام پایا ہوتا تو شاید ان کی سعادت و فضیلت کیلئے کافی تھا۔ انہوں نے "ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم فرمایا۔ شروع میں یہاں سے تصحیح کے خصوصی اہتمام کے ساتھ قرآن کریم کے نسخے شائع کئے جو اپنی صحت، حسن اور دلکشی کے لحاظ سے

کسی طرح تاج کمپنی کے نسخوں سے کم نہ تھے۔ اس کے بعد اسی ادارے سے انہوں نے "اعلاء السنن" جیسی عظیم الشان کتاب جو بیس جلدوں پر مشتمل ہے پہلی بار مکمل ٹائپ پر شائع کی۔ "اعلاء السنن" وہ جلیل القدر کتاب ہے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے اپنی نگرانی میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ سے تالیف کروائی تھی، اور خود حضرت کا یہ ارشاد متعدد بزرگوں نے نقل کیا کہ اگر خانقاہ تھانہ بھون سے اس کتاب کی تالیف کے سوا کوئی اور کام نہ ہوا ہوتا تو تنہا یہی کام اس کی سعادت کیلئے کافی تھا۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کو اس کتاب کی اشاعت کا بہت اہتمام تھا، لیکن قلت وسائل کی بنا پر اس وقت اس کی صرف گیارہ جلدیں شائع ہو سکیں، اور وہ بھی لیتھو کی طباعت کے ساتھ، باقی حصے سالہا سال تک تشنۂ طباعت رہے۔ آخر میں حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی آخر عمر میں یہ سوچ کر کہ یہ حصے کسی طرح وجود میں آکر محفوظ ہو جائیں، انہیں نہایت معمولی کاغذ پر لیتھو کی طباعت کے ساتھ چھپوا دیئے تھے، مگر اس کا مقصد محض کتاب کو وجود میں لانا تھا، اول تو طباعت ایسی تھی کہ خاص طور پر اہل عرب اس سے استفادہ نہ کر سکتے تھے، دوسرے اس وقت تک ابتدائی جلدیں نایاب ہو چکی تھیں۔

ہمارے تقریباً تمام بزرگوں کی تمنا تھی کہ یہ کتاب ٹائپ پر مکمل شائع ہو، لیکن بیس جلدوں کی طباعت کا انتظام کارے دارد تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ کے دل میں یہ داعیہ پیدا فرمایا، اور یہ کام انہی جیسے شخص کی ہمت مردانہ کا منتظر تھا۔ پاکستان میں عربی ٹائپ کی طباعت انتہائی مشکل کام تھا، اس کیلئے سرمایہ بھی درکار تھا اور محنت بھی۔ حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ نے اپنی خداداد قابلیت سے یہ مشکل کام بڑی خوبی کے ساتھ سر کیا، اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ کتاب طباعت کے حسین پیرہن میں منظر عام پر جلوہ گر ہو گئی۔

"اعلاء السنن" کی اشاعت نے ان کے سامنے علم و دین کی خدمت کا ایک وسیع دروازہ کھول دیا، اور اب انہوں نے ایسی نایاب کتابوں کی جستجو شروع کر دی جو ابھی تک طبع نہیں ہوئیں، یا طبع ہو کر مدت سے نایاب ہو چکی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یکے بعد دیگرے بہت سی گرانقدر علمی کتب شائع کیں جو ماضی قریب میں عالم اسلام کے کسی بھی حصے میں

شائع نہیں ہوئی تھیں۔ "مصنف ابن ابی شیبہ" کا مکمل نسخہ پہلی بار بمبئی سے حال ہی میں شائع ہوا تھا، لیکن اس میں بھی بہت سے ابواب غائب تھے، مولاناؒ نے پیر جھنڈا کے کتب خانے سے اسکا مخطوطہ نکلوا کر ان ابواب کا اضافہ کیا، اور پہلی بار اتنی مکمل صورت میں یہ کتاب شائع فرمائی۔ اسی طرح امام محمدؒ کی مبسوط جو کتاب الاصل کے نام سے مشہور ہے، اس کے بعض متفرق حصے مختلف ملکوں میں شائع ہوئے تھے، مولاناؒ نے ان حصوں کو یکجا کر کے شائع کیا۔ "الاشباہ والنظائر" مدت سے نایاب تھی، انہوں نے یہ کتاب بھی طبع فرمائی۔ اس کے علاوہ امام محمدؒ کی "الجامع الصغیر" اور "کتاب الآثار" بھی پاکستان میں پہلی بار اتنے خوبصورت لباس میں شائع کیں۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "محیط البرہانی" ابھی تک دنیا میں کہیں طبع نہیں ہوئی، یہ کتاب فقہ حنفی کے اہم ترین مآخذ میں سے ہے، لیکن دنیا بھر میں اس کے صرف چند قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ کتاب اتنی ضخیم ہے کہ اب تک کسی ناشر نے اسکی اشاعت کی ہمت نہیں کی۔ اسکی اشاعت بلاشبہ اتنا کٹھن کام ہے کہ اچھی اچھی اکیڈمیوں کو اس کے تصور سے پسینہ آجائے، لیکن مولاناؒ نے اس کتاب کو بلاشبہ منظر عام پر لانے کا ارادہ کر لیا تھا، اور اسی غرض کیلئے محنت شاقہ برداشت کر کے اسکے دو مکمل نسخوں کی فوٹو کاپیاں حاصل کر لی تھیں۔ ایک نسخہ راولپنڈی سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں میں موجود تھا جہاں فوٹو اسٹیٹ وغیرہ کی کوئی سہولت میسر نہ تھی، مولاناؒ ایک فوٹو اسٹیٹ مشین کے مالک کو منہ مانگی اجرت دیکر اس گاؤں میں لیکر گئے، اور دن رات جاگ کر اسکی فوٹو کاپی نکلوائی، دوسرا نسخہ مدینہ منورہ کے ایک کتب خانے سے اسی طرح حاصل کیا، اور ان سے کئی نسخے تیار کر لئے۔ ابھی نسخوں کی فراہمی کا عمل مکمل ہوا تھا، اور طباعت کا آغاز نہ ہو سکا تھا کہ زندگی کا سفر تمام ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جس زمانے میں وہ "المحیط البرہانی" کے نسخوں کی جستجو میں مصروف تھے، اسی دور میں ایک طرف "المبسوط للسرخسی" کی طباعت کا کام جاری تھا جو اب بحمد اللہ تکمیل کو پہنچ رہی ہے، اور دوسری طرف "احکام القرآن" کی طباعت کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

"اعلاء السنن" کی طرح "احکام القرآن" بھی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ العزیز کے عظیم کارناموں میں سے ایک کارنامہ ہے۔ اس کی تالیف

آپ نے مختلف علماء کے سپرد فرمائی تھی۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت والد صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ اور حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مد ظلہم نے قرآن کریم کے مختلف حصوں کا کام اپنے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اس کتاب کے بیشتر حصے کی تالیف مکمل ہو چکی تھی، البتہ بیچ کے دو حصے باقی تھے۔ تحریک قیام پاکستان کے ہنگامے میں یہ کام رک گیا۔ حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ نے "اعلاء السنن" کی طرح اس کے بیشتر حصوں کو وجود میں لانے کیلئے معمولی رف کاغذ پر چھپوا دیا تھا۔ حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ نے اس کی اشاعت کا بھی بیڑا اٹھایا، اور اب اس کتاب کی طباعت بھی تکمیل کے قریب تھی کہ داعی اجل آپہنچا، افسوس کہ وہ اسے مطبوعہ کتاب کی شکل میں خود نہ دیکھ سکے لیکن امید ہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب جلد منظر عام پر آجائے گی، اور ان کے صدقات جاریہ میں اضافے کا سبب بنے گی۔

بہرکیف! ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کے ذریعے نایاب عربی کتابوں کی اشاعت کا جو عظیم کارنامہ انہوں نے انجام دیا ہے، اور ملک کے علمی و اشاعتی حلقوں میں جو نئی طرح ڈالی ہے وہ ان کے حسنات زاخرہ کا بڑا روشن باب ہے۔

الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے انہیں قابل و صالح اولاد سے بھی نوازا، ان کے بڑے صاحبزادے مولوی امین اشرف سلمہ دارالعلوم کے فاضل تخصص، اور مدینہ طیبہ کے ہائی کورٹ میں موظف ہیں، ان سے چھوٹے صاحبزادے مولوی رشید اشرف سلمہ دارالعلوم کے قابل اور مقبول اساتذہ میں سے ہیں، اور احقر کی تقریر ترمذی انہوں نے ہی بڑی قابلیت سے مرتب کی ہے جو "درس ترمذی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ان سے چھوٹے صاحبزادے مولوی قاسم اشرف سلمہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے فارغ التحصیل ہیں، جامعہ اسلامیہ میں ایل ایل ایم کر چکے ہیں، آجکل اپنے مقالے کی تیاری میں مصروف ہیں، اور ماشاء اللہ تقریباً ہر امتحان میں اول آتے رہے ہیں۔ ان سے چھوٹے دو صاحبزادگان مولوی نعیم اشرف اور مولوی فہیم اشرف سلمہما بھی جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے فارغ ہونے کے بعد "ادارۃ القرآن" کے کاموں میں اپنے والد گرامی کا ہاتھ بٹاتے رہے اور اب ماشاء اللہ یہ ادارہ انہوں نے ہی سنبھالا ہوا ہے، ان صاحبزادگان کی ذہانت و قابلیت، سعادت مندی اور علمی ذوق سے پوری توقع ہے کہ وہ انشاء اللہ اس ادارے کے کام کو آگے

والد گرامی کے بنائے ہوئے نقوش پر آگے بڑھانے کی پوری کوشش کریں گے۔

حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ کافی مدت سے لسبیلہ ہاؤس کے مکان میں مقیم تھے' اور اسی کی نچلی منزل میں "ادارة القرآن" قائم کیا ہوا تھا۔ میں جمعہ کی نماز پڑھانے کیلئے لسبیلہ ہاؤس کی جامع مسجد میں جاتا تو وہاں ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ ۳۰ جنوری ۱۹۸۷ء کے جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ میں ابھی کے سفر سے واپس آیا ہوں اور اس مرتبہ پشاور کے بعد افغانستان سرحد پر ایسی جگہ تک جانا ہوا جہاں سے گولہ باری کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ کہہ کر ایک لمحے کیلئے رکے' اور پھر روہانسی آواز میں فرمانے لگے کہ "لیکن حسرت یہ ہے کہ وہاں سے شہادت لئے بغیر کیسے واپس آگیا؟"

اس کے بعد انہوں نے احقر سے پوچھا کہ تم سوڈان کب جا رہے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ انشاء اللہ کل روانگی ہے۔ فرمانے لگے کہ میں "کتاب الآثار" اور "معنوان الشرف الوافی" کا ایک ایک نسخہ دوں گا۔ وہ سوڈان میں ڈاکٹر حسن الترابی اور وزیر اعظم صادق المہدی کو دیدینا۔ پھر فرمانے لگے کہ "معارف لدنیہ" پر تبصرہ کب لکھو گے؟ (یہ کتاب صوبہ سرحد کے ایک بزرگ شیخ عبدالنصیر چلاسی مدظلہم کی فارسی مثنوی ہے جو مولاناؒ نے شائع کی تھی) میں نے عرض کیا کہ انشاء اللہ سفر سے واپسی پر۔ فرمانے لگے کہ کتاب اپنے ساتھ رکھ لو' جب بھی موقع ملے' سفر کے دوران لکھ دینا۔ احقر نے عرض کیا کہ کتاب ضخیم اور وزنی ہے' غیر ملکی سفر میں اتنا وزن ساتھ رکھنا مشکل ہوگا' میں انشاء اللہ دس بارہ دن تک واپس آہی جاؤں گا۔ فرمانے لگے "پھر ایسا کرو کہ جلد توڑ کر کچھ صفحات ساتھ رکھ لو"۔ میں خاموش ہو گیا۔

پھر جب میں نے ڈرائیور کو "کتاب الآثار" وغیرہ لینے کیلئے بھیجا تو اس کے ساتھ معارف لدنیہ کا ایک نسخہ جلد توڑ کر بھیج دیا۔۔۔ مولانا اس وقت پوری طرح چست اور توانا تھے۔ اور دور دور کسی بیماری یا کمزوری کے آثار نہ تھے' لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہوگی۔

اگلے دن شام کو ساڑھے چار بجے میں جدہ روانہ ہو گیا۔ اسی روز رات کو تقریباً بارہ بجے تک وہ معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مشغول رہے۔ نہ جانے کتنے معاملات نمٹائے' کتنوں سے فون پر بات کی' یہاں تک کہ اس دن کے تمام کاموں سے فارغ ہو کر بارہ

بجے بستر پر پہنچے۔ کچھ ہی دیر بعد اچانک کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا جو تھوڑی دیر بعد دل کے شدید دورے میں تبدیل ہو گیا۔ گھر والے اس یک بیک تکلیف کو ابھی سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ پیشاب کی حاجت ہوئی' اور وہ اپنے پاؤں چل کر بیت الخلاء تشریف لے گئے۔ لیکن جب واپس نکلے تو دروازے پر ہی گھر والوں سے کہا کہ مجھے سنبھالو' میں گر رہا ہوں۔ احقر کی ہمشیرہ اور عزیزم نسیم اشرف سلمہ نے سہارا دیکر بمشکل کمرے میں پہنچایا۔ (دوسرے صاحبزادے عزیزم مولوی نعیم اشرف سلمہ معالج کو بلانے چلے گئے تھے) لیکن بستر تک پہنچنا ممکن نہ رہا تو بستر کے قریب فرش ہی پر نیم دراز ہو گئے۔ اور بار بار آواز بلند "اللہ اکبر" "اللہ اکبر" کہتے رہے' اور یہی کلمات ادا کرتے کرتے دنیا کی سرحد پار کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جس طرح وہ دنیا میں ہر کام بعجلت ممکنہ کرنے اور کروانے کے عادی تھے' دنیا سے رخصت ہونے میں بھی اتنی ہی عجلت کا معاملہ ہوا کہ پندرہ منٹ کے اندر اندر عالم بالا کا سفر طے کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا' اور یہ صلاحیتیں انہوں نے بحیثیت مجموعی خدمت دین ہی میں صرف فرمائیں۔ یوں بھی انہیں تدین' ذوق عبادت اور رجوع الی اللہ کا خاص رنگ اپنے اساتذہ سے ورثے میں ملا تھا جو کبھی کسی ماحول اور کسی حالت میں نہیں اترا۔ عام طور سے سیاسی اور انتظامی امور کو علم سے بیر ہوتا ہے اور ان مصروفیات میں پھنس کر انسان علم سے دور ہو جاتا ہے' لیکن یہ وصف انہی میں دیکھا کہ ان تمام مصروفیات کے باوجود ان کا نہ صرف علمی ذوق بلکہ استحضار بھی ہر حالت میں باقی رہا' اللہ تعالیٰ نے اسی مشغلے میں زندگی اور اسی میں موت عطا فرمائی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ذات کی کامل مغفرت فرمائیں' آخرت میں انہیں جوار رحمت سے نوازیں' اور اپنے مقامات قرب میں پیہم ترقی درجات عطا فرمائیں۔ آمین' قارئین سے بھی ان کیلئے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب اور پس ماندگان کیلئے دعائے صبر کی درخواست ہے۔

البلاغ جلد ۳۶ شہ ۱۰

آہ! حضرت قاری فتح محمد صاحبؒ

ماہ شعبان کے دو ہفتے جنوبی افریقہ میں گزارنے کے بعد میں شعبان کے آخری عشرے میں مکہ مکرمہ پہنچا' خیال یہ تھا کہ اس مرتبہ رمضان المبارک کا ایک معتدبہ حصہ حرمین شریفین میں گزارنے کی توفیق ہو جائے۔ مدینہ منورہ کی حاضری میں ہمیشہ جو ضروری کام سرفہرست رہتے تھے ان میں حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب پانی پتی مہاجر مدنی کی زیارت بھی شامل تھی' اور پاکستان سے روانہ ہوتے وقت ہی ان کی زیارت اور ان کی دعاؤں سے فیض یاب ہونے کا شوق دل میں موجود تھا' بلکہ سامان میں حضرت قاری صاحبؒ کے لئے ایک مختصر سا ہدیہ بھی رکھ لیا تھا۔

لیکن مکہ مکرمہ پہنچنے کے اگلے دن (۲۳ شعبان کو) مولوی عبدالقیوم حقانی صاحب نے (جو دارالعلوم کے فاضل ہیں' اور ازہر سے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اب جامعہ ام القریٰ کے شعبہ تحقیق میں بحیثیت اسکالر کام کر رہے ہیں) اچانک یہ جانکاہ خبر سنائی کہ پچھلی جمعرات (۱۸ شعبان) کو حضرت قاری صاحب قدس سرہ اس دنیائے فانی کو خیرباد کہہ کر اپنے مالک حقیقی کے حضور پہنچ چکے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جس روز یہ حادثہ پیش آیا' اس دن میں جنوبی افریقہ میں تھا' اس لئے مجھے اس کی اطلاع نہیں ہو سکی اور اچانک یہ خبر دل پر بجلی بن کر گری۔ صرف چند روز کے فرق سے میں ان کی زیارت سے محروم رہا۔ ان کی عنایات' ان کی شفقتیں' ان کا سراپا رحمت وجود' ان کی دلکش ادائیں ایک ایک کر کے یاد آتی رہیں' اور چند لمحوں کیلئے قلب و ذہن پر سکتہ سا چھا گیا۔

حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب قدس سرہ بلاشبہ اس دور میں قرآن کریم کا زندہ معجزہ تھے' ان کے اوصاف و کمالات کو اگر آنکھوں سے دیکھا نہ ہوتا تو صرف لوگوں کے کہنے سے یقین آنا مشکل ہوتا۔

بچپن ہی سے حضرت قاری صاحب قدس سرہ کا نام تو سنا تھا' لیکن پہلی بار زیارت ۱۹۵۶ء میں اس وقت ہوئی جب حضرت والد صاحبؒ نے دارالعلوم کراچی میں تجوید و قراءت کا

ایک باقاعدہ شعبہ بڑے پیمانے پر قائم کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس وقت دارالعلوم میں ملک بھر کے چوٹی کے قراء کرام کا ایک بڑا اجتماع منعقد کیا گیا، جس میں حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب قدس سرہ اور حضرت مولانا قاری عبدالمالک صاحب قدس سرہ جیسے حضرات بھی شریک ہوئے۔ تجوید و قراءت کے فن سے تو ہماری ناواقفیت اس درجہ تھی کہ حضرت قاری فتح محمد صاحبؒ کے مقام کا اندازہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، لیکن ان کے سراپا، ان کی اداؤں اور ان کے انداز زندگی میں جو زہد و تقویٰ جھلکتا نظر آتا تھا، اس نے دل کو بے حد متاثر کیا۔

بعد میں حضرت والد صاحبؒ کی فرمائش پر حضرت قاری فتح محمد صاحب قدس سرہ نے دارالعلوم کے شعبہ تجوید و قراءت کی سرپرستی و نگرانی قبول فرمائی، اس وقت دارالعلوم کا شعبہ درس نظامی کورنگی کی موجودہ جگہ پر منتقل ہو چکا تھا، لہٰذا شعبہ تجوید و قراءت نانک واڑہ کی قدیم عمارت میں قائم کیا گیا، حضرت قاری صاحب قدس سرہ نے اپنی مستقل رہائش بھی وہیں اختیار کی، اسی عمارت میں جو مسجد تعمیر کی گئی، اس کا نام بھی حضرت قاری صاحب قدس سرہ کے نام پر "مسجد فتح" رکھا گیا۔

اس زمانے میں حضرت قاری صاحب قدس سرہ کی خدمت میں بار بار حاضری اور آپ کو قریب سے دیکھنے کی سعادت میسر آئی۔ اگر ان کی زندگی کا نقشہ مختصر الفاظ میں بیان کیا جائے تو کسی مبالغے کے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ ان کی پوری زندگی قرآن کریم میں رچی بسی ہوئی تھی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ماثور دعاؤں میں ایک دعا اس طرح منقول ہے:

واسألك باسمك الذی استقر به عرشك ...... ان ترزقنی القرآن العظیم و تخلطه بلحمی ودمی وسمعی وبصری وتستعمل به جسدی اے اللہ! میں آپ کے اس نام کے واسطے سے، جس سے آپ کا عرش قرار پذیر ہے، سوال کرتا ہوں کہ آپ مجھے قرآن عظیم عطا فرمائیں، اور اسے میرے گوشت، میرے خون، میری سماعت اور میری بصارت میں رچا دیں، اور میرے جسم کو قرآن ہی میں استعمال فرمائیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قاری صاحب قدس سرہ نے بھی یہ دعا دل سے مانگی ہوگی جو ان کے حق میں قبول ہوگئی، ان کی زبان تو تقریباً ہر وقت قرآن کریم کی تلاوت سے شاداب رہتی ہی تھی، لیکن ان کی سوچ، ان کے قلب و ذہن اور فکر و خیال کا محور بھی قرآن کریم ہی تھا۔ بس فکر ہر وقت یہ تھی کہ قرآن کریم کی تعلیم اور نشر و اشاعت کا بہتر سے بہتر

کونسا طریقہ اختیار کیا جائے؟

یہ منظر تو سینکڑوں انسانوں نے دیکھا ہوگا کہ حضرت قاری صاحبؒ بیک وقت کئی کئی حفاظ سے قرآن کریم اس طرح سنتے تھے کہ ہر شخص مختلف مقامات سے قرآن کریم پڑھتا ہوتا تھا، اور قاری صاحبؒ بیک وقت سب کی غلطیاں بتایا کرتے تھے۔

حضرت قاری صاحب قدس سرہ کو قرآن کریم کی متواتر قراءتیں اور ان کی مختلف روایات اس طرح ازبر تھیں جیسے عام مسلمانوں کو سورہ فاتحہ یاد ہوتی ہے۔ وہ رمضان المبارک کی راتوں میں سحری تک تراویح پڑھاتے تھے اور ایک ایک رات میں سات سے لیکر دس پاروں تک تلاوت فرماتے تھے۔ اس طرح تیسرے چوتھے دن قرآن کریم ختم فرماتے، اور پھر کسی اور قراءت یا روایت میں تلاوت شروع فرما دیتے۔ چنانچہ رمضان المبارک کے اختتام تک نو دس قراءتوں میں قرآن کریم ختم فرما لیتے تھے۔ دارالعلوم نانک واڑہ میں تراویح کا یہ معمول سالہا سال جاری رہا۔ عموماً ایک دو صفیں مقتدیوں کی ہو جاتی تھیں، مقتدی تو تراویح کے دوران کبھی بیٹھ کر، کبھی نیم دراز ہو کر آرام بھی کر لیتے تھے، لیکن حضرت قاری صاحب قدس سرہ مسلسل کھڑے رہ کر تلاوت فرماتے رہتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ تراویح ایسے وقت ختم ہوتی جب سحری میں صرف دس پندرہ منٹ باقی رہ جاتے۔

حضرت قاری صاحبؒ نے قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے ایسے ایسے طریقے ایجاد کئے ہوئے تھے کہ وہ خارقِ عادت معلوم ہوتے تھے، وہ آیاتِ قرآنی کے صرف آخری کلمات اس طرح تسلسل اور روانی سے پڑھتے چلے جاتے تھے جیسے ایک مسلسل عبارت۔ اسی طرح بعض اوقات آیاتِ قرآنی کے اوائل بھی اسی تسلسل سے پڑھتے چلے جاتے تھے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کئی شاگردوں کی تلاوت سنتے سنتے حضرت قاری صاحبؒ کو تھوڑی سی نیند آگئی، لیکن بیدار ہونے کے بعد تمام شاگردوں سے وہی حصے دوبارہ پڑھوائے جن میں ان سے غلطی ہوئی تھی۔

ذوقِ عبادت کا عالم یہ تھا کہ اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے، حد یہ ہے کہ ایک مرتبہ شدید گرمی کے موسم میں حج کا زمانہ آیا، عرفات کے میدان میں حضرت قاری صاحبؒ سے ملاقات ہوئی تو وہ اس وقت بھی روزے سے تھے...... نابینا ہونے کے باوجود ہر نماز مسجد میں باجماعت ادا کرنے کا اہتمام اس دور میں ان سے زیادہ کسی میں نہیں دیکھا، شاید یہ کہا جائے تو مبالغہ

نہ ہو کہ سالہا سال سے ان کی کوئی جماعت قضا نہیں ہوئی تھی۔

وفات سے تقریباً بارہ سال پہلے حضرت قاری صاحبؒ مدینہ منورہ ہجرت فرماگئے تھے، اور آخر وقت تک وہیں مقیم رہے، سات آٹھ سال پہلے حضرت قاری صاحبؒ پر فالج کا حملہ ہوا، اس وقت سے معذوری اور بڑھ گئی، مسلسل علاج کے باوجود بے تکلف بولنے پر آخر وقت تک قدرت نہیں ہوئی، لیکن اس حالت میں بھی حرم شریف کی حاضری میں فرق نہیں آیا۔ ہر نماز حرم شریف میں ادا فرماتے، اور عصر سے عشاء تک کا وقت حرم شریف ہی میں گزارتے تھے۔

نابینا ہونے کے باوجود قرآن کریم کی قرآت متواترہ کے علاوہ علم قرآت پر لکھی ہوئی کتابیں اور طویل قصائد بالکل ازبر تھے، اور علم قرآت پر حضرت قاری صاحبؒ نے محققانہ تصانیف کا جو عظیم الشان ذخیرہ چھوڑا ہے وہ اس دور میں یقیناً بے مثال ہے۔

حضرت قاری صاحب قدس سرہ نے درس نظامی کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں فرمائی تھی، مشکوٰۃ شریف میں داخلے کا امتحان حضرت والد صاحب قدس سرہ نے لیا تھا، اور قاری صاحبؒ کو اس امتحان کی ایک ایک جزوی تفصیل یاد تھی، اور اس کی بنا پر وہ حضرت والد صاحب قدس سرہ سے ہمیشہ استاذی کا جیسا معاملہ فرماتے تھے، حالانکہ حضرت والد صاحبؒ ان کے علمی و عملی کمالات کی بنا پر ان سے اپنے بزرگوں جیسا سلوک فرماتے تھے۔

طریقت میں حضرت قاری صاحبؒ نے حضرت مولانا مفتی محمد حسن قدس سرہ سے بیعت کا تعلق قائم فرمایا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت قاری صاحبؒ کے اپنے بیان کے مطابق حضرت والد صاحبؒ سے اصلاحی تعلق قائم رکھا، اور یہ حضرتؒ کے اخلاص تواضع اور فنائیت کا ثمرہ تھا کہ اتنے عظیم کمالات اور اتنی بڑی روحانی نسبتوں کے بعد بھی اپنے آپ کو اصلاحی تعلق سے مستغنی نہیں سمجھا، اور وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی قدس سرہ سے اصلاحی تعلق قائم فرمایا۔

حضرت قاری صاحب قدس سرہ کے معتقدین، متوسلین، شاگردوں اور نیاز مندوں کی تعداد یقیناً ہزاروں میں ہوگی، اور نابینا ہونے کی وجہ سے ان میں سے کسی کو دیکھنا ممکن نہ تھا، لیکن آواز ہی سے فوراً مخاطب کو پہچان لیتے تھے، بلکہ جو شخص سالہا سال بھی حضرتؒ سے نہ ملا ہو، وہ جب مدت دراز کے بعد ملتا تو اس وقت بھی اسے نہ صرف فوراً شناخت فرمالیتے، بلکہ

اس کے معاملات و مسائل بھی از خود یاد دلا دیتے تھے۔

برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم اور اس ناکارہ کے ساتھ حضرتؒ کی شفقتیں ناقابل بیان تھیں۔ خاص طور پر حضرت والد صاحب قدس سرہ کی وفات کے بعد اس توجہ میں بہت اضافہ ہو گیا تھا، جب تک فالج کا حملہ نہیں ہوا تھا، ہر تھوڑے عرصے کے بعد مدینہ طیبہ سے خط ارسال فرماتے جو نصائح اور دعاؤں سے بھرا ہوتا تھا۔ احقر کی جو کوئی تحریر "البلاغ" میں شائع ہوتی، اسے پورے اہتمام کے ساتھ سنتے تھے۔

احقر کو اپنی کتاب "علوم القرآن" کی تالیف کے دوران قرآن کریم کے "سبعۃ احرف" پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنا پڑا، اس مقالے کی تالیف میں احقر نے اپنی بساط کے مطابق کافی محنت کی، یہ مقالہ احقر کی ان چند تحریروں میں سے ہے جن میں احقر کو کافی مشقت اٹھانی پڑی، لیکن لکھنے کے بعد اس وقت تک اطمینان نہیں ہوا جب تک کسی محقق فن کی نظر سے نہ گذرے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت قاری صاحبؒ مدینہ منورہ سے پاکستان تشریف لائے تو احقر نے موقع غنیمت سمجھ کر حضرتؒ کو پورا مقالہ سنایا، حضرتؒ نے لفظا بہ لفظ مقالہ سنا، اس کی تصدیق و تصویب فرمائی اور بہت دعائیں دیں، اس کے بعد احقر کو اطمینان ہوا، اور اسے اشاعت کے لئے بھیجا۔

تقریباً بارہ سال سے حضرتؒ مدینہ طیبہ میں مقیم تھے، اور اس انتظار میں تھے کہ کسی طرح جنۃ البقیع کی مٹی نصیب ہو جائے، اس غرض کیلئے انہوں نے انتہائی خندہ پیشانی سے بڑے مجاہدات کئے، اور بڑی صعوبتیں اٹھائیں، اگرچہ کئی سال سے گویائی کی طاقت نہیں رہی تھی، اور طرح طرح کے امراض کا شکار تھے، لیکن چہرے پر ہر وقت سکینت و طمانیت کا نور چھایا رہتا تھا۔

احقر کی آخری ملاقات اب سے چند ماہ قبل مدینہ منورہ میں ہوئی، احقر صرف دو روز کے لئے مدینہ منورہ حاضر ہوا تھا، حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرتؒ کی اہلیہ محترمہ نے (جنہیں حضرتؒ کے تمام متعلقین "بڑی استانی جی" کہتے ہیں) احقر سے فرمایا کہ قاری صاحبؒ کو ضعف بہت ہو گیا ہے، اس کے باوجود وہ روزے مسلسل رکھ رہے ہیں، ذرا تم انہیں سمجھاؤ۔

احقر نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ "حضرت! آپ کی جسمانی حالت تو ایسی ہے کہ ایسے

میں فرض روزے بھی قضا کرنے کی اجازت ہو جاتی ہے، اور آپ فرض تو کیا مسلسل نفلی روزے رکھتے رہتے ہیں۔ اگر چند روز کے لئے نفلی روزے موقوف فرمادیں تو اس روز افزوں ضعف کا کچھ علاج ہو سکے "آخر نفس کا بھی کچھ حق ہے۔"

یہ بات سن کر حضرتؒ کے چہرہ مبارک پر تبسم چھا گیا، حسب منشا بولنے پر قدرت نہ تھی، لیکن جواب میں احقر کا ہاتھ پکڑ کر قدرے آواز سے ہنسے، اور دو تین بار ہاتھ کو جھٹکے دیکر چھوڑ دیا۔ زبان حال سے گویا یہ فرمایا کہ "ظاہری اعتبار سے تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن بات اس ظاہر سے آگے بڑھ چکی ہے۔"

کے معلوم تھا کہ یہ حضرت قاری صاحبؒ سے آخری ملاقات ہے، اس واقعے کے چند ہی ماہ بعد ۱۸ شعبان کو حضرت قاری صاحبؒ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت قاری صاحبؒ کی وفات کے حالات ان کے خادم خاص مولانا عبدالقادر صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ جو اسی شمارے میں الگ شائع ہو رہے ہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ کی وفات پورے عالم اسلام کا عظیم سانحہ ہے۔ اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔ ادارہ البلاغ حضرتؒ کے اہل خانہ بلکہ تمام مسلمانوں کی خدمت میں پیغام تعزیت پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت قاری صاحبؒ کی روح پر فتوح پر پیہم رحمتوں کی بارش فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین۔ قارئین البلاغ سے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کے اہتمام کی درخواست ہے۔

حافظ جی حضور

حضرت مولانا حافظ محمد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

بنگلہ دیش میں اس وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں صرف ایک ہی شخصیت باقی رہ گئی تھی اور وہ تھی حضرت مولانا حافظ محمد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت، جنہیں عموماً "حافظ جی حضور" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

رمضان المبارک کے پہلے عشرے میں احقر مدینہ طیبہ میں تھا کہ مولوی میزان الرحمٰن صاحب نے (جو دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدینہ منورہ کے ایک مدرسہ میں زیر تعلیم ہیں) یہ اندوہناک خبر سنائی کہ آج بنگلہ دیش میں خانقاہ تھانہ بھون کی یہ آخری یادگار بھی رخصت ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

البلاغ کے سابق شمارے میں مفتی اظہار الاسلام صاحب مدظلہم کے قلم سے ان کے حالات زندگی اور واقعہ وفات کی تفصیلات شائع ہو چکی ہیں۔ لہٰذا ان سطور میں صرف اپنے چند مختصر تاثرات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت حافظ جی قدس سرہ اللہ کے ان بندوں میں سے تھے جنہیں دیکھ کر ہی خدا یاد آتا ہے۔ ایک ایسا سادہ اور بے تکلف سراپا کہ اس میں ریا و تصنع کا دور دور کوئی شائبہ نہ تھا، دیکھ کر ایک اجنبی کو یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہوتا کہ یہ کوئی بڑے عالم یا بڑے صوفی بزرگ ہوں گے بس سادگی اور تواضع کا ایک چلتا پھرتا پیکر تھے۔

۱۹۶۶ میں جب میں پہلی بار حضرت والد صاحب قدس سرہ کے ساتھ ڈھاکہ گیا تو اس

وقت ڈھاکہ بڑی بڑی علمی، سیاسی اور روحانی شخصیتوں سے مالامال تھا۔ ہمارا قیام تو اس وقت بڑا کٹرہ کے مدرسہ اشرف العلوم میں ہوا جو اس وقت حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب قدس سرہ (پیرجی حضور) کے زیر سرپرستی چل رہا تھا۔ لیکن علماء کرام کی مشاورت وغیرہ کے اجتماعات حضرت مولانا شمس الحق صاحب فرید پوری قدس سرہ کے مدرسہ (لال باغ) میں ہوا کرتے تھے۔ لال باغ کا مدرسہ اجتماعی دینی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور حضرت مولانا شمس الحق صاحب فرید پوری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی اس وقت حافظ جی حضور بھی اسی مدرسے میں تشریف فرما تھے لیکن وہ ہمہ تن ذکر و شغل اور اصلاح و ارشاد میں مشغول تھے اور سیاسی اور اجتماعی امور سے عموماً الگ تھلگ رہتے تھے۔ اس لئے علماء کی ان مجالس میں جو حضرت مولانا شمس الحق صاحب فرید پوری قدس سرہ کے زیر اثر مدرسے میں منعقد ہوا کرتی تھیں، بہت کم شریک ہوتے تھے۔

لیکن بنگال کے سربرآوردہ علماء حضرت مولانا اطہر علی صاحبؒ، حضرت مولانا شمس الحق صاحب فرید پوریؒ وغیرہ کی وفات کے بعد ضرورت کے تحت حافظ جی حضورؒ نے بھی اجتماعی امور میں حصہ لینا شروع فرما دیا اور خاص طور پر بنگلہ دیش بننے کے بعد ان کی ذات ملک بھر کے دینی حلقوں کا سب سے بڑا مرکز بن گئی۔

لال باغ کے مدرسے کے علاوہ حافظ جی حضورؒ نے ڈھاکہ کے نواح کمرنگی چر کے علاقے میں ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ لال باغ سے کافی دور تھا اور برسات کے موسم میں تو وہاں کشتی کے بغیر جانا ممکن نہ تھا۔ لیکن حافظ جی حضورؒ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بیک وقت دونوں مدرسوں کی نگرانی و سرپرستی فرماتے رہے۔

بنگلہ دیش بننے کے بعد میں پہلی بار ۱۹۸۰ء میں ڈھاکہ گیا تو حافظ جی حضورؒ نے انتہائی شفقت و محبت سے کمرنگی چر کے مدرسے میں مدعو فرمایا۔ ایک دن ایک رات ان کی خدمت و صحبت میں رہنے کا موقع ملا اور ان کی شفقت و عنایت کی مٹھاس سے قلب و نظر کو سرور حاصل ہوا۔

اس وقت میں نے پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل سے استعفیٰ دیا ہوا تھا۔ حضرتؒ نے مجھ سے اس کی وجوہ پوچھیں جو میں نے بیان کر دیں جب میں چلنے لگا تو حضرتؒ نے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کے نام ایک خط احقر کے حوالے فرمایا کہ میں صدر صاحب کو

پہنچادوں' میں نے خط پڑھا تو اس کے آخری جملے مجھے خلاف مصلحت معلوم ہوئے اور ان کی موجودگی میں میرا اس خط کو صدر صاحب تک پہنچانا مناسب معلوم نہ ہوا چنانچہ میں نے اپنا یہ اشکال حضرت سے ذکر کرکے درخواست کی کہ یہ جملے خط سے حذف فرمادیں' لیکن حضرت نے حکماً فرمایا کہ جملے اسی طرح رہنے دو اور خط ضرور پہنچاؤ۔ احقر ادباً خاموش ہو گیا' اور پاکستان پہنچنے کے بعد خط صدر صاحب تک پہنچادیا۔ جس پر انہوں نے بڑی ممنونیت کا اظہار کیا۔ خط کا مضمون چونکہ سدا بہار ہے اور اس سے حافظ جی حضورؒ کے دل دردمند کی عکاسی ہوتی ہے اس لئے وہ ذیل میں پیش خدمت ہے۔

یکے از فقیر حقیر کمترین خلائق مسمی بہ محمد اللہ عفی عنہ۔

بشرف ملاحظہ جناب مخدومنا المکرم ضیاء الحق صاحب صدر مملکت پاکستان اضاءہ اللہ بضوءہ ونور ھدایة مسلکه واجعله من الهادین المهتدین غیر ضالین ولا مضلین سلماً لاولیاء وحرباً لاعداء الدین اللّٰھم اجعله من اولیائك المنتخبین الذین لایخافون فی اللہ لومة لائم آمین ثم آمین۔

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ۔

اما بعد عرض یہ ہے کہ یہ کمترین خلائق اس لائق نہیں کہ آپ جیسی بلند ہستی کے سامنے کچھ عرض معروض پیش کرے تاہم حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا ایک ارشاد یہ تھا کہ حق بات ایک بچہ بھی مجھے سمجھاوے تو میں ماننے کیلئے ہر وقت تیار رہوں اور آپ جانتے ہیں ماننا وہی معتبر ہے کہ جس پر عمل مرتب ہو مطلق ماننا معتبر نہیں جیسا کہ ابوجہل وغیرہ بہت سے کفار بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا نبی جانتے اور مانتے تھے۔ مگر بے ایمان ہی دنیا سے رخصت ہو کر نمرود و فرعون وغیرہ جیسے دبدبے والے بادشاہ کی طرح ابدالآباد کے لئے سزائے جہنم کے مستحق ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اور اللہ جل جلالہ و عم نوالہ نے آپ کو دنیا کی ایک سربلندی عطا فرمائی اس نعمت کے شکریہ میں ملک خدا میں قانون خداوندی نافذ اور عمل کرکے اللہ تعالیٰ کو راضی کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دلی صدمہ سے بچائیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں امت کی بداعمالیوں کے رپورٹ پہنچتی ہے اور کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد "لاتسودوا وجھی عند اللہ یوم القیامة او کما قال

علیہ الصلوۃ والسلام" کیا کوئی مومن حضورؐ کے اس صدمہ کو برداشت کر سکتا ہے اسی صدمہ کے پیش نظر ایک بزرگ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب کر کے کہا۔

ای بسر پردہ یثرب بخواب   خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

درحقیقت بزرگ نے اپنے دلی صدمہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر کے حضور کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے فرما دیا کہ اے اللہ ہم پر حکومت عادلہ قائم فرما۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے اکابرین علماء حقانی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے سلسلہ کے بزرگوں نے کفری سلطنت اور اسکی گمراہیوں سے بچانے کے لئے کیا کیا قربانیاں دیں۔ مثلاً سید احمد اور مولانا اسمٰعیل وغیرہ شہید نے بالاکوٹ میں کیا کیا قربانیاں دیں اور احیاء دین کے لئے شہادت قبول کیا۔ بالخصوص قیام پاکستان کے لئے محض اس وعدہ پر لاکھوں مسلمان اپنا خون بہا کر خدا کے پیارے بنے کہ پاکستان میں اسلامی قانون قرآن وسنت کے موافق عمل میں لایا جائے گا۔ دیکھئے حضرت حکیم الامت بموجب قائداعظم مسٹر جناح مرحوم کے اعلانات ممکن ہیں یاد رکھنے والوں کے ارشاد۔ اعلانات کے دن تاریخ بھی موجود ہیں۔ ایوب خان کے دور کے گورنر بنگال عبدالمنعم خان مرحوم نے یہاں کہا تھا کہ مسٹر جناح نے آخری سفر بنگال میں مجمع عام میں یہ خطاب کیا کہ میں نے پاکستان میں مسلمان کے حکومت اس وعدہ پر لایا کہ اس ملک میں چودہ سو سال پہلے کا قانون خداوندی ملک خدا میں نافذ کروں گا اگر مجھ سے نہ ہو سکا تو سب مسلمان اس کے ذمہ دار ہیں اگر کوتاہی کریں تو خداوند کریم کے سامنے روز محشر میں اس کے جواب دہ ہوں گے او کما قال۔ مجدد زماں حضرت حکیم الامت کے ساتھ مرحوم مسٹر جناح کے عہد وپیمان کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ مسٹر جناح مرحوم کے رفیق کار رہے۔ اور حضرت حکیم الامت کی دعا اور توجہات کے بعد پاکستان وجود میں آیا واحسرتاہ اللہ تعالیٰ نے تقریباً تیس سال تک مہلت دی پھر بھی عہد شکنی پر اڑے رہے خدا کی طرف سے یہ عذاب نازل ہوا کہ آپس میں لڑ کر قوۃ متحدہ کے دو ٹکڑے ہوئے اور لاکھوں مسلمانوں کے خون کے ندیاں بہایا"۔ معلوم کون شہید اور کون مردود ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے بقیہ پاکستان کے باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں دیا۔ فینظر کیف تعملون۔

ایک اللہ کو راضی کریں کہ جس نے آپ کو یہ نعمت عطا کیا۔ علماء حقانی کے مشورہ سے اپنے عزائم کو درست کریں کیونکہ ہر زمانہ میں کچھ علماء سوء بھی ہوتے ہیں۔ دیکھئے مکتوبات امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ان کے مشورہ سے سلطان جہانگیر نے کام کیا اور علماء سوء کے وجہ سے شاہ اکبر بگڑ کر ایک نیا دین الٰہی ایجاد کیا۔ حضرت شاہ جہانگیر نے حضرت مجدد صاحب کے مشورہ سے سارے فتنہ اکبری سے ملک کو صاف کیا۔ صحیح دین مسلمانوں کو دکھایا۔ آپ بھی زمانہ کے مجدد حضرت حکیم الامت تھانوی کی کتابیں جتنا ہو سکے مطالعہ کریں' بالخصوص (۱) حیوۃ المسلمین اور (۲) صیانۃ المسلمین پر عمل کریں اور ہمارے یہ نوجوان جناب مولانا محمد تقی صاحب ولد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کے صاحبزادہ کو اپنے قرب سے اور مشیرین سے ہرگز الگ نہ رہنے دیں اگر کسی عذر سے یہ دور رہنا ہی چاہیں آپ ہرگز گوارہ نہ کریں بلکہ عذر کو دور کریں۔ میں نے بھی ان کو سخت تاکید کیا کہ یہ آپ سے ہرگز دور نہ رہیں۔ یہ میرا ایک نہایت خیر خواہانہ مشورہ ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

احقر محمد اللہ عفی عنہ ۲۳ شوال ۱۴۰۰ھ
مدرسہ نوریہ اشرفیہ' ڈھاکہ

نظریاتی اور تبلیغی حد تک حافظ حضورؒ کی طرف سے ملک کے دینی اور سیاسی حلقوں کی رہنمائی فرمانا ملک و ملت کے لئے بڑی سعادت کی بات تھی' لیکن حضرتؒ کے بعض رفقاء نے انہیں رفتہ رفتہ انتخابی سیاست میں براہ راست شریک کرنے کی کوشش کی۔ اتفاق سے یہ حضرتؒ کی زندگی کا وہ دور تھا جب وہ بہ کثرت استغراق کے سے عالم میں رہتے تھے ملک و ملت کی اصلاح کا جذبہ تو دل میں پہلے سے موجود ہی تھا' ان دونوں چیزوں نے مل کر حضرتؒ کو براہ راست انتخابی سیاست میں لا کھڑا کیا۔ احقر کی ناقص رائے میں یہ بات حضرتؒ کے شایان شان نہ تھی اور حضرتؒ کی اصلاحی و تبلیغی جدوجہد سے ملک و ملت کو جو دینی اور ٹھوس فائدہ حاصل ہو رہا تھا' اس کو بہت نقصان پہنچا لیکن حافظ جی حضورؒ کی عظیم مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ صدر مملکت کے بعد سب سے زیادہ ووٹ انتخابات میں انہوں نے ہی حاصل کئے۔

اسی دوران ایک اور المیہ یہ پیش آیا کہ ایرانی انقلاب اور خمینی حکومت کی حمایت

میں بعض بیانات کی بناء پر (جن کی حقیقت احقر کو پوری طرح معلوم نہیں) ملک کے بیشتر دینی حلقے' جو حضرت کی سیاسی تحریک میں ان کے دست بازو بنے ہوئے تھے حضرتؒ سے دور ہوتے چلے گئے۔

احقر کو ان واقعات کی مکمل تفصیل تو دور ہونے کی بناء پر معلوم نہیں ہو سکی تھی' لیکن حافظ جی حضورؒ کی طبیعت سے کسی قدر آشنا ہونے کی بناء پر میرا اندازہ یہ تھا کہ ان اقدامات کو حضرت کی طرف سے منسوب کرنا بظاہر درست نہیں ہے اور یہ ان کی اپنی سوچ کا کرشمہ نہیں ہو سکتے۔ ابھی چھ ماہ پہلے جب میں دوبارہ بنگلہ دیش گیا اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس خیال کی مکمل تصدیق ہو گئی۔ احقر نے انتہائی عاجزی کے ساتھ حضرتؒ سے درخواست کی کہ آپ اپنے اصل کام یعنی اصلاح و ارشاد کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائیں اور ہر قسم کی سیاسی اور جماعتی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو یکسو فرمالیں اس طرز عمل سے ملک و ملت کو جو فائدہ پہنچ سکتا ہے سیاسی اور جماعتی سرگرمیوں سے اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ حضرتؒ نے احقر کی ان معروضات کو نہ صرف بکمال شفقت نہایت توجہ سے سنا بلکہ صریح الفاظ میں فرمایا کہ:

"بھائی میرا مزاج اور میری رائے تو بالکل وہی ہے جو آپ کہہ رہے ہیں۔"

اس گفتگو سے احقر کے سابقہ خیال کی مکمل تصدیق ہو گئی لیکن ماحول کی جن مجبوریوں کی بناء پر حضرت اپنے اصل مزاج کے خلاف ان سرگرمیوں سے یکسو نہ ہو سکے ان کی تفصیل میں جانے کی نہ ضرورت ہے نہ ان کی پوری تحقیق ہے۔ بہر صورت! یہ بات واضح ہے کہ ان کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبے کے سوا کچھ نہ تھا ان کی زندگی کا ہر سانس اطاعت الٰہی میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ان کی ذات سے بلا مبالغہ ہزاروں افراد اس طرح فیضیاب ہوئے کہ ان کی زندگیاں بدل گئیں۔ ان کے حالات میں انقلاب آگیا اور اس آخری دور میں بھی جب حالات انھیں سیاست کے گرداب میں کھینچ لائے تھے ان کا اصلاح و ارشاد کا سلسلہ بدستور جاری تھا اور اس سے مسلمانوں کو عظیم فائدہ پہنچ رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ حضرت کی روح پر فتوح پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین۔

اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

البلاغ جلد ۲۱ شمارہ ۱۱

مفتی سیاج الدین صاحب کاکاخیلؒ

شعبان کے اواخر میں محترم بزرگ جناب مولانا مفتی سیاج الدین صاحب کاکاخیلؒ ایک حادثے کا شکار ہو کر داغِ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم ملک کے ان ممتاز اور جید علماء میں سے تھے جن کی طرف ملک و ملت کے ہر اجتماعی مسئلے میں نگاہیں اٹھتی تھیں۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے نہ صرف فارغ التحصیل تھے بلکہ انہوں نے کچھ عرصہ وہاں تدریس کا شرف بھی حاصل کیا۔ تمام دینی علوم پر ان کی بڑی وسیع نگاہ تھی اور بالخصوص فقہ و فتویٰ کے ساتھ خصوصی شغف تھا۔

مولانا طبقے کے اعتبار سے یقیناً مجھ ناکارہ کے اساتذہ کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اگرچہ احقر نے براہ راست ان سے کچھ نہیں پڑھا تھا، لیکن احقر نے ان کے علم و فضل اور تقدم کے لحاظ سے ان کے ساتھ ہمیشہ نیازمندانہ تعلق رکھا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی حیات میں ان کے ساتھ رابطہ بس دور دور ہی سے رہا۔ کبھی شاذ و نادر ملاقات بھی ہوئی اور کبھی خط و کتابت بھی۔

لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہ کی وفات کے بعد مولانا کا ایک خط احقر کے پاس آیا اس میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کی وفات پر رنج و غم کا اثر انگیز اظہار تو تھا ہی مگر اس کے ساتھ ایک فقہی مسئلے کے بارے میں ایک طویل استفسار بھی تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ ان جیسے علم و فضل کے آدمی کو مجھ ناکارہ سے اس مسئلے میں رجوع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن درحقیقت یہ ان کی بے نفسی اور دینی مسائل میں غایت احتیاط کی علامت تھی کہ ان کے پاس آنے والے ایک استفتاء میں انہیں کچھ شبہ ہوا تو اپنے ایک چھوٹے سے بھی استصواب کرنے میں انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ انہوں نے لکھا کہ پہلے ہم ان جیسے مسائل میں آپ کے والد ماجد قدس سرہ سے رجوع کیا کرتے تھے۔ اب حال یہ ہے کہ۔

فصل گل رفت و گلستان شد خراب
بوئے گل را از کہ جوئیم؟ از گلاب

بہرکیف احقر نے اپنی بساط کے مطابق مسئلے کا مفصل جواب لکھ کر بھیجا؟ مولاناؒ نے اس پر نہ صرف اپنی موافقت' بلکہ بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ اتفاق سے مولانا کا وہ خط اس وقت مل گیا جو انہوں نے فتوی موصول ہونے پر احقر کو لکھا تھا اس سے مولانا کی دردمندی دل سوزی اور اس کے ساتھ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کا جذبہ نیز اسلوب تحریر کا اندازہ ہو سکے گا۔ یہ خط ذیل میں پیش خدمت ہے :۔

"بہ خدمت جناب محترم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدھم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ' بعد از سلام مسنون عرض ہے کہ کل آپ کا ارسال کردہ فتوی موصول ہوا۔ بڑے غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کیا۔ پڑھتے وقت بہت زیادہ خوشی حاصل ہوئی اور سارا فتوی مطالعہ کرنے کے بعد بہت زیادہ دعائیں دیں۔ محترم مولانا محمد رفیع صاحب کی مخلصانہ دعا کثر اللہ امثالک کو دو تین بار پورے حضور قلب کے ساتھ دہرانے کے بعد اور بھی جو جو دعائیں مستحضر ہو سکیں پورے اخلاص کے ساتھ دیں۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ اس کے لئے بڑی محنت اور مطالعہ کیا ہے بلکہ پوری فقاہت کے ساتھ مختلف اجزاء کی تنقیح کرکے اس کے مطابق مفصل اور تشفی بخش جواب دے دیا ہے۔ غالب نے تو "تقریر کی لذت" کہا ہے مگر میں کچھ تصرف کرکے یہی لکھوں گا۔

دیکھنا تحریر کی لذت کو جو اس نے لکھا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس مسئلہ کو جس طرح میں نے اپنے محدود علم کے مطابق فقہی حوالوں سے سمجھا تھا' اگرچہ اس کا اظہار استفتاء میں نہیں کیا تھا اور مناسب بھی نہیں تھا۔ آپ نے ٹھیک اسی انداز سے بالتفصیل تحریر فرمایا ہے۔ بلکہ جتنے حوالے میرے علم اور مطالعے میں تھے "آپ نے اس پر معین الحکام اور شامی کے بعض ان حوالوں کا اضافہ کر دیا ہے جو قاضی کی ذمہ داریوں سے متعلق ہیں۔ اور مجھے اس کا اعتراف ہے کہ آپ کے اس فتوے سے میرے علم

میں بھی اضافہ ہوا ہے جزاکم اللہ فی الدارین خیرا ۔ مجھے بہت زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ الولد سر لابیہ کا مقولہ آپ کے حق میں بالکل صحیح ثابت ہوا اور آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کی صحیح جانشینی کا استحقاق آپ کو ہے اور حضرت کے مسند افتاء کو آپ کما حقہ سنبھال سکتے ہیں ان کی وفات کے حادثۂ عظمیٰ کا ایک پہلو نہایت غم انگیز یہ بھی تھا کہ اہم فقہی مسائل میں ان کی رہنمائی سے مسائل حل ہو جایا کرتے تھے ان کی مفارقت سے پوری ملت کو اس رہنمائی سے محرومی کا حادثہ پیش آیا تھا۔ لیکن آپ کی اس محنت علمی کاوش، تحقیقی انداز اور سلیس و عام فہم عبارتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انشاء اللہ تعالیٰ حضرت کے بعد بھی ان کی یادگار ادارہ تدریس و افتاء دونوں شعبوں میں ملک و ملت کی رہنمائی کا کام سرانجام دے گی۔ میری درخواست ہے کہ آپ اپنے مصروف اوقات میں سے کچھ وقت اہم فتووں کے مرتب کرنے اور لکھنے کے لئے نکال لیا کریں تاکہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد دارالافتاء حقیقی معنوں میں آپ اور پورے پاکستان کے لئے مرکز افتاء ہو۔ پاکستان میں فقیہ النفس مفتیوں کی کمی نہیں بلکہ نایاب ہے کسی معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے حضرات فقہاء کرام کی صحیح تحقیقات و اجتہادات کی روشنی میں صحیح مسئلہ بتانے والا عالم اب بہت ہی کم ملتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تمام مدارس عربیہ اس حیثیت سے تو عقیم ہیں اور ایسے عالم اور صاحب افتاء اب ان مدارس سے نہیں نکلتے بلکہ نئے فارغ التحصیل مولوی صاحبان کی توجہ بھی اس طرف نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید توفیق و ہمت عطا فرمائے ان مخلصانہ دعاؤں کے ساتھ یہ عریضہ ختم کرتا ہوں۔ مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ دوسرے اساتذہ کرام خصوصاً مولانا غلام محمد صاحب اور مولانا شمس الحق صاحب کو میری طرف سے سلام مسنون قبول ہو۔" فقط والسلام

احقر سید سراج الدین کاکاخیل عفی عنہ ۱۰/۹ ربیع ۱۹۷۷ء

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد قدرت نے مولانا کے ساتھ ایک طویل رفاقت کی سعادت عطا فرمائی صدر ضیاء الحق صاحب کے ابتدائی عہد حکومت میں جب اسلامی نظریاتی کونسل دوبارہ تشکیل دی گئی تو اس میں مولانا بھی رکن بنے اور یہ ناکارہ بھی۔ اس طرح تقریباً تین سال مولانا کے ساتھ دن رات کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ ان کی بزرگانہ شفقت تھی کہ انہوں نے اس پورے عرصے میں احقر ناکارہ کے ساتھ برابری کا سا معاملہ فرمایا۔ اور

اپنے آپ سے اتنا بے تکلف کر لیا کہ بعض اوقات مجھے یہ احساس ہونے لگتا کہ میں اپنی حدود سے تجاوز تو نہیں کر رہا۔

چھوٹا ہونے کی وجہ سے کونسل میں تحریری کام زیادہ تر اس ناکارہ کے سپرد ہو جاتا۔ مفتی صاحبؒ اس میں ہمیشہ اپنے بیش قیمت مشوروں سے نوازتے' رہنمائی فرماتے اور کام کی تکمیل پر بڑی ہمت افزائی کرتے تھے ان کے قیمتی مشوروں سے احقر نے بہت سے علمی معاملات میں بڑا استفادہ کیا اور حضرت مولانا بنوری قدس سرہ کی وفات کے بعد ان کی وجہ سے بڑی تقویت حاصل رہی۔ اسی دوران ۱۹۷۹ء میں کونسل کا ایک وفد سعودی حکومت کی دعوت پر ایام حج میں سعودی عرب کے دورے پر گیا اس طرح مولانا کے ساتھ سفر حج کی رفاقت بھی میسر آئی اور حج کے دوران مولاناؒ کے ذوق عبادت اور افضل واولیٰ طریقوں پر عمل کا شوق فراواں قدم قدم پر محسوس ہوا۔

مفتی صاحبؒ سیاسی اور دعوتی معاملات میں مولانا مودودی صاحب مرحوم اور جماعت اسلامی سے نہ صرف متفق بلکہ ان سے آخر تک پوری طرح وابستہ رہے۔ اور اس لحاظ سے ان کا طرز فکر و عمل عام علماء دیوبند سے مختلف تھا۔ اس سلسلے میں وہ جماعت اسلامی کا بڑے زور شور کے ساتھ دفاع بھی کرتے تھے لیکن فقہ و عقائد کے معاملے میں بسا اوقات ان کی رائے عام علمائے دیوبند ہی کے ساتھ رہتی اور وہ ان معاملات میں مولانا مودودیؒ سے اختلاف کا اظہار بھی فرماتے تھے ان کا کہنا یہ تھا کہ "جماعت اسلامی ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے جو جدوجہد کر رہی ہے' میں اس جدوجہد میں اس کے ساتھ پورا تعاون کرنا چاہتا ہوں اور فقہی معاملات میں مولانا مودودی مرحوم کی آراء شاذہ کا ہم نوا نہیں ہوں"۔ چنانچہ بعض معاملات میں احقر نے خود مشاہدہ کیا کہ وہ مولانا مودودیؒ کی رائے کے خلاف نہ صرف فتویٰ دیتے' بلکہ جماعت اسلامی کے حضرات کو مولاناؒ کے بعض ایسے فتووں پر عمل کرنے سے روکتے تھے۔ جن میں انہوں نے ائمہ اربعہ کے مسلک کے خلاف کوئی راہ اختیار کی ہے۔

تاہم مولانا مودودیؒ کی جن آراء شاذہ سے مفتی صاحبؒ کو اختلاف تھا ان کے باوجود وہ ان کے لٹریچر کو بحیثیت مجموعی نہایت مفید سمجھتے اور لوگوں کو اسے پڑھنے کی تلقین بھی فرماتے تھے۔

کونسل کی رکنیت کے دوران کونسل کا اپنا کام اس قدر ہوتا کہ کبھی اس قسم کے مسائل پر تفصیل سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا، لیکن کبھی کبھی یہ موضوعات بھی زیر گفتگو آئے۔ احقر نے اپنی رائے ان سے عرض کی انہوں نے اپنی رائے ارشاد فرمائی، اختلاف رائے تو برقرار رہا، لیکن فضا ہمیشہ خوشگوار اور علمی ہی رہی۔

مفتی صاحبؒ کو مغربی تجدد پسندی سے نہ صرف نفرت تھی بلکہ وہ اس کے خلاف شمشیر برہنہ تھے۔ ان معاملات پر جب بھی کونسل میں کوئی گفتگو آجاتی تو وہ جلال میں آجاتے اور شدت جذبات میں ان کی آواز بھی بلند ہو جاتی تھی۔

جب کونسل سے میں مستعفی ہوا تو وہ بھی مستعفی ہو گئے تھے بعد میں کچھ وعدے وعید کے بعد کچھ ایسی ترتیب بنی کہ میں وفاقی شرعی عدالت میں چلا گیا اور وہ دوبارہ کونسل کے رکن ہو گئے۔ ڈاکٹر تنزیل الرحمن صاحب کی سربراہی میں وہ کونسل کے ہمہ وقتی رکن کی حیثیت سے بڑی گرانقدر خدمات انجام دیتے رہے لیکن جب ان کی مدت تقرر ختم ہوئی تو ڈاکٹر ضیاء الدین نے انہیں اپنے "عالمی ادارہ اقتصاد اسلامی" میں بلا لیا اور وہ وہاں تحقیقی کام کرتے رہے۔

شعبان کے آخری ہفتے میں اسی ادارے نے اسلامی ترقیاتی بنک جدہ کے تعاون سے جدہ میں ایک محفل مذاکرہ ترتیب دی تھی، جس میں قرضوں کو قیمتوں کی شرح سے مربوط کرنے (Indexalim) کی فقہی حیثیت زیر بحث تھی اس مذاکرے میں شرکت کے لئے میں چند روز قبل مکہ مکرمہ پہنچ گیا تھا خیال تھا کہ انشاء اللہ ان سے جدہ میں ملاقات ہوگی لیکن مذاکرے سے ایک روز قبل میں نے جدہ فون کیا تو ڈاکٹر منور اقبال نے یہ اندوہناک خبر سنائی کہ مفتی صاحبؒ پشاور سے اپنے صاحبزادے کے ہمراہ جدہ جانے کے لئے بذریعہ کار اسلام آباد آرہے تھے کہ راستے میں کار کا شدید حادثہ پیش آیا اور وہ اپنے صاحبزادے سمیت اس حادثے میں شہید ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

یہ خبر اتنی غیر متوقع اور اس قدر اندوہناک تھی کہ پہلی بار سننے پر یقین نہ آیا، لیکن قدرت کے فیصلے کسی کے یقین کرنے یا نہ کرنے پر موقوف نہیں ہوتے۔ ان کا وقت موعود آچکا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

البلاغ جلد ۲۱ شمارہ ۱۱

دو ذاتی حادثے

پچھلے ڈیڑھ ماہ میں احقر کو دو خاندانی نوعیت کے حادثے پیش آئے۔ ۲۰ شعبان کو احقر کی ایک حقیقی ہمشیرہ تقریباً دو ہفتے موت وحیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جاملیں، اور اس کے ٹھیک پینتالیس دن بعد ۵ شوال کو ان کے شوہر اور ہمارے بہنوئی مشرف حسین مرحوم اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

احقر کی سب سے بڑی ہمشیرہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی حیات ہی میں ۱۹۷۶ء میں ۳۷ سال کی عمر میں وفات پاچکی تھیں۔ ان کے بعد ان سے چھوٹی تین ہمشیرگان میں سے عمر کے لحاظ سے یہ دوسرے نمبر کی ہمشیرہ تھیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صفات سے نوازا تھا۔ انہوں نے کبھی کسی اسکول کالج کی شکل تک نہیں دیکھی، لیکن گھریلو تعلیم اور حضرت والد ماجد قدس سرہ کی تربیت کے طفیل اللہ تعالیٰ نے علمی وادبی صلاحیت بھی ایسی عطا فرمائی تھی کہ بڑی بڑی ڈگری یافتہ خواتین کو حاصل نہیں ہوتی۔ لکھنے پڑھنے کا بچپن ہی سے شوق تھا، اور تحریر وگفتگو میں شائستگی اور ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ فطری طور پر شعر کا بڑا ستھرا ذوق تھا، اعلیٰ معیار کی شعر فہمی کے ساتھ کبھی کبھی خود بھی بلاتکلف شعر کہہ لیتی تھیں۔ ان کے چند اشعار سے اس فطری صلاحیت کا اندازہ ہوسکتا ہے:

اٹھے گی کس طرح بزم جہاں ؟ نہیں معلوم
کہاں پہ جائیں گے کون ومکاں؟ نہیں معلوم
ہمیں تو آتا ہے رونا مآل گلشن پر
بھلا یہ ہنستے ہیں کیوں گلستاں؟ نہیں معلوم
گذر رہی ہیں نشیمن سے بے سلام و پیام
خفا خفا سی ہیں کیوں بجلیاں؟ نہیں معلوم

یہ آخری شعر تو ایسا ہے کہ اچھے اچھے پختہ کار شعراء کو بھی یہ فکر انگشت بدنداں رہ گئے

کہ ایک گھریلو خاتون، جس نے کبھی کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل نہیں کی، ایسا شعر کہہ سکتی ہے!

حضرت والد ماجد قدس سرہ کے طفیل بفضلہ تعالیٰ گھر کا ماحول دینی تھا، اور وہی دینی رنگ ان پر بھی چڑھا ہوا تھا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ اکثر چھٹیاں گزارنے کیلئے اہل و عیال سمیت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں تشریف لیجاتے تھے۔ اس دوران ہمارے وہ بڑے بہن بھائی جو اس وقت شعور کی حالت میں تھے، انہیں بھی حضرتؒ کی خدمت و تربیت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملتا تھا۔ چنانچہ ہماری یہ ہمشیرہ بھی اس نعمتِ عظمیٰ سے مستفید ہوئیں، اور شاید حضرتؒ سے باقاعدہ بیعت بھی ہوئیں۔

الحمد للہ! اس تربیت کا اثر یہ تھا کہ مزاج و مذاق اور فکر و عمل پر دینی رنگ چڑھا ہوا تھا، عبادات اور اذکار و اوراد کی پابند تھیں۔ طہارت کا خصوصی اہتمام رکھتی تھیں۔ اپنے تمام مرحوم اعزہ و اقرباء کے لئے الگ الگ ایصال ثواب اور بقید حیات لوگوں کیلئے الگ الگ نام بنام دعا کا معمول تھا۔ خوش اخلاقی اور دوسروں کے کام آنے کا ذوق تھا۔ مزاج میں مسکنت اور تواضع تھی۔ زندگی میں ان پر بہت سے تنگی کے ادوار گذرے لیکن صبر و شکر اور قناعت و استقلال کی پیکر بنی رہیں۔ زندگی کے آخری دور میں طرح طرح کے امراض و عوارض میں مبتلا ہو گئی تھیں، لیکن امراض اور ضعف کے اس عالم میں بھی ادائے حقوق کا اہتمام رہا۔ مرض الموت کے دوران کئی دن تک مسلسل غشی طاری رہی لیکن اس غشی کے عالم میں جب کبھی چند لمحوں کے لئے بھی ہوش آتا تو سب سے پہلا لفظ جو زبان پر آتا وہ نماز ہوتا، یہ کلمہ کہہ کر اٹھنے کی کوشش کرتیں گویا نماز پڑھنا چاہتی ہیں، لیکن مرض کی شدت سے اٹھنا ممکن نہ تھا، پھر غشی طاری ہو جاتی۔

غشی کا یہ سلسلہ جس میں سانس کی آمد و رفت بھی نہایت مشقت سے ہو رہی تھی، کئی روز مسلسل جاری رہا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سفر آخرت کیلئے جمعہ کے مبارک دن کی منتظر تھیں۔ جمعہ ۲۰ شعبان کو صبح آٹھ بجے کے قریب وہ اس دنیائے فانی کو خیرباد کہہ کر اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جمعہ کی نماز کے متصل بعد دارالعلوم ہی میں نماز جنازہ ہوئی جس میں ہزار ہا افراد نے

شرکت کی اور دارالعلوم ہی کے قبرستان میں حضرت والد ماجد قدس سرہ کے مزار مبارک کے قریب تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ اپنی اس بندی پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیں، اور اپنے جوارِ رحمت میں مقاماتِ عالیہ سے نوازیں۔ آمین۔

ان کے شوہر مشرف حسین صاحب کمزور اور بیمار تو عرصے سے تھے، لیکن اس حادثے نے ان کی کمر توڑ دی، اس کے بعد ان کی بیماری اور کمزوری میں اضافہ ہوتا چلا گیا، رمضان المبارک کے دوران ہی انہیں ہسپتال میں داخل کرنا پڑا، اور وہ بھی تقریباً پندرہ بیس دن ہسپتال میں رہے۔ اور اپنی اہلیہ کی وفات کے ٹھیک ۳۵ دن بعد ۵ شوال کو وہ بھی دنیا کی سرحد پار کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ شوہر بھی اسی بیماری میں انہی مراحل سے گذر کر دنیا سے رخصت ہوئے جس بیماری میں اور جن مراحل سے گذر کر بیوی دنیا سے گئی تھیں۔ زندگی کے دو رفیقوں کے درمیان آخرت کے سفر میں بھی اتنی موافقت بھی کم دیکھنے میں آئی ہے۔

مشرف حسین صاحب مرحوم بڑے کم گو، کم آمیز اور سادہ مزاج کے مالک تھے۔ عمر بھر جس محکمے میں ملازمت کی، اس کا ایسا حق ادا کیا کہ شاذ ہی ملازمت کا ایسا حق کوئی ادا کرتا ہوگا۔ ایک مرنجان و مرنج انسان جس نے کبھی اپنا بوجھ کسی پر ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ بات کے سچے، دل کے صاف اور خوددار مگر متواضع شخص تھے۔ اہلیہ کی علالت کے زمانے میں ایثار و وفا کا مثالی مظاہرہ پیش کیا، اور آخرت کے سفر میں بھی ان کا ساتھ دیا۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ دونوں کیلئے دعائے مغفرت اور حسب المقدور ایصال ثواب کا اہتمام فرمائیں۔ ان کے بچے جو بحمد اللہ سب سمجھدار اور بالغ ہیں، ۳۵ دن کے اندر اندر ماں اور باپ دونوں کے سائے سے محروم ہونے کی بنا پر جس شدید صدمے کا شکار ہونگے، وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کیلئے بھی دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صبر و سکینت سے نوازیں اور زندگی کے ہر مرحلے میں ان کی دستگیری فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

ضیاء شہید

(صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق شہیدؒ)

شہید مرحوم جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کے حادثۂ وفات پر پچھلے شمارے میں صرف چند سطور لکھ سکا تھا، اور ساتھ ہی یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ اگلے شمارے میں ان شاء اللہ ان کی شخصیت، ان کے ساتھ راقم کے تعلق کے واقعات اور ان پر مبنی تاثرات قدرے تفصیل سے قلمبند کروں گا۔

آج جب اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لئے بیٹھا ہوں تو مجھے گیارہ سال کے واقعات کی اتنی بہت سی تصویریں نگاہ کے سامنے آ گئی ہیں کہ انہیں ایک مربوط تحریر میں منضبط کرنا دشوار معلوم ہو رہا ہے۔ اس لیے میں آغاز ہی میں یہ معذرت کر لوں کہ:

دریں کتاب پریشاں نہ بینی از ترتیب
عجب مدار کہ چوں حال من پریشاں است

پچھلے گیارہ سال میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے اور صدر مرحوم کے بارے میں بہت سے لوگوں کی رائے میں انقلابی تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ وہی لوگ جو ابتداء میں انہیں فرشتہ بھی کہتے اور سمجھتے تھے، انہی کی زبان سے بعد میں ان کے خلاف بڑے سخت اور تلخ الفاظ بھی سنے گئے۔ بہت سے لوگ جو شروع میں ان کے اسلامی مشن کی وجہ سے ان کے پر زور حامی تھے، کچھ عرصے کے بعد ان کی مخالفت پر کمربستہ ہوئے، یہاں تک کہ انہیں اسلام دشمن یا منافق تک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔

مجھے ذاتی طور پر مرحوم سے نزدیکی کا دعویٰ نہیں ہے، لیکن حالات کے اس گیارہ سالہ نشیب و فراز میں صدر مرحوم کے بارے میں میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ میں ان کے بارے میں روزِ اول جو رائے رکھتا تھا، آخری دن تک اس میں کوئی قابلِ ذکر تغیر نہیں آیا۔ میں نے نہ انہیں پہلے دن فرشتہ معصوم یا خلیفہ راشد سمجھا تھا، نہ آخر میں (خدا نخواستہ) اسلام دشمن یا منافق قرار دینے کا کوئی داعیہ دل میں پیدا ہوا۔ ہاں! انتخابات پر یقین اور سو فیصد یقین تھا کہ ماضی میں ہم نے جتنے حکمرانوں کے تجربے کئے ہیں، اور بظاہر حالات آئندہ آنے کے لئے جو لوگ سامنے ہیں، ان کے مقابلے میں وہ اپنی اسلامی روش، دینی جذبے، خود اپنی ذاتی زندگی کے معاملات کے لحاظ سے اتنے قابلِ قدر انسان ہیں کہ موجودہ حالات میں ان کی شخصیت کو غنیمتِ کبریٰ سمجھ کر ان کے ساتھ نفاذِ اسلام کے مشن میں بھرپور تعاون کرنا چاہئے۔ پاکستان ہی میں نہیں، جہاں تک میرا ربط تھا، عالمِ اسلام کے دوسرے ملکوں میں بھی مجھے کوئی حکمران ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اسلام پر ایسا غیر متزلزل ایمان، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق اور اسلام کی سربلندی کا ایسا جذبہ رکھتا ہو۔ میرے ناچیز مطالعے کی حد تک وہ عالمِ اسلام کے حکمرانوں میں اس وقت واحد انسان تھے جن میں نفاذِ شریعت کے کام کو آگے لیکر آگے بڑھنے کا ذاتی جذبہ بھی تھا، اور جو اس بات کی صلاحیت رکھتے تھے کہ اس مقصد کے لئے وقت کے چلتے ہوئے نعروں سے ٹکر لے سکیں، اور واقعۃً انہوں نے بہت سے معاملات میں یہ ٹکر لیکر بھی دکھلائی، اور بہت سے وہ کام کئے جو مغربی افکار سے مرعوب ذہنوں کے لحاظ سے اس دور میں ناممکن سمجھے جاتے تھے۔

صدر مرحوم کے ساتھ المیہ یہ تھا کہ سیاسی طاقتیں تو ان کی اس لئے دشمن تھیں کہ وہ انہیں اپنے عزائم کی راہ میں ایک زبردست کانٹا نظر آتے تھے، بعض دینی حلقے اس لئے ان کے مخالف تھے کہ ان کی وجہ سے انہیں نفاذِ اسلام کی جدوجہد کا کریڈٹ اپنے ہاتھ سے نکلنے ہونے کا اندیشہ تھا، تیسری طرف وہ دیندار حلقے تھے جنہیں ان کی ذات سے کوئی پرخاش نہیں تھی، لیکن ان کے منہ سے نفاذِ اسلام کا لفظ سننے کے بعد وہ اس بات کے لئے بیتاب تھے کہ اس مقصد کی طرف پیش قدمی تیز رفتاری کے ساتھ ہو، جس کے اثرات معاشرے پر واضح نظر آئیں، اور چونکہ یہ پیش قدمی واقعۃً سست رفتار تھی، اس لئے ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں اور ان کی نگاہ مرحوم کے کئے ہوئے اچھے کاموں کے بجائے ان کاموں پر زیادہ رہتی

کی جو وہ نہیں کر سکے' یہاں تک کہ بالآخر وہ اتنے مایوس ہوئے کہ انہوں نے سرے سے یہ تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیا کہ صدر مرحوم نے اسلام کی کوئی خدمت کی ہے' یا کرنا چاہتے ہیں" اور اس طرح شاید وہ بھی پہلے اور دوسرے طبقے ہی کے ساتھ ہم آواز ہو گئے۔

ایک چوتھا طبقہ بھی تھا جو اس بات کی تکلیف ضرور محسوس کرتا تھا کہ نفاذ اسلام کی طرف پیش قدمی سست رفتار اور ناکافی ہے' لیکن ساتھ ہی صدر مرحوم کے عہد میں جو قابل قدر کام ہوئے ہیں' ان کی نفی کا بھی قائل نہ تھا' اور اس بات کو بھی شدت کے ساتھ محسوس کرتا تھا کہ بہت سے قابل تنقید امور کے باوجود اس وقت نفاذ اسلام کے مشن کے حق میں بظاہر حالات کوئی متبادل شخصیت سامنے نہیں ہے جو اتنا کام بھی کر سکے' لہذا وہ سمجھتا تھا کہ اصلاح حال کی بھرپور کوششوں کے ساتھ ساتھ صدر ضیاء الحق کی ذات کو غنیمت سمجھنا چاہئے اور بحیثیت مجموعی نفاذ اسلام کے مشن میں ان کی تائید و حمایت سے ہاتھ نہیں کھینچنا چاہئے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ساتھ ہی یہ طبقہ پہلے تین طبقات کی بنائی ہوئی فضا سے اتنا مرعوب بھی تھا کہ صدر مرحوم کے اچھے کارناموں کی اس قدر کھل کر حمایت اور تعریف نہیں کرتا جس کے وہ مستحق تھے' اس کی طرف سے بھی ان کے اچھے کاموں کی تعریف و حمایت بڑے تحفظات کے ساتھ ہوئی' اور اس میں بھی تنقید کا پہلو اکثر و بیشتر غالب رہا۔

اس صورت حال کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ شہید مرحوم کے کارنامے پس منظر میں چلے گئے' اور قابل تنقید امور زیادہ ابھر کر سامنے آئے' یہاں تک کہ یہ فقرے زبان زد عام ہو گئے کہ "گیارہ سال میں کچھ نہیں ہوا" "اسلام کو خواہ مخواہ بدنام کیا گیا ہے" "اسلام کو صرف اقتدار کو طول دینے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے" وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اسی ماحول میں جب ۱۷ اگست کو یکایک صدر مرحوم کا حادثہ شہادت پیش آیا تو یہ ایک ایسا ناگہانی صدمہ تھا جس کے بارے میں قوم نے سوچا بھی نہ تھا۔ مذکورہ چار طبقات میں سے آخری دو طبقے جو اسلام کے لئے واقعۃً مخلص تھے' اور جن کی ملک کے باشعور عوام میں اکثریت ہے' جب انہوں نے صدر مرحوم کے اس طرح اچانک منظر سے غائب ہو جانے کے بعد گرد و پیش پر نظر ڈالی تو انہیں یکایک یہ جانکاہ احساس ہوا کہ انہوں نے کیا چیز کھو دی ہے؟ اب لوگوں کو ایک ایک کر کے وہ اچھے کام یاد آئے جو تنقید کے تند و شور میں گم ہو گئے تھے' اور احساس ہوا کہ جن باتوں کو ہم ابھی تک غیر اہم' ناکافی بلکہ کالعدم سمجھتے آئے تھے' اب

کہیں انہی کے لالے نہ پڑجائیں۔ اس احساس نے قوم کے ہر باشعور مسلمان کو ایک ناقابل بیان صدمے اور زبردست تشویش میں مبتلا کردیا۔ یہ صدمہ صدر مرحوم کے ساتھ عقیدت و محبت کے طوفان میں تبدیل ہوگیا' اور ملک کی اس "خاموش اکثریت" نے مرحوم کی نماز جنازہ کے موقع پر وہ فقید المثال نظارہ پیش کیا کہ شاید مرگلہ کی وادی نے پہلے کبھی ایسا نظارہ نہ دیکھا ہوگا۔

یہ درست ہے کہ پچھلے گیارہ سال میں نفاذ اسلام کی طرف پیش قدمی سست رفتار تھی' یہ بھی درست ہے کہ اس زمانے میں بہت سی توقعات پوری نہیں ہوئیں' یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور میں بہت سے قابل تنقید امور بھی پیش آئے جن پر میں نے البلاغ کے ان صفحات میں مفصل تنقید کی' لیکن میرے نزدیک یہ کہنا سراسر ظلم اور پرلے درجے کی ناانصافی ہے کہ شہید مرحوم نے اس زمانے میں اسلام کی نمائش کے سوا نفاذ اسلام کی سمت میں کوئی کام نہیں کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ گیارہ سال کے دوران نفاذ اسلام و شریعت کے سلسلے میں جتنا کام اللہ نے شہید مرحوم کے ہاتھوں کرایا' وہ اس سے پہلے کے تیس سال میں نہیں ہوا تھا۔ اور نفاذ شریعت کے سلسلے میں ان گیارہ سال کو ایک پلڑے میں اور پہلے کے تیس سالوں کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو یقیناً ان گیارہ سال کا پلہ بھاری رہے گا۔ شہید مرحوم کے دور میں جو قابل تعریف کام ہوئے ان میں سے بہت سے کام ایسے ہیں جن کا عام لوگوں کو آج تک علم نہیں' اور بہت سے ایسے ہیں جن کی اہمیت کا کماحقہ احساس نہیں' لیکن انشاء اللہ وہ مرحوم کے لئے صدقہ جاریہ ثابت ہوں گے۔ یہاں خاص طور پر میں چند اہم کاموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں' جن کا مقصد مرحوم کو خراج تحسین پیش کرنے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ عام مسلمانوں کو انکی اہمیت کا کماحقہ احساس ہو' اور وہ آئندہ ان کے بقاء و تحفظ اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرسکیں۔

(۱) یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ صدر مرحوم کے زمانے میں اسلام اور شعائر اسلام کی عظمت و اہمیت کا ایک عام شعور پیدا ہوا۔ پہلے اسلام اور اسلامی شعائر سے عملی وابستگی رکھنے والوں کو قدم قدم پر ہمت شکنی کا سامنا کرنا پڑتا تھا' انہیں نشانہ استہزاء بنایا جاتا تھا' اور خاص طور پر سرکاری حلقوں میں شعائر اسلام کو عملاً فرسودگی اور دقیانوسیت کی علامت قرار

دے لیا گیا تھا، اور انگریز کی پیدا کردہ وہ ذہنی فضا نہ صرف برقرار تھی، بلکہ اس میں اضافہ ہو رہا تھا، جس کے تحت اسلام کا نام لینے والے پر اس کے کسی شعار پر عمل کرنے والے کو معاشرے سے الگ تھلگ کر دیا جائے، اور اس کے دل میں احساسِ کمتری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

شہید مرحوم کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنی متواتر جدوجہد سے اس فضا میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔ اور وہ فضا بنائی جس میں اسلام اور شعائرِ اسلام سے وابستگی کو واقعۃً عزت و عظمت کا سبب اور سرمایۂ فخر و ناز سمجھا جائے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کے راستے کی رکاوٹیں دور ہوئیں جو پہلے سے اسلام کے ساتھ مکمل وابستگی رکھتے تھے، بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب ہوئی۔

اندرونِ ملک کے علاوہ عالمی برادری میں بھی شہید مرحوم نے اسلام کا کلمہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ ڈٹ کر پیش کیا۔ وہ تاریخ کے واحد حکمران تھے جنہوں نے جنرل اسمبلی میں اپنی تقریر کا آغاز تلاوتِ قرآن سے کرنے پر اصرار کیا، اور اس طرح اس عالمی پلیٹ فارم سے قرآن کریم کا پیغام پیش کیا۔ کیوبا جیسے دہریہ ملک میں بھی انہوں نے تلاوتِ قرآن ہی کو اپنی تقریر کی بنیاد بنایا۔

(۳) ملک میں شراب جیسی ام الخبائث کا آزادانہ استعمال کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ سب سے پہلے حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے اپنی وزارتِ علیا کے دور میں صوبہ سرحد کے اندر شراب کی ممانعت کا قانون نافذ کیا، پھر بھٹو صاحب مرحوم نے اپنے آخری دور میں پورے ملک میں شراب کی ممانعت کا قانون جاری کیا۔ یہ دونوں قانون شراب بندی کے سلسلے میں بلاشبہ بڑے لائقِ ستائش تھے۔ لیکن ان دونوں قوانین میں شراب کی ممانعت صرف مسلمانوں کے لئے تھی، غیر مسلم اس ممانعت سے مستثنیٰ تھے، اور شراب نوشی کی سزا بھی شریعت کے مطابق نہیں تھی۔ اگرچہ ان قوانین کے بعد ملک میں پائے جانے والے کھلے شراب خانے بند ہو گئے تھے لیکن غیر مسلموں کے استثناء کی وجہ سے ایک وسیع چور دروازہ کھلا ہوا تھا، غیر مسلموں کے بہانے شراب کا استعمال عام تھا، بلکہ ایسی اطلاعات بھی ملیں کہ لوگوں نے اپنے آپ کو غیر مسلم ظاہر کر کے شراب حاصل کی، والعیاذ باللہ العظیم۔

صدر مرحوم نے ۱۹۷۹ء میں ممانعتِ شراب کا جو آرڈیننس جاری کیا، اس میں غیر

مسلموں کے لیے بھی شراب کی ممانعت کر کے یہ چور دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔ اور شراب نوشی کی سزا بھی شریعت کے مطابق مقرر کر دی گئی۔

اس آرڈی نینس کے بعد شراب کے استعمال پر موثر پابندی عائد ہوئی، اور اس گناہ عظیم کے بے دریغ ارتکاب پر موثر بریک لگا۔ خاص طور سے فوج کے حلقوں میں جہاں شراب نوشی ایک عام وبا کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی، وہاں اس اقدام نے ایک انقلاب برپا کر دیا، جس کا مشاہدہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

غیر مسلموں کو شراب بندی پر مطمئن کرنا خاصا دشوار کام تھا، لیکن صدر مرحوم نے بڑی حکمت کے ساتھ غیر مسلم اقلیتوں کو اس پر راضی کیا، جس کے نتیجے میں ان کی طرف سے کوئی بڑی مخالفت پیش نہیں آئی۔

پھر سب سے بڑی دشواری پی آئی اے کی بین الاقوامی پروازوں میں شراب بندی کے سلسلے میں پیش آئی۔ حکومت اور ایئرلائنز کے ذمہ داروں میں تقریباً ہر شخص اس اقدام کے عواقب سے خوفزدہ تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ بین الاقوامی پروازوں میں شراب کی سپلائی بند کرنے سے ایئرلائنز کو ناقابل تحمل خسارے کا اندیشہ ہے۔ سعودی ایئرلائنز کی مثال پیش کی جاتی تو یہ کہا جاتا کہ وہ ایک امیر ملک ہے، جو اس خسارے کو برداشت کر سکتا ہے لیکن پاکستان اس کا تحمل نہیں کر سکتا۔ مگر صدر مرحوم اعداد و شمار سے بنائی ہوئی اس ڈراؤنی فضا سے مرعوب نہیں ہوئے، اور پوری جرأت کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر پی آئی اے کی عالمی پروازوں میں بھی مطلقاً شراب بند کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ اس اقدام کے نتیجے میں ایئرلائنز کو نہ صرف یہ کہ کوئی خسارہ نہیں ہوا، بلکہ پہلے سے زیادہ نفع ہوا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہماری ایئرلائنز بھی اس ام الخبائث سے پاک ہو گئی۔

(۳) ۱۹۷۹ء سے پہلے تک انگریز کی پیدا کی ہوئی یہ صورت حال برقرار تھی کہ زناکاری جیسا گھناؤنا گناہ اگر باہمی رضامندی سے کیا جائے تو وہ کوئی جرم نہیں تھا۔ قانون صرف زنا بالجبر کو جرم قرار دیتا تھا اور اس میں بھی اگر ملزم عدالت کے ذہن میں یہ شبہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ شاید اس بدکاری کے ارتکاب میں عورت کی مرضی شامل ہو تو وہ جرم سے بری ہو جایا کرتا تھا۔ یہ صورت حال ایک مسلمان کہلانے والے ملک کے ماتھے پر کلنک کا ایسا ٹیکہ تھی کہ الفاظ اس کی شناعت کو بیان کرنے سے عاجز ہیں۔ شہید مرحوم جنرل ضیاء

صاحب کے دور میں پہلی بار اس بدکاری اور اس کے مقدمات کو قانوناً جرم قرار دیا گیا، اور اس پر شرعی سزائیں مقرر کی گئیں۔ زنا کاری کی حد شرعی (یعنی سو کوڑوں اور سنگساری) کو بطور قانون نافذ کیا گیا۔ چونکہ مذکورہ حد شرعی کا معیار ثبوت انتہائی سخت ہے، اس لئے حد تو شاذونادر ہی کہیں جاری ہو سکتی ہے، لیکن قانون میں جہاں حد کی شرائط پوری نہ ہوں وہاں سخت تعزیری سزائیں مقرر کی گئی تھیں جن پر اب عدالتیں عمل کر رہی ہیں۔

(۳) صدر مرحوم ہی کے زمانے میں ملک میں پہلی بار حدود شرعیہ کو بطور قانون نافذ کیا گیا۔ یہ درست ہے کہ اس قانون کے نفاذ کے بعد اب تک کسی مجرم پر کوئی حد جاری نہیں ہوئی، جس کی بنا پر عموماً یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ملک میں حدود شرعیہ نافذ نہیں ہیں، یا اگر ہیں تو وہ صرف نچلی عدالتوں کے لئے ہیں، اور اعلیٰ عدالتوں پر حدود شرعیہ کا قانون لاگو نہیں ہوتا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب تک حد جاری نہ ہونے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ پولیس، تفتیش جرائم اور عدالتی طریق کار میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، جس کی وجہ سے اکثر جرائم کے تو مقدمات ہی درج نہیں ہوتے، بہت سے مقدمات میں تفتیش صحیح طور پر نہیں ہوتی، اور بعض مقدمات میں عدالتی طریق کار میں خامیاں رہ جاتی ہیں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حدود شرعیہ کے اجراء کے لئے شریعت نے شرائط اتنی کڑی مقرر کی ہیں کہ وہ ننانوے فیصد مقدمات میں پوری نہیں ہو سکتیں۔

ورنہ جہاں تک قانون کا تعلق ہے، حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد سے جرائم متعلقہ حدود کی حد تک ملک کا قانون بلاشبہ اسلامی ہو چکا ہے، اور وہ صرف نچلی عدالتوں پر نہیں، مجسٹریٹ سے لے کر سپریم کورٹ تک ہر عدالت پر واجب العمل ہے، بلکہ شروع میں فوجی عدالتیں اور فوجی مقدمات اس سے مستثنیٰ تھے، اب تمام فوجی عدالتوں کو بھی اس کا پابند کر دیا گیا ہے۔

چونکہ مذکورہ بالا خامیوں کی بنا پر اب تک کسی مجرم پر کوئی حد جاری نہیں ہوئی، اس لئے اس قانون کے اثرات بلاشبہ معاشرے پر ظاہر نہیں ہو سکے، اور اس سلسلے میں عوام کو حکومت سے جو شکایت رہی ہے، وہ بالکل بجا اور برحق ہے، لیکن یہ بات ناقابل انکار ہے کہ جس دور میں دنیا نے حدود شرعیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا، وہاں صدر مرحوم نے مخالف پروپیگنڈہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور بالآخر ان قوانین کو نافذ کر کے ملک

میں چلی ہوئی اس نظریاتی بحث کو ختم کر دیا کہ حدود شرعیہ اس دور میں واجب العمل ہیں یا نہیں؟۔

(۵) ہمارے ملک کے ہر دستور میں یہ دفعہ لکھی جاتی رہی ہے کہ "ملک کے تمام قوانین قرآن و سنت کے مطابق بنائے جائیں گے" لیکن صدر مرحوم سے پہلے یہ دفعہ دستور کی ایک بے جان دفعہ تھی' نہ کبھی اس دفعہ کے تحت کسی قانون کو اسلامی بنایا گیا' نہ عوام کو یہ موقع فراہم کیا گیا وہ کسی مروجہ قانون کو غیر اسلامی ہونے کی بناء پر چیلنج کر کے اسے بدلوا سکیں۔ علماء اور نفاذ اسلام کا مطالبہ کرنے والے حلقوں کا یہ مطالبہ سالہا سال سے چلا آتا تھا کہ دستور کی مذکورہ بالا دفعہ کو مؤثر اور عدالت کے ذریعے قابل تنفیذ (Justiciable) بنایا جائے۔ اور اس ملک کے عوام کو یہ حق دیا جائے کہ وہ غیر اسلامی قوانین کو اعلیٰ عدالتوں میں چیلنج کر کے اسی طرح بدلوا سکیں جیسے بنیادی حقوق کے خلاف قوانین کو بدلوا سکتے ہیں۔ لیکن صدر مرحوم سے پہلے کسی حکومت نے مطالبے پر کان نہیں دھرے۔ یہ اعزاز سب سے پہلے صدر ضیاء الحق شہید کو حاصل ہوا کہ انہوں نے غیر اسلامی قوانین کو عدلیہ میں چیلنج کرنے کا راستہ پیدا کیا' اور اس غرض کے لئے وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ میں شریعت اپلیٹ بنچ قائم کی۔

افسوس ہے کہ عوام' علماء اور دینی جماعتوں کے طرف سے اس موقع سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا' اور اس راستے سے قوانین کی اصلاح کرانے میں بہت کم دلچسپی لی گئی جس کی بنا پر اس اقدام کے ممکنہ فوائد حاصل نہ ہو سکے۔ لیکن اس کے باوجود ان عدالتوں نے اب تک دسیوں غیر اسلامی قوانین کو کالعدم قرار دیکر ختم کر دیا' اور ان کے ذریعے قوانین کی ایک قابل ذکر تعداد کی اصلاح ہوئی۔

چند ماہ پہلے تک مالیاتی قوانین اور مسلم پرسنل لاء کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا' لیکن اب شریعت آرڈی نینس کے نفاذ کے بعد ان قوانین کو بھی ہائی کورٹ میں چیلنج کرنے کی گنجائش پیدا کر دی گئی ہے۔ اور اس طرح دنیا بھر میں پاکستان واحد ملک ہے جس کے عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ رائج الوقت قوانین کو غیر اسلامی ہونے کی بناء پر عدالت میں چیلنج کر سکتے ہیں اور عدالت اگر ان کے غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کر دے تو وہ قانون خود بخود منسوخ ہو جاتے ہیں' اور حکومت متبادل قانون نافذ کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اور بلاشبہ یہ

صدر مرحوم کا نہایت قابل قدر کارنامہ ہے۔

ہمارے ملک کے عوام چونکہ عموماً قانونی نظام کی تفصیلات سے باخبر نہیں ہیں' اس لئے اس موقع سے اب بھی بہت کم فائدہ اٹھایا جارہا ہے' حالانکہ اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کرنے کا طریقہ بھی بہت سادہ اور آسان ہے۔

(۶) قرارداد مقاصد ۱۹۴۹ء میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور دینی حلقوں کی کوشش سے منظور ہوئی تھی' لیکن پاکستان کے ہر دستور میں وہ ایک غیر مؤثر دیباچے کے طور پر شامل کی گئی۔ یہاں تک کہ اعلیٰ عدالتوں نے یہ فیصلے دیئے کہ محض ایک دیباچہ ہونے کی بنا پر اس کی کوئی لازمی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ صدر مرحوم کے دور میں پہلی بار اس قرارداد مقاصد کو آئین کا مؤثر حصہ بنایا گیا' اور اس طرح عدلیہ کے ذریعے ملک کے قانونی نظام کی اصلاح کا ایک دوسرا اہم دروازہ کھولا گیا۔ ابھی اس تبدیلی کے قانونی اثرات اعلیٰ عدالتوں میں زیر بحث ہیں' بعض اعلیٰ عدالتوں نے اس تبدیلی کی بنیاد پر غیر اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے کرنے سے انکار کیا ہے۔ اگر عدالت عظمیٰ نے بھی اس پوزیشن کو تسلیم کرلیا تو یہ تبدیلی ملک میں غیر اسلامی قوانین اور اقدامات کی اصلاح کے لئے ایک عظیم انقلابی تبدیلی ثابت ہوگی' جو یقیناً صدر مرحوم ہی کا صدقہ جاریہ ہے۔

(۷) یہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے کہ شہید مرحوم نے ملک میں نماز کے اہتمام کے لئے یادگار خدمات انجام دی ہیں۔ ان سے پہلے نمازی لوگوں کے لئے بھی بہت دفتری مجبوریوں کے تحت نماز کے وقت نماز باجماعت ادا کرنا سخت دشوار تھا۔ صدر مرحوم کے احکام کے تحت تمام سرکاری دفتروں میں نماز باجماعت کا مؤثر انتظام ہوا' اور اب شاید کوئی سرکاری دفتر ایسا نہیں ہے جہاں دفتری اوقات میں نماز باجماعت کا انتظام نہ ہو۔ اسلام آباد سیکریٹریٹ میں اگر دن کے ایک بجے سے ڈیڑھ بجے تک جا کر دیکھیں تو واقعتاً ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ مسلمان ملک کا سیکریٹریٹ ہے۔ تقریباً ہر عمارت اور ہر بلاک میں نماز باجماعت کے روح پرور مناظر نظر آتے ہیں۔ اس اہتمام کے نتیجے میں لوگوں کو نماز کی ترغیب ہوئی ہے' اور نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے' بہت سی جگہوں پر نماز کے متصل بعد چند منٹ کے وقفے میں کوئی حدیث سنانے کا بھی معمول ہے' جس کی افادیت ظاہر ہے۔

سرکاری دفاتر کے علاوہ سرکاری تقریبوں اور اجتماعات کے نظام الاوقات میں نماز کی

رعایت بھی اسی دور میں شروع ہوئی، ورنہ پہلے کسی سرکاری اجتماع میں جانے کا مطلب یہ تھا کہ انسان یا تو نماز سے ہاتھ دھوئے، ورنہ اس فریضے کی ادائیگی کے لئے سخت مشکلات کا شکار ہو۔ ملک بھر کے تمام ہوائی اڈوں، ریلوے اسٹیشنوں اور دوسرے عوامی مقامات پر بھی نماز اور وضو کے عمدہ انتظامات بھی اسی زمانے میں ہوئے، جنہوں نے نماز کی اہمیت کی عام فضا پیدا کی ہے، اور اس میں صدر مرحوم کی ذاتی دلچسپی کو دخل ہے۔

اس اہتمام کا یہ نتیجہ میں نے کھلی آنکھوں دیکھا ہے کہ بہت سے وہ سرکاری افسران جو پہلے نماز نہیں پڑھتے تھے، رفتہ رفتہ نماز کے عادی بن گئے، اور نماز ان کی زندگی کا لازمی حصہ ہو گئی۔

خاص طور پر فوج کے ماحول میں اس زمانے میں بہت نمایاں تبدیلی آئی ہے جس کی گواہی احقر کے سامنے بہت سے فوجی افسروں نے دی۔ ان میں سے ایک صاحب کے الفاظ یہ تھے کہ میں ۱۹۵۷ء سے فوج میں ہوں، پہلے عالم یہ تھا کہ جنگی مشقوں کے دوران اگر ہمارے چودہ افسر ہوتے تو ان میں سے تیرہ تو یقیناً ورنہ چودہ کے چودہ شراب نوشی کے عادی ہوتے تھے، اور اب بفضلہ تعالیٰ حال یہ ہے کہ چودہ میں سے کم از کم بارہ افراد نماز کے عادی ہوتے ہیں۔

(۸) صدر مرحوم سے پہلے رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کی تمام دکانیں، ہوٹل کھلے ہوتے تھے بلکہ ان میں کھانے پینے والوں کی تعداد بڑھ جاتی تھی، صرف ایک آدھا تختی پر "احترام رمضان" کی علامت کے طور پر لگا دیا جاتا تھا۔ صدر مرحوم نے پہلی بار یہ حکم جاری کیا کہ رمضان میں دن کے وقت ہوٹل، ریستوران اور کھانے پینے کی تمام دکانیں بالکلیہ بند رہیں گی۔ چنانچہ گیارہ سال سے اس پر عمل ہو رہا ہے اور اب محسوس ہونے لگا ہے کہ رمضان کا مہینہ کسی اسلامی ملک میں آیا ہے۔

(۹) ملک میں سرکاری طور پر زکوٰۃ کی وصولیابی اور تقسیم کا انتظام بھی پہلی بار صدر مرحوم ہی کے دور میں شروع ہوا۔ اگرچہ اس کی وصولیابی اور تقسیم دونوں کے طریق کار میں بہت سے نقائص ہیں، جن کی وجہ سے اس اقدام کے اثرات قوم پر نمایاں نہیں ہوئے، زکوٰۃ کی تقسیم کے بارے میں بالخصوص خورد برد کی اطلاعات بھی ملتی رہتی ہیں، لیکن جس معاشرے میں ہم جی رہے ہیں، اس کی خرابیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جتنی خورد برد کا اندیشہ تھا، شاید عملاً اتنی

شروع نہیں ہوئی۔ زکوٰۃ کی رقم کو سرکاری خزانے سے بالکل علیحدہ رکھنے اور سرکاری ملازمین کے بجائے عوام سے زکوٰۃ کی تقسیم کا کام لینے سے اس شعبے میں کافی مدد ملی ہے۔ بہر صورت! اس نظام کے تمام موجودہ نقائص کے باوجود اسلام کے ایک اہم رکن کو عملاً قائم کرنے کا آغاز ضرور ہو گیا ہے۔ اب اسے مؤثر، منظم اور مفید بنانے کی ضرورت ہے۔

(۱۰) صدر مرحوم ہی نے تمام سرکاری ملازمین کو قومی لباس پہننے کا پابند بنا کر ملک کو انگریزی لباس سے نجات دلائی۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں ہر چھوٹا بڑا افسر انگریزی لباس کا خوگر تھا۔ اسی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا تھا، اور اس کے حق میں دلائل دینے کے لئے ہر وقت تیار تھا، یہ تبدیلی لانا بھی شہید مرحوم کے بڑے کارناموں میں سے ہے۔ جس کے نتیجے میں پہلے سرکاری دفتروں اور سرکاری تقریبات سے انگریزی معاشرت کا یہ نشان ختم ہوا، اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کا اثر عام قومی زندگی پر بھی پڑا، اور اب شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ ملک میں انگریزی لباس پہننے والے اقلیت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ لباس کے مسئلے کو کوئی شخص خواہ کتنا غیر اہم قرار دینے کی کوشش کرے، لیکن زندگی پر اس کے نفسیاتی اثرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۱) تعلیم کے نصاب و نظام میں بھی اس دور میں خاصی تبدیلی آئی۔ تقریباً ہر مضمون کے نئے نصابی کتابوں کی تدوین میں اسلامی افکار کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اسلامیات کو تعلیم کے ہر مرحلے میں لازمی قرار دیا گیا۔ اعلیٰ سول اور فوجی افسران کے تربیتی کورسوں میں بھی اسلامیات کو ایک لازمی مادے کے طور پر شامل کیا گیا۔ ججوں اور تفتیشی افسران کو شریعت سے روشناس کرانے کے لئے ریفریشر کورس جاری کئے گئے۔ اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا، جس کا معیار تعلیم اسلامی علوم کے لحاظ سے ملک کی تمام سرکاری یونیورسٹیوں سے کہیں زیادہ بلند ہے، اور جہاں سے اسلامی قانون کے شعبے میں بعض بہت اچھے اور قابل طلبہ فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔

(۱۲) اسلامی علوم کی تدریس میں ملک کے دینی مدارس کا معیار تعلیم ہمیشہ یقیناً ملک کی ہر یونیورسٹی کی اعلیٰ سے اعلیٰ معیار سے کہیں زیادہ رہا ہے، سرکاری یونیورسٹیوں سے اسلامیات میں ایم اے یا پی ایچ ڈی کرنے والے علم دین میں دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود سرکاری حلقوں میں دینی مدارس کی سند کی

کوئی قیمت نہیں تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جن سرکاری مناصب پر علماء کی ضرورت تھی، وہاں بھی دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے پہنچنے کا قانوناً کوئی راستہ نہ تھا۔ صدر مرحوم نے اپنی ذاتی دلچسپی سے سرکاری طور پر دینی مدارس کی سند کو ایم اے کے مساوی قرار دیکر تعلیمی اداروں اور دیگر سرکاری مناصب کو علماء کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کیا۔

آجکل یہ فقرہ بہت کثرت سے بولا جاتا ہے کہ "صدر ضیاء کے دور میں علماء کا وقار بلند ہوا۔" میرے نزدیک یہ تعبیر درست نہیں ہے۔ علماء اگر صحیح معنی میں علماء ہوں، تو کسی کے وقار بلند کرنے کے محتاج نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ نے علم دین کو جو وقار عطا فرمایا ہے، وہ کسی کے عطا کرنے یا تسلیم کرنے سے بے نیاز ہے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے واقعۃً علم دین کی دولت عطا فرمائی ہو، اسے ان باتوں کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا، اور نہ سرکاری طور پر منظور کرنے سے اس کی عزت میں حقیقی طور پر کوئی اضافہ ہوتا ہے۔

لیکن مسئلہ اصل میں یہ تھا کہ جن مقامات پر علماء دین کی ضرورت تھی، وہاں انکی خدمات سے استفادہ کس طرح کیا جائے؟ پچھلے زمانوں میں نہ صرف یہ کہ یہ استفادہ نہیں کیا گیا، بلکہ اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی گئی۔ صدر مرحوم نے اپنے متعدد اقدامات کے ذریعے علماء کی خدمات سے استفادے کی راہ پیدا کرکے جہاں جہاں علماء کی ضرورت تھی، وہاں پہنچانے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔

(۱۳) ملک میں غیر سودی بنکاری کے نام سے جو طریق کار رائج ہوا ہے، اس کی خرابیوں پر میں البلاغ کے صفحات میں بارہا لکھ چکا ہوں، اور شاید اس نظام پر مجھ سے زیادہ کسی نے تنقید نہ کی ہو، لیکن ان تمام خرابیوں اور خامیوں کے باوصف صدر مرحوم کا یہ کارنامہ بلاشبہ قابل قدر ہے کہ اصولی طور پر بنکاری کے نظام کو سود سے پاک کرنا سرکاری طور پر طے کردیا گیا، اور وہ بحث ختم کردی گئی جس میں بینکوں کے سود کی حرمت ہی کو مشکوک بنانے کی سعی کی جارہی تھی، اب بحث یہ نہیں ہے کہ بینکوں کے نظام میں تبدیلی لائی جائے یا نہیں؟ اب بحث یہ ہے کہ تبدیلی کس طرح لائی جائے؟ اور اب صدر مرحوم نے شہادت سے کچھ ہی دنوں پہلے بنکاری کے ذمہ داروں کو بلاکر واضح لفظوں میں موجودہ طریق کار پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا، اور انہیں تاکید کی تھی کہ وہ جلد از جلد اس طریق کار کو بدل کر شریعت کے مطابق بنائیں۔ شریعت آرڈیننس کے نفاذ کے بعد اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔

(۱۴) ذرائع ابلاغ کے طرز عمل اور ان کے ذریعے بے حیائی کے فروغ پر ہم سب کی طرف سے بڑی جائز تنقید ہوتی رہی ہے، اور واقعہ یہی ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ کا طریق کار کسی بھی طرح ایک اسلامی ملک کے شایان شان نہیں ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ ۱۹۷۷ء سے پہلے ذرائع ابلاغ جس برق رفتاری سے فحاشی و عریانی کی طرف جا رہے تھے، صدر مرحوم کے زمانے میں اس کو کچھ نہ کچھ بریک ضرور لگا ہے، اگر ۱۹۷۷ء سے پہلے کے اخبارات و رسائل اور ریڈیو، ٹی وی کے پروگراموں کا موازنہ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد سے کیا جائے تو یہ فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔

(۱۵) ہمارا ملک ہر دور میں مرزائیت کی اسلام دشمن سرگرمیوں سے مجروح رہا ہے، ان سرگرمیوں پر جس قدر کاری وار صدر ضیاء الحق شہید مرحوم کے زمانے میں کیا گیا، اس سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ۱۹۷۴ء میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب مرحوم نے ایک دستوری ترمیم کے ذریعے مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا تاریخی اقدام کیا تھا جس نے ملک کو مرزائیت کے بارے میں صحیح رخ پر گامزن کیا، لیکن اس دستوری ترمیم کے باوجود مرزائیوں کی طرف سے اپنے آپ کو مسلمان باور کرانے، اپنی عبادت گاہوں کو مسجد قرار دینے اور اپنے کفریہ عقائد کو تبلیغ اسلام کے عنوان سے پیش کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے سربراہوں کے لئے اسلامی القاب و اصطلاحات استعمال کرتے تھے، اور ان کی تبلیغات علانیہ جاری تھیں۔ صدر مرحوم نے ایک تاریخی آرڈیننس کے ذریعے ان کی ایسی تمام سرگرمیوں پر پابندی عائد کر کے پاکستان میں ان کی تبلیغی سرگرمیوں اور تخریب انگیز پروپیگنڈے کو اس طرح تقریباً ختم کر دیا کہ ان کے سربراہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ اپنی تخریبی سرگرمیوں کے لئے پاکستان سے مایوس ہو کر لندن کو اپنا مستقر بنائے۔

(۱۶) جہاد افغانستان کے معاملے میں صدر مرحوم کے کارنامے کسی تشریح کے محتاج نہیں ہیں۔ افغان مہاجرین کی امداد اور مجاہدین کی پشت پناہی سے ان کا مقصد اپنے ستم رسیدہ مسلمان بھائیوں کی امداد تو تھا ہی، اس کے علاوہ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ اس طرح افغانستان میں ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم ہو جو اس علاقے میں احیاء اسلام کی تحریک کو سہارا دے، جس کے نتیجے میں پاکستان اور افغانستان پوری ہم آہنگی کے ساتھ نفاذ اسلام کے مشن کو پایۂ

تکمیل تک پہنچا سکیں۔ انہوں نے یہ پالیسی جس کامیابی سے چلائی اس نے پوری دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا۔ یہاں تک کہ روس جیسی طاقت کو اس علاقے سے پسپا ہونا پڑا۔

یہ صدر مرحوم کے دور کے چند موٹے موٹے کام ہیں جن کی بنا پر میں یہ کہنا بدترین ناانصافی سمجھتا ہوں کہ ان کے دور میں اسلام کے لئے کوئی کام نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ نفاذ اسلام کے مشن کو ادھورا چھوڑ گئے۔ ابھی اس سمت میں بہت سے جرأت مندانہ اقدامات کی ضرورت تھی، اور جو اقدامات ہوئے تھے، ان کو موثر و مستحکم بنانے کے لئے بہت کچھ کرنا باقی تھا، لیکن ان کے مندرجہ بالا اقدامات نے اس ملک کو پہلی بار صحیح رخ دیا، اور نفاذ اسلام کے مشن کے لئے بڑی حد تک راہ ہموار کی۔ اگر آئندہ اللہ کے کسی بندے کو اس مقصد کو آگے بڑھانے کی توفیق ہوگی تو وہ محسوس کریگا کہ اس راہ کے کتنے کانٹے صدر مرحوم چن گئے ہیں۔ آج سیاسی چپقلش کی فضا میں خواہ کچھ کہا جائے، لیکن جب بھی معاصرت کا گرد و غبار چھٹے گا، اور اسلام کا درد رکھنے والے کسی مورخ کو غیر جانبداری کے ساتھ ملکی حالات کے تجزیہ کا موقع ملے گا تو وہ ان تمام کاموں کو شہید مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے درخشاں کارناموں میں شمار کئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

مرحوم اپنی ذاتی زندگی میں بھی بڑے غیر معمولی اوصاف کے حامل تھے، اسلام سے ان کی عملی وابستگی ایک واضح اور ظاہر و باہر حقیقت تھی۔ لہذا نفاذ اسلام کے لئے ان کے عزائم اور اقدامات کو محض سیاست قرار دینا ممکن نہیں، وہ بہرحال! موجودہ معاشرے ہی کے ایک فرد تھے، اور نفاذ اسلام کے لئے جو کام وہ نہیں کرپائے، ان میں سے بعض کے پیچھے سیاست کارفرما ہو سکتی ہے، لیکن اسلام کے لئے جو کام انہوں نے کئے، وہ ان کے اندر کی آواز تھی۔

وہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی میں بلاشبہ قابل رشک تھے۔ صرف پنجگانہ نمازوں ہی کے نہیں، تہجد کے بھی پابند تھے، پنجگانہ نمازیں بھی بالعموم جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کرتے تھے۔ یہ منظر تو میرے علاوہ نہ جانے کتنوں نے دیکھا ہے کہ میٹنگ کے دوران پیچیدہ مسائل پر خواہ کتنے زور و شور سے بحث جاری ہو، مرحوم کی نگاہ گھڑی پر رہتی، اور جہاں نماز کا وقت ہوتا، کام کو وہیں چھوڑ کر اٹھ جاتے، اور اپنے دفتر ہی کے احاطے میں بنی ہوئی مسجد میں جا کر نماز ادا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک ایسی ہی میٹنگ کے دوران مجھے وضو میں کچھ دیر ہو گئی، جب میں مسجد میں پہنچا تو دیکھا کہ نماز کھڑی ہو چکی ہے، اور خود صدر مرحوم نماز پڑھا رہے ہیں

بعد میں معلوم ہوا کہ امام صاحب اس وقت موجود نہیں تھے، اس لئے لوگوں نے مرحوم ہی کو آگے کر دیا۔

ہفت روزہ تکبیر کے مدیر جناب صلاح الدین صاحب نے خود اپنا واقعہ لکھا ہے کہ حرمین شریفین کے ایک سفر میں وہ صدر مرحوم کے ساتھ تھے، نماز عشاء کے بعد حرم مکہ میں پہنچے، اور جب عشاء کی نماز جماعت سے پڑھنے کا ارادہ کیا تو امام حرم شیخ عبداللہ بن سبیّل نے صدر مرحوم سے کہا کہ مسلمانوں کے سربراہ کی حیثیت سے نماز تو آپ ہی کو پڑھانی چاہئے اور یہ کہہ کر انہیں آگے کر دیا۔ صدر مرحوم نے کعبہ شریف کے سامنے میں نماز پڑھائی، اور نماز کے دوران رقت کے عالم میں ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ بعد میں صلاح الدین صاحب نے ان سے اس غیر معمولی تاثر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں تو ایک گنہگار انسان ہوں، میں تو حرم شریف میں داخلے میں اجازت کا بھی اہل نہیں، چہ جائیکہ یہاں امامت کروں۔

مجھے صدر مرحوم کے انداز و ادا سے یہ حسرت تو ہوتا تھا کہ شاید وہ تہجد کی نماز بھی پڑھتے ہیں، لیکن یقین سے معلوم نہیں تھا۔ ایک روز ان کے ایک ہاؤس اے ڈی سی نے بتایا کہ میں سالہا سال سے ان کے ساتھ ہوں، فوج کے زمانے میں بھی ساتھ رہا ہوں۔ ان کی نماز تہجد عموماً ناغہ نہیں ہوتی۔ پھر بعد میں یہ بات اور بھی قریب کے لوگوں سے معلوم ہوئی، اور ان کے ساتھ غیر ملکی سفروں میں جانے والے کئی لوگوں نے بتایا کہ یہ معمول سفر میں بھی جاری رہتا ہے۔

تلاوت قرآن کریم کا بھی معمول تھا۔ یہاں تک کہ قرآن کریم ان کے آخری سفر میں بھی ساتھ تھا جو صرف چند گھنٹوں کا سفر تھا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی تفسیر معارف القرآن ان کے ڈرائنگ روم میں نمایاں رکھی نظر آتی تھی، ایک دن مجھ سے اس تفسیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب ایک بہت بڑا خزانہ ہے، اور جب مجھے قرآن کریم کی کوئی بات سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس سے استفادہ کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی دینی کتب کے مطالعے کا معمول تھا۔ اور آخر وقت میں بھی مرحوم کے بریف کیس سے جو اشیاء برآمد ہوئیں، ان میں ایک قرآن کریم کا نسخہ اور دو کتابیں شامل تھیں، ان دو کتابوں میں سے ایک اصلاح المسلمین اور ایک تصوف کے موضوع کی کتاب تھی۔

ان کی زندگی شروع ہی سے ان بڑے بڑے منکرات سے پاک تھی جو آج کل عموماً "اونچی سوسائٹی" کی زندگی کا لازمہ سمجھے جاتے ہیں۔ حرمین شریفین کی زیارت کا خاص ذوق تھا۔ اور جس کسی سفر کے دوران سعودی عرب جانے کا موقع ہو' وہ اہتمام کرکے حرمین شریفین کی حاضری کی کوشش کرتے تھے' اور ہر سال رمضان کی ۲۷ ویں شب وہاں گزارنے کا معمول تو اس کے علاوہ تھا۔ وہاں پہنچ کر ساری ساری رات حرم شریف میں گذارتے' اور جن لوگوں نے انھیں وہاں حاضر ہوتے ہوئے دیکھا ہے' ان کا بیان ہے کہ ان پر وہاں ایک عجیب عالم رقت طاری رہتا تھا۔ ایک محفل میں انہوں نے میرے سامنے یہ کہا کہ لوگ اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ میں بار بار سعودی عرب کے دورے کیوں کرتا ہوں؟ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں وہاں مالی امداد حاصل کرنے جاتا ہوں' لیکن بات دراصل یہ ہے کہ میں بڑا گنہگار انسان ہوں' اور مجھے بار بار وہاں سے اسٹیم بھرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

مشکلات میں اللہ تعالیٰ سے رجوع مرحوم کا خاص وصف تھا' اور ایک مرتبہ ان کی زبان سے بھی نکل گیا کہ میں اہم امور میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہوں' لوگوں نے اسے "سیاسی استخارہ" کا عنوان دیکر موضوع بحث بنا لیا۔

تواضع اور تحمل مرحوم کے دو ایسے وصف تھے کہ مخالف سے مخالف شخص بھی ان کا گہرا نقش لئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کا اقتدار پاکستان کی تاریخ کا طویل ترین اقتدار تھا' جس کا بیشتر حصہ نہایت وسیع اختیارات کے ساتھ گذرا ہے' لیکن ان وسیع اختیارات نے ان کی گردن میں کبھی تناؤ پیدا نہیں کیا' وہ ہر شخص سے نہایت انکساری کے ساتھ پیش آتے' اور کسی بھی مرحلے پر اپنی بڑائی کا اظہار کرنے کا کوئی شائبہ ان کے انداز و ادا سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

ان پر ان کے سامنے سخت سخت تنقید کی جاتی' لیکن وہ کبھی اس کا برا نہ مناتے' ٹھنڈے دل سے ہر ایک کی بات پوری توجہ کے ساتھ سنتے' اور اپنی یا سرکاری اقدامات کی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کر لیتے تھے' سخت سے سخت مصروفیت کی حالت میں بھی کبھی مخاطب کو اس بات کا احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ جلدی میں ہیں' اور اس کی بات سننا نہیں چاہتے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کوئی شخص بات کرتا تو جب

تک وہ از خود فارغ نہ ہو جائے، آپ اس کی طرف برابر متوجہ رہتے تھے۔ ایک مصروف آدمی کے لئے بلند اخلاق کا یہ طرزِ عمل بہت اونچائی کی بات ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اپنی زندگی میں صرف چند آدمی ہی ایسے دیکھے ہیں جو اکثر اوقات اس سنت پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ان چند انسانوں میں سے ایک صدر مرحوم جنرل محمد ضیاء الحق شہید بھی تھے۔

وہ ان تھک کام کرنے کے عادی تھے، بسا اوقات رات کو دو دو بجے تک کام کرتے رہتے، اور تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے چہرے پر کبھی تھکن، گھبراہٹ یا جھنجلاہٹ کا دور دور نشان نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بجائے انھیں ہمیشہ نہایت پرسکون اور تروتازہ پایا۔

مرحوم اے کے بروہی صاحب کہا کرتے تھے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے پاس انرجی کا کوئی محفوظ خزانہ ہے۔" اور واقعۃً ان کے حالات کو دیکھ کر بروہی صاحب مرحوم کی یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی تھی۔ یوں تو گیارہ سال میں اس کے بہت سے واقعات دیکھے، لیکن صرف ایک واقعہ بطور مثال ذکر کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ مغرب کے وقت میرے پاس ان کا فون آیا، انھوں نے فرمایا کہ کل کابینہ کے اجلاس میں بعض مسوداتِ قانون زیرِ بحث آ رہے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ کابینہ کی آخری منظوری کے وقت آپ موجود ہوں، تاکہ شرعی نقطۂ نظر سے ان کے بارے میں رائے دے سکیں۔ اس لئے اگر آپ کل صبح راولپنڈی تشریف لا سکیں تو بہت اچھا ہو۔ میں نے عرض کیا کہ وہ مسودات اپنی آخری شکل میں میں نے دیکھے نہیں ہیں، اور دیکھے بغیر رائے دینا مشکل ہوگا، انھوں نے کہا کہ وہ مسودات آج ہی رات میں آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ آپ سفر سے پہلے اور سفر کے دوران انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سن کر میں نے ہامی بھر لی۔ رات کو ایک بجے مسودات میرے پاس پہنچے۔ صبح پانچ بجے میں گھر سے روانہ ہوا۔ اور نو بجے راولپنڈی پہنچا، اور ایئرپورٹ سے سیدھا کابینہ کے اجلاس میں چلا گیا جو میرے پہنچنے کے وقت تک شروع ہو چکا تھا۔ اس وقت سے شام ساڑھے پانچ بجے تک ان مسودات پر بحث ہوتی رہی، درمیان میں ظہر اور عصر کی نمازوں کا وقفہ ہوا، دوپہر کا مختصر کھانا بھی اجلاس کے دوران میز پر

ہی ہوا۔ بالآخر نماز عصر کے بعد کی نشست میں ان مسودات پر بحث مکمل ہوئی تو صدر مرحوم نے فرمایا کہ "اب ہمارے سامنے کچھ دوسرے موضوعات ہیں' ہم نے آپ کا بہت وقت لیا' اب اگر آپ تشریف لے جانا چاہیں تو تشریف لیجائیں"۔

میں جب اٹھ کر جانے لگا تو مرحوم اپنی عادت کے مطابق پورچ تک چھوڑنے کے لئے آئے' اور کہنے لگے کہ اگر آپ آج رات پنڈی ہی میں ہوں تو مجھے کچھ اور باتیں بھی آپ سے کرنی ہیں' میں نے عرض کیا کہ میں رات رہ کر انشاء اللہ کل صبح واپس جاؤں گا۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ "پھر اگر آپ رات کو نو بجے میرے گھر پر زحمت فرمائیں تو اچھا ہو' میں نے وعدہ کر لیا' اور روانہ ہو گیا۔ بے خوابی اور مسلسل کام کی وجہ سے میں تو بہت تھک چکا تھا' اس لئے نماز مغرب کے بعد اچھی طرح آرام کیا۔ پھر نماز عشاء کے بعد ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہو کر نو بجے سے ذرا پہلے آرمی ہاؤس پہنچ گیا۔

صدر مرحوم کے اے ڈی سی نے استقبال کیا' اور بتایا کہ صدر صاحب ابھی تک کابینہ کے اجلاس میں مشغول ہیں' اور ان کا فون آیا تھا کہ آپ آئیں تو آپ کو بٹھالوں' صدر صاحب کو چند منٹ کی تاخیر ہو جائیگی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اجلاس کو تقریباً بارہ گھنٹے ہو چکے تھے' تھوڑی دیر بعد صدر صاحب کی گاڑی پورچ میں آکر رکی' اور وہ گاڑی سے اتر کر سیدھے میرے پاس کمرہ انتظار میں پہنچے' دیکھا تو بارہ گھنٹے کے طویل اجلاس کے بعد بھی وہ اس طرح ہشاش بشاش اور تازہ دم تھے کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی غسل خانے سے نکل کر آئے ہیں۔ آتے ہی انہوں نے تاخیر کی معذرت کی' اور اپنے ساتھ اپنے کمرہ ملاقات میں لے گئے' نوکروں سے کہا کہ گھر میں کہہ دیں کہ کھانے پر انتظار نہ کریں' اور کھانا یہیں لے آئیں۔ اس کے بعد نہایت اطمینان و سکون سے بہت سے امور پر تقریباً ساڑھے دس بجے تک مجھ سے بات کرتے رہے۔ میں ساڑھے دس بجے رخصت ہونے لگا تو دیکھا کہ تین حضرات ابھی کمرہ انتظار میں ملاقات کے منتظر ہیں۔ اے ڈی سی نے بتایا کہ ملاقاتوں کے بعد وہ تنہائی میں کام کریں گے' پھر ٹیلی فونوں کا جواب دیں گے' اور رات دو بجے کے قریب تہجد کی نماز پڑھ کر سوئیں گے' اور فجر کے لئے پھر اٹھ جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں بزرگوں کی خدمت و صحبت اور ان سے دعائیں لینے کا بھی خاص ذوق عطا فرمایا تھا' احقر کے مرشد و مربی عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی قدس

سرہ کی حیات میں جب کبھی میری ملاقات ہوتی تو حضرتؒ کا حال ضرور پوچھتے۔ انہیں سلام کہلاتے اور دعا کی درخواست کرتے۔

صدارت کے زمانے میں جب مرحوم کی پہلی صاحبزادی کا نکاح ہوا تو جناب مولانا ظفر احمد صاحب انصاری کے ذریعے حضرتؒ کی خدمت میں پیغام بھجوایا کہ "میرا نکاح حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا تھا۔ میرے بھائی کا نکاح حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے پڑھایا، اور اب میری خواہش ہے کہ میری لڑکی کا نکاح بھی حضرت تھانویؒ ہی کے کوئی خلیفہ پڑھائیں، اس لئے اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو حضرت نکاح پڑھانے کو منظور فرمالیں۔" حضرتؒ نے فرمایا کہ "اتنی ساری نسبتوں کے بعد میں کیسے انکار کروں؟" چنانچہ حضرتؒ نے نکاح پڑھانا منظور فرمالیا۔ اس سفر میں برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم اور احقر کو بھی حضرتؒ کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا۔

جب طیارہ راولپنڈی پہنچا تو صدر مرحوم خود پروٹوکول اور سیکیورٹی کے انتظامات سے بے نیاز جہاز کی سیڑھیوں پر حضرتؒ کے استقبال کے لئے موجود تھے، اور حضرتؒ کی تشریف آوری پر احسان مندی کے جذبات سے بچھے جاتے تھے۔ جہاز ہی سے حضرتؒ کو گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہوئے۔ راستے میں مختلف باتوں کے دوران عرض کیا کہ "حضرت! میرا دل تو یہ چاہتا تھا کہ آپ میرے گھر پر قیام فرمائیں، (مرحوم صدارت کے زمانے میں بھی ایوان صدر کے بجائے اپنے آرمی ہاؤس میں ہی آخر تک قیام پذیر رہے) لیکن پھر میں نے آپ کے قیام کے لئے ایوان صدر کو اس لئے ترجیح دی کہ اس کو برکت حاصل ہو"۔ یہ کہہ کر حضرتؒ کو ایوان صدر میں ٹھہرایا، اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ "سفر میں تعب ہو گیا ہو گا" آپ کچھ دیر آرام فرمالیں، عشاء کے بعد میں آکر نکاح کے لئے آپ کو لے جاؤں گا۔"

عشاء کے بعد پھر آئے، اور حضرتؒ کو اپنے مکان پر لے گئے، جہاں نکاح ہونا تھا۔ نکاح کی مجلس ان کے ڈرائنگ روم میں منعقد ہوئی۔ وہاں صوفے ہٹا کر فرشی نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ نکاح کی مجلس انتہائی سادہ اور مختصر تھی، مشکل سے بیس پچیس آدمی ہوں گے جن میں گھر کے افراد کے علاوہ ملتان میں حضرت تھانوی قدس سرہ کے خلیفہ حضرت حاجی محمد شریف صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جناب مولانا ظفر احمد انصاری، دو تین علماء، دو تین وزراء اور فوج کے چند اعلیٰ افسران شامل تھے۔ دو گاڑیوں پر حضرت ڈاکٹر صاحبؒ اور حضرت

حاجی صاحبؒ تشریف فرما تھے اور سامنے باقی لوگ بیٹھے تھے۔ صدر مرحوم انہی لوگوں کے درمیان ایک عام آدمی کی طرح با ادب بیٹھے رہے۔ نکاح کے بعد ڈاکٹر صاحب قدس سرہ نے اپنی عادت کے مطابق نصیحتیں شروع فرما دیں، اور تقریباً گھنٹہ بھر تک یہ محفل حضرتؒ کی مجلس ارشاد میں تبدیل ہو گئی۔

اسی دوران اسی کمرے میں فرش پر کھانے کے لئے دسترخوان بچھائے گئے، وہیں پر کھانا ہوا، کھانے کے بعد پھر حضرتؒ کے مواعظ کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے بعض وجوہ سے اسلامی نظریاتی کونسل سے استعفاء دے دیا تھا (جس کی وجوہ البلاغ کے اسی دور کے کسی شمارے میں تفصیل سے شائع ہو چکی ہیں) اس موقع پر صدر مرحوم نے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ سے عرض کیا کہ "مولانا تقی عثمانی صاحب نے اسلامی نظریاتی کونسل سے استعفاء دے دیا ہے، اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے کونسل کو ان کی ضرورت ہے، آپ ان سے فرمائیں کہ یہ دوبارہ کونسل کی رکنیت قبول کریں۔" حضرتؒ نے برجستہ جواب دیا کہ "انہوں نے میرے مشورے سے استعفاء دیا ہے، اور میں ہرگز ان سے نہیں کہوں گا کہ یہ دوبارہ رکنیت قبول کریں۔" صدر صاحب نے وجہ پوچھی تو حضرتؒ نے فرمایا کہ "جو قوانین یہ مرتب کرتے ہیں، آپ کی کابینہ ان میں ایسی تبدیلیاں کر دیتی ہے جو شریعت کے مطابق نہیں ہوتیں۔" صدر صاحب اس پر کچھ اپنی مجبوریاں پیش کرتے رہے، لیکن حضرتؒ نے انہیں تسلیم نہ کیا، بالآخر طویل ردوقدح کے بعد حضرتؒ نے فرمایا "اگر اس قسم کی کوئی عملی مجبوریاں ہوں تو آپ کو چاہئے کہ وہ کونسل کے علم میں لائیں تاکہ کونسل ان مجبوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی شرعی حل تجویز کر سکے۔" صدر صاحب نے اس کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ "جب بھی کونسل کی سفارشات کابینہ میں زیر بحث آئیں گی، تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان کی آخری منظوری سے پہلے ان سے مشورہ کیا جائے گا" پھر کہنے لگے کہ "حضرت! انشاء اللہ ہم اپنی غلطیوں کا بوجھ ان پر نہیں ڈالیں گے۔"

یہ کہہ کر حضرتؒ نے اجازت دے دی، میں اس پورے عرصے میں خاموش تھا، اگرچہ جس بنیادی وجہ کی بنا پر میں نے استعفاء دیا تھا (یعنی فرقہ وارانہ بنیاد پر پبلک لاء میں تفریق) اس میں اب خاصی تبدیلی آ چکی تھی، لیکن کئی سال کونسل میں شب و روز کی دماغ سوزی کے بعد میں اپنے ذہن کو کونسل سے یکسو کر چکا تھا اور یہ ارادہ کیا تھا کہ کوئی ضابطے کی ذمہ داری

قبول کئے بغیر نفاذ اسلام کی جدوجہد میں جو خدمت بن پڑیگی' وہ ادا کرتا رہوں گا' لیکن کونسل کی رکنیت قبول نہیں کروں گا) اس لئے اب دوبارہ اس طرف لوٹنا مجھے بہت شاق معلوم ہو رہا تھا' لیکن حضرتؒ کی ایماء دیکھی تو خاموش ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا' صدر صاحب نے حضرتؒ کی طرف سے رضامندی کا اشارہ پایا تو میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "بس فیصلہ ہو گیا' مبارک ہو۔"

اتفاق سے اس واقعے کے کچھ عرصے کے بعد ملک میں یہ مطالبہ زور پکڑ گیا کہ وفاقی شرعی عدالت میں علماء کو بطور جج مقرر کیا جائے۔ اس موقع پر صدر مرحوم کی رائے بدلی' اور انہوں نے کونسل کے بجائے مجھے وفاقی شرعی عدالت کا جج مقرر کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ میں اگرچہ وفاقی شرعی عدالت میں علماء کے وجود کو نہایت ضروری سمجھتا تھا' لیکن خود یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا' جس کی بہت سی وجوہ تھیں۔ چنانچہ شروع میں احقر نے حتمی طور پر معذرت کر دی' لیکن صدر صاحب کا اصرار جاری رہا' اور بالآخر اس معاملے میں بھی جیت انہی کی ہوئی' (جس کی تفصیل اس وقت موضوع سے خارج ہے) اور میں کونسل کے بجائے وفاقی شرعی عدالت اور پھر سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ میں پہنچ گیا۔

اس واقعے کے کئی سال بعد صدر مرحوم بنگلہ دیش کے دورے پر گئے ہوئے تھے' ایک روز مغرب کے بعد انہوں نے ڈھاکہ سے مجھے فون کیا' اور کہا کہ میری ایک دوسری لڑکی کی شادی ہونے والی ہے' پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی میری خواہش ہے کہ نکاح حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ پڑھائیں' لیکن مجھے اندازہ نہیں ہے کہ حضرتؒ کی صحت اس کی اجازت دیگی یا نہیں؟ میں اپنی خواہش کے باوجود حضرتؒ پر عذر کرنے میں تکلف ہو' اس لئے آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اگر حضرتؒ کی صحت متحمل ہو' اور طبیعت پر ذرا بھی بار ہو تو عذر فرما دیں' ایسی صورت میں میری طرف سے اصرار بالکل نہیں ہے' میں ایک گھنٹہ بعد پھر فون کر کے جواب معلوم کرلونگا۔

میں نے حضرتؒ کو فون کر کے صدر مرحوم کی بات من و عن نقل کر دی' حضرتؒ نے ان کی اس رعایت مزاج کو پسند فرمایا' اور فوراً بلا تأمل منظوری دیدی۔ چنانچہ جب ایک گھنٹے بعد صدر صاحب کا دوبارہ فون آیا تو میں نے حضرتؒ کی طرف سے منظوری نقل کر دی' جس پر وہ بہت خوش ہوئے' اور اس کے بعد براہ راست حضرتؒ سے فون پر گفتگو کی۔

اس سفر میں احقر حضرتؒ کے ساتھ نہ جا سکا' البتہ برادر محترم مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مد ظلہم اور حضرتؒ کے پوتے ساتھ گئے۔ پھر ایک ہفتے بعد صدر صاحب کے صاحبزادے کا نکاح بھی حضرتؒ ہی نے پڑھایا۔

ان تمام مواقع پر انہوں نے حضرتؒ کے ساتھ صرف نیاز مندانہ نہیں' خادمانہ معاملہ فرمایا' یہاں تک کہ حضرتؒ کے جوتے سیدھے کرنے میں بھی وہ ہم اور دوسرے خدام سے پہل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

مرشدی حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب مد ظلہم العالی پاکستان تشریف لاتے تو عموماً آپ کا قیام لاہور میں ہوتا تھا۔ صدر مرحوم اہتمام کے ساتھ زیارت اور دعائیں لینے کے لئے حضرت مد ظلہم کی خدمت میں جاتے تھے۔ اسی طرح ملتان کے حضرت حاجی محمد شریف صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ بھی نہایت نیاز مندانہ تعلق رکھتے تھے۔ غرض بزرگوں کی زیارت و خدمت کا انہیں خاص ذوق تھا۔

احقر لکھنے پڑھنے کے مشغلے کی وجہ سے طبعاً عزلت پسند واقع ہوا ہے' روابط بڑھانے کے فن سے قطعی نا آشنا ہے' جن لوگوں سے از خود کوئی تعلق پیدا ہو جائے' وہاں بھی جلد بے تکلف ہونے کی عادت نہیں' صدر مرحوم سے پہلی ملاقات ۱۹۷۷ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل جدید کے بعد اس کے افتتاحی اجلاس میں ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً ڈھائی سال تک میں کونسل میں رہا' اس دوران کونسل کے چیئرمین یا دوسرے ارکان کے ہمراہ بارہا کونسل کی سفارشات کے سلسلے میں ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ مختلف اجلاسات میں بھی ساتھ رہا' صدر مرحوم نے مجھ سے کئی بار کہا بھی کہ آپ جب چاہیں' کسی معاملے میں مجھ سے ملاقات کر لیا کریں' لیکن میں نے اس پورے عرصے میں ان سے کبھی علیحدہ ملاقات کی کوشش نہیں کی' اور جو بات کہنی ہوتی' اجتماعی ملاقاتوں ہی میں کہہ دیا کرتا تھا۔

بالآخر جب ملک میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر پبلک لاء میں تفریق کا سنگین خطرہ پیدا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ اپنی بساط کی حد تک صدر مرحوم کو اس معاملے کی سنگینی سے آگاہ کرنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ کونسل سے مستعفی ہو جاؤں' چنانچہ میں نے استعفا دے دیا۔

اس موقع پر احقر کے مخدوم بزرگ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب

مد ظلہم العالی نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں احقر کو یہ مشورہ دیا، بلکہ تاکید فرمائی کہ ملک میں نفاذ شریعت کی جو جدوجہد شروع ہوئی ہے، اس میں حتی المقدور حصہ لیتا رہوں۔ اس مکتوب کے مندرجہ ذیل فقرے نقل کرنے میں کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالم اسلام کے اہل نظر صدر موصوف کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ مولانا مد ظلہم نے فرمایا:۔

"اس وقت اتنا ضرور لکھتا ہوں کہ آپ اپنی موجودہ ذمہ داری کو کسی طرح ترک نہ فرمائیں۔ آپ کا شریک رہنا بڑے خیر و برکت کا باعث ہوگا اور اس سے توازن و اعتدال برقرار رہے گا۔ اس دائرے کے مرکزی نقطے سے آپ جتنے قریب اور مشوروں میں شریک ہوں، اس میں بالکل تامل نہ کریں۔ میں نے رباط سے لیکر رابطہ تک سب کو دیکھا ہے، مدار علیہ شخصیتوں میں سے کوئی بھی اندر سے ایسا مسلمان نظر نہیں آیا جیسے کہ صاحب موصوف (اپنی تمام کمزوریوں اور خامیوں کے ساتھ)۔ میں چاہتا ہوں کہ علماء کا رول، خاص طور پر آپ کا، اس دائرہ کے اندر وہی ہو جو رجاء بن حیوۃؒ کا سلیمان بن عبد الملک کے دربار میں تھا، اور جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی شکل میں خلیفہ راشد نصیب ہوا، یا کم سے کم وہ ہو جو حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کا اپنے عہد حکومت میں تھا اور جس کا حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں بار بار حوالہ دیتے ہیں۔

"من اگر شیخی کنم ہیچ شیخ در دنیا مریدے نیابد، لاکن مرا کارے دیگر فرمودہ اند۔"

اس کی حضرت مجددؒ تشریح فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اہل اقتدار سے مل کر اور تعلقات قائم کرکے احکام شرعیہ کا اجراء و نفاذ اور بدعات و منکرات کا ازالہ تھا۔"

صدر مرحوم کے بارے میں میری ذاتی رائے بھی قریب قریب وہی تھی جو حضرت مولانا مد ظلہم نے بیان فرمائی، لیکن اس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ میں نے کونسل سے باہر رہ کر ہی مقدور بھر خدمت کا فیصلہ کیا، اور پھر وہ واقعہ پیش آیا جو حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ کے سفر راولپنڈی کے ذیل میں لکھ چکا ہوں۔

اس زمانے میں صدر مرحوم نے مجھے از خود تنہائی میں ملاقات کی دعوت دی، اپنا خصوصی ٹیلی فون نمبر دیا تاکہ وقتاً فوقتاً دینی معاملات کے سلسلے میں ان سے رابطہ ہو سکے۔ اس کے بعد علیحدہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔

احقر نے یہ طے کیا تھا کہ ٹیلی فون پر بات ہو یا ذاتی ملاقات، انشاء اللہ کبھی اپنی، اپنے کسی دوست یا کسی عزیز کی کوئی درخواست لیکر کبھی ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس عزم پر قائم رکھا، اور گیارہ سال کے عرصے میں، ایک عزیز کی حج کی درخواست کے سوا، کبھی کوئی انفرادی مسئلہ میں نے ان کے سامنے پیش نہیں کیا، اور ملاقاتوں کے دوران ہمیشہ دینی معاملات ہی پر بات ہوئی، اور الحمدللہ بہت سے امور میں یہ ملاقاتیں مفید ثابت ہوئیں۔ صدر مرحوم کے عہد کے جن کاموں کا اجمالی تذکرہ پیچھے کیا گیا ہے، ان میں اللہ تعالیٰ نے ان ملاقاتوں کا بھی حصہ لگایا، اس کے علاوہ ان کاموں کے سلسلے میں حکومت کو غلط رخ پر ڈالنے کی بہت سی کوششوں کی مقاومت کا بھی موقع عطا فرمایا۔

مذکورہ اہم اور بنیادی کاموں کے علاوہ نہ جانے کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی تھیں جو صدر مرحوم کو توجہ دلانے سے انجام پا گئیں۔ راولپنڈی میں ایک ملاقات کے دوران میں نے صدر مرحوم سے ذکر کیا کہ کراچی میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے احسانات پاکستان پر اتنے زیادہ ہیں کہ ان سے ہم عمر بھر عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس کے باوجود سرکاری سطح پر ان شخصیتوں کی ناقدری کا حال یہ ہے کہ ان کے مزارات تک کی حفاظت کا آجتک کوئی انتظام نہیں ہے، جب سے ان مزارات پر اسلامیہ کالج تعمیر ہوا ہے، مزار پر حاضری انتہائی مشکل ہو گئی ہے۔ مزاروں کے آس پاس گندگی بھی بہت زیادہ ہے، اور مزار تک پہنچنے کا باہر سے کوئی راستہ نہیں۔

صدر مرحوم نے اس صورت حال پر افسوس کا اظہار کیا، اور کہا کہ واقعی یہ تو بڑے ظلم کی بات ہے کہ ملت کے ایسے محسنوں کے مزارات کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے۔ میں سندھ کے گورنر صاحب سے کہوں گا کہ وہ مزارات کے تحفظ کا مناسب انتظام کریں۔

میں نے عرض کیا کہ "میرے خیال میں تو اتنا کافی نہیں ہو گا" آپ کسی وقت خود مزار پر جا کر صورت حال کا اندازہ کریں، یوں بھی ان حضرات کے مزارات پر حاضری ایک سعادت ہے۔ اس کے بعد موقع پر خود احکام جاری فرمائیں۔

صدر صاحب نے فوراً جواب دیا۔ "بالکل ٹھیک ہے، مجھے کل ہی کراچی جانا ہے، وہاں خود حاضری دونگا اور صورت حال کو دیکھ کر مناسب کارروائی کروں گا۔"

میں اس زمانے میں اسلام آباد میں مقیم تھا۔ اگلے دن اخبارات میں پڑھا کہ صدر

صاحب کراچی ایئرپورٹ سے سیدھے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مزارات پر حاضر ہوئے' فاتحہ پڑھی' اور مزارات کے آس پاس سے گندگی اور ملبہ صاف کر کے مزار کے لئے مستقل راستہ بنانے کے احکامات جاری کئے۔

چند ماہ بعد میں مزار پر حاضر ہوا تو علاقے کا حلیہ بدل چکا تھا۔ دونوں بزرگوں کے مزارات کو کالج سے علیحدہ کر کے ان کے گرد عمدہ چار دیواری تعمیر ہو چکی تھی' باہر سے راستہ بن چکا تھا' دونوں بزرگوں کے اقوال پر مشتمل کتبے دیواروں پر لگائے جا رہے تھے' اور مزارات پر حاضری کا مسئلہ بحمد اللہ حل ہو گیا تھا۔

ایک اور ملاقات میں' میں نے صدر مرحوم سے ذکر کیا کہ میں نے پی آئی اے والوں کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ وہ پرواز شروع سے پہلے سفر کی دعا یعنی سبحان الذی سخرلنا ھذا وما کنا لہ مقرنین الخ پڑھا کریں۔ اس پر پی آئی اے کے متعلقہ ذمہ داروں سے کافی خط و کتابت ہوئی' شروع میں وہ اس تجویز کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ آخر میں آمادگی کا اظہار کر دیا تھا' لیکن اب اس واقعے کو بھی تین سال سے زیادہ ہو گئے ہیں یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ سعودی ایئر لائنز والوں نے یہ آیت پڑھنی شروع کر دی ہے لیکن پی آئی اے میں آج تک شروع نہیں ہوئی' شہید مرحوم نے تجویز کو بہت پسند کیا' اور فوراً اپنے پاس نوٹ کر لیا اس کے کچھ ہی عرصے بعد پی آئی اے میں پرواز سے پہلے یہ آیت پڑھی جانے لگی۔

ہر سال ربیع الاول کے موقع پر اسلام آباد میں سیرت کانفرنس منعقد ہوتی ہے۔ جب میں پہلی بار اس کانفرنس میں شریک ہوا تو دیکھ کر شدید تکلیف ہوئی کہ کانفرنس میں مردوں عورتوں کا مخلوط اجتماع تھا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی پر اجتماع منعقد ہوا اور اس میں آپؐ کے احکام کی اس قدر صریح خلاف ورزی کی جائے؟! احقر واپس چلا آیا' اور آئندہ سال جب کانفرنس دعوت نامہ آیا تو میں نے لکھ کر بھیج دیا کہ مردوں' عورتوں کا مخلوط اجتماع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے' اسلئے میں گنہگار ہونے کے باوجود سیرت کے نام پر ایسے اجتماع میں حاضری سے معذور ہوں۔

خیال یہ تھا کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا؟! اس سے قبل یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ ایک غیر سرکاری کانفرنس ایک ایسے صاحب کے انتظام میں منعقد ہو رہی تھی جو اسلام کے ساتھ اپنے لگاؤ میں خاصے مشہور ہیں' اس میں مخلوط اجتماع کی اطلاع ملی تھی تو وہاں بھی

برادر محترم محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہم اور احقر نے اسی عنوان سے معذرت کرلی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ منتظمین کو یہ "رجعت پسندانہ" بات بہت ناگوار گزری' اور بعض حضرات نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ "اچھا' اب یہ بھی اسلام کے ٹھیکیدار بن گئے"۔

جب ایک غیر سرکاری کانفرنس کے اسلام پسند منتظمین کا رد عمل یہ تھا تو ایک سرکاری کانفرنس کے منتظمین سے کسی بہتر رد عمل کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن میں نے یہ سوچ کر خط لکھ دیا تھا کم از کم اپنا فرض ادا کر دیا جائے' اور منتظمین کو یہ محسوس تو ہو کہ کچھ لوگ اس بنا پر عذر کر سکتے ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ وزارت مذہبی امور کے بعض افسران نے میرا یہ خط شہید مرحوم صدر ضیاء الحق صاحب کے پاس بھیج دیا۔ صدر مرحوم نے یہ خط پڑھ کر احکام جاری کر دیے کہ آئندہ سیرت کانفرنس میں مردوں عورتوں کا مخلوط اجتماع نہ کیا جائے۔ ان احکام کی اطلاع ان خواتین کو ہوئی جو ہر سال سیرت کانفرنس میں آیا کرتی تھیں تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا۔ اور اس سلسلے میں خواتین کے وفود صدر صاحب سے ملے۔ بالآخر صدر مرحوم نے مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ اجتماعات کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اب اسی پر عمل ہوتا ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کسی خاص معاملے میں مرحوم سے کوئی بات کہنی شروع کی تو اندازہ ہوا کہ انہیں پہلے سے اس کا احساس ہے۔

تقریباً دو سال کی بات ہے کہ میں سوڈان گیا ہوا تھا' جس روز کراچی واپس آیا' اسی دن اخبار میں دیکھا کہ ایک مقامی ہوٹل میں (غالباً اٹھارہ انیس سال تک کے) لڑکوں اور لڑکیوں کے مقابلہ صحت و خوبصورتی کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ محسوس یہ ہوا کہ پاکستان میں مقابلہ حسن کی تیاری اور اس کا مقدمہ ہے۔ اسی دن اس ہوٹل کے پاس سے گزرنا ہوا تو وہاں بینر بھی لگے ہوئے تھے جس سے اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ برادر محترم مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مد ظلہم نے اس کے خلاف بیان بھی دیا تھا۔ منتظمین کی طرف سے اس کے جوابات بھی دیے گئے مگر پروگرام جوں کا توں رہا۔ پاکستان جیسے اسلامی ملک میں ایسے مقابلے منعقد کرنے کی جرأت ایسی وحشت ناک خبر تھی کہ میں بے چین ہو گیا' لیکن اس اجتماع میں صرف ایک دن باقی تھا اور ہاتھ پاؤں مارنے کی گنجائش باقی نہ تھی۔ بالآخر میں نے صدر مرحوم کو فون کیا۔ ان کو فون کرنے کا طریقہ عموماً یہ ہوتا تھا کہ آپریٹر فون کرنے والے کا نام اور نمبر لکھ لیتا تھا' جب

صدر صاحب کو وقت ملتا، وہ وہاں فون کیا کرتے تھے اور چونکہ عموماً وہ رات گئے کاموں سے فارغ ہوتے تھے اس لئے فون کا جواب اکثر رات کو بارہ بجے کے بعد، کبھی ایک بجے، کبھی دو بجے آیا کرتا تھا۔ جو لوگ ان کو فون کیا کرتے تھے، ان کو یہ بات معلوم تھی، اس لئے وہ دیر تک جاگنے کا ارادہ کر کے ہی فون کرتے تھے۔ لیکن اس روز بارہ بجے سے پہلے ہی فون آ گیا۔

صدر صاحب نے علیک سلیک کے بعد پوچھا: "فرمائیے کیسے یاد فرمایا؟" میں نے عرض کیا کہ "میں آج ہی سوڈان سے واپس پہنچا ہوں، اور یہاں آتے ہی ایک اتنی تکلیف دہ بات کی اطلاع ملی ہے کہ اس پر افسوس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔"

ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا، اور اس تکلیف دہ بات کی وضاحت بھی نہیں کر پایا تھا کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔

"مولانا! وہ بات تو ختم ہو گئی۔"

میں نے عرض کیا: "کون سی بات؟"

کہنے لگے: "آپ اسی تقریب کے بارے میں فرمانا چاہتے ہیں جو کل منعقد ہونے والی تھی؟"

میں نے کہا: "جی ہاں" کہنے لگے "میں اسی کو کہہ رہا ہوں کہ وہ ختم ہو گئی۔"

میں نے مزید اطمینان کے لئے تصدیق چاہی کہ: "آج شام تک تو منسوخی کی کوئی اطلاع نہیں تھی؟"

فرمانے لگے: "ہاں مگر اب وہ نہیں ہو گی، آپ بالکل مطمئن رہیے۔"

اس کے بعد وہ سوڈان کے سفر کے بارے میں پوچھتے رہے، اور پھر بات ختم ہو گئی۔ صبح اخبار آیا تو اس میں اس پروگرام کی منسوخی کی خبر موجود تھی۔

غرض اس قسم کی نہ جانے کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں ان سے ملاقات یا گفتگو کے نتیجے میں درست ہوئیں، اور کم از کم یہ بات تو تھی ہی کہ ان سے ملک کے دینی حالات کے بارے میں کوئی بات کہنے میں کوئی تکلف نہیں تھا۔ کوئی بات ان کی رائے کے کتنے خلاف ہو، لیکن وہ اسے ٹھنڈے دل سے سنتے تھے اور دینی معاملات میں اپنی رائے پر ہر حال میں ڈٹے رہنے کا معمول نہیں تھا۔

ان کے یہ محاسن شمار کرنے سے ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ سیاسی اعتبار سے کوئی

آئیڈیل حکمران تھے، نہ خود ان کو کبھی یہ دعویٰ ہوا، اور بلاشبہ ان کے زمانے میں بہت سے سخت قابل اعتراض امور بھی سامنے آتے رہے، جن پر دینی اعتبار سے تنقید ہوتی رہی، بعض دینی معاملات میں محسوس ہوتا تھا کہ خود ان کا ذہن صاف نہیں ہے، بعض اہم معاملات کی طرف سے بے توجہی اور بعض غیر اہم معاملات پر زیادہ توجہ کی بھی شکایت رہتی تھی، اور ان کی بعض پالیسیاں ایسی بھی تھیں جو آج تک سمجھ میں نہیں آسکیں۔ بلکہ میرا معاملہ تو یہ رہا کہ ان سے گفتگو کے دوران زیادہ تر حکومت کے مختلف اقدامات پر تنقید ہی کا پہلو غالب رہتا تھا، لیکن بحمداللہ یہ تنقید خالص دینی نقطہ نظر سے ہوتی تھی اور یہ بات کتنی سخت کیوں نہ ہو، خیر خواہی کے جذبے سے ہوتی تھی۔ اور یہ بات مد نظر رہتی تھی کہ سابق اور آئندہ متوقع حکمرانوں کے مقابلے میں دینی اعتبار سے وہ اس دور میں بہت مغتنم حکمران ہیں، اور محض اس بنا پر ان کے اچھے اقدامات کی مخالفت میں جائز نہیں سمجھتا تھا کہ وہ جمہوری انتخاب کے بغیر برسر اقتدار آئے ہیں۔

ہمارے ملک میں پارلیمانی انداز جمہوریت کو ایک فیشن کے طور پر آئیڈیل نظام حکومت قرار دے لیا گیا ہے، اور ہماری چالیس سالہ تاریخ یہ رہی ہے کہ جو لوگ حکومت میں آگئے، وہ یہ دعویٰ کرتے رہے کہ انہوں نے جمہوریت قائم کردی ہے، اور جو لوگ حکومت سے باہر رہے، وہ اس بات پر احتجاج کرتے رہے کہ جمہوریت کو کچل دیا گیا ہے، اور جب تک وہ برسر اقتدار نہیں آجائیں گے، جمہوریت بحال نہیں ہوسکے گی۔ اسی جمہوریت کو کچلنے کی وجہ سے جس طبقے کو اقتدار سے اتارا گیا، اترنے کے بعد وہی طبقہ پھر جمہوریت پرستوں کے حلقے میں شامل ہوجاتا ہے، اور دوسرے جمہوریت پسند جو کل تک اسے جمہوریت دشمن قرار دیتے آئے تھے، اب جمہوریت کی بحالی کے لئے اسے اپنے سر پر بٹھانے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔

اس سیاسی کھیل سے تو راقم کو کبھی دلچسپی نہیں رہی، لیکن یہ درست ہے کہ صدر مرحوم معروف جمہوری طریقوں سے برسر اقتدار نہیں آئے تھے، بلکہ ان کا برسر اقتدار آنا اس تحریک کا منطقی نتیجہ تھا جو سیاست دان حضرات نے بھٹو صاحب مرحوم کو اتارنے کے لئے چلائی تھی۔ لیکن جتنی "جمہوری حکومتوں" کا اب تک ہم نے تجربہ کیا ہے، صدر مرحوم کی حکومت کا دور بحیثیت مجموعی ان سے زیادہ شریفانہ دور تھا، جس میں سیاسی مخالفین کے

ساتھ اس طرح کا تشدد روا نہیں رکھا گیا جو پچھلی حکومتوں میں عام تھا۔ حکومت اور اس کے اقدامات پر کھلے عام تنقید' بلکہ تنقیص تک' ہوتی رہی' مگر محض اس کی بنا پر کسی کو اپنے انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا گیا' بلکہ سیاسی حریفوں کے لئے کبھی کوئی ثقیل لفظ بھی صدر مرحوم کی طرف سے کم از کم مجھے یاد نہیں۔

ان کے مخالفین نے ان کے خلاف عیب جوئی کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا' لیکن آج تک کوئی شخص یہ الزام عائد نہیں کر سکا کہ انہوں نے اقرباء پروری یا ذاتی زراندوزی کے لئے منصب صدارت کو استعمال کیا۔ ان کے بیٹوں کے نام تک قوم کو ان کی شہادت کے بعد معلوم ہوئے' ان کے بھائی آخر دم تک عام دکان میں ملازمت کرتے رہے۔

تقریباً دو ماہ پہلے کی بات ہے' ایک سفر کے دوران جہاز میں کسٹم کے ایک ڈائرکٹر میرے ہم سفر ہو گئے' گفتگو کے دوران وہ اپنی کچھ مشکلات بیان کرنے لگے کہ ہم اگر اونچے سرکاری افسران یا ارکان پارلیمنٹ کا سامان کبھی کھول کر چیک کرلیں تو ہماری شامت آجاتی ہے' حالانکہ صدر مملکت کے سوا ہمیں قانوناً ہر شخص کے سامان کی چیکنگ کا اختیار حاصل ہے۔ البتہ ملک میں ایک شخص ہے جو غیر ملکی سفر سے واپسی پر اپنے سامان کی چابیاں کسٹم آفیسر کے حوالے کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے' اور وہ ہے صدر ضیاء الحق۔ وہ چیکنگ سے مستثنیٰ ہونے کے باوجود کہہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی سامان ڈیوٹی کے لائق ہو تو میرے اے ڈی سی سے وصول کرلینا اور ایک مرتبہ اس نے اپنے ہم سفروں کے سامان کی چیکنگ کی بھی ہدایت کردی تھی تو اس روز تقریباً دس بارہ عدد ایسے تھے جن کو کسی نے اپنی ملکیت تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

مرحوم نے اگرچہ ٹیلی فون کے ذریعے گفتگو اور شخصی طور پر ملاقات کے ایسے مواقع فراہم کر رکھے تھے جو طویل رسمی طریق کار سے مبرا تھے' لیکن میں نے ان کو شدید دینی ضرورت کے سوا کبھی استعمال نہیں کیا۔ چنانچہ ان سے شخصی ملاقاتیں بہت زیادہ نہیں ہوئیں' ان کے ساتھ جو حالات و واقعات گزرے' ان سب کی تفصیل اور ان پر تبصرہ اس وقت مقصود نہیں' اس وقت اجمالی طور پر ان کے محاسن اور اپنے ان جذبات کا اظہار مقصود تھا جو ان کی زندگی میں کبھی ذکر کرنے کا موقع نہیں ملا۔

ان سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب انہوں نے شریعت آرڈی نینس کے

سلسلے میں مشورے کے لئے اسلام آباد آنے کی دعوت دی' اس موقع پر دو دن تقریباً پورے کے پورے ان کے ساتھ آرڈی نینس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو میں گزرے۔ اگرچہ بے شمار اندرونی اور بیرونی مسائل کی وجہ سے ان پر اس زمانے میں کام کا بہت دباؤ تھا' لیکن وہ حسب معمول صبح نو سے شام تک پوری یکسوئی کے ساتھ شریعت آرڈی نینس پر بحث میں مصروف رہے۔ بحث کی تکمیل کے بعد دوسرے حضرات آرڈی نینس کی تبییض کے انتظار میں ایک دن مزید رکے' لیکن میں بعض مصروفیات کی بنا پر دو روز بعد صدر صاحب سے اجازت لے کر چلا گیا۔ چلتے وقت حسب معمول وہ دروازے تک پہنچانے کے لئے آئے' شریعت آرڈی نینس کے بعد بعض دوسرے امور کے لئے بھی مختصر مشورہ کیا' اور فرمایا کہ میں ان معاملات کو بھی آخری شکل دینا چاہتا ہوں' اور اس کے لئے آپ کو پھر زحمت دینا چاہوں گا۔ میں نے ہامی بھرلی' لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ ان کے ساتھ آخری ملاقات ہے' اور اب اسلام آباد آنے کی "زحمت" دو کسی اور عنوان سے دینے والے ہیں۔

۳ر محرم/۱۷ اگست کو مغرب کے بعد میں گھر آیا تو میرے بھتیجے مولوی زبیر اشرف سلمہ نے بتایا کہ "ناظم آباد سے ایک خاتون کا فون آیا تھا' وہ روتی ہوئی یہ خبر دے رہی تھیں کہ صدر ضیاء الحق صاحب کسی طیارے کے حادثے میں شہید ہوگئے ہیں۔" دل پر ایک دھکا سا لگا' لیکن اس قسم کی خبریں پہلے بھی کئی مرتبہ اڑ چکی تھیں' خبر کا ذریعہ بھی کچھ مستند نہ تھا' میں نے دل ہی دل میں خبر کی تردید کی کوشش کی' مگر زبیر میاں نے کہا "میں نے جنگ کے دفتر میں فون کیا تھا' انہوں نے بتلایا کہ ہمارے پاس بھی اس قسم کی اطلاعات آئی ہیں' مگر ہم ابھی تصدیق کر رہے ہیں"۔ پانچ دس منٹ بعد ریڈیو کی خبریں ہونے والی تھیں' آٹھ بجے ریڈیو کھولا تو پہلی ہی خبر دل چیرتی چلی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

گیارہ سال کے دوران مرحوم کی دعوت پر یا ان کے چھیڑے ہوئے کاموں کے سلسلے میں شاید سینکڑوں بار اسلام آباد جانا آنا ہوا' لیکن ۷ محرم/۲۰ اگست کی صبح اسلام آباد کا سفر کچھ عجیب و غریب کیفیت کا حامل تھا۔ جہاز میں اور بھی بہت سے لوگ شہید مرحوم کے جنازے میں شرکت کے لئے جا رہے تھے' میں برادر محترم حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ کے ہمراہ تھا' لیکن راستہ بھر ایک سوگوار سکوت طاری رہا۔ اسلام آباد اترے تو وہاں بھی ماحول انتہائی اداس تھا۔

ہم نے پہلے صدر مرحوم کے اہل خانہ کی تعزیت کے لئے ان کے گھر جانا چاہا، لیکن وہاں ایک عجیب عالم نظر آیا۔ مکان کے ایک دروازے پر غریب اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس خواتین کا ایک انبوہ جمع تھا، اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا، دوسرے دروازے پر مردوں کا یہی عالم تھا، اور آنے جانے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی معلوم ہوا کہ میت ابھی ابھی گھر پہنچی ہے، اس لئے اندازہ ہوا کہ اندر گھریلو ماحول ہوگا، ہم نے اس موقع پر اندر جانا مناسب نہ سمجھا اور قیامگاہ پر آگئے، لیکن راستے بھر لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ کھڑے دیکھے جو شاید اس انتظار میں کھڑے تھے کہ میت یہاں سے گزرے گی۔

نماز جنازہ فیصل مسجد میں ہوئی تھی، خیال یہ تھا کہ ہجوم خاصا ہوگا، اس لئے ہم کافی پہلے راولپنڈی سے روانہ ہوئے اور ایئرپورٹ کی طرف سے اسلام آباد جانے والی سڑک پر پہنچے، ابھی مری روڈ تک پہنچنے سے پہلے آدھا راستہ باقی تھا کہ سڑک پر دونوں طرف پیدل چلنے والوں کا ایک نہ ختم ہونے والا ہجوم نظر آیا، یہاں سے فیصل مسجد آٹھ نو میل سے کم نہیں ہوگی لیکن، یہ لوگ تپتی ہوئی دھوپ کی پروا کئے بغیر پیدل لپکے ہوئے جا رہے تھے۔ مری روڈ عبور کرنے کے بعد اس تعداد میں بہت اضافہ ہوگیا۔ اور زیرو پوائنٹ تک پہنچتے پہنچتے گاڑی کا چلنا مشکل ہوگیا۔ یہاں سے چھتوں تک لدی ہوئی بسیں اور ویگنیں بھی ان گنت تعداد میں نظر آنے لگیں۔ اور ابھی فیصل مسجد دو ڈھائی میل دور تھی کہ عام ٹریفک نے لوگوں کو وہیں اتارنا شروع کردیا اور سڑک پر چلنے کی جگہ نہ رہی، ہماری گاڑی رینگ رینگ کر آگے سرکتی رہی، یہاں تک کہ جب ہم فیصل مسجد کے مین روڈ پر پہنچے تو سڑک بالکل بلاک تھی، اور چاروں طرف حد نظر تک انسانی سروں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جس کی انتہا نظر نہیں آتی تھی۔ فیصل مسجد میں عمارت کے اندر ایک لاکھ نمازیوں کی گنجائش ہے، اور اس سے ملحق سبزہ زاروں میں چار لاکھ انسان نماز پڑھ سکتے ہیں اور فیصل مسجد انسانوں کے اس سمندر میں ایک چھوٹی سی عمارت محسوس ہوتی تھی، لہذا حاضرین کا اندازہ دس سے پندرہ لاکھ تک کا تھا۔ یہ بات بھی واضح اور بدیہی تھی کہ ان لاکھوں افراد کو کوئی زمیندار، کوئی صنعت کار یا کوئی حاکم زبردستی یہاں نہیں لایا۔ حکومت کی طرف سے جنازے میں شرکت کے لئے کوئی خصوصی انتظام نہیں تھا۔ فیصل مسجد جیسی دور دراز جگہ تک لوگوں کو پہنچانے کے لئے انتظامات بالکل ناکافی تھے، اگرچہ اس روز بس مالکان نے بسیں کرایہ کے بغیر چلائیں، اور ان

کا کوئی ایسا حصہ جہاں پاؤں رکھنے کی جگہ ہو' خالی نہیں رہا' لیکن یہ تمام بسیں مل کر بھی مجمع کو منتقل کرنے کے لئے ناکافی تھیں' اور ہزاروں افراد تپتی ہوئی دھوپ میں بارہ بارہ پندرہ پندرہ میل سے پیدل چل کر فیض مسجد پہنچے' جن میں بوڑھے' کمزور اور معذور افراد بھی شامل تھے۔

انسانوں کا یہ انبوہ جس کی نظیر میدان عرفات یا کراچی میں امام کعبہ کی نماز جمعہ کے علاوہ مجھے کبھی یاد نہیں' اس ایک شخص کو الوداع کہنے آیا تھا جس کی اپنی کوئی جماعت نہیں تھی' اور جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ عوام اس کے ساتھ نہیں ہیں' یہ سب لوگ کسی ایک لڑی میں پروئے ہوئے نہیں تھے' مگر ان کا نظم و ضبط قابل دید تھا۔ خاموش' پرسکون اور سوگوار' کوئی شور نہیں' کوئی جھگڑا نہیں' کوئی دھکا پیل نہیں' وہاں بے شمار لوگوں نے شہید مرحوم کے ساتھ اپنی محبت و عقیدت کے اظہار کے لئے بینرز اٹھا رکھے تھے' ان میں سے اکثر ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ ان بینروں پر بڑے پر اثر جملے تحریر تھے' اور ایک بینر پر تو ایک شعر میں اس سوگوار فضا کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تھا' اس پر لکھا تھا کہ:

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

ہم نے ہجوم کی وجہ سے نماز جنازہ سڑک پر کھڑے ہو کر ادا کی' نماز کے بعد تدفین کے وقت کسی طرح قبر کے قریب پہنچنے اور مٹی دینے کا موقع ملا۔ جس سے ملو' وہ اداس تھا' بعض ایسے حضرات جو زندگی میں مرحوم کو برا بھلا کہا کرتے تھے' انہیں بچوں کی طرح روتے دیکھا' بہت سے علماء' صحافیوں اور اہل فکر سے ملاقات ہوئی' ان سب کو ہاتھ ملتے ہوئے پایا۔ ایک معروف عالم اور سیاسی رہنما کے الفاظ یہ تھے کہ: "اس قوم نے شاید اس نعمت کی قدر نہ کی' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اس نعمت کے لائق نہیں ہو' اس لئے وہ واپس لے لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو شہادت کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اگر یہ حادثہ کسی تخریب کاری کا نتیجہ تھا' جیسے کہ ظاہر یہی ہے' تو یہ پہلے درجے کی شہادت ہے' جس پر دنیا و آخرت

دونوں میں شہادت کے احکام جاری ہوتے ہیں' ورنہ اخروی احکام کے لحاظ سے تو شہادت میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی حسنات پر بہترین صلہ عطا فرمائے' سیئات کی کامل مغفرت فرمائے۔ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے' اور ملک وملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

صدر مرحوم کی شہادت پر ملک کی تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا۔ اب ملک اور اس کے عوام کے لئے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ مرحوم نے ملک میں نفاذ اسلام کی حرکت کو جس منزل تک بھی پہنچایا تھا' قوم اس کے تحفظ و بقاء اور اس کو آگے بڑھانے کے لئے کیا کرتی ہے؟ مغربی جمہوریت کے راستے سے نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والوں کے خیال میں صدر مرحوم نفاذ اسلام کی راہ کا ایک کانٹا تھے" آج یہ کانٹا نکل گیا' اب ان کے لئے میدان صاف ہے' جن لوگوں کے خیال میں مرحوم نفاذ شریعت کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے' اب یہ رکاوٹ دور ہو گئی' اب ان تمام حضرات پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ زیادہ صحیح' زیادہ مکمل' زیادہ مؤثر طریقے سے ملک میں شریعت نافذ کریں" اور کروائیں۔

اب تک سیاسی جماعتوں کی جدوجہد کا ایک ہی مرکزی نقطہ تھا' اور وہ تھا "صدر ضیاء کو ہٹانا" اللہ نے خود ہی انہیں اس طرح ہٹا دیا کہ کسی جماعت کو ان کے ہٹنے کا کریڈٹ لینے کا موقع نہیں مل سکا۔ بہرحال! اب انہیں کوئی مثبت پروگرام پیش کر کے دکھانا ہو گا کہ ان کی جولانیوں کا میدان صرف نفی ہی نفی نہیں ہے۔

اسی طرح وہ لوگ جو صدر مرحوم کے بارے میں یہ سمجھتے تھے کہ واقعۃً ان کا مشن نفاذ اسلام ہے' اور اسی وجہ سے ان سے محبت رکھتے تھے' اب ان کا بھی یہی فریضہ ہے کہ وہ اس مشن کی تکمیل اور اس کو آگے بڑھانے کی فکر کریں' اور اس جدوجہد کے لئے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کریں۔ اس طرح دونوں قسم کے لوگوں پر اس وقت بہت بھاری ذمہ داری عائد ہو گئی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص کے بغیر عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تاریخ کے اس نازک موڑ پر اس قوم کی دستگیری اور رہنمائی فرمائے' اور اسے وہ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو اس کی رضا کے مطابق ہو اور جس کی ملک وملت کو ضرورت ہے۔

موت و حیات اور سانحات و حوادث اس دنیا کے لوازم میں سے ہیں' کوئی شخص ہمیشہ

دنیا میں نہیں رہ سکتا۔ اگر قوم اپنی تاریخ اور پیش آنے والے واقعات سے سبق لیکر اپنے لئے صحیح راہ عمل طے کرسکتی ہو تو اس قسم کے حوادث اسے ڈگمگانے کے بجائے اس کے لئے مہمیز کا کام کرتے ہیں، اور وہ ان کے ذریعے اپنی جدوجہد کے کچھ اور زینے طے کرسکتی ہے" لیکن اگر خدانخواستہ واقعات سے صحیح سبق لینے کی بصیرت یا حوصلہ نہ ہو تو یہ مستقبل کے لئے شدید خطرے کی گھنٹی ہے، جس کا انجام بڑا ہولناک ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ہولناک انجام سے مسلمانوں کی حفاظت فرمائے آمین ثم آمین۔

ایضاً جلد ۲۳ شمارہ ۲

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھیؒ

مورخہ ۲۳ جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ کو استاذ محترم حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی رحمتہ اللہ علیہ، صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان بھی ہمیں داغ مفارقت دیکر اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ اپنے مخلصانہ دینی جذبے، بے پناہ قوت عمل، دین کیلئے انتھک جدوجہد اور گوناگوں دینی و علمی خدمات کے لحاظ سے ان شخصیات میں سے تھے، جو کسی بھی قوم کیلئے باعث فخر ہوسکتی ہے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں مشاہیر علماء دیوبند سے تعلیم حاصل کی، علوم مروجہ میں پختہ استعداد کے حامل تھے، لیکن ابتداء میں انہوں نے کسی دینی مدرسہ کو اپنا مرکز فیض قرار دینے کے بجائے السنہ شرقیہ کے سرکاری امتحانات کی تیاری کے لئے ایک ادارہ قائم کیا، جو "ادارہ شرقیہ" کے نام سے مدتوں خدمات انجام دیتا رہا اور غالباً یہ السنہ شرقیہ کی تدریس کا ممتاز ادارہ تھا، جس سے شاید ہزارہا لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور عربی، اردو، فارسی کی معیاری تعلیم حاصل کی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد مولانا کے جذبہ فیض رسانی کو یہ ذریعہ ناکافی معلوم ہوا، اور مولانا اس نتیجے پر پہنچے کہ دین کی ٹھوس خدمت کیلئے کسی دینی مدرسہ ہی میں رہ کر روایتی طریقے سے علوم اسلامیہ کی درس و تدریس ضروری ہے۔ چنانچہ مولانا نے بڑی جانی اور مالی قربانیوں کے ساتھ رفتہ رفتہ ادارہ شرقیہ کے کاموں کو سمیٹ کر ہمارے دارالعلوم میں تدریس کے فرائض انجام دینے شروع کردیئے۔

یہ وہ وقت تھا، جب ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں دارالعلوم نانک واڑہ کی قدیم عمارت سے حالیہ جدید عمارت میں منتقل ہوا تھا، اس وقت دارالعلوم کے آس پاس نہ کورنگی کی آبادی تھی، نہ اس کا کوئی تصور، دارالعلوم کی زمین جنگلی جھاڑیوں اور ریتیلے ٹیلوں کے درمیان دو پختہ اور ایک زیر تعمیر عمارت پر مشتمل تھی۔ قریب میں ایک قدیم شرافی گوٹھ کے سوا کوئی آبادی نہ تھی۔ نہ بجلی تھی، نہ پانی، نہ ٹیلیفون اور شہر سے رابطہ کیلئے بس بھی ایک میل کے فاصلے سے ملتی تھی، اور یہ پورا فاصلہ لق و دق صحرا پر مشتمل تھا۔ مولانا کیلئے ادارہ شرقیہ کی

ذمہ داریوں کو یک لخت چھوڑنا ممکن نہیں تھا، اور اس لئے وہ دارالعلوم میں مستقل قیام بھی نہیں فرما سکتے تھے، چنانچہ انہوں نے دارالعلوم میں تدریس کیلئے روزانہ آمدورفت کا سلسلہ شروع کیا۔ شہر سے روزانہ دو بسیں بدل کر لانڈھی پہنچنا اور وہاں سے ایک ڈیڑھ میل کا فاصلہ اس طرح پیدل طے کرنا کہ ساتھ کتابیں بھی ہوتیں، اور چونکہ مولانا چائے اور پان کے نہ صرف عادی، بلکہ بلانوش تھے، اس لئے ساتھ چائے کا تھرماس بھی ہوتا، اور پان کا سامان بھی اور پھر کئی گھنٹے جم کر درس دینا اور بعد میں اسی طرح شہر واپس جانا، اور وہاں جاکر ادارہ شرقیہ کی ذمہ داریاں نبھانا روز مرہ کا معمول تھا، جسے دیکھ کر ہم نوجوانوں کو بھی پسینہ آتا تھا، اور یہ معمول ایک دو دن یا چند ماہ نہیں، مسلسل چار سال تک جاری رہا، اور اس ساری مشقت کے صلے میں مولانا نے کوئی مالی معاوضہ لینا گوارہ نہیں فرمایا۔

برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب اور احقر کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسی زمانہ میں ہم نے دیوان حماسہ حضرت مولانا سے پڑھا۔ مولانا بڑے لطیف ادبی مذاق کے حامل تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے دیوان حماسہ کے درس کی حلاوت ۳۳ سال گزر جانے کے بعد بھی قلب و ذہن میں اسی طرح تازہ ہے اور دیوان حماسہ کے اشعار ان کے مخصوص انداز و آہنگ اور آواز کی اسی گھن گرج کے ساتھ آج بھی کانوں میں گونجتے ہیں، اور بہت سے اشعار کی تشریحات اور اس کے ذیل میں بتائے ہوئے افادات اس طرح یاد ہیں، جیسے کل ہی ان سے یہ درس لیا ہو۔ درس کی یہ تاثیر بہت کم اساتذہ کے حصے میں آتی ہے کہ طالب علم کو سالہا سال گزرنے پر بھی اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہی نہیں، استاد کا لب ولہجہ بھی مستحضر رہ جائے۔

مولانا اپنے حماسہ کے درس میں الفاظ کی لغوی تحقیق اور نحوی ترکیب کے علاوہ شعر کے مختلف ممکن معانی پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے اور اس کے ذیل میں عربوں کی معاشرت، ان کی تاریخ، ان کے عادات و نفسیات، اور بالخصوص جاہلی اور اسلامی عہد کے درمیان پیدا ہونے والے فرق کی ایسی وضاحت فرماتے کہ طلبہ کے سامنے عرب کی خانہ بدوش اور قبائلی زندگی کا نقشہ کھنچ جاتا۔ جاہلیت کی شاعری میں مشاہدہ کی جو قوت اور ذہنوں کی نفسیاتی کیفیت کا جو بے ساختہ بیان پایا جاتا ہے، اس سے خود بھی لطف لیتے، اور پڑھنے والے کو اس لطف میں حصہ دار بناتے، چنانچہ اسی وقت سے حماسہ کے بیشتر اشعار جو مولانا

سے پڑھے تھے، کسی کوشش کے بغیر از بریاد ہو گئے تھے، اور آج بھی جب کبھی وہ اشعار پڑھتا ہوں تو مولانا کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

مولاناؒ بڑے بلند آواز بزرگ تھے، دارالعلوم کی درس گاہوں اور دارالاقامہ کے درمیان کافی وسیع و عریض میدان حائل ہے، اور اس وقت اس میدان میں ٹیلوں اور جھاڑیوں کی بھی کثرت تھی، لیکن ہم دارالاقامہ میں بیٹھ کر درسگاہ سے مولانا کی آواز سنا کرتے تھے، اور اس طرح مولانا کی تشریف آوری کی اطلاع ہو جاتی تھی۔

دارالعلوم کے اس دور افتادہ مقام کا، اور اس بے سروسامانی کے دور میں روزانہ شہر سے آ کر کئی گھنٹے پڑھانا یقیناً مولانا کیلئے ایک شدید مجاہدہ سے کم نہ تھا، لیکن مولانا نے یہ مجاہدہ کئی سال جاری رکھا۔ پھر بالآخر حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ میں جو اب جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کے نام سے معروف ہے، تدریس شروع فرمادی، وہاں پہنچ کر مولانا نے رفتہ رفتہ "ادارہ شرقیہ" کے مشغلہ کو بالکل ختم ہی کر دیا اور ہمہ تن مدرسہ کے ہو کر رہ گئے۔ تدریس کے علاوہ مولانا انتظامی امور میں بھی حضرت مولانا بنوری صاحب قدس اللہ سرہ کے دست و بازو بنے رہے اور جب حضرت مولانا نے مدرسہ سے ماہنامہ "بینات" جاری کیا تو اس کے مدیر اور طابع و ناشر کی حیثیت سے مولانا ہی کو منتخب فرمایا۔

مولاناؒ کے دل میں یہ تڑپ عرصہ سے تھی کہ دینی مدارس جو درحقیقت برصغیر میں اسلام کے قلعوں کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں تعلیم کا نظم و ضبط اور مستحکم اور معیاری ہونا چاہئے اور اس معاملہ میں مختلف مدارس کے درمیان جو تفاوت پایا جاتا ہے اس کو کم کرنا چاہئے۔ چنانچہ جب اس غرض کیلئے وفاق المدارس العربیہ کا قیام عمل میں آیا تو اگرچہ اس تنظیم کے رسمی مناصب پر تو اس وقت کے مشاہیر علماء حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے حضرات فائز رہے، لیکن اس بات کا اعتراف ان سب حضرات نے بارہا کیا کہ عملی طور پر وفاق کے کرتا دھرتا درحقیقت حضرت مولانا ادریس صاحبؒ ہی تھے، ہر تنظیم کی طرح وفاق بھی اپنی ابتداء میں وسائل کی قلت کا شکار تھا، اور مولانا محرری سے لیکر ڈاک کی ترسیل تک کے تمام کام تن تنہا انجام دیتے تھے، اور راتوں کو جاگ جاگ کر

یہ کام تمنا تھے۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد باتفاق آپ ہی کو وفاق المدارس کا صدر منتخب کیا گیا، اور اسی عہدہ پر آپ آخر وقت تک فائز رہے۔

آپ ہی نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں تخصص فی الحدیث کا سلسلہ شروع کیا، اور طلبہ سے مقالے لکھوانے اور ان کے مطالعے وغیرہ کی نگرانی کے فرائض نہایت عرق ریزی سے انجام دیئے۔ اسی دوران جب مرحوم صدر پاکستان محمد ایوب خان کے دور میں ادارۂ تحقیقات اسلامیہ، اسلام آباد اور اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کی تجدد پسندانہ تحقیقات سامنے آئیں، جو درحقیقت تحریف دین کی سرحدوں کو چھو رہی تھیں تو مولانا نے "بینات" میں اس کے خلاف بڑے وقیع علمی مقالے تحریر فرمائے۔ اور ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "السنة ومكانتها في التشريع الإسلامي" کا ترجمہ فرمایا، جو "سنت کا تشریعی مقام" کے نام سے شائع ہوا، اور اس میں سنت کی تشریعی حیثیت کے بارے میں سینکڑوں افراد کے ذہنوں سے شبہات کے کانٹے نکالے۔

حضرت مولانا کو حرمین شریفین کی حاضری کا والہانہ ذوق بھی تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی قابل رشک توفیق بھی تھی، بیس پچیس سال سے ان کا یہ معمول قضا نہیں ہوا کہ وہ رمضان کا عشرہ اخیرہ حرمین شریفین میں گذارتے، اور پھر حج کیلئے دوبارہ تشریف لے جاتے، اس طرح سال میں دو مرتبہ کی حاضری ان کا لازمہ زندگی بن گئی تھی۔

سالہا سال سے ذیابیطس کے مرض کے باوجود ان کی قوت برداشت غیر معمولی تھی، لیکن اب چند سال سے ضعف بے حد بڑھ گیا تھا، چند قدم چلنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود پانچوں نمازوں میں صف اول کی حاضری آخر وقت تک جاری رہی، اور درس کی پابندی بھی آخر دم تک اسی طرح باقی رہی کہ ٹھیک وفات کے دن بھی تفسیر جلالین کا درس دیا، اور آخری آیت جو طلبہ کو پڑھائی وہ تھی:

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ۔

"بیشک نیک لوگ (جنت کی) نعمتوں میں ہوں گے۔"

بس یہی وہ منزل تھی، جس کے حصول کیلئے عمر بھر کی تگ و دو جاری تھی۔ اور اسی پر پہنچ کر قدرت کی طرف سے ان کا کاروان حیات روک دیا گیا۔ بس اس کے چند ہی گھنٹوں بعد

ان کی روح انشاء اللہ جنت کی نعمتوں کی طرف پرواز کر گئی۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے ذمہ دار حضرات نے بڑا مناسب فیصلہ کیا کہ مولانا کی تدفین دارالعلوم کورنگی کے قبرستان میں کی جائے۔ چنانچہ ۲۵ جمادی الثانیہ کی شب میں یعنی شب جمعہ میں مولانا کی نعش مبارک دارالعلوم پہنچی اور اس خاک میں دفن ہو گئی جہاں سے انہوں نے اپنی دینی ادارتی کی زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔

اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ، وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ، ونقہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس۔

البلاغ جلد ۲۳ شمارہ ۷

* * *

آہ! حضرت مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہ

ابھی شہید مرحوم جنرل ضیاء الحق صاحب کا حادثۂ وفات تازہ تھا، اور ان کے بارے میں تفصیلی تاثرات لکھ کر فارغ ہوا تھا، اور وہ زیرِ کتابت تھے کہ ایک اور جانکاہ حادثے کی خبر نے نڈھال کر دیا۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہ (بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک) اس ملک کی ان گرانقدر شخصیتوں میں سے تھے جن کے تصور سے اس ظلمت بھرے دور میں دل کو ڈھارس اور قلب کو تقویت محسوس ہوتی تھی، اور جن کے خیال سے اپنے عہد کے افلاس کا احساس کم ہوتا تھا۔ آج ہم اس بلند پایہ اور دلنواز شخصیت اور ان کی برکات سے بھی محروم ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ کی ذات والا صفات یادگارِ سلف تھی۔ علم و فضل اور طہارت و تقویٰ کے ارفع کمال پر فائز ہونے کے باوجود وہ سادگی اور تواضع و انکسار کا ایسا پیکرِ مجسم تھے کہ عجب و پندار کے اس دور میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ان کا پُر نور چہرہ دیکھ کر اللہ یاد آتا تھا، ان کی صحبت میں رہ کر قلب میں گداز اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی تھی، اور محسوس ہوتا تھا کہ ہم سلف صالحین کے کسی بزرگ کی صحبت سے فیض یاب ہیں۔

طبعی طور پر حضرت موصوف درس و تدریس اور علمی و تبلیغی مشاغل کے بزرگ تھے، سیاست اور اسٹیج کے نہیں۔ لیکن ایک درد مند صاحبِ دل کی طرح ملت کی بہبود کی فکر اور پاکستان میں نفاذِ شریعت کی لگن بھی ان کی حیاتِ طیبہ کا جزو لاینفک بن گئی تھی۔ چنانچہ اسی لگن کی بنا پر انہوں نے اپنا گوشۂ عزلت چھوڑ کر ملک کے سیاسی معاملات میں بھی فعال حصہ لیا، لیکن یہ سب کچھ دین اور صرف دین کیلئے تھا۔

حضرت ایک طویل عرصے تک قومی اسمبلی کے رکن رہے۔ آپ آجکل کی انتخابی سیاست کے داؤ پیچ سے کوسوں دور تھے اور ووٹ حاصل کرنے کیلئے جو ترکیبیں آج کی انتخابی سیاست کیلئے لازمی حیثیت رکھتی ہیں، ان سے بھی آپ کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ لیکن محض اپنے اخلاص، شخصیت اور علم و تقویٰ کی بنا پر آپ اپنے حلقۂ انتخاب میں وہ مقبولیت

عامہ رکھتے تھے کہ پے در پے کئی انتخابات میں آپ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے' اور اپنے مقابلہ بڑے بڑے سیاسی پہلوانوں کو زیر کیا۔ ایک مرتبہ تو صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ بھی آپ کے مقابل میں ناکام ہوا۔

اسمبلی میں آپ کی جدوجہد کا محور بھی صرف دین اور خالصۃً دین رہا' آپ معاصر سیاست کے ان کاموں میں کبھی نہیں الجھے جو اپنی کوشش کے اس بنیادی نقطے سے آپ کو ہٹا سکیں' حق کے اس بندے نے اسمبلی میں ہمیشہ حق کی آواز بلند کی' حق کا ساتھ دیا' اور محض سیاسی بنیاد پر بنی ہوئی دھڑے بندیوں میں اپنے آپ کو ملوث نہیں ہونے دیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ آپ کی شخصیت ان چند گنی چنی شخصیتوں میں سے تھی جن کی مقبولیت اور جن کا حلقہ اثر حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی تفریق سے نا آشنا تھا۔

ملک میں جب کبھی کوئی ایسا مسئلہ پیدا ہوا جس کا تعلق دین سے ہو' حضرت مولاناؒ نے اسمبلی میں اس سے متعلق خالص دینی نقطہ نظر سے اپنا موقف واضح کیا۔ حضرتؒ نے اسمبلی میں جو تقریریں فرمائیں' یا جو تحریکیں پیش کیں' ان میں سے کچھ کا ریکارڈ آپ کے فاضل صاحبزادے جناب مولانا سمیع الحق صاحب نے ایک کتاب میں مرتب فرما دیا ہے جو "قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

حضرتؒ ہمارے ملک میں مسلک علماء دیوبند کے علم برداروں میں سے تھے' اور اپنے عقیدہ و عمل میں پورا رسوخ رکھتے تھے' لیکن اس رسوخ اور تصلب کے باوجود آپ نے کبھی اپنے آپ کو فرقہ واریت میں ملوث نہیں ہونے دیا۔ آپ نے ہر اختلاف کو اختلاف کی حدود میں رکھنے کا وہ معتدل طریقہ اپنایا جو درحقیقت اکابر علماء دیوبند کا بنیادی وصف ہے۔ اپنے مسلک و مشرب کو مضبوطی سے تھامنے کے ساتھ ساتھ دین کے بلند اور مشترک مقاصد کے لئے دوسرے مکاتب فکر سے اشتراک عمل بھی جاری رہا' اور کوئی مخالف سے مخالف شخص بھی آپ پر فرقہ وارانہ تعصب کی تہمت نہیں لگا سکا۔

اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی ذات ملک کے تمام دینی حلقوں کی نظر میں اپنے اخلاص و تقویٰ کی بنا پر ایک محترم مقام رکھتی تھی' اور آپ کی شخصیت پر مختلف مکاتب فکر اور متحارب گروہ جمع ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ حال ہی میں "شریعت بل" منظور کرانے کی جدوجہد کیلئے ملک بھر کے مختلف الخیال عناصر کا جو "متحدہ شریعت محاذ" بنایا گیا' اس کا سربراہ

آپ ہی کو چنا گیا۔ اب ملک کے علماء میں کوئی دوسری شخصیت ایسی نہیں نظر آتی جس پر مختلف مکاتب فکر کے لوگ اس طرح بے کھٹکے متفق ہو جائیں۔

حضرتؒ علمی میدان میں' جو آپ کا اصل میدان تھا' دارالعلوم دیوبند کے اکابر کے علم وفضل کے امین تھے۔ آپ نے اکوڑہ خٹک جیسے دور افتادہ قصبے میں "دارالعلوم حقانیہ" کی بنیاد ڈالی جو رفتہ رفتہ ملک کے ممتاز ترین دینی مدارس میں اعلیٰ مقام کا حامل بنا۔ آپ نے اس دارالعلوم کو خونِ جگر پلا کر پروان چڑھایا' اور آخر وقت تک اس میں درس حدیث کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اسمبلی کی گھمبیر مصروفیات کے عین درمیان بھی تدریس حدیث کا یہ مبارک مشغلہ موقوف نہیں ہوا۔ آپ اکوڑہ خٹک سے اسلام آباد تک کا طویل فاصلہ کار میں' بلکہ بسا اوقات بسوں اور ویگنوں میں طے کر کے اپنے دونوں فرائض بحسن وخوبی نبھاتے رہے' اور اس کام کیلئے بڑھاپے کے دور میں جو مشقتیں آپ نے اٹھائیں' وہ ہم جیسے جوانوں کے لئے حیرت انگیز تھیں۔

آپ کا دورہ حدیث کا درس ملک کے ممتاز ترین دروس میں سے تھا جس میں ہر سال طلبہ کی تعداد سینکڑوں میں ہوا کرتی تھی' چنانچہ آپ کے شاگردوں کا سلسلہ چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا ہے' آپ کے درس ترمذی کی تقریر کا ایک حصہ "حقائق السنن" کے نام سے شائع ہوا ہے' اس سے آپ کے درس کی عظمت' ہمہ گیری اور معیار تحقیق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ تقریر مکمل طور پر شائع ہو جائے تو معلومات کا بیش بہا خزانہ ثابت ہوگی۔

آپ آخر وقت تک اکوڑہ خٹک کے ایک اندرونی محلے میں ایک نیم پختہ سے مکان میں مقیم رہے' اور اسی کے متصل ایک مسجد میں (جہاں ابتداء میں دارالعلوم حقانیہ کا آغاز ہوا تھا) جمعہ کا خطبہ دیتے رہے۔ آپ کا یہ خطبۂ جمعہ بھی انتہائی مفید اور مقبول تھا' اس کا خلاصہ ماہنامہ "الحق" میں ہر مہینے شائع ہوتا رہا ہے۔

جہاد افغانستان شروع ہوا تو ملک کے تمام دینی مدارس میں سے دارالعلوم حقانیہ غالباً وہ پہلا مدرسہ تھا جس کے فضلاء نے حضرت مولاناؒ کے زیر ہدایت اس جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' اور نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔

راقم الحروف کے ساتھ حضرت مولاناؒ کا مشفقانہ تعلق لفظ وبیان سے ماوراء تھا۔ ان کی خدمت وصحبت میں پہنچ کر شفقت پدری کی ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی۔ پہلے پہل احقر کو ان

کی زیارت کا موقع ۱۹۵۱ء میں ملا۔ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے ملک میں اسلامی دستور کے لئے جدوجہد کرنے کی خاطر جمعیت علماء اسلام کو منظم کرنے کیلئے کراچی سے پشاور تک کا طوفانی دورہ کیا' اس دورے میں آپ کے ساتھ حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی شریک تھے' برادر محترم حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہم اور احقر بھی آپ کے ہمراہ رہے۔ اس موقع پر اکوڑہ خٹک میں قیام حضرت مولانا کے مدرسے میں ہوا' وہیں پہلی بار آپ کی زیارت ہوئی' اور پہلی ہی زیارت میں دل پر یہ تاثر قائم ہوا کہ گویا دنیا ہی میں کسی فرشتے کی زیارت ہو رہی ہے۔ سرخ و سفید نورانی چہرہ' چہرے پر بلا کی معصومیت' گفتگو سے پھول جھڑتے ہوئے' انداز و ادا میں وہ نورانیت کہ جیسے اس دنیائے دوں کی آلائشوں سے دامن کبھی آلودہ نہیں ہوا۔ یہ حسین اور منور چہرہ اسی وقت سے دل پر نقش ہو گیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بارہا حضرتؒ کی زیارت و صحبت کے مواقع نصیب فرمائے' اور ہر بار یہ نقش پختہ ہوتا چلا گیا۔ حضرتؒ کے لائق و فاضل فرزند جناب مولانا سمیع الحق صاحب سے احقر کے بے تکلف برادرانہ تعلق کی وجہ سے حضرتؒ اس ناکارہ پر بھی ایسی ہی شفقت فرماتے جیسے اولاد پر ہوتی ہے' اور ان کے سایۂ شفقت میں پہنچ کر دل کو ایک عجیب سکینت نصیب ہوتی تھی۔

علم و فضل کے دریا جذب کر لینے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنے کی البیلی ادا ہمارے بزرگوں کا طرۂ امتیاز رہی ہے' اور یہ وصف حضرت مولاناؒ میں اس درجہ زیادہ تھا کہ بعض اوقات حیرت ہو جاتی تھی' اور مخاطب شرم سے پانی پانی ہو جاتا تھا۔

غالباً ۱۹۷۲ء کی بات ہے' بھٹو صاحب مرحوم کا دور حکومت تھا' اور اسمبلی میں ۱۹۷۳ء والے دستور کا مسودہ زیر بحث تھا۔ حضرت مولاناؒ قومی اسمبلی کے رکن تھے' میرے پاس برادر محترم مولانا سمیع الحق صاحب کا خط آیا کہ حضرت مولاناؒ شرعی نقطۂ نظر سے مسودۂ دستور کا جائزہ لینا چاہتے ہیں' تاکہ اس میں ترمیمات پیش کر سکیں۔ حضرتؒ کا خیال ہے کہ اگر اس موقع پر تم بھی آجاؤ تو یہ کام مل جل کر کر لیا جائے۔ احقر کو یہ غلط فہمی نہیں تھی کہ حضرتؒ کو واقعۃً اس کام کے لئے میری ضرورت ہے' بلکہ زیادہ خیال یہ تھا کہ یہ مولانا سمیع الحق صاحب نے "تقریب بہر ملاقات" پیدا کرنے کا ایک لطیف حیلہ ایجاد کیا ہے۔ لیکن حضرتؒ

کی شفقت سے بہرہ ور ہوتے اور ان کے کسی کار خیر میں برائے نام ہی سہی حصہ لگانے کو سعادت سمجھ کر احقر چلا گیا۔

میں جب اسلام آباد پہنچا تو اسمبلی کا اجلاس جاری تھا' برادر محترم مولانا سمیع الحق کے ہمراہ میں اسمبلی کی گیلری میں چلا گیا جہاں سے اسمبلی کی کارروائی دیکھی جاتی ہے۔ حضرتؒ نے کچھ دیر بعد نیچے سے گیلری کی طرف نگاہ اٹھائی' اور مولانا سمیع الحق صاحب کے ساتھ احقر کو بیٹھے دیکھا تو تھوڑی دیر کیلئے باہر نکل آئے' اور ہمیں بھی باہر آنے کا اشارہ فرمایا۔ ہم باہر پہنچے تو حضرتؒ نے گلے سے لگا لیا اور احقر کو' جو ان کی اولاد اور شاگردوں کے برابر آنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا تھا' خطاب کرتے ہوئے بے ساختہ جو جملہ ارشاد فرمایا' وہ یہ تھا کہ

"حضرت آپ نے بڑی شفقت فرمائی۔"

میں حضرتؒ کے چہرے کو دیکھتا ہی رہ گیا کہ وہ کیا الفاظ کس سے کہہ رہے ہیں؟ لیکن وہاں کسی تصنع یا تکلف کا نام ہی نہ تھا' وہ ایسے انداز سے بات کر رہے تھے جیسے میں نے ان کی خدمت میں حاضری دیکر ان کی کوئی ضرورت پوری کی ہے۔ اللہ اکبر! تواضع کا یہ مقام خال خال ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

الحمد للہ' اس کے بعد بھی بارہا حضرتؒ کی خدمت میں حاضری اور صحبت سے بہرہ ور ہونے کی سعادت حاصل ہوتی رہی اور ہمیشہ "من تواضع للہ ۔۔" کا نظارہ سامنے آیا۔

اب سالہا سال سے ملک میں جب بھی کسی اجتماعی دینی کام کا کوئی تصور کیا جاتا تو سب سے پہلے نظر حضرت مولانا کی طرف جاتی تھی۔ عرصہ دراز سے حضرتؒ علیل چلے آتے تھے اور ضعف وعلالت کے باوجود اپنی غیر معمولی ہمت اور قوت ایمانی سے کام لیکر اپنے آپ کو متحرک اور فعال بنائے رکھتے تھے' لیکن صحت کے انحطاط کو دیکھتے ہوئے یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ کسی بھی وقت داغ مفارقت دے سکتا ہے۔ بالآخر یہ خطرہ اس ماہ حقیقت بنکر سامنے آگیا۔ حضرتؒ اس دنیا کے بکھیڑوں سے فراغت پاکر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ۔ اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

حضرت مولاناؒ اپنی زندگی علم وعمل کے ہر میدان میں قابل رشک طریقے سے گذار گئے' اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ انشاء اللہ ان کی نئی زندگی راحت واطمینان کی زندگی

ہوئی لیکن ان جیسی شخصیات کے اٹھنے سے ہم پسماندگان کے لئے جو عجیب خلا پیدا ہوتا ہے وہ بڑی مشکل سے پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ ان کے تربیت یافتگان بیشمار ہیں، خاص طور پر ان کے فاضل فرزند اور برادر محترم جناب مولانا سمیع الحق صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ان کی خصوصی صحبت و تربیت سے سرفراز فرمایا ہے، وہ عالم شعور میں آنے کے بعد ان کی جدوجہد کے ہر مرحلے میں ان کے دست و بازو بنے رہے ہیں۔ انشاء اللہ وہ ان کی زندگی کے مشن کو جاری و ساری رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی توفیق خاص سے نوازیں، اور ان کے کندھوں پر جو گراں بار ذمہ داریاں آگئی ہیں، ان سے اپنی رضائے کاملہ کے مطابق عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

حضرتؒ کی نماز جنازہ میں شرکت کی خواہش تھی، لیکن اطلاع ایسے وقت ملی کہ میں یہ سعادت حاصل نہیں کر سکا۔ لیکن جو حضرات اس نماز جنازہ میں شریک ہوئے ان کا بیان ہے کہ کسی نماز جنازہ میں علماء کا اتنا بڑا مجمع پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔

الحمد للہ دارالعلوم کے تمام اساتذہ و طلبہ نے اسباق کی تعطیل کر کے نہایت عقیدت و محبت کے ساتھ حضرتؒ کی روح پر فتوح پر ایصال ثواب کا اہتمام کیا۔ قارئین سے بھی درخواست ہے کہ وہ حضرتؒ کے لئے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کو خود اپنی سعادت سمجھ کر اہتمام کریں۔

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
فضل حق تیری لحد پہ رحمت افشانی کرے

مولانا محمد مالک کاندھلوی صاحب ؒ

۱۴ نومبر سے احقر کو پے در پے کئی طویل غیر ملکی سفر پیش آئے۔ میں لیبیا میں تھا کہ میرے پیچھے ملک کے ممتاز اور مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد مالک صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا حادثہ وفات پیش آیا جس کی وحشتناک اطلاع مجھے پاکستان واپس پہنچ کر ملی۔ یہ خبر اتنی غیر متوقع اور ناگہانی تھی کہ شروع میں اس پر یقین نہیں آیا۔ مولانا ماشاء اللہ بڑے صحت مند، چاق و چوبند اور ہشاش بشاش بزرگ تھے، عمر بھی اتنی زیادہ نہیں تھی، اس لئے دور دور تصور نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے رخصت ہو جائیں گے لیکن موت جس کا وقت مخلوق کی تمنا کے حساب سے نہیں، اور طے ہو چکا ہے، ہمارے تصورات اور خواہشات کی پابند نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ وہ علیم و حکیم ذات کرتی ہے جس کی حکمت ہمارے محدود دائرہ فکر سے ماوراء ہے۔ معلوم ہوا کہ وفات بالکل اچانک اور بڑی حیرت ناک ہونے کے باوجود درست ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی برصغیر کے مایہ ناز عالم اور بزرگ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہ کے فرزند ارجمند تھے، اور ان کے علم و فضل کے صحیح وارث۔ احقر نے انہیں سب سے پہلے اس وقت دیکھا جب (تقریباً ۱۳۷۰ھ میں) دارالعلوم نانک واڑہ میں قدوری اور کافیہ وغیرہ پڑھتا تھا۔ مولانا اس وقت حضرت والد صاحب قدس سرہ کی خواہش پر دارالعلوم میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے اور غالباً ابوداؤد یا ترمذی شریف کا درس ان کے سپرد تھا۔ احقر کو ان سے براہ راست استفادے کا موقع تو نہیں ملا لیکن وہ بجائے خود احقر سے بڑے اور احقر کے اساتذہ کے درجے کے تھے۔

دارالعلوم میں ان کا قیام مختصر مدت کے لئے رہا، لیکن ان کی تواضع، اخلاق، خوش مزاجی اور شفقت کا اثر ہمیشہ دل پر نقش رہا۔ اس کے بعد مولانا ٹنڈوالہ یار میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، اور ایک طویل عرصہ تک وہیں درس حدیث دیا۔ بعد میں جب ان کے والد ماجد حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہ کا وصال ہوا تو جامعہ اشرفیہ لاہور میں اپنے والد کی جگہ صحیح بخاری کا درس آپ نے شروع فرمایا جو زندگی کے آخری دور تک جاری رہا۔

آپ کا صحیح بخاری کا درس بڑا مقبول درس تھا۔ ہر سال تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ آپ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہ کی درس حدیث کی مسند کو سنبھالنا کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن حضرت مولانا ؒ نے ٹھوس علمی مذاق اپنے والد ماجد ؒ سے وراثت میں پایا تھا اور ذوق مطالعہ بھی خوب تھا۔ چنانچہ آپ نے درس حدیث کے اس معیار کو بڑی حد تک برقرار رکھنے کی پوری کوشش فرمائی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ دورۂ حدیث میں طلبہ کے رجوع و اقبال میں کوئی کمی نہیں آئی۔

تدریس کے علاوہ اپنے والد ماجد ؒ کی طرح مولانا ؒ کو تصنیف و تالیف کا بھی خاص ذوق تھا آپ کی بہت سی ٹھوس علمی کتابیں آپ کے صدقہ جاریہ کے طور پر باقی ہیں۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہ اپنی حیات میں تفسیر معارف القرآن کی تکمیل نہیں فرما سکے تھے، مولانا ؒ نے ماشاء اللہ اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور تفسیر میں اپنے والد ماجد ؒ کے رنگ کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش فرمائی۔

اس کے علاوہ مولانا کی کتابوں میں "مناہل القرآن" بڑے پائے کی کتاب ہے جسمیں علوم قرآن کے موضوع پر بڑی گراں قدر مباحث اور معلومات جمع فرمائی ہیں اور شاید اردو میں علوم القرآن پر اتنی ضخیم کتاب کوئی اور نہیں ہے اس کے علاوہ "تاریخ حرمین" اور "اصول تفسیر" بھی آپ کی گراں قدر علمی یادگار ہیں جو اپنے اپنے موضوع پر وقیع تصانیف کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے تدریس و تصنیف کے ساتھ ملت کے اجتماعی مسائل کا درد اور ان کے ساتھ خاص شغف بھی عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی آپ نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ آپ صدر ضیاء الحق صاحب شہید مرحوم کے دور میں مجلس شوریٰ اور پھر اسلامی نظریاتی کونسل کے بھی رکن رکین رہے۔ جامعہ اسلامیہ اسلام آباد اور متعدد تعلیمی اداروں کی ذمہ دار مجالس اور نصاب کمیٹیوں کے بھی رکن رہے اور ان تمام حیثیتوں میں دین کی دعوت و اشاعت کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

آپ کے ذہن پر مدت سے اس بات کا تقاضا تھا کہ دینی مدارس کے فضلاء میں ایسے حضرات کی ایک کھیپ تیار کی جائے جو دعوت و ارشاد کی لگن رکھتی ہو اور اس مقدس فریضے کی انجام دہی کے لئے ان ہتھیاروں سے لیس ہو جو اس دور میں ایک داعی حق کے لئے

ضروری ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے شمالی ناظم آباد کراچی میں ایک مستقل ادارہ اپنی عمر کے آخری حصے میں قائم فرمایا۔ جس کا بنیادی مقصد فارغ التحصیل طلبہ کو دعوت وارشاد کی تربیت دینا اور اس سلسلے کی ضروری معلومات سے آراستہ کرنا تھا۔ افسوس ہے کہ ابھی یہ ادارہ اپنے ابتدائی مراحل ہی طے کررہا تھا کہ وہ مولانا کی سرپرستی اور نگرانی سے محروم ہوگیا۔

مولانا بڑے متواضع، منکسر النفس اور شفیق بزرگ تھے۔ آپ کی باتوں میں اپنے والد ماجد کا علمی رنگ جھلکتا تھا۔ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ساتھ خوش طبعی آپ کا خاص وصف تھا۔ آپ علمائے دیوبند کے مسلک اور مزاج پر سختی سے کاربند تھے لیکن فرقہ وارانہ تعصب سے بلند ہوکر دین کے مشترک مقاصد میں وحدت امت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ چنانچہ دوسرے مسلک کے حضرات بھی آپ سے اختلاف رکھنے کے باوجود آپ کے علمی مقام اور دین کے لئے آپ کے خلوص کے قائل تھے۔ عبادات کا بھی اللہ تعالیٰ نے ذوق عطا فرمایا تھا اور علمی و اجتماعی مشاغل کے ساتھ عبادت کا اہتمام قابل رشک حد تک تھا۔

اس دور میں کوئی اجتماعی، علمی یا دینی کام کرنا ہو تو اس کی انجام دہی کے لئے ملک کے گنے چنے لوگوں کی طرف نگاہیں اٹھتی ہیں۔ مولانا انہی میں سے تھے اور اس نازک دور میں ایسی شخصیت کا اٹھ جانا یقیناً امت کا بہت بڑا نقصان ہے۔ ایسا خلا آج کے دور میں مشکل ہی سے پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مکمل مغفرت فرماکر انہیں جوار رحمت میں مقامات عالیہ عطا فرمائیں اور پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائیں۔ آمین۔

البلاغ جلد ۲۳ شمارہ ۶

حضرت مولانا امیر الزمان کشمیریؒ

تقریباً پانچ ماہ ہونے کو ہیں کہ میرے انتہائی شفیق اور محترم استاذ حضرت مولانا امیر الزمان صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ آزاد کشمیر کے علمی اور دینی حلقوں کیلئے تو مولاناؒ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی، پاکستان کے بھی اکثر دینی مدارس میں مولاناؒ اچھی طرح متعارف تھے' اور اپنے مخلصانہ دینی جذبے اور مجاہدانہ خیالات کے لئے مشہور و معروف۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا' اور اسی جذبہ بے تاب کا نتیجہ تھا کہ وہ پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۸ء کے جہاد کشمیر میں بہ نفس نفیس شامل رہے۔ اور جب اس کے بعد حیدر آباد دکن میں انڈیا کی طرف سے پولیس ایکشن ہوا تو وہاں بھی رضاکاروں میں شامل ہوگئے' جنہوں نے نہتے' اور بے سروسامان ہونے کے باوجود انڈیا کے ٹینکوں کی مزاحمت کی تھی۔ آزاد کشمیر کے ایک باشندے کا حیدر آباد دکن جاکر اس جدوجہد میں شریک ہونا جہاد کے گرم جوش جذبے کے سوا اور کس چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟

سقوط حیدر آباد کے بعد مولاناؒ کراچی تشریف لے آئے تھے' اور میرے والد ماجدؒ کے شاگرد ہونے کے ناتے تقریباً روزانہ ہی ان کا ہمارے یہاں آنا جانا رہتا تھا۔ میں اس وقت بچہ تھا' اور قرآن کریم کی تعلیم کے بعد فارسی' عربی تعلیم کا مسئلہ سامنے تھا۔ لیکن اس وقت کراچی میں کوئی ایسا دارالعلوم نہیں تھا جہاں یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ ہم اس وقت آرام باغ کے قریب رہتے تھے' اور حضرت والد صاحب قدس سرہ نے مسجد باب الاسلام میں ایک چھوٹے سے مکتب کی بنیاد رکھی تھی۔ جب مولانا امیر الزمان صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کراچی تشریف لے آئے تو حضرت والد صاحبؒ نے وہاں ابتدائی فارسی عربی کی تعلیم کا آغاز بھی فرما دیا۔ مدرسہ امداد العلوم کے نام سے یہ چھوٹا سا مدرسہ باب الاسلام کے وضو خانے اور چھت پر کام کر رہا تھا۔

اسی زمانے میں میں نے حضرت مولانا امیر الزمان صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے

فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ مولانا سبق بھی بڑے دلنشین انداز میں پڑھاتے، اور ساتھ ساتھ جہاد کشمیر اور حیدر آباد دکن کے واقعات بھی سناتے، اور اسی کا اثر تھا کہ بچپن کے اس عالم میں جہاد کا شوق دل میں پیدا ہوتا چلا گیا۔ اپنی شامت اعمال سے کبھی کسی جہاد میں عملی حصہ لینے کی نوبت تو نہیں آئی، لیکن پانچ وقت کی نمازوں میں یہ دعا ضرور شامل ہو گئی کہ یا اللہ! جہاد کی زندگی اور شہادت کی موت عطا فرما۔

اسی زمانے (۱۹۵۳ء) میں ملک بھر میں قادیانیوں کے خلاف تحریک ختم نبوت شروع ہوئی، مولانا امیر الزمان کشمیری صاحبؒ کے مجاہدانہ جذبے نے اس موقع پر یہ رخ تلاش کر لیا، اور مولانا کراچی کی سطح پر اس تحریک کے روح رواں بنے رہے۔ اس راہ میں چوٹیں کھائیں، زخمی ہوئے اور بالآخر جیل چلے گئے۔ اور اس کے بعد "فتنہ مرزائیت" کے نام سے ردّ قادیانیت پر مفصل کتاب بھی تحریر فرمائی۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ نے نانک واڑہ میں دار العلوم کراچی کی باقاعدہ بنیاد رکھ دی تو جیل سے رہائی کے بعد مولانا نے دار العلوم میں تدریس کی خدمات انجام دینی شروع کر دیں، اسی زمانے میں مختصر القدوری کا ایک معتدبہ حصہ احقر اور برادر مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہم العالی نے حضرت مولانا ہی سے پڑھا۔

کچھ عرصے کے بعد مولانا امیر الزمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے وطن کشمیر چلے گئے، اور وہاں مدرسہ قاسم العلوم کے نام سے ایک مدرسے کی بنیاد رکھی۔ جو ماشاء اللہ تا حال سرگرم عمل ہے۔ کشمیر جانے کے بعد بھی مولانا ہر سال رمضان کراچی میں گذارتے، اور اکثر قیام دار العلوم ہی میں رہتا۔

کشمیر سے بھی خط و کتابت کا سلسلہ رہتا تھا، اور مولانا ملک و ملت سے متعلق مختلف دینی امور میں اپنے مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ احقر کی کوئی تصنیف یا تحریر منظر عام پر آتی تو اس کے بارے میں ہمت افزائی بھی فرماتے، مشورے بھی دیتے، اور مختلف موضوعات پر لکھنے کی طرف متوجہ بھی فرماتے رہتے تھے۔

مولانا اکابر علماء دیوبند کے عاشق تھے، تحریک پاکستان کے سلسلے میں علماء کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہوا، لیکن مولانا اس اختلاف رائے سے بے نیاز اپنے تمام بزرگوں کے ساتھ یکساں عقیدت و محبت رکھتے، اور اگر کبھی کوئی شخص ان حضرات کے بارے میں کوئی

نقل جملہ کہہ دیتا تو مولاناؒ کے جلال و عتاب سے ان کی اس بے لوث اندرونی محبت کا اظہار ہوتا تھا جو انکو علماء دیوبند کیلئے ان کی رگ و ریشے میں سرایت کر گئی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے مولاناؒ کو صبر و شکر کی تصویر بنایا تھا۔ وہ اپنی مجاہدانہ زندگی کے دوران بہت سے سخت مصائب سے دوچار ہوئے، فقر و فاقہ برداشت کیا، مشقتیں جھیلیں، لیکن ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک پر طمانیت تبسم جلوہ ریز دیکھا۔ دینی بحرانوں کے علاوہ مولاناؒ کی نجی زندگی ایک آزمائش سے کم نہ تھی۔ ان کے ایک صاحبزادے کو دودھ پیتے ہی کی عمر میں کوئی بیماری لاحق ہوئی اور غالباً غلط علاج کے نتیجے میں بچے کی ذہنی نشوونما بند ہوگئی، بچے کی جسمانی بڑھوتری بدستور جاری رہی، لیکن ذہنی طور پر دو سال ہی کا بچہ رہا۔ سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد بھی اس کی تمام حرکات و سکنات ایک شیر خوار بچے کی مانند تھیں۔ اپنے جگر گوشے کی یہ ذہنی معذوری مولانا جیسے حساس باپ کے لئے ہر وقت سوہانِ روح تھی، لیکن انہوں نے جس صبر و استقامت کے ساتھ اس المیہ کا سامنا کیا وہ بذات خود ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

چند سال پہلے کچھ لوگوں نے فرقہ وارانہ منافرت کی آگ بھڑکا کر ایک مسجد میں مولاناؒ پر حملہ کیا، اور اسی طوفانِ بدتمیزی میں ایک ضرب مولاناؒ کی آنکھ میں اس طرح لگی کہ آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔ کشمیر اور راولپنڈی سے لیکر کراچی تک ہر مشہور ہسپتال میں اس کا علاج ہوا، کئی بار آپریشن بھی ہوئے، اور کئی کئی مہینے متواتر مولاناؒ ہسپتال میں داخل رہے، لیکن آنکھ کی وہ تکلیف نہ جانی تھی نہ گئی۔ بلکہ اسی دوران دوسری پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں، ذیابیطس کی تکلیف پہلے سے تھی، بار بار کے آپریشنوں نے کمزور بھی بہت کر دیا۔ یہاں تک کہ بالآخر دل کی تکلیف بھی شروع ہوگئی۔ لیکن امراض و آلام کے اس ہجوم میں بھی انہیں کبھی شکایت کرتے تو کیا، گھبراتے بھی نہیں دیکھا۔ جب بھی ملاقات ہوئی احقر کے جواب میں صحت کا مختصر ذکر کرنے کے بعد حسب معمول علمی، دینی اور اجتماعی موضوعات پر بات شروع کر دیتے، اور ملنے والے کو یہ احساس بھی نہ ہونے دیتے کہ وہ کسی شدید تکلیف کا شکار ہیں۔

مولاناؒ سے آخری بار گذشتہ شوال میں مولاناؒ کے بھتیجے مولانا محمد طیب صاحب کے مکان پر ملاقات ہوئی، جہاں وہ بغرضِ علاج مقیم تھے۔ اس مرتبہ آنکھ اور ذیابیطس کے ساتھ شدید اختلاجِ قلب کی شکایت کا اضافہ ہو گیا تھا، لیکن حسبِ معمول چہرے پر تبسم کھلتا رہا، اور وہ مختلف دینی موضوعات پر گفتگو فرماتے رہے۔

میں کسی سفر پر گیا ہوا تھا۔ واپسی پر یہ جانکاہ خبر ملی کہ بالآخر مولانا جہاد زندگی میں سرخرو ہو کر اپنے مالک کے حضور پہنچ گئے' اور ع

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا کا حادثۂ وفات مئی ۱۹۸۹ء میں پیش آیا' لیکن مجھے اس کی اطلاع کافی عرصہ کے بعد ملی' اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ انشاء اللہ انہوں نے تو دنیا کے اس جھنجھٹ سے نجات پا کر ابدی سکینت کی منزل حاصل کرلی' لیکن اس دنیا میں اخلاص' جہد و عمل' ملت کے درد اور صبر و استقامت کے ایسے پیکر کم پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جوار رحمت میں اپنے مقامات قرب سے نوازیں' اپنی رضائے کاملہ سے سرفراز فرمائیں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں۔ آمین

البلاغ جلد ۲۳ شمارہ ۴

میرے مرحوم بھائی جناب محمد رضی عثمانی صاحبؒ

البلاغ کے پچھلے شمارے میں میرے مرحوم بھائی جناب محمد رضی عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حادثۂ وفات کی خبر شائع ہو چکی ہے۔ برادر مرحوم اس وقت ہم چار بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، اور ان کی وفات احقر کے لئے والدین کی وفات کے بعد سب سے بڑا حادثہ ہے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے بھائی کا رشتہ ایسا بنایا ہے کہ اسے عرفِ عام میں قوتِ بازو کہا جاتا ہے، اور اپنا بھائی ہر شخص کو پیارا ہوتا ہے، لیکن برادر مرحوم کے ساتھ احقر کے تعلق کی نوعیت اس سے کہیں زیادہ تھی، اتنی زیادہ کہ اس کی پوری کیفیت کو بیان کرنے کیلئے مجھے کوشش کے باوجود موزوں الفاظ میسر نہیں آرہے۔ چنانچہ دنیا سے ان کے چلے جانے کے بعد اس بھری پری دنیا میں جو مہیب خلا محسوس ہو رہا ہے، اس کو کسی اور تعلق سے پر کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

برادر مرحوم ہم سب بھائیوں میں سب سے زیادہ کم آمیز اور شہرت طلبی کے مواقع سے سب سے زیادہ دور واقع ہوئے تھے، اس لئے بظاہر ان کا حلقۂ تعلقات بھی دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں کم تھا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی ہر دلعزیزی سے نوازا تھا کہ جس شخص سے بھی ان کا تعلق قائم ہوا، وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کی وفات پر ملک اور بیرون ملک سے تعزیتی خطوط اور پیغامات کا جو سلسلہ اب تک جاری ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک کم آمیز اور بظاہر الگ تھلگ ہستی نے کتنے بے شمار دل جیتے ہوئے تھے۔

بھائی صاحب مرحوم کی ولادت دیوبند میں ۱۳۵۰ھ میں ہوئی۔ اس وقت ہمارے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ دارالعلوم دیوبند میں تدریس اور افتاء کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ جس دن بھائی صاحب کی ولادت ہوئی اس روز حضرت والد صاحبؒ دارالعلوم میں سورۂ مریم کی اس آیت کا درس دے رہے تھے جس میں حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے بیٹے (حضرت یحییٰ علیہ السلام) کیلئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی تھی کہ

واجعلہ رب رضیا

"اور میرے پروردگار! اس بچے کو رضی (پسندیدہ) بنایئے گا۔"

اسی درس کے دوران حضرت والد صاحبؒ کو اطلاع ملی کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا عنایت فرمایا ہے۔ اسی وقت حضرت والد صاحبؒ نے ارادہ فرمالیا تھا کہ ان کا نام "محمد رضی" رکھیں گے، چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ کے مشورے سے ان کا یہی نام رکھا گیا۔ پھر حضرت والد صاحبؒ نے اسی آیت سے ان کی تاریخ ولادت نکالی۔ چنانچہ مذکورہ آیت میں "بک" کے اضافے سے برادر مرحوم کی تاریخ ولادت نکل آتی ہے۔

بک ۲۲+ واجعلہ رب رضیا ۱۳۲۸=۱۳۵۰ھ

ہوش سنبھالنے کے بعد بھائی صاحب مرحوم نے ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی۔ قرآن کریم اور ابتدائی اردو دینیات کے علاوہ فارسی اور ریاضی کی معیاری کتابیں وہیں پڑھیں۔ اور ابھی تعلیم کا سلسلہ نامکمل تھا کہ تحریک پاکستان نے زور پکڑا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پاکستان معرض وجود میں آیا، اور حضرت والد صاحب قدس سرہ دیوبند سے ہجرت فرماکر کراچی تشریف لے آئے۔ یہاں اس وقت دینی علوم کی تحصیل کا کوئی معیاری انتظام نہیں تھا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ اپنی اجتماعی مصروفیات میں اس درجہ مشغول تھے کہ نہ ان کے لئے خود پڑھانا ممکن تھا، اور نہ کوئی معاشی مشغلہ اختیار کرنا۔ ہم بھائیوں میں اس وقت برادر مرحوم ہی ایسے تھے جو کوئی معاشی مشغلہ اختیار کرسکتے تھے۔ خود ان کا رجحان بھی تجارت کی طرف تھا۔ حضرت والد ماجد قدس سرہ نے ان سے فرمایا کہ معاشی ضرورت پوری کرنے کے لئے تجارتیں بہت سی ہوسکتی ہیں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم کتابوں کی اشاعت اور تجارت کا سلسلہ شروع کرو۔ اگرچہ اس زمانے میں کتاب کی تجارت کوئی قابل ذکر تجارت نہیں تھی، نہ اس سے کوئی بہت زیادہ نفع کی توقع تھی، لیکن حضرت والد صاحبؒ نے بھائی صاحبؒ کیلئے اس تجارت کا انتخاب اس لئے کیا کہ اس طرح ایک طرف دینی کتابوں اور اہل علم کے ساتھ تعلق برقرار رہے گا، اور دوسری طرف دینی کتابوں کی نشرو اشاعت میں حصہ دار بننے کی سعادت حاصل ہوگی۔ چنانچہ "دارالاشاعت" کے نام سے بھائی صاحبؒ نے ایک تجارتی کتب خانہ قائم کیا جو بحمد اللہ اردو بازار میں اب تک قائم ہے۔

بھائی صاحبؒ اس کے بعد سے پورے استقلال اور استقامت کے ساتھ اس ادارے میں مشغول رہے۔ معاشی اعتبار سے صبر آزما حالات سے بھی دوچار ہوئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے رفتہ رفتہ برکت دی، اور اس ادارے سے انہوں نے تین سو سے زائد دینی کتابیں شائع کیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ ان کیلئے صدقہ جاریہ ثابت ہونگی۔

اگرچہ کتابوں کی نشر و اشاعت اور تجارت کا یہ کام بنیادی اعتبار سے ایک ذریعہ معاش کے طور پر اختیار کیا گیا تھا، لیکن اس ذریعہ معاش کے انتخاب میں دین اور علم دین سے تعلق قائم رکھنا، اور دینی، علمی اور تبلیغی کتب کی خدمت انجام دینا پیش نظر تھا۔ اس لئے بھائی صاحبؒ نے اپنی حد تک اس بات کا پورا اہتمام کیا کہ حتی الامکان صرف صحیح عقیدہ و مسلک کی کتابیں اس ادارے سے شائع ہوں، اور محض تجارتی فائدے کی خاطر ایسی کتابوں کی نشر و اشاعت میں حصہ دار نہ بنیں جو دینی اعتبار سے مضر ہوں۔

دوسری طرف معاملات کی صفائی حضرت والد صاحب قدس سرہ کی تربیت کے اثر سے گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ بحمد اللہ تعالیٰ ان کی تجارت ایک صاف ستھری تجارت تھی جس کا مقصد بھی نیک تھا اور طریق کار بھی۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ سچائی اور دیانت داری کے ساتھ تجارت کے جو فضائل احادیث میں وارد ہوتے ہیں، ان شاء اللہ وہ ان کو حاصل ہوئے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی طبیعت میں نظم و ضبط بھی ودیعت فرمایا تھا، اور مصارف خیر میں کشادہ دلی کے ساتھ حصہ لینے کا جذبہ بھی۔ ہر چیز کے مدات الگ الگ مقرر تھے، اور ہر مد سے اس کی آمدنی کے بقدر اخراجات کا معمول تھا۔ محض ٹیپ ٹاپ اور نمائش و آرائش کیلئے فضول خرچی سے کوسوں دور تھے۔ اسی احتیاط اور نظم و ضبط کی یہ برکت تھی کہ قلیل آمدنی کے زمانے میں بھی مصارف خیر کیلئے ان کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، چنانچہ بحمد اللہ تعالیٰ بہت سے مصارف خیر میں ان کا حصہ ان کیلئے ایک مستقل صدقہ جاریہ ہے۔

آج کے ڈگری زدہ دور میں جہاں انسان کی قابلیت کو کاغذی اسناد کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے، ان کے پاس ڈگری تو کوئی نہ تھی، لیکن وسعت مطالعہ اور بزرگوں کی صحبت کے نتیجے میں ان کی حقیقی قابلیت اچھے اچھے ڈگری یافتہ لوگوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اردو اور فارسی

ادب پر ان کا عبور قابلِ رشک تھا، دینی اور علمی معلومات نہایت وسیع تھیں، اور کسی بھی علمی مجلس میں کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان کے پاس کوئی معروف ڈگری نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عبادت کا بھی ذوق عطا فرمایا تھا، رمضان کی تمام راتیں جاگ کر عبادت میں گزارتے، عام دنوں میں بھی بکثرت تہجد کی توفیق ہوتی۔ حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ حج اور عمرے کے سفر کرنے کے بعد حرمین شریفین کی حاضری کا ایک خاص ذوق پیدا ہو گیا تھا اور شاید دنیا میں کسی بھی چیز کا اتنا شوق نہ ہو جتنا حرمین شریفین کی حاضری کا شوق تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے وسعت عطا فرمائی تو سال میں کم از کم ایک مرتبہ عمرے کیلئے ضرور جاتے۔ تین سفروں میں احقر کو بھی ان کی رفاقت کا موقع ملا، اور ہر مرتبہ اس بات کا مشاہدہ ہوا کہ حرمین شریفین کے قیام کے دوران ان پر محویت کا ایک عجیب عالم طاری ہے۔ وہ بیت اللہ شریف کا طواف کرتے تو ایسا لگتا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ اور وہاں سے واپس آنے کے بعد ان کا محبوب ترین موضوعِ گفتگو وہیں کی باتیں ہوتیں۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ سے انہیں بے حد محبت اور عقیدت تھی۔ اور یہ محبت صرف اس حق کی حد تک محدود نہ تھی جو ایک سعادت مند بیٹے کو اپنے باپ سے ہوتی چاہئے۔ بلکہ اس میں عقیدت و محبت کا وہ رنگ غالب تھا جو ایک طالبِ اصلاح کا اپنے شیخ کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ مجھے روئے زمین پر علم و فضل اور بزرگی و تقویٰ کے لحاظ سے بھی اپنے والد صاحبؒ سے سب سے زیادہ عقیدت ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت والد صاحبؒ سے باقاعدہ اصلاحی تعلق قائم کرنے کی درخواست بھی کی۔ حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ باپ بیٹے کے تعلق میں عام طور سے اصلاحی تعلق کا پورا فائدہ ظاہر نہیں ہوتا، اس لئے کسی اور شیخ سے رجوع کرنا چاہئے، تاہم کسی اور سے تعلق قائم ہونے تک حضرت والد صاحبؒ نے انہیں اصلاحی خط و کتابت کی اجازت دیدی تھی جو انہوں نے جاری رکھی، لیکن حضرت والد صاحبؒ کی وفات سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ابھی انتقال سے ایک ڈیڑھ ماہ پہلے جبکہ وہ کچھ دن سے صاحبِ فراش تھے، ایک روز انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں کسی بزرگ سے باقاعدہ بیعت کی سعادت حاصل نہیں کر سکا، انہیں معلوم تھا کہ احقر نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب رحمۃؒ کی وفات کے بعد

حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب مدظلہم العالی سے اصلاحی تعلق قائم کیا ہوا ہے اور وہ بھی یہ سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن صاحب فراش ہونے کی بنا پر خط لکھنا ممکن نہ تھا، احقر نے ان کی خواہش پر حضرت والا کو عریضہ لکھا اور ان کی طلب کا ذکر کیا تو حضرت والا نے خط کے ذریعے انہیں بیعت فرمالیا۔ حضرت والا کا یہ مکتوب ان کی وفات سے تقریباً دو ہفتے پہلے موصول ہوا، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش بھی پوری فرمادی۔

بھائی صاحب مرحوم کو مجھ ناکارہ سے بچپن کی بالکل ابتداء ہی سے غیر معمولی تعلق تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں تقریباً تیرہ سال بڑے تھے، اور میری شیرخواری کے زمانے میں ان کا محبوب ترین مشغلہ مجھے لئے لئے پھرنا تھا۔ انہوں نے حضرت والد صاحبؒ کے بارے میں "البلاغ" کے مفتی اعظم نمبر میں جو دلچسپ اور سبق آموز مضمون لکھا تھا اس میں بھی اس بات کا اظہار کیا ہے۔ ۱۳۶۳ھ میں برادر مرحوم حضرت والد صاحب قدس سرہ کے ساتھ ڈابھیل گئے تھے، اس سفر کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"ڈابھیل قیام کے دوران حضرت والد صاحبؒ تو شب و روز درس و تدریس میں مشغول رہتے، اور احقر کو اتنا یاد ہے کہ احقر ان دنوں قرآن پاک ناظرہ پڑھتا تھا اور وہیں درجہ قرآن میں داخلہ لے لیا تھا۔ مدرسے سے چھٹی کے بعد احقر اکثر خاموش رہتا تھا۔ نہ کھانے میں دل تھا اور نہ کسی اور کام میں۔ اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آج کے مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ اس وقت دو یا ڈھائی سال کے تھے اور احقر کو ان سے اس قدر محبت اور تعلق خاطر تھا کہ روزانہ چند ایک گھنٹے بھی ان سے علیحدہ رہنا شاق گذرتا تھا۔ چنانچہ ڈابھیل میں بھی ہر وقت بس وہی یاد آتے رہتے، اور جب کچھ اور بس نہ چلتا تو مدرسے کے در و دیوار پر ان کا نام لکھتا رہتا تھا"۔ (البلاغ۔ مفتی اعظم نمبر ص ۲۴۷)۔

تعلق و محبت کا یہ عالم بچپن کے ساتھ خاص نہ تھا۔ بڑے ہونے کے بعد اس میں ترقی ہی ہوتی گئی۔ میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کسی خوشی یا اعزاز کا کوئی واقعہ پیش آتا تو ان کی دلی مسرت کی انتہا نہ رہتی۔ زبان سے اپنے جذبات کے اظہار کا تو زیادہ معمول نہ تھا لیکن ان کی ایک ایک ادا سے ایسا محسوس ہوتا کہ یہ خوشی ان کی ذات کی خوشی اور یہ اعزاز ان کی ذات کا اعزاز ہے۔ احقر کو کوئی تکلیف ہوتی تو یہ معلوم ہوتا کہ جیسے یہ تکلیف انہی کو پہنچی ہے۔ خود غرضی اور نمائش سے بھرپور دنیا میں ایسی بے لوث محبت کی مثال خال خال ہی

کہیں نظر آتی ہے، اور میں اس خوش نصیبی پر جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس جنس نایاب کا حصہ وافر عطا فرمایا۔

بچپن کی اس محبت کا عکس بھائی صاحبؒ کے دل میں آخری لمحات تک منقش رہا، اور بھائی صاحبؒ کے اہل خانہ کا بیان ہے کہ مرض وفات کے دوران غشی کی سی کیفیت میں وہ بسا اوقات احقر کو پکارا کرتے تھے۔

پاکستان آنے کے بعد تقریباً آٹھ نو سال تک ہم سب بھائی حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ رہے، لیکن جب دارالعلوم کی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے برادر مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم اور احقر کو اپنی رہائش دارالعلوم میں منتقل کرنی پڑی تو ہمہ وقت ساتھ رہنے کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ ہمارا اجتماع ضرور ہوتا تھا۔ میں تقریباً تیس سال سے جمعہ کی نماز نسیلہ ہاؤس میں برادر مرحوم کے مکان کے قریب پڑھاتا رہا ہوں، چنانچہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، اور ہم دوپہر کا کھانا ہمیشہ ساتھ ہی کھاتے تھے۔ مجھے بھی پہلے سے اس ملاقات کا انتظار اور اشتیاق ہوتا تھا اور بھائی صاحبؒ بھی جمعہ کے بعد میری آمد کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ عموماً برادر محترم جناب محمد ولی رازی صاحب بھی وہیں تشریف لے آتے۔ جمعہ کے بعد سے عصر تک کا یہ اجتماع نہایت پر کیف ہوتا، اور مجھے یہ محسوس ہوتا کہ ہفتہ بھر کی تابڑ توڑ مصروفیات کے بعد سرور و نشاط کے ان لمحات سے جسم و روح کو نئی تازگی میسر آگئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں باغ و بہار طبیعت سے نوازا تھا۔ شگفتہ مزاجی ان کی سرشت میں داخل تھی۔ ان کے بے ساختہ ظریفانہ جملے خاندان بھر میں مشہور تھے۔ ان ظریفانہ جملوں میں بسا اوقات وہ بڑے کام کی باتیں اور کسی کے غلط طرز عمل پر بڑا لطیف تبصرہ بھی کر جاتے اور سننے والے کو ناگوار بھی نہ ہوتا تھا۔ غرض ان کی مجلس بڑی باغ و بہار مجلس ہوتی تھی جس میں اکتاہٹ کا کوئی گذر نہیں تھا۔

ہمارے سب سے بڑے بھائی جناب محمد زکی کیفی صاحب مرحوم کی وفات کے بعد وہ ہم بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، اور حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد انہوں نے ایک بڑے بھائی کی ذمہ داریاں پورے اہتمام کے ساتھ انجام دیں، اور چھوٹوں کی دلداری کا فریضہ حتی الامکان پوری طرح ادا کیا، لیکن کبھی اپنی بڑائی کا رعب داب قائم کرنے کا تصور

بھی انہیں نہیں آیا۔ اس کے بجائے وہ اپنے چھوٹوں سے ہمیشہ تواضع کے ساتھ پیش آتے، اور ان کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے گھلے ملے رہتے کہ جیسے وہ ان کے ہم عمر یا ان سے بھی چھوٹے ہیں۔ چنانچہ ان سے دل کی کوئی بات کہنے میں کسی کو کوئی تکلف یا حجاب نہیں ہوتا تھا۔

احقر کی عربی تالیف "تکملہ فتح الملہم" کی پہلی جلد جب چھپ کر آئی تو میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کیلئے الفاظ نہیں پاتا تھا کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے حدیث پاک کی اس خدمت کی توفیق بخشی، ورنہ اپنی بساط کو دیکھوں تو اس کام کا تصور بھی میرے لئے مشکل تھا۔ چنانچہ اس کتاب کے چھپنے کی مجھے طبعی طور بہت خوشی ہوئی، اور ایک روز میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر حضرت والد ماجد قدس سرہ بقید حیات ہوتے تو اس کتاب کی اشاعت کی سب سے زیادہ خوشی ان کو ہوتی، اور میں یہ کتاب ان کے پاس لیکر جاتا تو نہ جانے ان کی کتنی دعائیں ملتیں۔

ابھی میں اس خیال ہی میں تھا کہ دیکھا تو برادر مرحوم رحمہ اللہ تعالیٰ گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ آکر بیٹھے اور کہنے لگے کہ "میں نے آج جب "تکملہ فتح الملہم" کی پہلی جلد مطبوعہ شکل میں دیکھی تو اس قدر خوشی ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا، اور ساتھ ہی مجھے یہ خیال آیا کہ اگر حضرت والد صاحب حیات ہوتے تو اس موقع پر وہ بے حد مسرور ہوتے اور یقیناً تمہیں اس خدمت پر انعام دیتے" یہ کہہ کر انہوں نے مجھے پانچ سو روپے نکال کر دیئے اور فرمایا کہ "یہ انعام والد صاحبؒ ہی کی طرف سے ہے"۔ بھائی صاحبؒ کے اس انعام میں کچھ ایسی مٹھاس تھی کہ آج بھی اس کی حلاوت قلب و روح میں محسوس ہوتی ہے، اور واقعۃً مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ انعام مجھے والد ماجد قدس سرہ کی طرف سے ملا ہے۔

"بڑے بھائی" کے مقام کو اتنی باریک بینی کے ساتھ نبھانے کا عالم تو یہ تھا، لیکن دوسری طرف مزاج میں تواضع اس قدر تھی کہ عام طرز عمل میں اپنے آپ کو کبھی بڑا نہیں سمجھا۔ اور یہ یقیناً بڑائی کا وہ درجہ ہے جو بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے، اور اسی بڑائی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں بھائیوں کے درمیان کبھی کوئی تلخی بھی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن احقر کے ساتھ برادر مرحوم کی محبت و شفقت کا یہ عالم تھا کہ بحمد اللہ ساری عمر کبھی کسی ادنیٰ رنجش کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوا۔ یقیناً احقر سے انہیں تکلیفیں بھی پہنچی ہوں گی، لیکن ان کی وجہ سے کبھی کسی ذرا سی ناگواری کا بھی اظہار کبھی نہیں فرمایا۔ دو چار مرتبہ احقر کی کسی غلطی پر شفقت کے

ساتھ متنبہ ضرور کیا، لیکن احقر کے ساتھ تعلق میں تلخی، ناگواری یا رنجش کے الفاظ ان کی لغت ہی سے خارج تھے، اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی کہیں مل سکتی ہیں کہ اٹھاسی سال کے ایسے قریبی تعلق میں کبھی کوئی ناگواری پیدا نہ ہوئی ہو۔

دو تین سال سے میں نے بزرگوں کے ارشاد پر گلشن اقبال کی مسجد البیت المکرم میں جمعہ کے دن عصر سے مغرب تک ایک عوامی درس کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے جس میں پہلے حکیم الامت حضرت تھانوی صاحبؒ کے ملفوظات کچھ تشریح کے ساتھ بیان کرنے شروع کئے تھے، اور اب کچھ عرصے سے "ریاض الصالحین" شروع کی ہوئی ہے۔ یہ بھائی صاحبؒ کی کمال تواضع کا اثر تھا کہ وہ اس درس میں نہ صرف خود شریک ہوتے، بلکہ اپنے تمام گھر والوں کو لیکر جاتے تھے۔ احقر کو اسمیں کافی حجاب بھی معلوم ہوتا تھا، لیکن ان کی دینی طلب کو دیکھ کر مجھے کچھ کہتے بھی نہ بنی۔ جمعہ کے بعد میں ہمیشہ بھائی صاحبؒ کے گھر میں ہی ہوتا تھا، عصر کے وقت ہم ساتھ ہی مسجد البیت المکرم جایا کرتے تھے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک بھائی صاحبؒ بالکل ہی صاحب فراش نہیں ہو گئے۔ بلکہ بیماری کے زمانے میں بھی دو ایک مرتبہ شدید تکلیف کے باوجود تشریف لائے، اور ایک مرتبہ جب مسجد کی سیڑھیاں چڑھنے کی طاقت نہ تھی تو مسجد کے باہر ہی گاڑی میں بیٹھ کر لاؤڈ اسپیکر سے درس سنتے رہے۔

بھائی صاحب مرحوم کی صحت و طاقت ہم بھائیوں میں سب سے اچھی اور قابل رشک تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حسن باطن کے ساتھ حسن ظاہر سے نوازا تھا، لیکن اس دنیا میں کوئی حسن اور کوئی طاقت ایسی نہیں جو کبھی نہ کبھی روبہ زوال نہ ہو۔ پچھلے دو تین سال سے ان کی صحت گرنے لگی تھی، لیکن عمر بھر ان کا معمول یہ رہا کہ وہ اپنی ناسازی طبیعت کو کبھی خاطر میں نہیں لائے، علاج معالجے کی طرف کبھی توجہ نہ کرتے اور اپنے معمولات میں مشغول رہتے۔ چنانچہ مختلف قسم کی تکالیف کے باوجود ان کے نظام زندگی میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں آیا۔ میں جمعہ کے دن حاضر ہوتا تو اسی شگفتگی اور شادابی کے ساتھ ملتے جو ان کی طبیعت کا لازمہ تھا۔

وفات سے تقریباً دس ماہ پہلے ایک جمعہ کو میں ان کے پاس گیا تو انھوں نے ذکر کیا کہ چند روز سے ان کی کمر میں مونڈھے کے نیچے کچھ عجیب جکڑن سی ہے، جو لیٹنے کے وقت زیادہ

ہو جاتی ہے، اور اس کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ شروع میں ہم نے یہ سمجھا کہ شاید یہ کوئی اعصابی قسم کا درد ہے، اور اسی کے مطابق علاج بھی شروع کر دیا گیا۔ اتفاق سے انہی دنوں مجھے امریکہ اور کینیڈا کا سفر پیش آ گیا، اور میں تقریباً دو ہفتے ملک سے باہر رہا۔ دو ہفتے بعد جب میں واپس پہنچا تو معلوم ہوا کہ بھائی صاحب کی تکلیف اس دوران شدت اختیار کر گئی ہے، میرے گھر پہنچنے کے چند ہی گھنٹے بعد بھائی صاحبؒ کے صاحبزادے عزیزم خلیل اشرف سلمہ کا فون آیا تو انہوں نے بتایا کہ اس دوران بھائی صاحبؒ کے متعدد ایکسرے ہوئے ہیں، اور ان کی رپورٹ اچھی نہیں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا کہ رپورٹ سے سینے میں کسی قسم کے غدود کی نشان دہی ہوئی ہے اور ریڈیالوجسٹ نے بائیوپسی (Biopsy) کا تاکید کے ساتھ مشورہ دیا ہے۔ ناگہانی طور پر یہ غیر متوقع خبر سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے یکایک آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہو۔ عزیزم خلیل اشرف سلمہ نے بتایا کہ بھائی صاحبؒ پہلے ہی علاج معالجے سے بیزار ہیں، اور بائیوپسی جیسے عمل کیلئے تیار نہیں، اور وہ کئی روز سے آپ کی واپسی کے منتظر ہیں کہ آپ کے مشورے کے بعد کوئی علاج شروع کیا جائے۔

میں افتاں و خیزاں بھائی صاحبؒ کے پاس پہنچا تو اندازہ ہوا کہ دو ہفتوں میں تکلیف کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ حالت یہ تھی کہ کمر کے درد کی وجہ سے بستر پر لیٹنا ممکن نہ تھا اور وہ چوبیس گھنٹے ایک کرسی پر بیٹھ کر گذار رہے تھے۔ مختلف کرم فرما معالجوں سے یکے بعد دیگرے رجوع کیا گیا، سب نے صورتحال تشویشناک بتائی۔ یہ دن جس پریشانی اور ذہنی کرب میں گذرے، ان کا بیان الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف بھائی صاحبؒ کی تکلیف کی شدت اور دوسری طرف معالجوں کی تشویش، دونوں چیزوں نے مل کر ایسی کرب ناک کیفیت پیدا کر دی کہ مجھے اپنی عمر میں اتنی طویل اور ایسی شدید پریشانی یاد نہیں ہے۔ اس کے بعد بھائی صاحبؒ تقریباً دس مہینے صاحب فراش رہے، اور اس دوران ان پر انواع و اقسام کی تکلیفیں گذریں۔ بائیوپسی کے بعد جو علاج ہوا وہ بھی اتنا سخت اور صبر آزما تھا اس کے جانبی اثرات (Side Effects) کو برداشت کرنا آسان نہ تھا، لیکن آفرین ہے بھائی صاحبؒ کے صبر و استقلال اور استقامت کو، کہ انہوں نے یہ ساری تکلیفیں انتہا درجے کے صبر و ضبط اور تحمل کے ساتھ خندہ پیشانی سے برداشت کیں، اور دس ماہ کے اس طویل عرصے میں کبھی کوئی حرف

شکایت زبان پر نہیں آیا۔ اس کے بجائے ہمیشہ یہی فرماتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ عافیت، راحت اور آرام ہی کے ساتھ رکھا ہے، اگر کچھ دن کیلئے یہ تکلیف آگئی ہے تو کیا ہے؟ اس کے ساتھ راحت و اطمینان کے بے شمار سامان بھی تو ہیں جن پر شکر ادا کرنا چاہئے۔

آخری چند ماہ ایسے گذرے کہ تکلیف کی شدت اور نقاہت کی وجہ سے بھائی صاحبؒ کے لئے بستر پر بھی نقل و حرکت مشکل ہو گئی۔ اس حالت میں بھی نماز وغیرہ کا اہتمام جاری رہا۔ اس کے باوجود اپنے صاحبزادے عزیزم خلیل اشرف سلمہ کو وصیت کی کہ جب سے میری بیماری ہوئی ہے، اس وقت سے نماز کے صحیح طریقے سے ادائیگی کا بھروسہ نہیں ہے، اس لئے اس دن سے حساب کر کے میری نمازوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے۔ اور چونکہ طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے انتظام عطا فرمایا تھا، اس لئے ساتھ ہی یہ تاکید فرمائی کہ اس کام کیلئے ایک لفافہ بنا کر روزانہ کا فدیہ روزانہ اس میں ڈال دیا کرو، تاکہ بہت دن کا فدیہ جمع ہو جانے سے اس کی یکمشت ادائیگی مشکل نہ ہو۔

ایک جمعہ کو میں حاضر ہوا تو مجھ سے فرمایا کہ میں ایک خط اپنے تمام اہل تعلقات کو لکھنا چاہتا ہوں کہ اگر کسی کا کوئی حق میرے ذمے رہ گیا ہو تو یا وصول کر لے یا معاف کر دے، اور چاہتا ہوں کہ دارالاشاعت کی جو تازہ فہرست چھپ رہی ہے، اس میں بھی یہ خط شائع کر دیا جائے، لیکن مجھے لکھنے کی ہمت نہیں، چنانچہ ان کے ایماء پر احقر نے ان کی طرف سے یہ تحریر لکھی جو فہرست کتب میں بھی شائع ہوئی، اور احقر نے اسے "البلاغ" میں اشاعت کیلئے بھی دیدیا، جو پچھلے شمارے میں ان کی وفات کی خبر کے ساتھ ساتھ شائع ہو سکی۔

مرض وفات کی سختیوں کے عین درمیان حقوق کی ادائیگی کی یہ فکر درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور اس کے سامنے جواب دہی کے قوی احساس سے پیدا ہوتی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ انشاء اللہ ان کی یہ بیماری ان کے لئے کفارۂ سیئات اور بلندی درجات کی باعث بنی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اللہ نے انہیں پاک و صاف کر کے اپنے پاس بلایا ہے۔

اللہ نے انہیں حسین و جمیل، متوازن اور تنومند جسم عطا فرمایا تھا، لیکن اس بیماری کے دوران وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک خزاں دیدہ گلاب کی طرح مرجھا گیا تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں نقاہت کے باعث انہیں دیکھ کر پہچاننا مشکل تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں طبیعت کی

جو شگفتگی عطا فرمائی تھی، وہ آخر وقت تک برقرار رہی، اور ان کی لطیف ظرافت سے بھرپور باتیں اس حالت میں بھی جاری رہیں۔

۶ اگست کو مجھے سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ کے اجلاس میں شرکت کے لئے راولپنڈی جانا پڑا۔ ان کو جس حالت میں چھوڑ کر گیا تھا، اس کی بنا پر دل میں دھڑکا تو ہر وقت لگا ہوا تھا۔ لیکن ۱۸ محرم ۱۴۱۱ھ اور ۱۰ اگست ۱۹۹۰ء کی شام کو تقریباً ساڑھے چھ بجے شام عدالت سے فارغ ہو کر اپنے ریسٹ ہاؤس پہنچا تو کراچی سے فون آیا کہ بھائی صاحب دس ماہ کی کشمکش کے بعد اپنی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عموماً اسلام آباد سے کراچی کیلئے آخری پرواز سات بجے شام ہوتی ہے، جس سے کراچی جانے کا وقت نکل چکا تھا، لیکن اللہ کو پہنچانا منظور تھا، اس روز شام ۴ بجے والی پرواز اتنی لیٹ ہوئی کہ رات کو تقریباً گیارہ بجے روانہ ہو سکی، اور میں اس کے ذریعے رات ہی میں کراچی پہنچ گیا۔ ائیر پورٹ سے بھائی صاحبؒ کے مکان پر پہنچا تو وہ اپنے بستر پر سکون سے لیٹے ہوئے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب تمہیں میری تکلیف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اب مجھے چین آچکا ہے۔

اب کیا ستائیں گی ہمیں دوراں کی گردشیں
اب ہم حدود سود و زیاں سے نکل گئے

صبح کو ان کا جنازہ دارالعلوم کے قبرستان میں لایا گیا، یہاں ان کی نماز جنازہ ہوئی، جس میں علماء کرام اور اہل تعلقات کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی۔ بھائی صاحب کو ہماری والدہ ماجدہؒ سے بہت تعلق تھا، اور مرض وفات کے بالکل آغاز میں بھائی صاحبؒ نے یہ خواب بھی دیکھا تھا کہ والدہ صاحبہؒ ان کے آنے کی خوشی منا رہی ہیں، چنانچہ ان کی قبر والدہ صاحبہؒ کے بالکل قریب بنائی گئی تھی۔ ان کے صاحبزادے عزیزم خلیل اشرف سلمہ اور احقر نے انہیں قبر میں اتارا، اور جس باغ و بہار وجود نے آدھی صدی سے زیادہ خاندان بھر کو اپنی شگفتگی سے مہکائے رکھا، آج اسے اپنے ہاتھوں سے یہ کہہ کر سپرد خاک کر آئے کہ۔

اے خاک تیرہ دلبر ما را نگاہ دار

اور ایسا لگا جیسے بھائی صاحب بزبان حال یہ کہہ رہے ہوں کہ ۔

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائینگے اس منزل سے ہم

بھائی صاحبؒ کو ماشاء اللہ اپنے والدین کی خدمت کی بھی بڑی توفیق ملی۔ جنہیں دیکھ کر والدین کی آنکھوں میں ٹھنڈک پڑتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کی برکت سے انہیں اولاد بھی بڑی سعادت مند عطا فرمائی، ان کے تین بچوں میں عزیزم خلیل اشرف سلمہ ان کے اکلوتے صاحبزادے ہیں، اور ماشاء اللہ انہوں نے بھائی صاحبؒ کی علالت کے دوران والد کی خدمت کی ایک مثال قائم کی، انہوں نے جس محبت، عزم و ہمت، سمجھ بوجھ، باریک بینی اور استقامت کے ساتھ بھائی صاحبؒ کی خدمت کی ہے، وہ اس دور میں کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اب انہوں نے ہی "دارالاشاعت" کا کام سنبھالا ہوا ہے، اور بفضلہ تعالیٰ خیر و خوبی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ اللہ ان کی عمر اور علم و عمل میں برکت اور ان کے کاموں میں ہمیشہ آسانی پیدا فرمائیں، اور انہیں صبر جمیل اور اجر جزیل کی نعمت سے نوازیں۔ آمین۔

قارئین البلاغ اور دوسرے اہل تعلقات نے صدمے کے اس موقع پر تعزیت کے تاروں اور خطوط سے احقر، برادر مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم اور عزیزم خلیل اشرف سلمہ کو نوازا، ہم ان کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں، امید ہے کہ تمام حضرات بھائی صاحب مرحوم کو اپنی دعائے مغفرت اور ایصال ثواب میں یاد رکھیں گے۔

حضرت مولانا نجم الحسن تھانویؒ

پچھلے دنوں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی بابرکت مجلس کا ایک اور چراغ یکایک اس طرح بجھا کر بزم اشرفؒ کے خدام میں جن کے لئے یہ حادثہ قطعی طور پر غیر متوقع تھا، صف ماتم بچھ گئی۔ حضرت مولانا نجم الحسن تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ناگہانی وفات کی خبر ان سے تعلق رکھنے والوں کے لئے ایسا حادثہ ہے جس کا زخم مدتوں مندمل نہیں ہو سکے گا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون.

پبلسٹی اور تشہیر کے اس دور میں جو شخصیتیں نام و نمود سے دور رہ کر گوشہ نشینی کے ساتھ خاموش خدمات بجا لاتی ہیں، انہیں دنیا میں اس طرح کی شہرت تو حاصل نہیں ہوتی جیسی ان لوگوں کو ملتی ہے جن کا نام روزانہ اخبارات میں چھپتا رہتا ہے لیکن جس کسی کو ایسی شخصیات کو قریب سے دیکھنے کی لذت و سعادت حاصل ہوتی ہے، ان کے دل پر ایسی شخصیات کے یادوں کے نقوش اول الذکر اشخاص کے مقابلے میں کہیں زیادہ انمٹ، پائیدار اور لازوال ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا نجم الحسن صاحب تھانویؒ اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتے تھے۔

بات یہ نہیں کہ ان کو شہرت اور ناموری کے مواقع ہی میسر نہ آئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو مختلف نسبتیں اور جو خصوصیات عطا فرمائی تھیں، ان کے ذریعے نام و شہرت تک پہنچنا کوئی ایسا مشکل نہ تھا، لیکن بات یہ تھی کہ انہوں نے جس ماحول میں تربیت پائی تھی، وہاں زندگی کا سب سے پہلا سبق یہ تھا کہ۔

دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے

حضرت مولانا نجم الحسن تھانوی صاحبؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی

صاحب تھانویؒ کے بھائی اکبر علی صاحب مرحوم کے نواسے تھے' اور اس لحاظ سے خود حضرتؒ کے نواسے اور نواسے بھی ایسے نہیں کہ حضرتؒ سے صرف رشتہ داری کا برائے نام تعلق رہا ہو' بلکہ پانچ سال سے بائیس سال کی عمر تک گویا حضرتؒ کی آغوش شفقت میں ہی رہے۔ آپ کی پیدائش ۳ فروری ۱۹۲۵ء کو سہارنپور میں ہوئی تھی لیکن کم عمری ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا' اس لئے اپنے ماموں حضرت مولانا شبیر علی تھانوی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی نگرانی میں انہی کے مکان میں مقیم رہے۔ حضرت مولانا شبیر علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت حکیم الامتؒ سے جو نسبی اور روحانی تعلق تھا وہ ظاہر ہے' چنانچہ اس پورے عرصہ میں نہ صرف حضرت مولانا شبیر علی صاحبؒ کی بلکہ خود حضرت حکیم الامتؒ کی تربیت اور سرپرستی کی سعادت انہیں حاصل رہی۔

ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کے بعد دینی علوم کے دوسرے بڑے مرکز یعنی مظاہر العلوم سہارنپور میں آپ نے علوم دین حاصل کئے جہاں حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوریؒ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری قدس سرہ' جیسے اساطین سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ تجوید و قراءت میں حضرت مولانا قاری عبدالمالک صاحبؒ سے کسب فیض کیا اور دورہ حدیث سے فراغت کے بعد مظاہر العلوم سہارنپور میں ماہر اساتذہ کے زیر نگرانی فتویٰ نویسی کی تربیت بھی حاصل فرمائی۔

ظاہری علوم تو بہت سے لوگ حاصل کر ہی لیتے ہیں لیکن اس علم کو کسی شیخ کامل کی صحبت سے صیقل کرنے کی جو ضرورت ہوتی ہے' اس کا موقع آپ کو خوب خوب حاصل ہوا۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی نگاہ فیض کے سائے میں اس طرح نشوونما پائی کہ حضرتؒ کی تعلیمات ہی نہیں' آپ کا انداز زندگی بھی نظر سے لیکر دل و دماغ تک رچ بس گیا۔ حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ حکیم الامتؒ کے اجل خلفاء میں سے بھی تھے اور حضرتؒ کے مزاج و مذاق کے وارث بھی۔ حضرت مولانا نجم الحسن صاحب کو ان کی بھی بھرپور صحبت میسر آئی۔ حضرت مجذوبؒ ایک پرگو شاعر بھی تھے اور جب اپنے اشعار سنانے آتے تو گھنٹوں یہ سلسلہ جاری رہتا۔ حضرت مولانا نجم الحسن صاحبؒ نے ان کی شعر و سخن کی مجلسیں اس طرح دیکھیں کہ وہ گویا اشعار مجذوبؒ کے حافظ ہو گئے۔ چنانچہ خود ان کا حال یہ تھا کہ جب کبھی حضرت مجذوبؒ کے اشعار کا ذکر آجاتا تو ان کے ذہن میں یادوں

کے دریچے کھل جاتے اور وہ بھی گھنٹوں ان کے اشعار اور ان سے متعلق واقعات سناتے رہتے تھے۔

حضرت مولانا نجم الحسن صاحبؒ بذات خود بڑے ستھرے شعری ذوق کے حامل تھے۔ خود بھی کبھی کبھی شعر کہتے اور بڑے دلکش ترنم کے ساتھ سناتے تھے۔ جب ان کے بھائی مولانا شمس الحسن صاحب مدظلہم (خطیب مسجد خضرا کراچی) کا نکاح ہوا تو حضرت مجذوبؒ کی موجودگی میں آپ نے ان کا سہرا ترنم سے سنایا۔ حضرت مجذوبؒ نے بے ساختہ فرمایا۔

کچھ اس انداز سے گاتا ہے تو نجم الحسن! سہرا
کہ گانے لگتا ہے سن کر سراپا ہو کے تن سہرا

قیام پاکستان کے بعد مولانا نجم الحسن صاحبؒ اپنے اہل خانہ کے ساتھ لاہور تشریف لے آئے۔ اس وقت لاہور میں مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ کی ذات مرجع خاص و عام تھی۔ مولاناؒ نے آپ کی مجالس سے بھی سالہا سال استفادہ فرمایا۔ یہاں تک کہ جب حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے جامعہ اشرفیہ سے "انوار العلوم" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری فرمایا تو اس کی ادارت کے فرائض بھی مدت تک مولانا ہی انجام دیتے رہے۔

شروع میں ذریعہ معاش کوئی نہ تھا، پھر آپ یونیورسٹی آف پنجاب کے کانفیڈنشل پریس کے انچارج مقرر ہوئے، اور ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۸ء تک پہلے لاہور، پھر سرگودھا اور بالآخر راولپنڈی میں پنجاب کے تعلیمی اداروں کے خفیہ پریس میں خدمات انجام دیتے رہے اور ۱۹۷۸ء میں ریٹائر ہوئے۔

لاہور میں قیام کے دوران مال روڈ پر مشہور اور عالی شان "مسجد شہداء" تعمیر کرانے میں بھی آپ نے بنیادی کردار ادا کیا اور وہاں ۳۰ سال تک اعزازی طور پر جمعہ کی خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بلکہ جب سرگودھا تبادلہ ہو گیا تب بھی جمعہ کی خطابت کے لئے ہر ہفتے لاہور آنے کا معمول رہا۔

مولاناؒ کا ایک بہت بڑا صدقہ جاریہ "مجلس صیانۃ المسلمین" ہے جو ایک کثیر المقاصد دعوتی انجمن ہے جس کا خاکہ، اغراض و مقاصد، طریق کار سب کچھ حکیم الامت حضرت مولانا

اشرف علی تھانوی قدس سرہ کا تجویز فرمودہ ہے۔ نام بھی حضرتؒ نے ہی تجویز فرمایا تھا لیکن حضرتؒ کی حیات میں یہ جماعت قائم نہ ہو سکی تھی۔ لاہور میں اس مجلس کا کام ابتداء میں تو حضرت حکیم الامتؒ کے خلیفہ حضرت مولانا جلیل احمد صاحب شیروانی قدس سرہ نے شروع فرمایا تھا لیکن ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا نجم الحسن صاحبؒ کو اس کا صدر منتخب کیا گیا اور ان کی صدارت کے زمانے میں مجلس کا کام کافی آگے بڑھا۔ پنجاب کے مختلف شہروں، سندھ اور کراچی وغیرہ میں اسکی شاخیں قائم ہوئیں اور مجلس ایک تخیل سے نکل کر عملی دنیا میں نظر آنے لگی۔ مجلس کے کام کو ترقی دینے میں جہاں جناب مولانا وکیل احمد شیروانی اور جناب مولانا مشرف علی تھانوی صاحب کے نشاط کار کو دخل ہے وہاں حضرت مولانا نجم الحسن صاحب قدس سرہ کی بے لوث قیادت اور ان کی مخلصانہ مساعی نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی وفات سے "مجلس صیانۃ المسلمین" میں اتنا بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ اس کا پُر ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔

راولپنڈی منتقل ہونے کے بعد بھی مولانا کی تبلیغی مساعی مسلسل جاری رہیں۔ یہاں مختلف مقامات پر آپ کے درس قرآن کا سلسلہ جاری تھا جس میں اہل ذوق بڑی دلچسپی سے شریک ہوتے تھے اور اس سے بڑا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ ایک جامع مسجد میں اعزازی طور پر جمعہ کے خطاب کا بھی معمول تھا اور اس طرح نام و نمود سے دور رہتے ہوئے دین کی خدمت و تبلیغ کے کام میں آپ آخر وقت تک مشغول رہے۔

احقر ناکارہ پر حضرت مولانا کی شفقتیں ناقابل فراموش ہیں۔ احقر جب اپنے عدالتی کام کے سلسلے میں راولپنڈی میں مقیم ہوتا تو بارہا آپ سے نیاز حاصل ہوتا اور اس سلسلے کا آغاز بھی انہوں نے خود فرمایا۔ ایک مرتبہ سپریم کورٹ کے ریسٹ ہاؤس میں مولانا کا خود فون آیا کہ میں شام کو ملنے کے لئے آرہا ہوں۔ احقر کو شرمندگی بھی ہوئی کہ پہل مجھے کرنی چاہئے تھی لیکن مجھے مولانا کا پتہ وغیرہ معلوم نہ تھا۔ بہرکیف! مولانا نے کرم فرمایا، تشریف لائے اور پھر عصر سے عشاء تک احقر کو اپنی پرکیف صحبت سے نہال فرمادیا۔ حضرت مجذوبؒ کے اشعار کا سلسلہ شروع ہوگیا اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ راولپنڈی آنے کے بعد مولاناؒ سے نہ مل کر میں کتنی بڑی غلطی کرتا ہوں۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے حسن باطن کے ساتھ حسن ظاہر سے بھی نوازا تھا، وہ نہایت

دلکش، وضع دار، شگفتہ مگر متین شخصیت کے مالک تھے۔ بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے معلوم ہوتے، ادا ادا سے خوش اخلاقی اور تواضع مترشح ہوتی تھی۔ ان کے صاحبزادے نعیم الحسن صاحب کا بیان ہے کہ کبھی کسی بات پر فوراً غصہ نہیں کرتے تھے، غصے پر حیرت انگیز کنٹرول تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ میں غصے میں جو کچھ بھی کہتا ہوں سوچ سمجھ کر کہتا ہوں اور آج تک مجھے کچھ کہہ کر پچھتانا نہیں پڑا۔ کہنے کو یہ ایک معمولی سی بات ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مقام اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس نے مدتوں ریاضت کے بعد اپنے جذبات و خواہشات کو عقل و شریعت کے آگے رام کر لیا ہو۔ وہ خانقاہ تھانہ بھون کا مجسم تذکرہ تھے اور اسی لحاظ سے ان کی ہر محفل سے ہم جیسوں کو بزرگوں کی کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی تھی اور ان کی ہر ملاقات ہمارے لئے باعث فیض تھی۔

مولانا کے ایک بھائی ضیاء الحسن صاحب حیدر آباد میں مقیم تھے، وہاں ان کی ایک دکان تھی جس پر کچھ شقی القلب ڈاکو حملہ آور ہوئے اور وہ ان کی بربریت کا نشانہ بن کر شہید ہو گئے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مولانا کو اس المناک حادثے کی اطلاع ملی تو وہ حیدر آباد پہنچے اور اسی صدمے سے نڈھال کراچی تشریف لائے۔ رات کے کھانے کے بعد انہیں سینے پر کچھ گرانی محسوس ہوئی جو رات دو بجے تک شدت اختیار کر گئی۔ مولانا اپنے داماد مولانا تنویر الحق تھانوی (صاحبزادہ حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانویؒ) کے مکان پر مقیم تھے اور ان کے صاحبزادے نعیم الحسن صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ مولانا کو قریبی ہسپتال میں لے گئے۔ ان کا سانس بے قابو تھا اس لئے انہیں آکسیجن لگائی گئی۔ جس کے فوراً بعد وہ پرسکون ہو گئے۔ تیمارداروں نے ابتداء میں یہ سمجھا کہ تنفس میں سہولت حاصل ہونے سے انہیں آرام ملا ہے لیکن درحقیقت مولانا اس دنیا کے جھنجٹوں سے نجات حاصل کر کے ابدی سکون پا چکے تھے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا کے ایک صاحبزادے حافظ نصیر الحسن صاحب ایم اے تک اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آجکل آسٹریلیا میں ایک اسلامی اسٹڈی سنٹر کے ڈائریکٹر ہیں۔ دوسرے صاحبزادے نعیم الحسن مولانا کے ساتھ راولپنڈی میں مقیم ہیں اور ماشاء اللہ کاروبار کرتے ہیں۔ دونوں صاحبزادے اپنے تدین، خوش اخلاقی اور متانت و شرافت میں ماشاء اللہ اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر ہیں اور مولانا کے حسن تربیت کا نمونہ۔

دلی سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے نوازیں (آمین)

البلاغ جلد ۲۵ شمارہ ۲

مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ
خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

جمعرات ۲۳ رجب ۱۴۱۱ھ کو صبح چار بجے کے قریب اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو دل سہم سا گیا کہ اس وقت آنے والا ٹیلی فون عموماً کوئی خوش گوار خبر لیکر نہیں آتا۔ ڈرتے ڈرتے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف ایک اجنبی سی آواز نے ایک ایسی ناگہانی اور اندوہناک خبر سنائی کہ اس پر یقین کرنا مشکل ہوگیا۔ خبر یہ تھی کہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے مہتمم حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عمر بمشکل باون ترپن سال کی ہوگی، اور وہ آج ہی دوپہر ہمارے دارالعلوم تشریف لا کر برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم سے نہ صرف مل کر، بلکہ دیر تک وفاق المدارس کے بارے میں اہم مشورے کرکے گئے تھے۔ پوری طرح صحت مند، چاق و چوبند اور کسی بھی طرح کی بیماری سے کوسوں دور۔

ٹیلی فون پر جن صاحب نے یہ ناگہانی خبر سنائی تھی، ان سے راقم الحروف واقف نہ تھا، اس لئے دل کو بہلایا کہ شاید کسی نے یہ بے بنیاد خبر ازراہ شرارت دی ہو، اگرچہ لہجے میں کسی شرارت کے بجائے دردمندی کا اسلوب نمایاں تھا جس سے ماتھا تو ٹھنکا لیکن خبر پر یقین کرنے کو ابھی دل نہ مانا۔ اس کے بعد میں نے بنوری ٹاؤن کے مدرسے اور دوسری متعلقہ جگہوں پر خبر کی تصدیق کے لئے فون کئے تو سارے فون مشغول ملے، اور اس سے خبر کی مزید تائید ہوگئی۔ بالآخر نماز فجر کے بعد متعدد ذرائع سے گفتگو کرکے یقین ہوگیا کہ خبر درست تھی، اور مفتی صاحب واقعۃً ہم سے اچانک بچھڑ گئے ہیں۔ اِنّا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ برصغیر کے مشہور عالم و عارف حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کیملپوری قدس سرہ کے فرزند ارجمند تھے، اور شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ کے داماد۔ اس طرح نسب اور مصاہرت دونوں

میں جہتوں سے ان کو بڑی عظیم نسبتیں حاصل تھیں۔ ان کے والد ماجد (حضرت مولانا عبدالرحمٰن کیمبلپوری) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے اجل خلفاء میں سے تھے اور حضرت کے خلفاء میں آپ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے آپ کو بیعت سے پہلے ہی خلافت عطا فرما دی تھی۔

مفتی احمد الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض سے نوازا، اور اس کے بعد حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ سے تلمذ اور استفادے کی دولت عطا فرمائی۔ حضرت بنوری صاحب قدس سرہ کی مسلسل صحبت حاصل ہوئی، یہاں تک کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صاحبزادی کا عقد بھی ان کے ساتھ کردیا۔

آپ نے حضرت بنوری قدس سرہ سے علم حدیث میں استفادے کے علاوہ حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب مدظلہم العالی سے افتاء کی تربیت حاصل کی۔ حضرت مولانا بنوری صاحب قدس سرہ کی حیات طیبہ کے دوران انہوں نے عموماً کم آمیزی کی زندگی گذاری، لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جب مدرسے کے انتظام و اہتمام کی تمام تر ذمہ داریاں ان کے کندھے پر آگئیں تو انہوں نے اپنی زندگی مدرسے اور اسکے متعلقہ امور کے علاوہ دین کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کردی۔

حضرت بنوری قدس سرہ کے علمی و عملی مقام بلند کی وجہ سے ان کے قائم کردہ مدرسے کو اپنے تعلیمی معیار اور وقار کے لحاظ سے دینی مدارس میں ایک امتیاز حاصل تھا، اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اس اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنا آسان نہ تھا، لیکن مفتی احمد الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی متواتر جدوجہد اور انتھک محنت سے مدرسے کو اسی معیار پر قائم رکھنے کی پوری کوشش فرمائی، اور جامع مسجد بنوری ٹاؤن کے علاوہ شہر کے متعدد دوسرے مقامات پر بھی مدرسے کی ایسی شاخیں قائم فرمائیں جو خود مستقل مدارس کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مدرسے کی خدمات کے علاوہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کے اجتماعی امور میں بھی گہری دلچسپی لیتے تھے اور ان کی فعال زندگی دین کے مختلف شعبوں میں گوناگوں خدمات کے لئے وقف ہوگئی تھی۔

آپ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے نائب صدر بھی تھے اور "سواد اعظم اہلسنت پاکستان" کے ناظم اعلیٰ بھی، اور اب حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی قدس سرہ کی وفات کے بعد "وفاق المدارس العربیہ" کے ناظم اعلیٰ کی ذمہ داریاں بھی انہی کے کندھوں پر آگئی تھیں۔ ان میں سے ہر کام ایسا ہے جو ہمہ وقتی توجہات اور مصروفیات کا طالب ہے، لیکن مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی متحرک شخصیت ان تمام ذمہ داریوں کو حسن و خوبی کے ساتھ نبھا رہی تھی۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ان کو ملک اور بیرون ملک طویل سفر بھی پیش آئے، اور اس طرح ان کی خدمات کا دائرہ نہ صرف برصغیر بلکہ افریقہ اور یورپ کے علاقوں تک پھیل گیا۔

مولانا (رحمۃ اللہ علیہ) ایک متواضع، سادہ اور شگفتہ شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے دل میں دین کا درد اور اس کے لئے غیرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنی غیرت ایمانی کی بدولت انہوں نے اپنی ذات کے لئے بڑے بڑے خطرات مول لئے، لیکن جس موقف کو وہ درست سمجھتے تھے، اس سے پیچھے نہیں ہٹے۔ اپنے غیرت دینی کے زیر اثر انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، دشمنیاں بھی مول لیں، لیکن کوئی لالچ یا خوف انہیں اپنے راستے سے نہ ڈگمگا سکا۔

قحط الرجال کے اس دور میں، جب خدمت دین کے ہر شعبے میں مناسب رجال کار کا فقدان ایک خوفناک ملی مسئلہ بن چکا ہے، وہ ان لوگوں میں سے تھے، جنہوں نے بیک وقت بہت سے محاذ سنبھالے ہوئے تھے۔ اور جب بھی ملت اسلامیہ کے مسائل میں کسی اجتماعی کام کی ضرورت پیش آتی، تو مولانا ان حضرات میں سے تھے جن کی طرف پر امید نگاہیں سب سے پہلے اٹھتی ہیں۔ ان کی عمر، صحت، قوی اور چاق و چوبند وجود میں خوردبین لگا کر بھی کسی ایسے اندیشے کا شائبہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ اتنی جلدی داغ مفارقت دے جائیں گے، لیکن قدرت کے فیصلے ہمارے قیاسات، تخمینوں اور خواہشات سے ماورا ہیں۔ اس دنیا میں ہر شخص اپنی زندگی کے گنے ہوئے سانس لے کر آیا ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت اس میں کمی یا اضافہ نہیں کرسکتی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، مفتی صاحب جب بدھ ۱۳ رجب ۱۴۱۱ھ کی دوپہر کو برادر معظم مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم سے ملاقات کے لئے دارالعلوم تشریف لائے تو کسی

کے واہمے میں بھی نہ آسکتا تھا کہ ان کی زندگی کے صرف بارہ تیرہ گھنٹے باقی رہ گئے ہیں، پھر ہسپتال سے واپس جاکر بھی وہ اپنی معمول کی زندگی میں مصروف رہے، یہاں تک کہ رات کے وقت مدرسہ بنوریہ میں مشکوٰۃ شریف کے ختم کی تقریب میں شرکت فرمائی اور وہاں سے ساڑھے نو بجے رات کو اپنے مکان پر واپس تشریف لائے۔ اس وقت بھی کسی کو دور دور اندازہ نہ تھا کہ اب یہ صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔

لیکن رات کو بارہ بجے کے بعد سینے میں درد اور اس کے ساتھ کھانسی کا دورہ شروع ہوا جو ایک دو گھنٹے ہی کے اندر شدت اختیار کر گیا۔ رات کو تین بجے کے بعد انہیں ایمبولینس کے ذریعہ امراض قلب کے ہسپتال لے جایا گیا، لیکن!

علاج درد سے کچھ اور درد بڑھ ہی گیا۔

وہاں پہنچ کر درد و کرب کی شدت میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، معلوم ہوا کہ معالج حضرات نے اپنی فنی مہارت کے تمام راستے اختیار کر لئے اور اپنی طرف سے کسی تدبیر میں کوئی کمی نہیں کی، لیکن!

داعیا دوا والموت حکل طبیب

مولانا کی منزل قریب آچکی تھی، مقدر کے سانسوں کی تعداد پوری ہو رہی تھی جس کے بعد کوئی ڈاکٹر، کوئی حکیم، کوئی سائنس اور کوئی ہنر کام نہیں دیتا۔ کچھ دیر موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد بالآخر وقت موعود آپہنچا اور مولانا ایک ہی جست میں اپنے وطن اصلی تک پہنچ گئے۔

نماز فجر کے بعد مولانا کی وفات کی خبر شہر کے تمام علمی و دینی حلقوں میں پھیل گئی، دارالعلوم اور دوسرے بہت سے مدارس میں اسباق بند کرکے علماء و طلبہ ایصال ثواب میں مصروف ہو گئے، احقر بھی اساتذہ دارالعلوم کے ہمراہ جب مولانا کے گھر پہنچا تو اسی کمرے میں جہاں کبھی حضرت مولانا بنوری صاحب قدس سرہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا کرتا تھا، مولانا کی نعش رکھی ہوئی تھی، چہرے پر واضح تبسم تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ایک طویل اور پر مشقت سفر کے بعد کوئی مسافر منزل پر پہنچ کر آسودہ ہو گیا ہو۔

وہی مدرسہ جو ان کی بھاگ دوڑ اور فکر و عمل کا محور تھا، آج اس کے در و دیوار سوگ میں نظر آتے تھے۔

شام کو عصر کے وقت نماز جنازہ میں شرکت کے لئے دوبارہ حاضری ہوئی، مسجد اور مدرسے کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں آدمی نہ ہوں۔ ہزارہا افراد نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ مولانا (رحمۃ اللہ علیہ) کے بڑے بھائی جناب مولانا قاری سعید الرحمن صاحب نے، جو وفات کی خبر سن کر راولپنڈی سے یہاں پہنچے تھے، نماز جنازہ پڑھائی۔ اطراف ملک سے بعض دوسرے علماء بھی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے کراچی پہنچے تھے، وہ بھی نماز میں شریک ہوگئے۔

اور اس طرح ایک متحرک اور فعّال وجود، جو کل تک علمی و دینی حلقوں کا ایک جزو لازم معلوم ہوتا تھا، دیکھتے دیکھتے قافلے سے الگ ہوگیا۔

اس قسم کے منظر روز آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں، مگر انہیں دیکھ کر بہت کم لوگ ہیں جو عبرت حاصل کرتے ہوں، اور یہ سوچ سکتے ہوں کہ یہ واقعہ صرف دوسروں کے ساتھ نہیں، اپنے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔

ولعمرك ان حتفنا من الموت حيضته كم العرباق والذي متظافل۔

مولانا (رحمۃ اللہ علیہ) کے اہل خانہ، اہل مدرسہ اور تمام دینی حلقوں سے تعزیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کو اپنی مغفرت اور رضائے کاملہ سے نوازیں، انہیں جنت الفردوس میں مقامات عالیہ عطا فرمائیں۔ ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں، اور مدرسے کے انتظام و انصرام کے لئے غیب سے ایسی صورت پیدا فرمائیں جو مدرسے کی ظاہری و باطنی ترقیات کا ذریعہ ہو۔ آمین۔

مولانا (رحمۃ اللہ علیہ) کے ایک صاحبزادے امسال دورۂ حدیث سے فارغ ہو رہے ہیں، دوسرے صاحبزادے درجہ خامسہ میں ہیں، تیسرے ان سے بھی کمسن ہیں، اور شاید درجہ حفظ میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو علم نافع اور عمل صالح کی دولت سے مالا مال فرمائیں۔ اور اپنے آباؤ اجداد کے حقیقی ورثے کا حامل بنائے اور ان کے آثار حسنہ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔ قارئین سے بھی ایصال ثواب اور مذکورہ بالا دعاؤں کی درخواست ہے۔

حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ

اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

پاکستان میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے آخری خلیفہ اور مجلس اشرفی کی آخری یادگار حضرت مولانا فقیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی پچھلے مہینے ہم سے رخصت ہو کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا فقیر محمد صاحب قدس سرہ العزیز ان نفوس قدسیہ میں سے تھے جن کا نفس وجود بہت سے فتنوں کے لئے آڑ بنا رہتا ہے اور اس پر آشوب زمانے میں جن کے تصور ہی سے قلب کو تسکین ہوا کرتی ہے۔

ایک وقت تھا کہ پاکستان بحمد اللہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے خلفاء سے آباد تھا اور ان میں سے ہر فرد اپنی اپنی جگہ رشد و ہدایت کی شمع روشن کئے ہوئے تھا۔ نام و نمود اور پبلسٹی کی دنیا سے الگ تھلگ ان حضرات نے اپنے اپنے حلقوں میں تعمیر انسانیت اور افراد سازی کی وہ خدمات انجام دی ہیں کہ ان میں سے ایک ایک شخص کی خدمات بڑی بڑی جماعتوں کے کام پر بھاری ہیں۔

سنت اللہ کے مطابق یہ تمام ہستیاں ایک ایک کر کے رخصت ہونی شروع ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے میدان خالی نظر آنے لگا لیکن اس ویرانی کے عالم میں حضرت مولانا فقیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت تھی کہ اس پر حق شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی مسافر کو چلچلاتی دھوپ میں جھلسنے کے بعد ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میسر آ گئی ہو۔

نام و نمود کی اس دنیا میں جہاں شخصیتوں کو پبلسٹی کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے حضرت مولانا فقیر محمد صاحب قدس سرہ کو جاننے اور پہچاننے والے بہت زیادہ نہیں تھے لیکن علم و دین اور اصلاح و ارشاد کے حلقوں میں آپ کی شخصیت اس وقت مرجع خلائق تھی اور اس بات کا زندہ ثبوت کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہو جائے" وہ اپنی ذات کو کتنا چھپانے کی کوشش کرے لیکن اس کی سیرت و کردار کی خوشبو دور دور تک پہنچ کر رہتی ہے۔

حضرت مولانا فقیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۱۱ھ میں آزاد قبائل کے علاقے مہمند ایجنسی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا خانستہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے عالم باعمل بزرگ تھے۔ آپ کے والد ماجد خان محمد خان صاحب نے آپ کو دینی تعلیم کے لئے وقف کیا اور آپ ابتدائی تعلیم تحصیل چارسدہ میں حاصل کرنے کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری قدس سرہ کے مدرسے میں امرتسر تشریف لے گئے اور تقریباً دس سال تک حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے زیر نگرانی تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے جو آپ پر نہایت شفقت فرماتے اور آپ کو بکثرت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

حضرت مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے اجل خلفاء میں سے تھے اور حضرت حکیم الامت کے عاشق صادق۔ چنانچہ جب آپ حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں تھانہ بھون تشریف لے جاتے تو اکثر حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ شروع سے نہایت رقیق القلب تھے اور دین کی باتوں کے دوران آپ پر اکثر گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ یہ سلسلہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ کے درس تفسیر و حدیث یا وعظ کے دوران بھی جاری رہتا اور حضرت حکیم الامت کی مجلس میں بھی۔ یہاں تک کہ حضرت حکیم الامتؒ سے تعلق رکھنے والے حضرات میں آپ کا لقب "بکّاء" (بہت رونے والے) مشہور ہو گیا تھا۔ یہ گریہ بے اختیار تھا اور اللہ تعالیٰ کی محبت یا خوف کی بناء پر ہوتا تھا اس میں اکثر آواز بھی بلند ہو جاتی تھی اور اس کا سننے والوں پر بھی اثر ہوتا تھا۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی مجلس میں بناوٹی قسم کے حال و قال کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن حضرت مولانا فقیر محمد صاحب قدس سرہ کا یہ گریہ ان کی حقیقی باطنی کیفیت کا آئینہ دار تھا" اس لئے حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس پر نہ صرف کوئی گرانی محسوس نہیں فرمائی بلکہ جب آپ خانقاہ میں حاضر ہو کر حضرت تھانوی قدس سرہ سے مصافحہ کرتے تو آپ فرماتے "رونق آگئی' رونق آگئی"۔

ایک مرتبہ حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ تنہا تھانہ بھون تشریف لے گئے اور حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ کو امرتسر چھوڑ گئے۔ حضرت تھانوی قدس سرہ نے پوچھا "فقیر محمد کو کیا

حال ہے؟" حضرت مفتی صاحبؒ نے جواب دیا کہ "آجکل ان پر گریہ بہت طاری ہے اور اسی وجہ سے انہیں چھوڑ آیا ہوں کہ کہیں حضرت کو تکلیف نہ ہو"

حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا "ان کے گریہ سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی"

حضرت مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ کی معرفت حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے تعلق قائم ہوا' یہاں تک کہ حضرتؒ نے آپ کی بیعت کی درخواست نہ صرف قبول فرمائی بلکہ بعد میں آپ کو اپنا مجاز بیعت مقرر فرمایا۔ حضرت مولانا فقیر محمد صاحب قدس سرہ اس تعلق کا ذکر کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں :

"حضرت رحمتہ اللہ علیہ میرے لئے آئینہ باطن تھے۔ ہر عیب اور خوبی مجھے ان کے ذریعے سے معلوم ہوتی تھی اور اس کی اصلاح بھی کرتے۔ ان کی مجلس سے مجھے جو کچھ ملا ہے میں اسے ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے ظاہر کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ وہ راز کی باتیں ہیں۔ حضرتؒ دین اور دنیا دونوں کے کفیل تھے ایک مرتبہ فرمایا "جاؤ شادی کرو' شادی پر جو خرچ ہو گا میں دیدوں گا۔"

حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی وفات سے پہلے چھ ماہ تک متواتر حضرت مولانا فقیر محمد صاحب قدس سرہ کو اپنے شیخ کی خدمت کی توفیق ہوئی حضرتؒ کی علالت کے زمانے میں حضرتؒ کی مسلسل خدمت کا شرف جن بزرگوں کو حاصل ہوا ان میں حضرت مولانا عبدالکریم صاحبؒ اور حضرت مولانا فقیر محمد صاحب قدس سرہ کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔ ایک دفعہ حضرتؒ نے فرمایا "تم دونوں نے میری بہت خدمت کی ہے" دونوں حضرات نے عرض کی کہ "یہ تو آپ کی کرم نوازی ہے کہ آپ ہم پہاڑی لوگوں سے خدمت کرواتے ہیں ورنہ آپ کے تو ہزاروں خادم موجود ہیں" حضرت قدس سرہ فرماتے تھے کہ "یہ دونوں میری خدمت بھی کرتے ہیں اور احسان بھی مانتے ہیں۔"

ایک طرف جذبۂ خدمت و محبت کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف خود فرماتے ہیں کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی وفات سے ایک ہفتہ پہلے مجھے تھانہ بھون کی ہر چیز پر گریہ طاری نظر آتا تھا۔ مسجد کے ستون' محراب' سہ دری' حضرتؒ کا گھر غرض ہر چیز روتی ہوئی معلوم ہوتی تھی' اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی جدائی کا وقت قریب آچکا ہے اور چونکہ مجھ میں اس صدمے کی تاب نہ تھی اسلئے وہاں سے چلا آیا اور ایک ہفتے

بعد ہی مجھے معلوم ہوا کہ حضرتؒ دنیا سے تشریف لے گئے۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی وفات کے بعد آپ نے اپنے استاذ و مربی حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ سے تعلق قائم رکھا اور اس کے بعد دوسرے اکابر علماء نے آپ سے اصلاحی تعلق فرمایا اور اصلاح و ارشاد سے فیض یاب ہوئے۔

آپ نے پشاور کے قریب ایک چھوٹی سی بستی "تنگی ارباب" میں تعلیم قرآن کریم کا ایک مدرسہ قائم فرمایا ہوا تھا وہیں پر اقامت پذیر ہوئے تھے اور وہیں "خانقاہ اشرفیہ" کے نام سے ایک خانقاہ قائم فرمائی تھی۔ لیکن سالہا سال سے معمول یہ تھا کہ چھ ماہ حرمین شریفین میں قیام فرماتے اور چھ ماہ اپنے گھر پر گذارتے۔ ضعف اور علالت کے باوجود حرمین شریفین کی حاضری کا یہ معمول آخر دور تک جاری رہا اور اسطرح حضرتؒ کے فیوض پاکستان کے علاوہ حجاز کے مستفیدین تک بھی پھیل گئے۔

جنہوں نے حضرت مولانا فقیر محمد صاحب قدس سرہ کی زیارت کی ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرتؒ کے چہرہ مبارک پر بلا کی معصومیت تھی، حضرتؒ معروف طریقے سے وعظ و تقریر نہیں فرماتے تھے لیکن اللہ والوں کو اپنا پیغام پہنچانے کے لئے لفظ و بیان کی حاجت نہیں ہوتی ان کا چہرہ مہرہ ان کا انداز و ادا اور ان کی ایک ایک نقل و حرکت مجسم پیغام ہوتی ہے۔ ایسا پیغام جو براہ راست دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے جوڑ دیتا ہے۔ بس یہی حضرت کا انداز تربیت و اصلاح تھا جس سے سینکڑوں افراد سیراب ہوئے۔

چنانچہ حضرتؒ کے خلفاء مجازین میں ہمارے دور کے اکابر علماء شامل ہیں جن میں سے حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم العالی، حضرت مولانا نجم الحسن صاحب تھانوی حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب مدظلہم نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۸ء میں احقر اسلامی نظریاتی کونسل کی میٹنگ کے سلسلے میں پشاور گیا ہوا تھا قیام مختصر تھا لیکن میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ حضرت مولانا فقیر محمد صاحب قدس سرہ کی خدمت میں حاضری دیئے بغیر نہیں جاؤں گا، چنانچہ شام کے وقت میں نے حاضری کا ارادہ کیا۔ جناب جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب اس وقت کونسل کے چیئرمین بھی تھے اور سپریم کورٹ کے جج بھی، احقر نے ان سے بھی ذکر کیا کہ وہ بھی تشریف لے جانا چاہیں تو ساتھ

چلیں وہ نہایت اشتیاق کے ساتھ آمادہ ہو گئے اور ہم مغرب کے بعد حضرتؒ کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت نے حسب معمول انتہائی محبت و شفقت کا معاملہ فرمایا۔ وہاں وعظ و تقریر کا معمول تو تھا نہیں لیکن چند محبت بھری باتیں کرنے کے بعد حضرتؒ پر حسب معمول گریہ طاری ہو گیا جناب جسٹس چیمہ صاحب سے بھی حضرت نے کوئی خاص بات نہیں کی تھی لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا اللہ والوں کو پیغام دینے کے لئے کسی تقریر کی ضرورت نہیں ہوتی چند ہی لمحوں کے بعد میں نے دیکھا کہ جناب جسٹس چیمہ صاحب پر گریہ طاری ہو گیا اور دیر تک ان پر ایسی کیفیت طاری رہی کہ میں نے انھیں ایسی حالت میں بہت کم دیکھا ہے۔ بعد میں وہ جب کبھی حضرتؒ کے بارے میں کوئی خبر سنتے تو آپ کی زیارت کے لئے ضرور حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے تھے۔

لنڈی ارباب کا مدرسہ تو حضرتؒ نے مدت سے قائم فرمایا ہوا تھا لیکن آخر دور میں اپنے پشاور کے مال روڈ پر جامعہ امداد العلوم کے نام سے ایک عظیم الشان مدرسے کی بنیاد ڈالی جو بحمد اللہ درس نظامی کی معیاری تعلیم کا مرکز ہے اور حضرتؒ کے صاحبزادے مولانا عبد الرحمٰن صاحب کے زیر اہتمام چل رہا ہے اور حضرت مولانا حسن جان صاحب مد ظلہم جیسے فاضل بزرگ اس کے شیخ الحدیث ہیں۔

حضرتؒ کی علالت کا سلسلہ تو مدت سے چل رہا تھا لیکن وفات سے چند روز پہلے سے اہلیہ محترمہ اور اہل خانہ سے بار بار یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب میرا وقت قریب آگیا ہے۔ بظاہر معروف بیماریوں میں سے کوئی بیماری نہ تھی لیکن تین دن مکمل بے خوابی اور غنودگی کی سی کیفیت ہوئی۔ بعض حضرات نے ہسپتال لیجانے کا ارادہ کیا لیکن حضرتؒ ہسپتال لے جانے سے پہلے ہی منع فرما چکے تھے کہ اب میرے سفر کا وقت آچکا ہے۔ چنانچہ اسی حالت میں ۲۲ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ مطابق ۲ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو رات کے آٹھ بجے انتہائی سہولت کے ساتھ روح پرواز کر گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جن دنوں یہ حادثہ پیش آیا، احقر اس وقت ملک سے باہر سفر پر تھا اس لئے جنازے میں شرکت کی سعادت نصیب نہ ہو سکی، لیکن جو حضرات تجہیز و تکفین میں شریک تھے انہوں نے بتایا کہ غسل کے بعد ہر شخص چہرہ مبارک کی تر و تازگی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ بڑا بھاری افراد کے ہجوم نے جنازے میں شرکت کی۔ حضرت مولانا حسن جان صاحب مد ظلہم نے نماز جنازہ

ج عالی اور پھر لنڈی ارباب ہی میں حضرتؒ کو دفن کیا گیا۔

حضرتؒ کی وفات ملک و ملت کا زبردست سانحہ ہے۔ آپ کی وفات پر آپ کے اہل خاندان ہی نہیں پوری امت مستحق تعزیت ہے۔ اس ناکارہ پر بھی حضرتؒ کی عنایات اور شفقتیں ناقابل بیان ہیں۔ جب بھی حاضری ہوتی زبان مبارک سے دعاؤں کی بارش شروع ہو جاتی۔ معصومانہ انداز میں دنیا و آخرت کے مقاصد کے لئے دعائیں کر کرکے نہال فرما دیتے اور بات بات پر ہمت افزائی فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے احقر کو حضرتؒ کے سفر حج میں رفاقت کی سعادت عطا فرمائی۔ منیٰ میں قیام کے دوران حضرتؒ کی صحبت بابرکت نصیب رہی جس نے ان ایام کا لطف دوبالا کر دیا۔ اس موقع پر حضرتؒ نے حکم دیا کہ ”نمازیں تم پڑھاؤ“ چنانچہ احقر تعمیل کرتا رہا۔ اس کے بعد جب بھی حاضری ہوتی تو حضرتؒ اس واقعہ کو ضرور دہراتے اور فرماتے ”یہ ہمارا امام ہے اس نے حج میں ہم کو نمازیں پڑھائیں“ اور اس کے بعد مشفقانہ دعاؤں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ حضرتؒ کو جنت الفردوس میں درجات عالیہ اور اپنے مقامات قرب میں پیہم ترقی عطا فرمائیں۔ حضرتؒ کے اہل خانہ اور پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے نوازیں اور ہمیں حضرتؒ کے فیوض سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

مولانا ظفر احمد انصاری رحمتہ اللہ علیہ

۱۴ جمادی الثانیہ ۱۴۱۲ھ مطابق ۲۰ دسمبر ۱۹۹۱ء کو جمعہ کی شام جناب مولانا ظفر احمد انصاری صاحبؒ بھی راہی آخرت ہو گئے، اور اس طرح قیام پاکستان، تحریک آزادی اور پاکستان میں اسلامی نظام کی جدوجہد کا ایک اہم کردار ہم سے رخصت ہو گیا، اور برصغیر کے ایک صدی کے سیاسی اتار چڑھاؤ کے بعد سے راز اور شاید ملت اسلامیہ کے مستقبل کے بارے میں بہت سے فکر انگیز نظریات بھی انہی کے ساتھ دفن ہو گئے۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔

ہوش سنبھالتے ہی ہم نے جن حضرات کو حضرت والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ کے پاس کثرت سے آتے جاتے دیکھا اور جن کا گھر میں بکثرت چرچا سنا، ان میں مولانا ظفر احمد انصاری صاحبؒ کی شخصیت بہت نمایاں تھی "مولانا" وغیرہ کے القاب تو ان کے ساتھ بعد میں لگے، لیکن ہم شروع میں انہیں "انصاری صاحب" کے نام سے جانتے تھے "انصاری" کی نسبت سے برصغیر میں نہ جانے کتنے لوگ ہوتے، لیکن ہمارے گھر اور حضرت والد صاحبؒ کے حلقہ احباب میں جب صرف "انصاری صاحب" کہا جاتا تو اس سے مولانا ظفر احمد انصاری صاحبؒ کے سوا کوئی اور مراد نہیں ہو سکتا تھا۔

بچپن میں ہمارے گھر کے سامنے اکثر ایک بگھی آکر رکا کرتی جس سے ایک وضع دار شخصیت نمودار ہوتی، جسم پر علیگڑھی شیروانی اور پاجامہ، سر پر جناح کیپ، ہاتھ میں چھڑی، چلتے وقت پاؤں میں ہلکی سی رکاوٹ، پیشانی پر مفکرانہ سلوٹیں، انداز و ادا میں متانت، غرض سنجیدگی، شرافت اور وقار کا ایک پیکر مجسم جسے دیکھ کر ہمیں یہ احساس ہوتا کہ اب حضرت والد صاحبؒ کم از کم گھنٹے دو گھنٹے کے لئے ان کے ساتھ ایسی گفتگو میں مشغول رہیں گے جس کا بیشتر حصہ ہماری پرواز فہم و ادراک سے بالاتر ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا، وہ تنہا ہوں، یا دوسرے حضرات بھی مجلس میں موجود ہوں، گفتگو پر سنجیدگی اور تفکر کا رنگ اتنا غالب ہوتا ہے کہ اس مجلس میں چائے اور پان پہنچانے کی حد تک محدود رہنے ہی میں عافیت سمجھتے تھے۔

اس وضع دار شخصیت کو ہم "انصاری صاحب" کے نام سے پہچانتے تھے۔

دوسری طرف بارہا ایسا ہوتا۔ ہم حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ کسی جلسے سے آرہے ہیں، بندر روڈ پر سعید منزل سے گزرتے ہوئے حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ "ذرا انصاری صاحب سے ایک ضروری بات کرتے چلیں" چنانچہ سعید منزل کے سامنے ایک پرانے طرز کے فلیٹ میں سیڑھیوں کا زینہ طے کرنے کے بعد والد صاحبؒ کے ساتھ ایک ایسی بیٹھک میں داخل ہو جاتے جس کا دروازہ ہم نے کبھی بند نہیں دیکھا اور نہ کسی کو اس میں داخل ہونے کے لئے کبھی صاحب خانہ سے اجازت لیتے ہوئے پایا۔ جس کا جی چاہتا کسی رکاوٹ کے بغیر اندر چلا جاتا اور بے تکلف ان صوفوں پر بیٹھ جاتا جو گھنٹوں بیٹھے رہنے والوں کا بوجھ سہہ سہہ کر جھولا ہو گئے تھے۔

حضرت والد صاحبؒ یہاں جناب "انصاری صاحب" سے محو کلام رہتے اور ہم دیر تک اس کھلی ہوئی فضا میں بیزار بیٹھے رہتے جس میں ہماری دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔

اس زمانے میں جبکہ "انصاری صاحب" کی گفتگو کا ہر موضوع ہمیں اپنے فکر و خیال سے ماوراء معلوم ہوتا تھا، ایک دن ہمیں اپنے گھر میں ان کی تصنیف کردہ ایک کتاب نظر آئی جس کا عنوان تھا "ہمارے دستوری مسائل کا نظریاتی پہلو"، اس عنوان میں "ہمارے" کے سوا کوئی لفظ ہمارے پلے نہ پڑا، اور ہمیں یقین ہو گیا کہ ان کی تقریر اور تحریر دونوں ہمارے ادراک سے بلند ہیں۔

لیکن جوں جوں عمر میں اضافہ ہوتا گیا، رفتہ رفتہ "انصاری صاحب" کی باتیں نہ صرف سمجھ میں آنے لگیں، بلکہ ان میں ایک گونہ دلچسپی پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب سعید منزل کی وہ کھلی ہوئی بیٹھک جس میں والد صاحبؒ کے ساتھ بیٹھے بیٹھے ہم بیزار ہو جایا کرتے تھے، اب اسی میں لطف محسوس ہونے لگا، اور یہ بھی سمجھ میں آنے لگا کہ بہت سے لوگ یہاں گھنٹوں گھنٹوں کیوں بیٹھے رہتے ہیں؟ اور پھر کسی نہ کسی درجے میں خود ہم بھی ان بیٹھنے والوں میں شامل ہو گئے، اور یہ بھی ایک کرشمۂ قدرت تھا، اور حضرت انصاری صاحبؒ کہ جن دینی مسائل پر وہ حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ محو کلام رہا کرتے تھے، اور جس جدوجہد میں وہ حضرت والد صاحبؒ کے رفیق کار تھے، بعد میں اسی قسم کے مسائل اور اسی قسم کی جدوجہد میں ہمیں بھی ان کی خدمت اور رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔

جب سے برصغیر میں قیام پاکستان کی تحریک شروع ہوئی، اس وقت سے شاید مسلمانوں کی کوئی سیاسی اور ملی جدوجہد ایسی نہیں ہے جس میں جناب مولانا ظفر احمد انصاری صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا کوئی نہ کوئی کردار نہ ہو۔ انہوں نے اپنی جدوجہد کا آغاز قیام پاکستان کے لئے مسلم لیگ میں شامل ہو کر کیا جسکے آل انڈیا پارلیمنٹری بورڈ کے وہ سیکرٹری رہے اور اس منصب کے علاوہ بھی انہوں نے اپنی زندگی پاکستان کے لئے صحیح معنیٰ میں وقف کردی۔ تحریک پاکستان کے صف اول کے قائدین جن میں قائداعظم محمد علی جناح، نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب، خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر وغیرہ داخل ہیں، ان سب سے مولانا انصاریؒ کے قریبی تعلقات تھے، اور یہ حضرات ان کی خدمات کے قدردان تھے۔

قیام پاکستان کی تحریک میں صحیح معنیٰ میں جان اس وقت پڑی جب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے ایماء پر ان کے بہت سے متوسلین نے تحریک کی حمایت شروع کی، اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ اور ان کے رفقاء نے جن میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ، احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ وغیرہ شامل تھے، جمعیت علماء اسلام کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھی۔ اور اس نے ملک کے طول و عرض میں تحریک پاکستان کے حق میں فضا ہموار کرنے کی مہم شروع کی۔ مولانا ظفر احمد صاحب انصاریؒ اس جماعت کے بانی اراکین میں سے تھے، اور انہوں نے اس جماعت کی تشکیل و تاسیس میں نمایاں کردار ادا کیا۔

مولانا انصاریؒ کو اللہ تعالیٰ نے جن صلاحیتوں سے نوازا تھا، اور بانیان پاکستان کے ساتھ ان کے جو قریبی روابط تھے، ان کے پیش نظر پاکستان بننے کے بعد کسی بڑے عہدہ و منصب یا مالی مفادات کا حصول ان کے لئے چنداں مشکل نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ان باتوں سے بہت بلند بنایا تھا، پاکستان بننے کے بعد انہوں نے مسلم لیگ کو خیرباد کہہ دیا، اور عہدہ و منصب یا ملازمت، بلکہ اپنے لئے کسی مستقل ذریعہ معاش سے بھی غلو کی حد تک پرہیز کیا۔ پاکستان کے ابتدائی دور میں اسلامی دستور کا ڈھانچہ تیار کرنے کے لئے دستور ساز اسمبلی کے ساتھ "بورڈ تعلیمات اسلامیہ" کے نام سے ایک بورڈ بنایا گیا جس کے صدر حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ تھے، اور اس کے ارکان میں احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ بھی شامل تھے۔ حضرت انصاری صاحبؒ اس بورڈ کے سیکرٹری کے فرائض

انجام دیتے رہے۔ قرارداد مقاصد کی منظوری پاکستان میں اسلامی دستور کی جدوجہد میں سب سے پہلا قدم تھا، اور اس قرارداد کی تسوید میں مولانا انصاری صاحبؒ کا کردار مرکزی اہمیت کا حامل تھا۔ دستور کے متفقہ اسلامی نکات طے کرنے کے لئے ۱۹۵۱ء میں مختلف مکاتب فکر کے تینتیس علماء کا جو تاریخی اجتماع منعقد ہوا، اور جس میں مشہور بائیس نکات متفقہ طور پر منظور کیے گئے، اس اجتماع میں مختلف الخیال حضرات کو کسی ایک فارمولے پر متفق کرنے میں جناب انصاری صاحبؒ نے یادگار خدمات انجام دیں۔ پھر ۱۹۵۳ء میں حکومت کے پیش کردہ دستوری مسودے پر تبصرہ کرنے کے لئے دوبارہ علماء کا اجتماع منعقد ہوا، اسمیں بھی متفقہ ترمیمات مرتب کرنے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ پھر ۱۹۵۳ء کے مسودہ دستور کی ترتیب و تسوید میں بھی وہ شریک رہے، جو اسلامی اعتبار سے شاید سب سے بہتر مسودہ دستور تھا لیکن نافذ نہ ہو سکا۔

جب گورنر جنرل غلام محمد صاحب نے دستور ساز اسمبلی توڑی تو اس کے ساتھ "بورڈ تعلیمات اسلامیہ" بھی ختم ہو گیا۔ اس کے چند سال بعد مولانا انصاری صاحبؒ جنیوا چلے گئے جہاں وہ اسلامک سنٹر کے تحت خدمات انجام دیتے رہے، لیکن پاکستان سے اور اس کے مسائل کی فکر نے انہیں زیادہ عرصے وہاں رہنے نہ دیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب انصاری صاحبؒ جنیوا میں تھے تو والد صاحبؒ نے ان کے ایک خط میں انہیں پاکستان کے کچھ حالات لکھے، اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ ایسے مواقع پر آپ کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ جواب میں انصاری صاحبؒ کا جو خط آیا اسمیں انہوں نے ایک شعر لکھا جو ان کی قلبی کیفیات کی تصویر تھا۔

کچھ یاس سے تسکین دل مضطر کو ہوئی تھی
پھر چھیڑ دیا زخم جگر، ہائے تمنا

وہ کچھ عرصے بعد پھر پاکستان آگئے، اور ان کی سابقہ مصروفیات پھر شروع ہو گئیں۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اور ۱۹۷۳ء کے دستور کی منظوری میں انہوں نے یادگار کردار ادا کیا، اور ایک ایسے مرحلے پر جب حکومت اور اپوزیشن کے درمیان تناؤ انتہا کو پہنچا ہوا تھا، اور قریب تھا کہ دستور متفقہ طور پر منظور نہ ہو سکے، انہوں نے اپنی حکمت عملی اور تدبر سے فریقین کے درمیان فاصلے کم کئے،

اور بالآخر ۱۹۷۳ء کا دستور منظور ہوا۔

۱۹۷۴ء میں جب ملک گیر تحریک ختم نبوت شروع ہوئی تو اس کی مجلس عمل میں مولانا انصاریؒ بھی شامل تھے، اور بالآخر جب قومی اسمبلی میں مرزا ناصر اور لاہوری جماعت کے پیشوا پر اس وقت کے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار صاحب نے جرح کی تو ان کو مواد فراہم کرنے اور جرح کے لئے تیار کرنے میں مولانا نے اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۷۷ء میں جب مارشل لا لگا، اور شہید جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم برسراقتدار آئے تو انہوں نے مولانا انصاریؒ کی خدمات اور ان کی حکمت و تدبر کی بڑی قدردانی کی، اور ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا۔ ان کے عہد میں اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو ہوئی تو مولانا انصاریؒ اس کے رکن رکین تھے، اور تقریباً آٹھ سال تک اس حیثیت میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۳ء میں جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم نے نظام حکومت میں اصلاح کے لئے جو دستوری کمیشن قائم کیا، مولاناؒ اس کے چیئرمین بنائے گئے، اور وہ "انصاری کمیشن" ہی کے نام سے لوگوں میں مشہور ہوا، ان دونوں اداروں میں احقر کو بھی انکی معاونت اور رفاقت کی سعادت حاصل ہوئی۔

پاکستان کے علاوہ عالم اسلام کے دوسرے ملکوں میں بھی مولانا انصاریؒ کے اچھے روابط تھے، شروع میں "الاخوان المسلمون" اور "مؤتمر العالم الاسلامی" کے لیڈروں سے مولانا کے تعلقات تھے، اور وہ بھی ان کی حکمت و تدبر کے مداح تھے، اسی زمانے میں انہوں نے بہت سے اسلامی ملکوں کے دورے بھی کئے۔ پھر جب سعودی عرب میں رابطۃ العالم الاسلامی کے نام سے ایک بین الاسلامی تنظیم قائم ہوئی تو جناب انصاری صاحبؒ اس کی مجلس تاسیسی کے بھی رکن منتخب ہوئے، اور آخر تک رکن رہے۔

مولانا ظفر احمد انصاری صاحبؒ جن مناصب پر فائز رہے، اور جن جن حیثیتوں سے انہوں نے ملک وملت کی خدمات انجام دیں، ان کا مختصر تذکرہ تو میں نے مذکورہ بالا سطور میں کردیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان باتوں میں مولاناؒ کے خداداد اوصاف اور ان کے حقیقی کارناموں کی صحیح عکاسی ناممکن ہے جن مناصب پر وہ فائز رہے، ان جیسے مناصب بہت سے لوگوں کو حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بعض ایسی غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا جو آج کے دور میں شاذ و نادر ہی دستیاب ہوتی ہیں۔ تعلیمی اعتبار سے وہ فلسفہ میں

ایم۔ اے، آنرز اور ایل ایل بی تھے، اور بعد میں انہوں نے بعض اساتذہ سے عربی زبان اور بعض دینی علوم بھی پرائیوٹ طور پر اس طرح پڑھ لئے تھے کہ وہ عربی کی کتابوں سے بخوبی استفادہ کر لیتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں فہم و ذکاوت اس بلا کی عطا فرمائی تھی کہ جو موضوعات ان کے اختصاص سے باہر تھے، ان میں بھی وہ بہت جلد بات کی تہ تک پہنچ جاتے تھے، مطالعہ بہت وسیع تھا، اور حافظہ قابل رشک۔ عالم اسلام کے تقریباً ہر ملک کے سیاسی آثار چڑھاؤ سے باخبر تھے، اور حالات کا تجزیہ بڑی وقت نظر سے کرنے کے عادی تھے۔

ان تمام ملکات و خصوصیات کے علاوہ ان کا سب سے قیمتی وصف ان کا اخلاص اور سوز دروں تھا جو ہمہ وقت انہیں عالم اسلام کے مختلف مسائل میں غلطاں و پیچاں رکھتا تھا۔ شہرت پسندی، پبلسٹی اور نام و نمود سے انہیں نفرت تھی، اور وہ ہر کام کا فیصلہ اسکی معروضی خوبیوں کی بنا پر کرتے تھے، لوگوں کی تعریف و توصیف کی انہیں پرواہ نہ تھی۔ اگر پورا ماحول کسی ایک طرف بہا چلا جا رہا ہو، اور خود ان کی رائے اس کے خلاف ہو تو وہ محض حالات کے بہاؤ پر بہنے والے نہیں تھے۔ ان کی اپنی رائے ہوتی۔ اور وہ اس پر بلا خوف لومتہ لائم ثابت قدم رہتے تھے۔

انہوں نے اصحاب اقتدار کے انتہائی قریب رہنے کے باوجود زندگی بھر ان سے کوئی مالی فائدہ نہیں اٹھایا، اور زندگی کے سالہا سال انتہائی عسرت کے عالم میں گزارے جو خوشحال لوگ صبح و شام ان کی محفل سے معلومات اور مفید مشوروں کا خزانہ لیکر لوٹتے تھے، ان میں سے اکثر لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ان کی گھریلو زندگی کس تنگی سے بسر ہو رہی ہے؟ لیکن اسی تنگی کے دور میں بھی انہوں نے جس استغناء کے ساتھ اپنے شب و روز گزارے اس کی مثالیں اس دور میں بہت کم ملیں گی۔

چونکہ ان کا ضمیر مطمئن تھا اور دامن اس قسم کی آلودگی سے پاک۔ اسلئے انہوں نے اپنے مقصد اصلی..... یعنی پاکستان کا استحکام اور اسمیں اسلامی اقدار کے فروغ.. کی خاطر اگر کسی صاحب اقتدار کے قریب جانا زیادہ مفید خیال کیا تو یہ اندیشے اکی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے کہ لوگ کیا کہیں گے؟ انہوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کی برملا مخالفت کی، لیکن اس کی کامیابی کے بعد جب ملکی سالمیت کے لئے ضروری سمجھا تو اس پارٹی کے لیڈروں، یہاں تک کہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سے گفت و شنید اور مفاہمت میں کوئی باک

محسوس نہیں کیا، اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۳ء کا آئین متفقہ طور پر منظور ہو گیا جو اس وقت ملک کی سالمیت کے لئے نہایت ضروری تھا۔

ان کا یہی وصف تھا جس کی وجہ سے مختلف الخیال حلقے اور متحارب و متصادم گروپ ان سے یکساں تعلق رکھتے اور ان کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ ان کا حلقہ تعلقات بے حد وسیع تھا جس میں ہر شعبہ زندگی کے نمایاں افراد شامل تھے۔

سعید منزل پر ان کے مکان کی جس بیٹھک کا ذکر میں نے شروع میں کیا تھا، وہ شام کے وقت عموماً ان مختلف شعبہ ہائے زندگی کے افراد سے بھری رہتی تھی، ان میں علماء بھی تھے، سیاسی جماعتوں کے قائدین بھی، صحافی بھی، وکلاء بھی، ادباء بھی اور شعراء بھی۔ اور مولانا ان سب کے ذوق کی پوری پوری تسکین کرتے تھے۔

حضرت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں آپؐ کا ایک عجیب و غریب وصف یہ بیان ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص آپؐ سے کوئی بات کرنا شروع کرتا تو آپؐ اس وقت تک اس کی بات توجہ سے سنتے رہتے جب تک وہ خود بات ختم کر کے واپس نہ ہو جاتا۔ یعنی آپؐ از خود سلسلہ کلام ختم کر کے کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ کہنے کو یہ بات آسان ہے لیکن ایک ایسے شخص کے لئے جس کے کندھوں پر بے شمار مصروفیات کا بوجھ ہو، اس پر عمل کرنا انتہائی مشکل ہے، اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے "خلق عظیم" کی دولت سے نوازا ہو۔

اس عظیم سنت نبویؐ کی جھلک احقر نے جن گنے چنے افراد میں دیکھی۔ ان میں حضرت انصاری صاحبؒ بھی داخل ہیں۔ مصروفیات کے ہجوم میں بھی وہ ہر مخاطب کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور کوئی شخص ان کے سامنے خواہ کتنی طویل گفتگو، کتنے بے ربط اور بے فائدہ انداز میں کر رہا ہو، کم از کم میں نے ان کے انداز و ادا میں کبھی کوئی جھنجلاہٹ نہیں دیکھی۔

کتنے لوگ تھے جو اپنی ناقابل عمل تجاویز اور بے ربط تبصروں کے دفتر کے دفتر ان کے سامنے کھولتے رہتے، ان کے اقدامات پر اپنے اپنے ظرف و استعداد کے مطابق تنقید بھی کرتے رہتے، مگر وہ تھے کہ پورے صبر و تحمل کے ساتھ نہ صرف ان کی پوری بات سنتے، بلکہ حتی الامکان ان کا اطمینان بھی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

کچھ سراپا اخلاص حضرات ایسے بھی تھے جن کے طرز عمل سے ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے شاید اپنی عمر کے آخری ایام سعید منزل کی اس بیٹھک میں بسر کرنے کا تہیہ کر لیا ہے، انہوں نے بیٹھک میں بچھے ہوئے صوفوں میں اپنی نشست بھی اس طرح متعین کر لی تھی کہ ایک نووارد کو انہی پر صاحب خانہ ہونے کا گمان ہو سکتا تھا۔

چنانچہ حضرت انصاری صاحب کے پاس آنے والوں میں جہاں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو ان سے استفادے اور مشورے کے لئے ان کی خدمت میں آتے تھے۔ وہاں اچھی خاصی تعداد ایسے حضرات کی بھی تھی جو انصاری صاحب کو اپنے نظریات اور اپنے مشوروں سے مستفید کرنا چاہتی تھی، اور جن کے آنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کو اپنے دل کا غبار نکالنے کے لئے سعید منزل کی اس بیٹھک سے بہتر کوئی اور جگہ میسر نہیں آسکتی تھی۔ لیکن حضرت انصاری صاحبؒ تھے کہ ان کا دامن شفقت سب کے لئے کشادہ تھا، اور ان کو کسی نے شاذ و نادر ہی اس بات کی شکایت کرتے ہوئے پایا ہو گا۔

شرافت اور وضع داری ان کا خاص وصف تھا، اور تعلقات کو نبھانے اور ان کا حق ادا کرنے کی ہر قیمت پر کوشش کرتے تھے، جن لوگوں سے انہیں شدید اختلاف ہوا ان کے حق میں بھی ان کے منہ سے ثقیل الفاظ نہیں سنے گئے۔ شدید جذباتی فضا میں بھی وہ الفاظ کا استعمال تول تول کر کرتے، اور کسی پر تنقید کے لئے بھی حتی الامکان مہذب سے مہذب اسلوب استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ان کی ساری عمر سیاست کی گتھیاں سلجھانے میں گزری، لیکن آجکل کے بہت سے سیاسی حضرات کے وہ اوصاف جو آجکل سیاست کے لوازم میں سے سمجھے جانے لگے ہیں، حضرت انصاری صاحبؒ ان سے کوسوں دور رہے۔ اول تو آج کی سیاست کا سب سے بڑا لازمہ طلب اقتدار ہے، لیکن یہ ہوس انصاری صاحب کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ دوسرے کہا جاتا ہے کہ آج کی سیاست اصولوں کی پابند نہیں ہوتی۔ مولانا انصاری صاحبؒ نے اپنے عمل سے اس کی تردید کر کے دکھائی۔ تیسرے آج کی سیاست میں شرافت کا عمل دخل بہت کم نظر آتا ہے۔ لیکن انہوں نے سیاست و شرافت کو شیر و شکر کر کے دکھایا۔

چوتھے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ بہت سے وہ حضرات جو سیاست میں اسلام کے نفاذ کا علم لے کر چلے تھے، سیکولرزم کی تردید کے جوش میں بسا اوقات انہوں نے سیاست پر

اتنا زور دیا کہ وہ دین کا مقصود اصلی بن کر رہ گئی، اور دین کے دوسرے شعبے اس کے تابع بنا لئے گئے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سیاست کو اسلامی تو نہ بنا سکے، لیکن انہوں نے اسلام کو سیاسی بنا کر رکھ دیا۔ "اسلامی سیاست" اور "سیاسی اسلام" کا یہ فرق اس دور میں بہت کم حضرات نے ملحوظ رکھا ہے۔ حضرت انصاری صاحب اگرچہ شب و روز سیاست ہی کے نشیب و فراز میں غلطاں و پیچاں رہے، لیکن انہوں نے دین میں سیاست کے اصل مرتبہ و مقام کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی۔ وہ اس نقطۂ نظر کی شدت سے تردید کرتے تھے کہ دین کا اصل مقصود سیاست ہے۔ ایک مرتبہ میری موجودگی میں ایک صاحب ان سے اسی موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ آخر میں ان صاحب نے پوچھا کہ "پھر آخر دین کا اصل مقصد ہے کیا؟" مولانا انصاری نے برجستہ جواب دیا: "تعلق مع اللہ پیدا کرنا"۔ پھر فرمایا کہ سیاست دین کا ایک شعبہ ضرور ہے، لیکن بالکل اسی طرح جیسے تجارت اور کسب معاش بھی دین کا ایک شعبہ ہے لیکن جس طرح کسب معاش کو دین کا مقصود نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح سیاست کو بھی دین کا مقصود قرار دینا غلط ہے۔ پھر انہوں نے سیاست کو مقصود دین قرار دینے کو ایک دھوکا قرار دیتے ہوئے اقبال مرحوم کا یہ شعر پڑھا۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

اللہ تعالیٰ نے انہیں عبادت کا بھی ذوق عطا فرمایا تھا، اور جب تک ان کے اعضاء کام دیتے رہے، انہوں نے ہر سال حرمین شریفین کی حاضری ترک نہیں کی، وہ بڑے مضبوط اعصاب کے آدمی تھے، اور ان کے بارے میں رونے دھونے کا تصور مشکل ہی سے آ سکتا ہے، لیکن اپنی چوبیس سالہ یادداشت میں، میں نے انہیں صرف ایک مرتبہ روتے ہوئے دیکھا۔ ایک دن حرم مکہ میں مجھے وہ دور سے رکن یمانی کے قریب تنہا بیٹھے نظر آئے۔ میں ان کے پیچھے سے ان کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں رخساروں پر بہہ رہی ہیں، لرزتے ہوئے ہونٹوں سے آہستہ آہستہ وہ کچھ کلمات ادا کر رہے ہیں اور نگاہیں مسلسل کعبہ شریف کی چھت پر ٹکی ہوئی ہیں۔ میں نے اس حالت میں انہیں متوجہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے لوٹ آیا۔

[illegible]

حضرت والد صاحب قدس سرہ کے تعلق سے حضرت انصاری صاحبؒ کو دارالعلوم سے بھی قریبی تعلق تھا، وہ اس کی مجلس منتظمہ کے بانی ارکان میں سے تھے، اور جب تک صحت نے ساتھ دیا، انہوں نے اس تعلق کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم اور احقر پر ان کی شفقتیں ناقابل فراموش ہیں خاص طور سے احقر پر ان کے بہت احسانات ہیں بچپن ہی سے وہ احقر پر شفقت فرماتے، اور تعلیم کے دوران تعلیمی حالات دریافت کرتے رہتے تھے۔ میں جب عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا تو ایک مرتبہ میں نے مدرسے کے کسی جلسے میں عربی میں تقریر کی۔ مولانا انصاری صاحبؒ اس کے بعد تشریف لائے تو حسن البنا شہیدؒ کی کتاب "مذکرات الدعوۃ والداعیۃ" اپنے دستخط کے ساتھ لے کر آئے، اور مجھے دے کر فرمایا: "یہ آپ کی تقریر کا انعام ہے"

درس نظامی سے فراغت کے بعد میری انگریزی اور بعض عصری علوم کی تعلیم اور مطالعے میں بھی مولانا کے مشورے اور رہنمائی کا بڑا دخل رہا، اور متعدد تصانیف میں بھی، احقر کے بعض مقالات پر انہوں نے نظرثانی بھی فرمائی، اور اپنی مفید ہدایات سے بھی نوازا۔ اور پھر بالآخر احقر کے گوشہ عزلت سے کسی قدر باہر نکلنے کا ایک مؤثر سبب بھی وہی بنے۔

۱۹۷۷ء میں جب شہید جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم نے جناب جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب کی سربراہی میں اسلامی نظریاتی کونسل کی ازسرنو تشکیل کی تو انہوں نے اس کے ارکان کے انتخاب کے لئے جن حضرات سے مشورہ کیا، ان میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا انصاری صاحبؒ بھی شامل تھے، ان دونوں حضرات کی تجویز پر احقر کو بھی کونسل کا رکن نامزد کیا گیا، اور اس کے بعد سے تقریباً تین سال تک اسلامی نظریاتی کونسل میں احقر کو ان کی رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ تین سال کی اس مدت میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بڑے بھرپور انداز میں کام کیا۔ اس کے اجلاسات بعض اوقات کئی کئی ہفتے جاری رہتے، اور اس طرح طویل طویل مدت کے لئے ان کے ساتھ اسلام آباد میں شب و روز ساتھ رہنے کے مواقع میسر آئے۔

حضرت انصاری صاحبؒ بڑے دھیمے انداز میں سوچنے اور انتہائی غور و فکر کے بعد کوئی فیصلہ کرنے کے عادی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ضبط و تحمل کی بھی خصوصی صفت عطا فرمائی تھی، اور جلدبازی یا تیز رفتاری پر اپنی اس صفت کو قربان کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتے

تھے۔ کوئی اقدام کرنے سے پہلے وہ اس کے دور تک کے عواقب و نتائج کو اچھی طرح سوچ لینا چاہتے تھے، تاکہ جو کام ہو، وہ ٹھوس نتائج پیدا کرے، اور جلد بازی کی وجہ سے اس کے برے نتائج نہ نکلیں۔

دوسری طرف ہمیں یہ جوش تھا کہ جب ایک کام کرنے کا موقع ملا ہے تو جلد از جلد اسکے مثبت نتائج سامنے آنے چاہئیں۔ اس لئے ہم ان کی رفتار سے آگے بڑھنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ایسے ہی موقع پر جب حضرت انصاری صاحبؒ اپنی حکمت و تدبر کے تحت کسی معاملے میں کچھ دھیما چلنا چاہتے تھے، اور ہم لوگ قدرے تیز رفتاری کے خواہش مند تھے، انہوں نے ہم سے خطاب کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا جو ان کی عمر بھر کی ادھیڑ بن کی تصویر ہے فرمایا۔

اے شمع! تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
ہم نے تمام عمر گذاری ہے اس طرح

جہاں دیانت اور اخلاص ہو، وہاں اختلاف رائے بھی تقریباً ناگزیر ہوتا ہے، چنانچہ بعض مسائل میں، بالخصوص بعض فقہی معاملات میں، حضرت انصاری صاحبؒ سے اختلاف رائے بھی ہوا۔ راقم الحروف یقیناً ان کی اولاد کے درجے میں تھا، اور ان کی رائے کے خلاف باقاعدہ کوئی موقف اختیار کرنا احقر کے لئے بڑا صبر آزما اور ناخوشگوار فریضہ تھا، لیکن یہ انکی عظمت کی بات تھی کہ انہوں نے اس پر کبھی ادنیٰ تکدر کا اظہار نہیں فرمایا۔ اور انکی بزرگانہ شفقتوں میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔

اسلامی نظریاتی کونسل ہی کے زمانے میں جب کبھی کونسل کے کاموں سے کسی قدر فرصت ملتی تو مولانا کے ساتھ بڑی پر لطف مجلسیں بھی ہوتیں، اللہ تعالیٰ نے انکو قابل رشک حافظہ عطا فرمایا تھا۔ وہ برصغیر کی سیاسی تاریخ کی جزوی تفصیلات تک سے باخبر تھے، اور واقعات سنانے پر آتے تو ماضی کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے، ان کی زبانی ہر مجلس میں کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی تھی۔ ان کو شعر و ادب سے بھی بڑا لگاؤ تھا، اور وہ اس شعبے میں بھی بڑے پاکیزہ اور ستھرے ذوق کے مالک تھے۔ انہوں نے کسی دور میں خود بھی شاعری کی ہے، ان کی نظم "پیام حریت" بڑی ولولہ انگیز نظم ہے جو ان سے کئی بار سنی، اس کے علاوہ انہوں

نے غزل کے بھی بہت سے اشعار کہے، اور ایک غزل تو شدید بخار کے بحران کے عالم میں غالب کی زمین میں کہی جس کا عجیب و غریب قصہ وہ بڑے مزے سے سنایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں برصغیر کے ممتاز شعراء کا منتخب کلام حیرت انگیز حد تک ازبر تھا خصوصاً اکبر اور اقبال کے کلام کے تو وہ عاشق تھے۔ اور ان کی مجلسوں میں ان سے یہ ساری باتیں سننے کو ملتی تھیں۔

۱۹۸۳ء میں اس وقت کے صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم نے حضرت انصاری صاحبؒ کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا جسکا مقصد ملکی نظام حکومت میں اصلاح کے لئے دستوری سفارشات پیش کرنا تھا۔ اس کمیشن کے کام کے لئے انہوں نے جو غیر معمولی محنت اٹھائی، وہ انتہائی حیرت انگیز تھی، اس وقت ان کی عمر اسی سال کے لگ بھگ ہو گی، اور اس زمانے میں وہ کئی شدید بیماریوں کا شکار تھے، یہاں تک کہ انہیں اس دور میں پیشاب کے ساتھ خون آ رہا تھا، لیکن ضعف و علالت کے اس عالم میں وہ صبح سے رات گئے تک انتھک کام کرتے تھے، اور اپنی عادت کے خلاف انہوں نے کمیشن کی رپورٹ بہت تیز رفتاری کے ساتھ، یعنی تقریباً دو ہفتے میں مکمل کر کے پیش کر دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان مسائل پر وہ سالہا سال سے سوچتے چلے آئے تھے، اس لئے کسی فیصلے تک پہنچنے کے لئے وہ حزم و احتیاط کے جن مراحل کو ضروری سمجھتے تھے، وہ پہلے ہی گزر چکے تھے۔ لیکن پورے کمیشن کو ساتھ لے کر چلنے، مختلف موضوعات پر بحث اور پھر رپورٹ کی تیاری بھی بڑے وقت اور محنت کی طالب تھی، اور ایسا لگتا تھا کہ ملک وملت کی سالمیت کے لئے انہوں نے عمر بھر جو غور و فکر کیا ہے اس کے نتائج کو وہ اپنے پاس امانت سمجھتے ہیں، اور وہ ایسی شدید بیماری کے عالم میں موت و حیات سے بے نیاز ہو کر یہ چاہتے ہیں کہ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اس امانت سے عہدہ برآ ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی وقت تک اپنی اس بیماری کا باقاعدہ علاج شروع نہیں کیا جب تک وہ کمیشن کے کام سے فارغ نہیں ہو گئے۔

اتفاق سے ان دنوں میرے گھر میں بھی علالت کا سلسلہ تھا، میں نے مولاناؒ کے ارشاد پر اپنا ایک غیر ملکی سفر تو ملتوی کر دیا تھا، لیکن گھر کی علالت کی وجہ سے میں کمیشن کے کام میں کوئی مؤثر حصہ نہ لے سکا۔ ان مسائل پر حضرت انصاری صاحب کی سوچ سے احقر کو بڑی حد تک اتفاق بھی تھا، اور بعض امور میں اپنی رائے زبانی عرض بھی کر دی تھی، اس لئے میں

شروع کے ایک دو روز شرکت کرنے کے بعد گھریلو مجبوری کی وجہ سے چند روز کے لئے کراچی چلا آیا۔ اور جب واپس پہنچا تو کام کا بڑا حصہ گزر چکا تھا۔ میں نے مولاناؒ کے سامنے اپنی مجبوری ذکر کر کے معذرت کی، تو انہوں نے فرمایا:

بیشتر مسائل میں آپ کی رائے تو مجھے معلوم تھی۔ البتہ میری خواہش یہ تھی۔ کہ آپ کا قلم ہمیں میسر آجاتا۔ یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ تاہم جو کچھ لکھا گیا ہے، آپ دیکھ لیجئے، اور جہاں ترمیم کی ضرورت ہو، مجھے بتا دیجئے۔

احقر نے رپورٹ دیکھی، جوہری معاملات میں تو احقر کو اتفاق ہی تھا۔ البتہ بعض جزوی معاملات اور بعض جگہ بات کہنے کے انداز میں کچھ ترمیمات ذہن میں آئیں، لیکن مولاناؒ کی صحت کا حال دیکھ کر تقاضا یہ ہوا کہ ان کا جلد از جلد اس رپورٹ سے فارغ ہو جانا ضروری ہے تاکہ وہ آمادۂ علاج ہو سکیں۔ اس لئے بعض جزوی باتوں سے صرف نظر کرنا مناسب معلوم ہوا۔ اور اس طرح وہ رپورٹ تیار ہوئی۔

چند سال سے حضرت انصاری صاحبؒ کی صحت بہت کمزور ہو گئی تھی، بینائی، سماعت اور چلنے کی صلاحیت ہر چیز متاثر ہوئی تھی، لیکن ذہنی اور فکری طور پر وہ آخر وقت تک چاق و چوبند رہے، پرانی باتیں اسی طرح یاد رہیں، اور عملی زندگی سے کنارہ کش ہونے کے باوجود وہ ملک و ملت کے مسائل میں آخر وقت تک غلطاں پیچاں رہے۔

کافی عرصے سے وہ سعید منزل سے اپنے صاحبزادے ڈاکٹر ظفر اسحٰق صاحب کے مکان میں گلشن اقبال منتقل ہو چکے تھے، اور یہاں ان کی بیٹھک کی وہ رونق باقی نہ رہی تھی، لیکن ان سے محبت کرنے والے یہاں بھی پہنچتے رہتے تھے۔ احقر کو ناگوں مصروفیات کی وجہ سے بہت کم ان کی خدمت میں حاضر ہو پاتا تھا، اور جب بہت دن گزر جاتے تو وہ خود فون پر یاد فرما لیتے، کبھی یہ شکایت تو نہیں کی کہ تم بہت کم آتے ہو، لیکن ہر مرتبہ یہ فرماتے کہ ""میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کی طرف آؤں، مگر کوئی نہ کوئی عذر پیش آجاتا ہے۔"" ان کا یہ جملہ شرم دلانے کے لئے کافی ہوتا، اور میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتا۔ وہ لکڑی کے سہارے بھی مشکل سے چل پاتے تھے، اور ان کو اندر سے ڈرائنگ روم میں آتے دیکھ کر بھی دل پر بوجھ ہوتا تھا کہ ہمارے آنے سے انہیں تکلیف ہوئی، لیکن جب بیٹھتے تو باتیں اسی شان سے شروع ہو جاتیں جیسے ان کے فکر و تعقل نے بڑھاپے کو ذرہ برابر تسلیم نہیں کیا۔

وضعداری کا عالم یہ کہ پچھلے سال میرے بڑے بھائی جناب محمد رضی عثمانی صاحب مرحوم کا انتقال ہوا تو اس ضعف و علالت کے عالم میں تعزیت کے لئے ہمارے نسبیلہ کے مکان پر تشریف لائے اور سیڑھیاں نہ چڑھ سکنے کی وجہ سے دیر تک گیٹ ہی پر بیٹھے رہے۔

آخر میں میں ان کے فاضل صاحبزادے ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری صاحب نے جو آج کل ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر ہیں، ان سے درخواست کر کے انھیں اپنے پاس اسلام آباد بلا لیا تھا۔ میں نومبر کو ایک میٹنگ کے سلسلے میں اسلام آباد گیا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ضعف کا بھی وہی عالم تھا۔ اور حاضر دماغی کا بھی، صحت دریافت کرنے پر اپنی حالت تو مختصر لفظوں میں بیان کر دی، لیکن پھر وہی علمی اور ملی مسائل شروع ہو گئے۔ اس وقت ایک سیاسی رہنما نے مخلوط انتخاب کے حق میں بیان دیا تھا۔ اس کے بارے میں دیر تک تبصرہ کرتے رہے کہ مخلوط انتخاب کس بنا پر پاکستان کے لئے مہلک ہے، اس نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں کیا کردار ادا کیا؟ اور اس سے ملک کی نظریاتی بنیادوں پر کس طرح ضرب لگتی ہے؟ پھر عربی حروف میں بنگلہ زبان لکھنے اور اس طرح کا ایک قرآن کریم کا ترجمہ شائع کرنے کے لئے انہوں نے سالہا سال جو خدمت انجام دی، اسکا تذکرہ فرماتے رہے، اور اس سلسلے میں احقر کو کچھ ہدایات بھی دیں۔ دوپہر کا کھانا بھی میں نے ان کے اور ڈاکٹر ظفر اسحٰق صاحب کے ساتھ کھایا۔ پھر میں نے ان سے رخصت چاہی، اور انہوں نے محبت کے ساتھ رخصت کیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہو گی۔ بالآخر ۱۹ دسمبر کی رات میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، اور ۲۰ دسمبر کو جمعہ کے دن عصر کے بعد وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے، وہ روح جو عمر بھر ملک و ملت کے لئے بے قرار رہی، آخر کو ان تمام بکھیڑوں سے نجات پا گئی، اور ع

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیں، انکی زلات و سیآت کی مکمل مغفرت فرما کر انھیں مقامات قرب عطا فرمائیں، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق مرحمت فرمائیں، آمین۔

البلاغ جلد ۲۶ شمارہ ۸، ۹

اہلیہ محترمہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

۱۱ رمضان ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء کو ہم سب کے سروں سے ایک گھنیر سایہ رحمت اٹھ گیا، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی چھوٹی اہلیہ محترمہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو کر اپنے مالک حقیقی سے جاملیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون مرحومہ موصوفہ کو حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے متوسلین کے حلقوں میں عموماً "چھوٹی پیرانی صاحبہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، اور حضرت والاؒ کے خصوصی متعلقین کے درمیان "آپا جی" کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔

احقر کو حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی زیارت تو نصیب نہ ہوئی، کیونکہ حضرت کی وفات احقر کی پیدائش سے بھی تین ماہ قبل ہو چکی تھی۔ لیکن بحمد اللہ حضرت پیرانی صاحبہؒ کی بے پایاں شفقتیں ہمارے حصے میں آئیں۔ بچپن میں تو پردے کا بھی کوئی سوال نہیں تھا، اور انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رحمت و شفقت نے مجسم ہو کر ایک انسانی وجود اختیار کر لیا ہے۔ ان کی ادا ادا میں بلا کی معصومیت اور بات بات میں خلوص و محبت کی ایسی مٹھاس تھی جو نفاق اور لگاوٹ کی اس دنیا میں متاع نایاب سے کم نہیں۔ ان کا دامن شفقت حضرت حکیم الامتؒ کے تمام متعلقین کے لئے ہمیشہ کشادہ تھا، اور وہ اہل تعلقات کے مسائل میں اس طرح شریک رہتیں جیسے وہ ان کے گھر اور ان کے خاندان کے افراد ہیں۔ ایک ایک شخص کے حالات اور مسائل سے باخبر رہ کر وہ پیچیدہ مسائل کی گتھیاں شفقت اور حسن تدبیر سے سلجھاتیں، اور حضرت کے متوسلین کو ان کی ذات میں ایک شفیق ترین ماں کے وجود کا احساس ہوتا، جس سے قلب پر ایک ہمہ وقتی ڈھارس موجود رہتی تھی۔ آج ہم اس ڈھارس اور اس سایہ شفقت و رحمت سے محروم ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حضرت پیرانی صاحبہؒ کی زندگی ایک مثالی مومن خاتون کا مجسم نمونہ تھی۔ مجھے بچپن

ہی سے جب کبھی اسلاف کی بزرگ خواتین مثلاً حضرت رابعہ بصریہؒ وغیرہ کا تصور آتا تو حضرت پیرانی صاحبہؒ کی صورت میں آتا جنہیں ہمارے گھر میں قدرے بے تکلفی سے "آپا جی" بھی کہا جاتا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی سیرت و کردار اور اخلاق و اعمال میں اسلامی تعلیمات کی خوشبو اس طرح رچی بسی ہوئی تھی کہ ان کے انداز و ادا سے اسلامی طریق زندگی کی تعلیم حاصل کی جا سکتی تھی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کا پہلا نکاح گنگوہ میں ۱۲۹۸ء میں ہوا تھا۔ اور نکاح قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے پڑھایا تھا۔ یہ پہلی اہلیہ محترمہ خود بھی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے بیعت تھیں اور نہایت متقی اور پارسا خاتون تھیں۔ پھر دوسرا نکاح رمضان ۱۳۳۲ھ میں چھوٹی اہلیہ محترمہ سے ہوا۔ یہ آپ کے بھانجے مولانا سعید احمد تھانویؒ کی بیوہ تھیں، اور ان کے انتقال کے ایک سال بعد آپ نے ان سے نکاح فرمایا، جس کے وجوہ و اسباب کی تفصیل حضرت نے خود اپنے رسالے "الخطوب المذیبۃ للقلوب المنیبۃ" میں تحریر فرمائی ہے۔

اسلام میں مرد کو چار شادیوں تک کی اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ تمام بیویوں کے درمیان مکمل عدل و انصاف کا برتاؤ کر سکے۔ جب حضرت نے دوسرا نکاح فرمایا تو پہلی اہلیہ محترمہ نے ایک مرتبہ ذکر کیا کہ "آپ نے اپنے متعلقین کے لئے دوسری شادی کرنے کا دروازہ کھول دیا ہے۔" اس پر حضرتؒ نے جواب دیا: "میں نے عقد ثانی کا دروازہ کھولا نہیں ہے، بلکہ بند کر دیا ہے، کیونکہ جب لوگ یہ دیکھیں گے کہ دو بیویوں میں اتنی رعایت کرنا پڑتی ہے تو اس کو دشوار سمجھ کر عقد ثانی کی ہمت ہی نہ کر سکیں گے۔"

اور واقعہ یہی ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اپنی دونوں ازواج کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھنے کے لئے جو غیر معمولی انتظام قائم فرمایا تھا، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ایک مرتبہ یہاں تک فرمایا کہ "میں تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلاف عدل سمجھتا ہوں، کیونکہ اس سے ان کی طرف توجہ میں کمی ہوگی جس کی باری ہے۔ اور یہ حق تلفی ہے۔ اسی طرح میں اپنے کپڑے خانقاہ ہی میں رکھتا ہوں، کیونکہ اگر میں ایک گھر میں رکھتا تو دوسرے گھر والوں کو شکایت ہو سکتی تھی کہ ہمارے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں جتنی دوسری کے ساتھ ہے۔"

غرض مقصود یہ ہے کہ نقد یا غیر نقد جو کچھ دیتے وہ دونوں گھروں میں برابر ہوتے، یہاں تک کہ جن چیزوں کا وزن ممکن ہے، ان کے وزن کے لئے خانقاہ ہی میں ترازو رکھی ہوئی تھی۔

حضرت والاؒ کے خلیفہ اجل حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی مدظلہم العالی نے ایک دفعہ یوں فرمایا کہ:

"ایک دن مجلس میں ایک دیہاتی دو تربوز لے کر حاضر ہوا۔ حضرتؒ نے پوچھا "بھائی! یہ دو تربوز کیسے؟" اس نے کہا "حضرت! آپ کی دو بیویاں نہیں ہیں کیا؟" حضرت نے فرمایا "بھائی ہیں تو!" تو اس نے کہا "ایک ایک بیوی کے لئے، دوسرا دوسری بیوی کے لئے ہے۔" حضرتؒ نے فرمایا "یہ کیسے معلوم ہوگا کہ دونوں برابر ہیں یا کم زیادہ؟" اس نے کہا "میں دونوں وزن کرکے لایا ہوں، دونوں ہم وزن ہیں" حضرتؒ نے فرمایا "یہ کیسے معلوم ہوگا کونسا میٹھا ہے اور کونسا پھیکا؟" تو اس دیہاتی نے کہا "میں اندر تھوڑا ہی گھسا ہوں، جو دیکھتا کہ اندر سے کیسا ہے؟" حضرتؒ نے دونوں تربوز نصف نصف کرکے ایک کا نصف دوسرے کے ساتھ اور دوسرے کا نصف پہلے کے ساتھ کرکے خادم کو دونوں گھر پہنچانے کا حکم دیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس دیہاتی نے عرض کیا "مولوی جی! تو تو بڑی تکلیف میں ہے" حضرتؒ نے فرمایا "بھائی! یہاں کی تھوڑی سی تکلیف گوارا ہے، آخرت کی بڑی تکلیف سے بچنے۔"

(منقول از ماہنامہ الحسن لاہور شمارہ نومبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۵)

حضرتؒ کی بڑی اہلیہ محترمہ کا انتقال حضرتؒ کی وفات کے کچھ عرصے بعد ہندوستان ہی میں ہو گیا تھا، لیکن چھوٹی اہلیہ محترمہ بحمداللہ حضرتؒ کی وفات کے بعد تقریباً نصف صدی تک بقید حیات رہیں۔ آپ کی اپنے پہلے شوہر مولانا سعید الحسن تھانویؒ سے ایک صاحبزادی تھیں جو حضرت تھانوی قدس سرہ کی ربیبہ تھیں، اور حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہم کے نکاح میں آئیں۔ حضرت پیرانی صاحبہ قدس سرہا اپنی ان صاحبزادی کے ساتھ لاہور آگئیں اور آخر وقت تک حضرت مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہم العالی کے گھر میں مقیم رہیں۔ حضرت مفتی صاحب مدظلہم اور ان کے اہل خانہ کو حضرت پیرانی صاحبہ کی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی جسکا ماشاءاللہ انہوں نے خوب حق ادا کیا۔

حضرت حکیم الامتؒ کی وفات کے بعد حضرت پیرانی صاحبہ پچاس برس تک بقید حیات

رہی اور ان کا وجود متعلقین کے لئے بڑی ڈھارس اور تسلی کا موجب بنا رہا۔ اب کچھ عرصے سے ان کی علالت نے سنگین نوعیت اختیار کر لی، اور بالآخر ۸ رمضان [illegible]ھ کو ان کا وقت موعود آن پہنچا، اور وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔

اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں مقام قرب و درجات عطا فرمائیں، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں۔ آمین، اللھم اکرم نزلھا ووسع مدخلھا ونقھا من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس۔

البلاغ جلد ۲۶ شمارہ ۱۲

مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ

(خلیفۂ اجل حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۹۲ء کی تاریخ دین اور علمِ دین سے تعلق رکھنے والوں کے لئے جس جانکاہ حادثے کی خبر لے کر آئی وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے خلیفہ اجل حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ کی وفات حسرت آیات کا حادثہ تھا۔ حضرت قدس سرہ کی ذات اس وقت ایک ایسا چشمہ فیض تھی جس سے نہ صرف برصغیر، بلکہ افریقہ، یورپ اور امریکہ کے دور دراز علاقوں کے مسلمان مستفید ہو رہے تھے، جس نے اس انحطاط پذیر زمانے میں اتباع سنت پر مبنی دین کی خالص اور بے غل و غش فہم کو عملی صورت میں مجسم کر کے دکھایا، اور جس نے شریعت و طریقت کا حسین امتزاج اپنے قول و فعل اور تعلیم و تربیت کے ذریعے عام کر کے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے فیوض کو تر و تازہ بنا رکھا تھا۔ آج یہ مقدس وجود ہم سے جدا ہو گیا، اور ہم اس دریائے فیض سے محروم ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے گذشتہ صدی میں تجدید و احیائے دین کے سلسلے میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے، ان کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ آپ نے تعلیم و تربیت اور ارشاد و اصلاح کے ذریعے اپنے خلفاء کی ایک بڑی جماعت تیار کی جو اپنے شیخ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اور جن کا مزاج و مذاق حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی تعلیمات کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ ان خلفاء نے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی وفات کے بعد بھی اصلاح و ارشاد کا یہ سلسلہ جاری رکھا، اور چار دانگ عالم میں اپنے فیوض پھیلائے، لیکن رفتہ رفتہ یہ نفوس قدسیہ بھی راہی آخرت ہوتے گئے۔ پاکستان میں اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ تھے، اور ان کی وفات کے بعد صرف ہندوستان میں حضرت حکیم الامتؒ کے دو خلفاء باقی رہ گئے تھے، ایک۔ حضرت مولانا

مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ اور دوسرے حضرت مولانا ابرار الحق صاحب مدظلہم العالی۔ اب حضرت مولانا بھی ہم سے رخصت ہوگئے اور اب حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء میں سے صرف حضرت مولانا ابرار الحق صاحب مدظلہم باقی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا سایہ رحمت ہم پر تادیر بعافیت سلامت رکھیں۔ آمین ثم آمین۔

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ حضرت حکیم الامتؒ کے ان خلفاء میں سے تھے جنہوں نے سالہا سال اپنے شیخ کی صحبت اٹھائی، اور ان کے رنگ کو اپنی زندگی میں اس طرح جذب کیا کہ ان کا وجود اپنے شیخ کی زندہ یادگار بن گیا۔

آپ ۱۳۲۹ھ میں ضلع علی گڑھ کی ایک بستی سرائے برلہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد جناب حامد حسین خان صاحب شیروانی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور اپنے علاقے میں بڑے بااثر اور ہردلعزیز سمجھے جاتے تھے۔ حضرت کو بچپن ہی سے عبادات و طاعات کا ذوق تھا، بچپن ہی میں نوافل، تہجد اور ذکر کے عادی ہوگئے تھے۔ آپ کے ایک رشتہ دار مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت تھے، آپ اکثر ان کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے، اور انہی کے ذریعے آپ کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے مواعظ مطالعے کیلئے میسر آئے جس کے نتیجے میں آپ کو حضرت حکیم الامتؒ سے غائبانہ طور پر ہی خصوصی محبت و عقیدت پیدا ہوگئی۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی کے ایک سرکاری اسکول میں درجہ ششم تک حاصل کی، اور اس کے ساتھ بہشتی زیور اور حضرت حکیم الامت کے مواعظ کا مطالعہ جاری رکھا۔ اسکول میں آپ ہمیشہ ممتاز نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے، لیکن طبیعت چونکہ ابتدا ہی سے دینی تعلیم کی طرف راغب تھی، اس لئے کچھ عرصے کے بعد والد صاحب نے آپ کا طبعی رجحان دیکھتے ہوئے آپ کو فارسی اور عربی کی تعلیم شروع کرادی۔ ابتدا سے مشکوٰۃ شریف تک کی تعلیم آپ نے اپنے وطن ہی میں حاصل کی، آپ کے اس وقت کے اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب لکھنویؒ بطور خاص قابل ذکر ہیں، جن سے حضرتؒ نے مشکوٰۃ سمیت درس نظامی کی بہت سی کتابیں پڑھیں، لیکن یہ عجیب بھی استاد اور شاگرد دونوں کے انتہائی اخلاص اور دونوں کے مقام بلند کا کرشمہ ہے کہ بعد میں جب شاگرد کو حضرت حکیم الامتؒ سے بیعت و ارشاد کی اجازت حاصل ہوئی تو استاد نے اپنی اصلاح کے

لئے شاگرد سے رجوع کیا، اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحبؒ نے اپنے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اللہ اکبر! ایک طرف حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ کے مقام کا اندازہ لگایئے کہ ان کے استاذ نے بیعت ارشاد کے لئے ان کا انتخاب کیا، اور دوسری طرف حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحبؒ کے اخلاص اور بے نفسی کا عالم دیکھئے کہ اپنے شاگرد کو اپنا شیخ طریقت بنانے میں کوئی حجاب مانع نہیں ہوا۔ باوجود یہ کہ وہ خود حضرت تھانویؒ کی طرف سے مجاز صحبت قرار دیئے جاچکے تھے۔ سچ ہے کہ جب دل میں فکرِ آخرت بیدار ہوتی ہے، اور انسان کو اپنی اصلاح کی فکر دامنگیر ہوتی ہے تو رسوم وقیود کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی فکر انسان کے سینے میں بسے ہوئے خودپسندی کے تمام بتوں کو پاش پاش کردیتی ہے، پھر اندر سے اللہ کی بندگی میں ڈوبا ہوا وہ انسان ابھرتا ہے جس کی پاکیزگی اور تقدس پر فرشتے رشک کرتے ہیں، اور جس کی لغت میں نام و نمود، ذاتی شہرت پسندی اور عجب و تکبر کے الفاظ نہیں ہوتے، پھر اس کی سیرت و کردار کی مشک ہر اس شخص کو معطر کرتی ہے جو اس سے چھو کر گذر جائے، لیکن اس بھری پُری دنیا میں عظمت کردار کے ایسے نگینے خال خال ہی وجود میں آتے ہیں۔

بہرکیف! حضرتؒ نے اپنا زمانۂ طالب علمی اس طرح گذارا کہ اساتذہ تو ان کی ذہانت وذکاوت اور متانت کردار کے معترف تھے ہی، والد صاحب بھی آپ کی نیکی کا اس درجہ احترام کرتے تھے کہ اپنے اس بیٹے سے اپنے حقے کی چلم کبھی نہیں بھروائی، حضرتؒ نے بعض مرتبہ والد کی خدمت کے شوق میں یہ کام کرنے کی کوشش کی، لیکن والد صاحب نے سختی سے انکار کردیا۔

حضرتؒ نے مشکوٰۃ شریف تک تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرنے کے بعد دورۂ حدیث کیلئے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا، اور وہاں اپنی تعلیم کی تکمیل فرمائی، جن بزرگوں سے وہاں آپ نے استفادہ کیا، ان میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی صاحبؒ بطور خاص قابل ذکر ہیں، اور اسی زمانے میں حضرتؒ نے احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ سے بھی تعلیم حاصل کی ہے۔

حضرت حکیم الامت سے عقیدت و محبت تو بچپن ہی سے تھی، حضرت کی علی گڑھ تشریف آوری کے موقع پر زیارت بھی ہو چکی تھی، لیکن باقاعدہ بیعت اور اصلاحی خط و کتابت کا آغاز دارالعلوم دیوبند میں داخلے کے بعد ہوا، اور چھٹیوں میں تھانہ بھون حاضری کا بھی معمول رہا۔ یہاں تک کہ جس سال آپ دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے "یعنی ۱۳۵۱ھ" اسی کے فوراً بعد شوال ۱۳۵۱ھ میں حضرت حکیم الامتؒ نے آپ کو بیعت کی اجازت بھی مرحمت فرمادی۔ یوں تو حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء کی فہرست کافی طویل ہے، لیکن حضرت نے اپنے زمانہ علالت میں خاص طور پر "گیارہ خلفاء مجازین کے نام شائع فرمائے تھے جن کے بارے میں یہ تصریح فرمائی تھی کہ ان کے طرز تعلیم پر مجھے اعتماد ہے۔ ان منتخب خلفاء میں حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔

بلکہ یہ امتیاز بھی شاید حضرت والاؒ ہی کو حاصل ہوا کہ حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے متعلقین میں سے ایک صاحب کو اس شرط پر اپنی خانقاہ میں آنے کی اجازت دی کہ وہ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ سے اپنا اصلاحی تعلق قائم کریں، اور ہر ماہ جو خط و کتابت ہو، وہ مجھے (یعنی حضرت حکیم الامتؒ کو) دکھایا کریں۔ چنانچہ دو تین سال تک برابر وہ حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں اپنے خطوط اور حضرت مولانا مسیح اللہ خان قدس سرہ کے جوابات پیش کرتے رہے، لیکن حضرت الامتؒ نے آپ کے کسی جواب پر کوئی گرفت نہیں فرمائی۔

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کی اس خصوصی نظر شفقت کا اثر تھا کہ حضرت مولاناؒ کی تعلیم و تربیت کا فیض دور دور تک پھیلا۔ حضرت حکیم الامتؒ کے ارشاد پر آپ نے جلال آباد میں قیام فرمالیا تھا اور وہاں مفتاح العلوم کے نام سے ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی، اور تقریباً نصف صدی تک اسی مدرسے کو فیض رسانی کا مرکز بنائے رکھا۔ وہیں پر درس و تدریس، تصنیف و تالیف، وعظ و ارشاد اور مدرسے کے انتظام و انصرام کی خدمات میں مشغول رہے۔ یہیں پر عرصہ دراز تک صحیح بخاری شریف کا درس دیا جس کی تقریر کا کچھ حصہ شائع بھی ہو چکا ہے۔

جن حضرات نے حضرت موصوفؒ کی زیارت کی ہے اور جلال آباد میں آپ کی مصروفیات کا مشاہدہ کیا ہے وہ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے ہوں گے کہ حضرتؒ کی زندگی سراپا کرامت ہے۔ احقر کو یہ شرف بالکل آخری دور میں حاصل ہوا جب آپ کے ضعف و علالت

کا دور تھا، اور آپ قریبی مسجد تک بھی سہارے سے تشریف لے جاتے تھے، لیکن اس ضعف کے عالم میں بھی معمول یہ تھا کہ تہجد کے وقت سے جو کام میں لگتے، مغرب کے وقت تک مسلسل کام میں مشغول رہتے۔ فجر کے بعد برائے نام ناشتہ فرماتے، اور پھر مغرب تک کچھ تناول نہیں فرماتے تھے۔ اور فجر کے بعد سے مسلسل اپنی نشست پر دوزانو بیٹھے رہتے، احقر نے کبھی آپ کو چار زانو بیٹھے نہیں دیکھا۔ اسی انداز نشست پر بیٹھ کر اہل حاجت کی حاجتیں پوری فرماتے۔ جس کا جی چاہتا، بیٹھک کی چق اٹھا کر اندر آ جاتا، اور اپنی ضرورت بیان کرتا، حضرتؒ پوری خندہ پیشانی سے اس کا کام کرتے، بیچ بیچ میں ڈاک کے جواب کا سلسلہ جاری رہتا، ساری دنیا سے متوسلین کے خطوط آتے تھے، اور ڈاک کے ذریعے ان کے باطنی مسائل کا حل تجویز فرمایا جاتا، صبح نو بجے سے مجلس عام شروع ہوتی، اور وہ دو تین گھنٹے تک علوم ومعارف کے دریا بہتے رہتے۔ اس دوران کوئی محسوس بھی نہ کر سکتا تھا کہ حضرتؒ ضعف کے اس عالم میں ہیں، بعض اوقات مجلس تین گھنٹے سے بھی زیادہ طویل ہو جاتی مگر حضرتؒ پر تعب کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ان مجالس میں تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف و طریقت کے دینی علوم کا ناپیدا کنار سمندر رواں دواں رہتا تھا۔ اور اس پورے عرصے میں حضرتؒ کی نشست نہیں بدلتی تھی۔ مجلس کے بعد پھر دوسرے کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا، اور نماز کے اوقات کو چھوڑ کر مغرب تک جاری رہتا تھا۔

تواضع، سادگی اور فنائیت کا یہ عالم تھا کہ اپنے آپ کو دنیا بھر کا خدمت گذار سمجھا ہوا تھا۔ مدرسے کے طلبہ کی بیماری کی خبر سنتے تو ان کی نہ صرف بیمار پرسی، بلکہ اپنے ہاتھوں سے ان کی خدمت کرتے، ایک نو مسلم طالبعلم کی تمام ضروریات کی کفالت آپ نے اپنے ذمے رکھی تھی، وہ صاحب کچھ عجیب طبیعت کے واقع ہوئے تھے۔ جب ان کے جی میں آتا، عین مجلس میں آکر ایسی باتیں حضرت والاؒ سے کہہ دیتے جو سننے والوں کو گستاخانہ معلوم ہوتیں، دکانداروں سے قرض کر لیتے، اور پھر آکر تقاضا کرتے کہ مجھے پیسے چاہئیں۔ ایک مرتبہ مجلس میں آئے اور کہنے لگے کہ "ہمارے جوتے ٹوٹ گئے ہیں، اور بنوا دیجئے" حضرتؒ نے فرمایا کہ "ابھی تو خرید کر دیئے تھے، تھوڑے سے ٹوٹے ہوں گے، مرمت کروا دی جائے گی"۔ انہوں نے کہا "ہمیں معلوم نہیں، آپ دیکھ لیجئے"۔ آپ نے فرمایا "لاؤ، دیکھ لوں" اس پر انہوں نے کہا۔ "وہ پڑے ہیں چق کے باہر، آپ دیکھ لیجئے" ان کے اس جواب پر حضرت والاؒ مجلس سے

اٹھ کر دھوپ میں باہر تشریف لائے، جہاں بہت سے جوتے رکھے تھے۔ چونکہ آپ کو ان کے جوتے کی پہچان نہیں تھی، اس لئے مختلف جوتے اٹھا اٹھا کر فرماتے رہے کہ "یہ تمہارے جوتے ہیں؟" اور وہ صاحب اندر ہی اندر سے انکار کرتے رہے۔ بالآخر جب دیر گزر گئی تو حاضرین میں سے کسی صاحب نے ان سے کہا کہ "تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ آگے بڑھ کر دکھلا دو" اس پر انہوں نے اپنے جوتے دکھائے، اور حضرتؒ نے مرمت کے لئے پیسے دیئے۔

کسی نے ان صاحب کے بارے میں حضرتؒ سے عرض کیا کہ یہ صاحب ایسی بے تکی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ "بھائی حضرت تو سب لوگ کہتے ہیں، کوئی ایسا بھی تو ہو جس سے میں اپنے آپ سنبھالا رہوں، اور میری اصلاح ہوتی رہے"۔

ایک مرتبہ حضرتؒ مدرسہ تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں ایک بڑے میاں اپنے مکان کے دروازے کے باہر چارپائی پر لیٹے ہوئے کراہ رہے تھے۔ حضرت والاؒ نے ان سے سلام کے بعد حال دریافت کیا، انہوں نے کمر میں درد کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا "لائیے میں آپ کی کمر دبا دوں" انہوں نے سختی سے انکار کیا، آپ اس وقت تو مدرسہ تشریف لے گئے، لیکن رات کو عشاء کے بعد پھر ان کے پاس پہنچ گئے، اور ان کی کمر دبانی شروع کر دی، اور ان کے انکار پر فرمایا کہ صبح تو دوسرے حضرات بھی موجود تھے آپ ان سے شرماتے ہوں گے، لیکن اس وقت کوئی نہیں ہے، اب دبوا لیجئے، آپ کو آرام آ جائے گا۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے اصلاحی تعلق قائم ہونے کے بعد آپ پر مخلوق خدا پر شفقت کا ایک خاص حال اس درجہ طاری ہوا کہ انسان تو انسان کسی جانور اور کیڑوں مکوڑوں کو بھی اپنی ذات سے کوئی ادنیٰ تکلیف پہنچنا بے حد شاق گذرتا تھا۔ یہاں تک کہ موذی حشرات الارض کو بھی اپنے ہاتھ سے مارنے پر قدرت نہ ہوتی تھی۔ جس شخص کا جانوروں کے ساتھ یہ معاملہ ہو، وہ انسانوں کی تکلیف کا کس درجہ خیال رکھے گا؟ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت والا کا مستقل قیام اگرچہ جلال آباد میں تھا، لیکن دعوت و ارشاد کے مقصد سے آپ نے اطراف ملک اور بیرون ملک سفر بھی بہت سے کئے۔ برصغیر کے علاوہ جنوبی افریقہ، برطانیہ، فرانس، امریکہ، پاناما، مصر وغیرہ کے دورے فرمائے، اور اس طرح آپ کا علمی اور روحانی فیض ان تمام علاقوں میں پہنچا، اور دنیا کے ان تمام خطوں میں آپ کے متوسلین اور

متعلقین موجود تھے جو خط و کتابت کے ذریعے آپ سے اصلاحی تعلق استوار کئے ہوئے تھے، ان حضرات کے خطوط کا ایک انبار ہروقت آپ کے سامنے موجود رہتا، اور ہر خط کا اطمینان بخش جواب مختصر مدت میں روانہ ہو جاتا۔

حضرتؒ کا تذکرہ احقر نے بچپن میں سب سے پہلے اپنے استاذ گرامی قدر حضرت مولانا محمد سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم (صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان و مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی) سے سنا جو مدتوں حضرتؒ کے مدرسے میں تدریسی اور انتظامی خدمات انجام دیتے رہے تھے، اور بعد میں پاکستان تشریف لے آئے تھے۔ اسی زمانے میں حضرتؒ دو ایک مرتبہ کراچی تشریف ______________ لائے تو دارالعلوم میں بھی تشریف آوری ہوئی اور حضرت والد ماجد صاحب قدس سرہ سے ملاقات فرمائی۔ پہلی بار آپ کی زیارت اسی موقع پر ہوئی، ایک انتہائی سادہ اور متواضع وجود، جسمانی اعتبار سے منحنی، لیکن سرخ و سفید چہرہ مبارک پر زہد و عبادت کے انوار، کم گوئی اور فروتنی کی وجہ سے کوئی اندازہ بھی نہ لگا سکتا تھا کہ یہ مشت استخواں علوم و معارف کے کتنے دریا سینے میں جذب کئے ہوئے ہے۔

آپ بکثرت لاہور بھی تشریف لاتے تھے، اور اپنے بھانجے اور داماد جناب مولانا وکیل احمد شیروانی صاحب مدظلہم کے یہاں قیام فرماتے تھے، وہاں بھی متعدد مرتبہ زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ پھر جب احقر کے شیخ و مربی سیدی و سندی حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی قدس سرہ کی وفات ہوئی تو احقر پر ایک عالم حسرت طاری تھا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ جیسے شیخ کامل سے جو فائدہ اٹھانا چاہئے تھا، میں اپنی نااہلی کی بنا پر نہیں اٹھا سکا۔ دوسری طرف حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ایک لق و دق صحرا میں تنہا کھڑا رہ گیا ہوں۔

اس موقع پر قلب میں شدت کے ساتھ یہ تقاضا پیدا ہوا کہ حضرتؒ کے بعد اپنی نگرانی اور اصلاح کیلئے حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ سے اصلاحی تعلق قائم کروں، چنانچہ احقر نے آپ کی خدمت میں اس مقصد کے لئے عریضہ لکھا۔ حضرت والاؒ کا جواب ملا کہ :

"احقر تو خادم ہے، جو چاہے، استقامت کے ساتھ خدمت لے۔"

اس کے بعد بفضلہ تعالیٰ خط و کتابت کے ذریعے حضرتؒ سے اصلاحی تعلق تقریباً سات سال قائم رہا۔ اس دوران اتفاق سے حضرت والاؒ کی پاکستان (لاہور) تشریف آوری صرف ایک مرتبہ ہوئی۔ اس موقع پر بفضلہ تعالیٰ حضرتؒ کی مجالس میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد دو مرتبہ احقر بھی جلال آباد حاضر ہوا اور حضرت والاؒ کے سایۂ شفقت میں چند روز گذارنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ حضرتؒ نے بے پایاں عنایتوں سے ہمیشہ نہال فرمایا۔ جلال آباد کے قیام کے دوران روزانہ حضرتؒ کی مجلس میں حاضری کی توفیق ہوئی، اس زمانے میں حضرتؒ تین تین گھنٹے، بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زائد بیان فرماتے، لیکن محویت کا عالم یہ ہوتا کہ یوں محسوس ہوتا جیسے یہ وقت پلک جھپکتے گذر گیا، اور جو علوم و معارف وہاں سننے میں آتے، ان کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

احقر کو جسمانی حاضری اور براہِ راست صحبت سے استفادے کا موقع تو بہت کم ملا، لیکن الحمدللہ، مراسلت کے ذریعے اپنے تقریباً تمام کاموں میں حضرتؒ سے رہنمائی حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ خط جانے اور جواب آنے میں کم از کم بیس دن لگ جاتے تھے، لیکن جب ڈاک میں حضرتؒ کا مکتوب گرامی نظر نواز ہوتا تو ایک عجیب سرور محسوس ہوتا، اور جواب پڑھ کر دیر تک سرور طاری رہتا۔

حضرتؒ کا ضعف تو عرصے سے روز افزوں تھا، لیکن معمولات میں فرق نہیں آتا تھا، اب چند ماہ پہلے معلوم ہوا کہ ضعف اتنا بڑھ گیا ہے کہ مسجد تک بھی نہیں جا پاتے، اور مجلس کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ ڈاک کا جواب بھی نہیں لکھ رہے ہیں، بیچ میں کبھی کبھی افاقے کی خبریں بھی آتی رہیں۔ احقر نے ۲ نومبر کو ہندوستان جانے کا ارادہ کیا ہوا تھا، اور جلال آباد حاضر ہونے کا قصد تھا، لیکن اچانک ازبکستان کا سفر پیش آگیا، اور ہندوستان کا سفر وہاں سے واپسی پر ملتوی کر دیا۔ لیکن حضرتؒ کی زیارت مقدر میں نہ تھی، ازبکستان سے واپسی کے چند ہی دن بعد اچانک حضرت والاؒ کے وصال کی خبر آئی، جمعرات کا دن گذرنے کے بعد جمعہ کی شب میں حضرتؒ نے بلند آواز سے ذکر شروع کیا، اور ذکر کرتے کرتے ہی دنیا سے کوچ فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جمعہ کے دن حضرت والاؒ کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ سنا ہے کہ حضرت مولانا عنایت اللہ صاحب مدظلہم العالی نے نماز جنازہ پڑھائی۔

البلاغ جلد ۲۷ شمارہ ۹

حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی صاحب ؒ

۶ رجب ۱۴۱۵ھ کی صبح کو میں جامعہ امدادیہ کے ختم بخاری کے اجتماع میں شرکت کے لئے فیصل آباد ایئرپورٹ پر اترا تو حضرت مولانا نذیر احمد صاحب مدظلہم نے یہ المناک خبر سنائی کہ حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی ؒ آج صبح رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی ؒ ان خوش نصیب ہستیوں میں سے تھے جنہیں خانقاہ اشرفیہ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ؒ کے زیر سایہ ایک طویل عرصہ گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ چونکہ حکیم الامت حضرت تھانوی ؒ کی ربیبہ حضرت مفتی صاحب ؒ کے گھر میں تھیں۔ اس لئے حضرت مفتی صاحب ؒ کو حضرت تھانوی ؒ سے دامادی کی حیثیت بھی حاصل تھی اور ان کا شمار حضرت تھانوی ؒ کے اہل خانہ میں سے ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے ان کو اس دور میں خانقاہ اشرفیہ کی آخری یادگار کہا جاتا تھا۔

حضرت مفتی جمیل احمد صاحب ؒ ضلع مظفر نگر کے قصبہ تھانہ بھون میں پیدا ہوئے تھے اور ابتدائی تعلیم وہاں اور آس پاس حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ مظاہر العلوم کے قیام کے دوران شیخ العرب والعجم حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری ؒ سے شاگردی کا شرف حاصل کیا اور حضرت مولانا سہارنپوری ؒ کے منظور نظر بھی رہے، یہاں تک کہ جب دورۂ حدیث کے امتحان میں اول آئے تو حضرت مولانا سہارنپوری ؒ نے ایک جیبی گھڑی انعام میں دی۔ جو اس دور کے لحاظ سے انتہائی قیمتی انعام سمجھا جاتا تھا۔

حضرت سہارنپوری کے علاوہ اس دور میں مفتی صاحب ؒ نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری، حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، اور حضرت حافظ عبداللطیف صاحب سے بھی خصوصی استفادہ کیا۔ پھر حضرت سہارنپوری ہی کے

تعلیم سے فراغت کے بعد حیدر آباد دکن کے ایک مدرسے میں تدریس کیلئے تشریف لے گئے وہیں کچھ عرصہ مدرسہ نظامیہ حیدر آباد میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ بالآخر ۱۳۴۶ھ میں واپس مظاہر العلوم تشریف لائے۔ وہاں تقریباً ۲۵ سال تدریس کی خدمات انجام دیں۔ وہاں سے آپ نے ایک ماہنامہ "المظاہر" اور بعد میں دوسرا رسالہ "دیندار" جاری کیا۔ اور یہ دونوں رسالے دعوت وتبلیغ کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۳۶۰ھ میں جب حضرت تھانوی ؒ بیمار ہوگئے تو حضرت ہی کے حکم سے خانقاہ اشرفیہ کے مدرسہ امداد العلوم میں فتویٰ اور تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔

حضرت حکیم الامت ؒ نے "احکام القرآن" کی تالیف کے لئے اپنے متوسلین میں جن چار بزرگوں کا انتخاب فرمایا ان میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مفتی محمد شفیع، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کے بعد چوتھا نام حضرت مفتی جمیل احمد صاحب ؒ ہی کا تھا اور انہوں نے تقریباً پانچ پاروں کی تالیف تھانہ بھون میں رہتے ہوئے ہی کرلی تھی۔ احکام القرآن کی یہ تالیف حکیم الامت حضرت تھانوی ؒ کی بڑی عزیز آرزوؤں میں سے تھی۔ لیکن اس کے بعض حصے ابھی تک ناتمام چلے آتے تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی جمیل احمد صاحب ؒ کے خلف رشید جناب مولانا مشرف علی صاحب تھانوی کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سبب سے حضرت حکیم الامت کی اس خواہش کی تکمیل کا کوئی باعث پیدا فرمایا۔ چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے ایسے اسباب مہیا کئے کہ ان کے والد گرامی حضرت مفتی جمیل احمد صاحب ؒ اور جامعہ حقانیہ ساہیوال کے حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی مدظلہم العالی اس کام کے لئے تیار ہوگئے اور ان دونوں بزرگوں نے اپنے ضعف اور علالت کے باوجود بڑی تیز رفتاری سے اس عظیم کام کی تکمیل فرمادی۔

فجزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

۱۳۷۰ھ میں مفتی صاحب ؒ نے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد جامعہ اشرفیہ لاہور سے تعلق قائم کیا تھا۔ جہاں وہ آخری وقت تک فتویٰ کی خدمت انجام دیتے رہے۔

مجھ ناکارہ پر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شفقتیں ناقابلِ فراموش رہیں۔ بالخصوص جب سے ماہنامہ "البلاغ" میرے زیرِ ادارت دارالعلوم کراچی سے نکلنا شروع ہوا اس وقت سے بکثرت خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ حضرت مفتی صاحب وقتاً فوقتاً البلاغ کیلئے مضامین بھی تحریر فرماتے تھے۔ جو البلاغ میں چھپتے رہتے ہیں۔ البلاغ کے بارے میں بہت سے مشورے بھی دیتے رہتے تھے اور رسالے کے مجموعی رنگ کی باقاعدہ دیکھ بھال رکھتے اگر کوئی بات قابلِ اصلاح نظر آتی تو اس سے احقر کو ضرور مطلع فرماتے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کا ایک خاص اسلوب تھا۔ جس میں اختصار بھی تھا۔ اور جامعیت بھی۔ نثر کے ساتھ ساتھ عربی اور اردو دونوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے قصائد اور ان کی نظمیں ان کی پرگوئی کی دلیل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف واقعات کی تواریخ نکالنے کا آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ وہ اکثر وفات کی تاریخیں قرآنی آیات سے نکالتے تھے۔ چنانچہ بہت سے بزرگوں کی تواریخ وفات انہی کے قلم سے البلاغ میں شائع ہوئیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی تصنیفات چھوڑی ہیں۔ جو انشاء اللہ اہلِ علم اور دیندار مسلمانوں کیلئے بہترین رہنما ثابت ہوں گی۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک عرصے سے بہت ضعیف ہو گئے تھے اور سماعت و بصارت خاص طور سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ لیکن یہ قرآن و حدیث کے علوم میں اشتغال کی برکت ہے کہ عمر کے اس حصے میں پہنچنے کے بعد اور قویٰ کے اس انحطاط کے دور میں بھی وہ ذہنی طور پر پوری طرح علمی کاموں کیلئے پوری طرح تیار رہے۔ آخر وقت تک فتویٰ کی خدمت انجام دی۔ قویٰ کے اسی انحطاط کے دور میں "احکام القرآن" کی تالیف مکمل کی۔ آخری بار شوال ۱۴۱۴ھ میں جب احقر ان کی زیارت کیلئے ان کے مکان پر حاضر ہوا تو سماعت تقریباً بالکل جواب دے چکی تھی۔ بینائی بھی رخصت ہو رہی تھی۔ لیکن حسبِ معمول شفقت فرماتے ہوئے اندر سے باہر تشریف لائے اور اسی دوران کچھ تھوڑی باتیں علمی ہی کرتے رہے۔ اسی وقت یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ

[illegible] حضرت کی آخری تمنا پوری ہوئی۔ چنانچہ اس سے بعد [illegible] کی [illegible] حضرت مولانا [illegible] صاحب نے [illegible] مفتی صاحب [illegible] کے جنازے میں قرأت ہو جائے۔ [illegible] حضرت مولانا [illegible] صاحب نے ختم نبوت کا جو اعلان [illegible] قرآن میں قرأت کے ساتھ جنازے میں قرأت ممکن نہیں تھی۔ [illegible] کا خیال نہ [illegible] تھا۔ ان کے جنازے میں قرأت سے بھی محروم رہی۔ کیونکہ دارالعلوم سے میرے بھتیجے مولانا [illegible] صاحب [illegible] اور مفتی صاحب کے بھتیجے مولانا [illegible] جنازے میں قرأت [illegible] پہنچ گئے تھے اور ان کی وساطت سے [illegible] دارالعلوم کی قرأت ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب [illegible] دنیا سے [illegible] اللہ تعالیٰ [illegible] صاحبزادوں سے [illegible] حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے علوم و معارف [illegible] دارالعلوم [illegible] اللہ تعالیٰ ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کے علوم و معارف سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین

(البلاغ جلد ۹ [illegible] شمارہ [illegible])

حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ؒ

اس ہفتے کے پہلے حصے میں میرے استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ؒ کے حادثۂ وفات نے ملک کے تمام دینی اور علمی حلقوں میں صف ماتم بچھا دی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مجھے ذاتی طور پر والدین کے بعد جن شخصیتوں سے علمی اور فکری استفادہ سب سے زیادہ کیا، ان میں حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ؒ کی شخصیت سرفہرست ہے۔ انہوں نے ہمیں صرف کتابیں ہی نہیں پڑھائیں، بلکہ [illegible] ذہن میں ایک نئی دینی فکر کی تعمیر کی [illegible] جو آج تک کام آرہی ہے۔

حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ؒ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اپنے آبائی وطن ٹونک میں ایک عرصے تک تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔ ان کے جد امجد حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب ٹونکی ؒ ریاست ٹونک کے [illegible] علماء میں سے تھے۔ انہوں نے [illegible] کے نام سے عربی مصنفین کا ایک وسیع انسائیکلوپیڈیا مرتب کی تھی، جو [illegible] [illegible] جس کی چند جلدیں شائع ہوئیں۔ حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب ٹونکی اپنے علاقے میں فتویٰ کے معاملے میں بھی مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ؒ نے بچپن ہی میں ان کی تربیت پائی اور وہیں سے [illegible] کا ذوق پایا تھا۔ پھر جب تقسیم ہند کے بعد حضرت مفتی ولی حسن صاحب ؒ نے ٹونک چھوڑ کر پاکستان میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا اور اسی غرض کیلئے کراچی تشریف لائے تو اس وقت کراچی میں دینی تعلیم کا کوئی بڑا ادارہ نہ تھا، اور [illegible] میں [illegible] مدرسہ مظہر العلوم کے نام سے معروف تھا، لیکن وہ بھی [illegible] کی ذمہ داری [illegible] نہیں سنبھال سکتا تھا۔ اس لئے حضرت مفتی ولی حسن صاحب ؒ نے اس وقت [illegible] [illegible] اسکول میں ملازمت کے ذریعہ [illegible]

سے کام شروع کردیا۔

۱۹۵۰ء میں میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ؒ نے آرام باغ کی باب الاسلام مسجد میں "دارالعلوم" کے نام سے ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا جس میں حفظ وناظرہ کے علاوہ ابتدائی فارسی اور عربی کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ احقر اور ہمارے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم اسی مدرسے کے پہلے طالب علم تھے۔ جہاں ہم نے ابتدائی فارسی کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ اسی مدرسے کے ساتھ حضرت والد صاحب ؒ نے ایک دارالافتاء بھی قائم فرمایا۔ جہاں اہل شہر کی طرف سے بھیجے گئے شرعی سوالات کے جوابات دیئے جاتے تھے۔ حضرت مولانا نور احمد صاحب ؒ ان تمام کاموں میں حضرت والد صاحب ؒ کے دست وبازو کے طور پر کام کرتے تھے اور انہوں نے اس وقت جو خاموش خدمات کیں ان میں ایک بڑی خدمت یہ تھی کہ انہوں نے بہت سے ایسے اہل علم کو جو زمانے کی ناقدری کا شکار ہو رہے تھے اور جن سے ان کی صلاحیتوں کے مطابق فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا تھا، ایک مرکز پر جمع کرکے ان کے علمی اور دینی فیض کا ایک وسیع میدان فراہم کیا۔ حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ؒ دارالعلوم دیوبند میں ان کے ہم سبق رہ چکے تھے اور انہیں پوری طرح اندازہ تھا کہ علم وفضل کا یہ جوہر درحقیقت کسی بڑی درسگاہ میں پڑھانے کے لئے ہے، بچوں کا ابتدائی مدرسہ کے بجائے کسی بڑے مرکز کی نگرانی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ابتداء میں "دارالعلوم" کے مدرسے اور دارالافتاء سے ان کا رابطہ قائم کرایا اور جب ۱۹۵۱ء میں نانک واڑہ میں دارالعلوم کی بنیاد پڑی تو وہ حضرت مفتی ولی حسن صاحب ؒ کو مستقل طور پر "مدرسہ مظہر العلوم" سے الگ کر کے دارالعلوم لانے میں کامیاب ہوگئے اور دارالعلوم سے حضرت مفتی صاحب ؒ نے پاکستان میں اپنی علمی خدمات کا آغاز فرمایا۔

دارالعلوم کراچی کے دارالعلوم نانک واڑہ کے قیام کے دوران ہی برادر محترم

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی اور احقر نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ عربی کے ابتدائی سالوں میں ہم نے "عربی کا معلم" حضرت مفتی صاحب سے پڑھی اور بعد میں پوری ہدایہ اولین پڑھنے کا شرف بھی انہیں سے حاصل ہوا۔ اگرچہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبان میں ہلکی سی لکنت تھی، لیکن آپ کا درس انتہائی دل نشین اور دلچسپ ہوتا تھا۔ آپ مشکل سے مشکل بحث کی تقریر اس طرح فرماتے کہ مسئلہ پانی ہو کر رہ جاتا۔ اور زبان کی معمولی لکنت اس تقریر کی لذت میں کمی کرنے کے بجائے اور اضافہ کر دیتی تھی۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنے علم اور مطالعہ کو صرف درسیات کی حد تک محدود رکھتے ہیں، بلکہ ان کے شب و روز کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ مطالعہ تھا، اور وہ ہر علم و فن کے بارے میں وسیع مطالعہ کے حامل تھے، اور کتابوں کے بارے میں بھی ان کی معلومات نہایت وسیع تھی۔ جب کسی شخص کو کسی خاص موضوع پر مواد کی تلاش ہوتی تو وہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچ جاتا، اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کو بہت سی کتابوں کے نام بتا دیتے، اور اس کا کام بن جاتا۔ ہم جب حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس عربی کا معلم پڑھتے تھے اس وقت سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے اندر مطالعے کے ذوق کی آبیاری شروع کر دی تھی، اور مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں جب ہماری عربی تعلیم بالکل ابتدائی تھی، اور ابھی عربی کتابوں سے براہ راست استفادہ کا تصور مشکل تھا، ایک روز حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے بلا کر فرمایا: "تمہیں ایک بڑی مزیدار کتاب بتاتا ہوں۔ اس کا نام ہے "فقہ اللغۃ" یہ ابو منصور ثعالبی کی تصنیف ہے، اور اس میں عربی زبان کے بڑے لطائف اور ظرائف مذکور ہیں، یہ کتاب کتب خانے میں فلاں جگہ رکھی ہوئی ہے۔ اس کا مطالعہ کیا کرو۔ اس سے تمہیں عربی ادب کی کتابوں میں مدد ملے گی۔"

چنانچہ احقر نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد پر عمل کیا اور اب خیال آتا ہے کہ عربی کا معلم پڑھنے والے ایک طالب علم کو ثعالبی کی "فقہ اللغۃ" پڑھنے کا مشورہ

۔ یہ حضرت مفتی صاحب ؒ کے ذوق تربیت ہی کی برکت تھی۔ اگرچہ اس وقت ”نفحۃ الیمن“ سے کما حقہ استفادہ شاید میں نہ کرسکا ہوں، لیکن ادب کی اس کتاب تک رسائی حاصل ہوجانے کے بعد آئندہ سالوں میں بھی وہ میرے مطالعے میں رہی اور واقعۃً عربی ادب کی تعلیم میں اس سے بڑی مدد ملی۔ بہرصورت اس طرح کتب خانے سے ایک رابطہ پیدا ہوگیا اور یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ اپنا مطالعہ صرف درسیات تک محدود نہ رکھنا چاہئے بلکہ خارج مطالعہ بڑھانے کی کوشش بھی ایک طالب علم کیلئے ضروری ہے۔

حضرت مفتی ولی حسن صاحب ؒ اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے لیکن انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بھی تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں انہیں تاریخ اور ادب کے ساتھ خصوصی دلچسپی حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ عربی کا معلم پڑھاتے وقت عربی تحریر و تقریر کا ذوق بھی انہوں نے ہمارے اندر پیدا فرمایا۔ خوش قسمتی سے انہی دنوں عربی صرف و نحو اور زبان کی تمام ابتدائی کتب ہم استاذ مکرم مولانا سحبان محمود صاحب مدظلہم العالی سے پڑھتے تھے، اور انہوں نے بھی اپنے تمام دروس میں عربی تحریر و تقریر کی طرف اپنی بھرپور توجہ مرکوز کی ہوئی تھی۔ اس لئے الحمدللہ ان دو بزرگوں کی نظر عنایت نے ہمیں پہلے ہی سال اس قابل کردیا تھا کہ ہم عربی زبان میں چھوٹے چھوٹے مضامین باسانی لکھ لیتے تھے۔

”تفسیر“ حضرت مفتی صاحب ؒ کا خصوصی موضوع تھا اور یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ جلالین اولین ان سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

جس کے نتیجے میں تفسیر سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب ؒ اپنے درس میں نہ صرف یہ کہ جلالین کے مباحث کو بہت دل نشین پیرائے میں سمجھاتے بلکہ متعلقہ مسئلے کے فقہی پہلو پر بطور خاص روشنی ڈالتے اور مسئلے سے نکلنے والی اصولی ہدایات کی نشاندہی بھی فرماتے۔ اور بسا اوقات یہ بھی بتاتے کہ ان اصولی ہدایات سے وقت کے نئے مسائل میں کس طرح کام لیا جاسکتا ہے؟ اس کے ساتھ

کی حضرت مفتی صاحب ؒ عصر حاضر کی تمام فکری تحریکات سے پوری طرح باخبر تھے۔ اور جدید مسائل کے بارے میں اپنے آپ کو تازہ ترین معلومات سے مزین رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے درس میں بھی یہ ساری معلومات اس طرح منعکس ہوتی تھیں کہ طالب علم کی فقہی بصیرت کو جلا اور ترقی ملتی تھی۔ مختصر یہ کہ کہنے کو ہدایہ اولین کا درس ایک درس تھا۔ جو دن میں دو گھنٹے ہوا کرتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس درس کے دوران حضرت مفتی صاحب ؒ نے ہمیں سوچ کا ایک ایسا رخ عطا کیا جس نے ہمارے طلب علم کی صورت گری میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ اگرچہ ضابطے میں ہدایہ کا درس دو گھنٹے ہوا کرتا تھا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ درس ختم ہو جانے کے بعد بھی جب دوسرے اساتذہ اور طلبہ چھٹی پر چلے جاتے تو ہم دیر تک حضرت مفتی صاحب ؒ کی خدمت میں بیٹھے رہتے۔ اور مختلف موضوعات پر ان کے علم و فضل سے استفادہ کا سلسلہ جاری رہتا۔ اسی زمانے میں حضرت مفتی صاحب ؒ ہی کے حکم پر احقر نے اپنا سب سے پہلا مقالہ تحریر کیا۔ جس کا عنوان تھا "رسول کریم ﷺ سب سے بڑے شارع تھے" یہ ناظم آباد میں ہونے والے ایک مذاکرے کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس مذاکرے میں شہر کے مختلف تعلیمی اداروں کے طلبہ کو اس موضوع پر تقریر اور مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ حضرت مفتی صاحب ؒ نے فرمایا کہ تم اس موضوع پر لکھو۔ لکھنے کا طریقہ بھی خود ہی تلقین فرمایا۔ مواد بھی بتایا اور لکھنے کے بعد اس کی اصلاح بھی فرمائی۔ یہ مقالہ مذاکرے میں پیش ہوا اور اسے پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ میں نے حضرت مفتی صاحب ؒ سے دریافت کیا کہ قرآن کریم کی آیت:

وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین

میں آنحضرت ﷺ کے وجود باجود کو صرف انسانوں کیلئے نہیں بلکہ پوری کائنات کے لئے رحمت قرار دیا گیا ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کائنات کے بے شعور موجودات مثلاً چاند، سورج، دریا، پہاڑ، سمندر کے لئے آپ کے رحمت ہونے

کا کیا مطلب ہے؟ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ جن موجودات کو ہم بے شعور سمجھتے ہیں وہ بھی اپنے وجود کی مناسبت سے کچھ نہ کچھ شعور ضرور رکھتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

وان من شیء الا یسبح بحمده ولکن لا تفقهون تسبیحهم

دوسری غرض کائنات کی تمام موجودات کیلئے باعث رحمت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا دین فطرت کے مطابق چلے۔ آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے یہ مقصد حاصل ہوا اور زمانہ اپنی فطرت پر لوٹ آیا۔ پھر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے جو ارشاد فرمایا۔

ان الزمان قد استدار کهیئته یوم خلق الله السموات والارض

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ زمانہ اپنی فطری تخلیق کی حالت پر لوٹ آیا ہے۔ یہ تشریح دلنشین انداز میں فرمانے کے بعد حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احقر سے فرمایا یہ بات تو ایک مضمون کی شکل میں لکھ کیوں نہیں دیتے؟ چنانچہ حضرت ہی کے ایماء پر میں نے لکھا وہ مضمون تھا جس کا عنوان تھا "وہ سب کے لئے رحمت ہیں" یہ مضمون ایک دینی ماہنامہ "البلاغ" میں تین قسطوں میں شائع ہوا۔ اس طرح تحریر و تصنیف کے میدان میں اس ناکارہ کو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھایا۔

حضرت سے خصوصی مناسبت کی بناء پر میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی صاحب کو دار العلوم میں تجوید کی خدمات بھی تفویض کی ہوئی تھیں۔ اسی لئے جب جب شعبان رمضان کی تعطیلات آتیں تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے چھوٹے بھائی حضرت والد صاحب کے ہمراہ دیوبند سے گھر تشریف لے آیا کرتے اور ہمارے گھر کی بیٹھک میں بیٹھ کر قرآن کا دور کرتے رہتے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پارہ پڑھتے تھے اور ان کو وقت تعارف کراتے اپنا فائدہ اٹھاتے۔ اسی دوران ایک مرتبہ میں حضرت

مفتی صاحب ؒ کے سامنے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت مفتی صاحب ؒ کو بہت سے فتاویٰ کا جواب لکھنا تھا۔ جو ان کے سامنے رکھے ہوئے تھے اچانک انہوں نے ایک استفتاء پڑھنے کے بعد مجھ سے فرمایا کہ دیکھو' یہ کتنا آسان سوال ہے' اس کا جواب تم ہی لکھ دو۔ میں اس وقت ہدایہ پڑھتا تھا' اور حضرت مفتی صاحب ؒ کا یہ فرمانا مجھے شروع میں مذاق محسوس ہوا۔ لیکن مفتی صاحب ؒ نے سنجیدگی کے ساتھ اصرار فرمایا تو میں نے ڈرتے ڈرتے جواب لکھ دیا۔ مفتی صاحب ؒ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ جواب ٹھیک ہے' اور اسی طرح رفتہ رفتہ انسان فتویٰ لکھنا سیکھ لیتا ہے' یہ کہہ کر مفتی صاحب ؒ نے فتویٰ پر اپنے دستخط فرما دیئے۔ یہ میرا پہلا فتویٰ تھا۔ اور اس طرح فتویٰ کے میدان میں بھی میرا پہلا قدم رکھوانے کا سہرا بھی حضرت مفتی صاحب ؒ کے سر ہے۔

۱۹۵۶ء میں جب دارالعلوم نانک واڑہ کی تنگ عمارت سے شرافی گوٹھ کے قریب ایک وسیع رقبہ زمین پر منتقل ہوا تو یہ جگہ شہر سے کٹی ہوئی تھی۔ اور یہاں روزانہ آمدورفت بہت مشکل اور مشقت طلب تھی' دوسری طرف حضرت مفتی ولی حسن صاحب کو بعض ایسے گھریلو اعذار لاحق تھے۔ جس کی وجہ سے وہ مستقل طور پر دارالعلوم کے احاطہ میں قیام نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ اس موقع پر دارالعلوم سے مستعفی ہو کر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری ؒ کے نئے قائم کردہ مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن سے منسلک ہو گئے۔

مجھے یاد ہے کہ حضرت مفتی صاحب ؒ کا یہ فیصلہ ہم دونوں بھائیوں پر اتنا شاق گزرا کہ دارالعلوم کے واقعات میں بھی کسی اور واقعہ کا اتنا تاثر دل پر نہیں ہوا۔

نیوٹاؤن کے مدرسے سے منسلک ہونے کے بعد اگرچہ باقاعدہ استفادہ کا سلسلہ بظاہر منقطع ہو گیا لیکن الحمدللہ حضرت مفتی صاحب ؒ سے جو قلبی تعلق قائم ہو گیا تھا۔ وہ قاعدوں اور ضابطوں سے ماورا تھا۔ ہم لوگ مفتی صاحب ؒ سے علمی کاموں میں مشورے کرتے رہے اور حضرت والد صاحب ؒ نے جدید مسائل کی

[illegible] [illegible] میں حاصل [illegible] تھی۔ حضرت مفتی صاحب نے [illegible] ان کے [illegible] میں حضرت مفتی صاحب نے علم و فضل و تفقہ کے اعتراف کا موقع ملا [illegible] فتاویٰ میں حضرت مفتی صاحب نے [illegible] مفتی کے [illegible] کی صلاحیت [illegible] تھے اور ان کے [illegible] ممتاز اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ [illegible] حضرت [illegible] کی وفات کے بعد [illegible] میں حضرت [illegible] کا شرف بھی آپ کو حاصل [illegible] طلبہ [illegible] حاصل کیا جو اس وقت [illegible] میں [illegible] خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ حضرت مفتی صاحب [illegible] کا صدقہ جاریہ ہے۔

وسعت مطالعہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو [illegible] تحریر کی صلاحیت سے [illegible] ان کی سب سے پہلی کتاب "تذکرۃ الاولیاء" شائع ہوئی تھی۔ [illegible] آپ کی ناصحانہ کتب بھی بڑی مقبول ہوئیں۔ اس کے علاوہ بھی "[illegible]" میں آپ کے تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے۔ جب [illegible] علوم سے [illegible] جاری کیا گیا تو [illegible] کی درخواست پر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "[illegible] آخرت" کے نام سے چند مضامین لکھے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ان [illegible] سے [illegible] کہ ان کے اوقات کا ایک معتد بہ حصہ تصنیفی کام میں صرف ہوا۔ آپ کے علم و فضل اور تفقہ سے استفادہ کا [illegible] حضرت مفتی صاحب نے "[illegible]" کی درخواست کی اور حضرت [illegible] کی وفات کے بعد "[illegible]" [illegible] کیا اور [illegible] فتاویٰ [illegible] حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت [illegible] حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی [illegible] اور [illegible] ان سے [illegible] مطالبات [illegible]

کا بیڑا اٹھائے وہ کوئی شخص سامنے موجود ہو۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ مزاج نہیں ہے کہ ہر شخص سے اس کی صلاحیت اور مزاج کے مطابق وہ کام لیا جائے۔ جس میں اس کی صلاحیتیں زیادہ بہتر طور پر استعمال ہوں۔ اس کے بجائے مصروفیات پر بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک علمی شخصیت تھے اور انہیں سادگی اور قناعت پسندی کے مزاج نے گوشہ دور رکھا، ایسے معاملات کی مجبوری کہئے یا ناقدر شناسی کی ستم ظریفی کہ ان کے بہت سے اوقات ایسے کاموں میں بھی صرف ہوئے، اور "الفتح" جلسوں کی صدارت وغیرہ جیسے دوسرے کاموں میں بھی جن ان کے وسیع مطالعے، گہرے تفقہ اور علمی افادات کو پائیدار صورت میں محفوظ کرنے اور رکھنے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ ہو سکی، چنانچہ بہت سے وہ کام جن کے لکھنے کا ان کی طرف اشتیاق تھا تشنۂ تکمیل رہ گئے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جن صفات اور خصوصیات سے نوازا تھا، وہ مشکل ہی سے کسی ایک شخصیت میں جمع ہوتی ہیں۔ علم و فضل کے مقام بلند کے ساتھ ساتھ ان کی سادگی اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ کوئی اجنبی دیکھنے والا یہ بھی نہیں بھانپ سکتا تھا کہ اس سادہ سے پیکر میں علم و فضل کے کیسے خزانے چھپے ہیں۔ ان کے حسین چہرے پر بڑی معصومیت تھی، جو دیکھنے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ لیکن اس علم و فضل اور اس معصومیت کے ساتھ ان کے مزاج میں ظرافت اس قدر تھی کہ وہ جس بے تکلف مجلس میں بیٹھ جاتے اس کو باغ و بہار بنا کر چھوڑتے۔ ایسی مجلسوں میں ان کے منہ سے بے ساختہ ایسے ظریفانہ جملے برآمد ہوتے جنہیں ظریفات ادب کا شاہکار کہنا چاہئے، اور ان جملوں میں اکثر اوقات علمی نکات کی بھی چاشنی ہوتی جو ان کی معنویت میں چار چاند لگا دیتی۔ وہ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں سے بھی بہت بے تکلف تھے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے عبادات و ریاضت کا بھی خاص ذوق عطا فرمایا تھا۔ اور ان کی ظرافت کو غور سے دیکھئے تو ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے اپنی بزرگی کو ظرافت و مزاح کے پردے میں چھپایا ہوا ہے، اور اس حقیقت کے ادراک کے بعد حضرت مفتی

صاحب رحمہ اللہ کے حوالے سے حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ کی شہادت آسکتی تھی۔ ان کے بارے میں ان کے شاگرد کہتے ہیں کہ:

کنا نسمع ضحکہ بالنہار و بکاءہ باللیل

(یعنی ہم دن کے وقت ان کے ہنسنے کی آواز سنتے تھے اور رات کے وقت ان کے رونے کی)

آج سے تقریباً چھ سات سال پہلے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ پر فالج کا شدید حملہ ہوا، جس میں قوت گویائی بھی باقی نہ رہی۔ مسلسل علاج کے نتیجے میں آپ بچ تو گئے لیکن معذوری کی سی جو کیفیت پیدا ہوگئی تھی، اس میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا جو حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کو عملی زندگی میں دوبارہ لاسکتا۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تقریباً اس پورے عرصے میں گھر ہی کی حد تک محدود رہے اور ان سے ملاقات بھی مشکل ہوگئی۔ اسی رمضان کے دوسرے روزے کو جمعہ کے دن حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے پاس داعی اجل کا پیغام آگیا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتنے عرصے سے رمضان اور جمعہ کے انتظار میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی ماہ مبارک کے پہلے ہی جمعہ میں انہیں اپنے پاس بلالیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے صاحبزادوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کی تدفین دارالعلوم کے قبرستان میں ہو۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز دارالعلوم ہی سے کیا تھا اور یہیں ہمیشہ کے لئے آسودہ ہوگئے۔

اللہم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ واغسلہ بالثلج والبرد ونقہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس

آخر میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ کچھ عرصے سے بعض خاص حضرات کی نماز جنازہ دو مرتبہ پڑھنے کا رواج چل نکلا ہے، اور چونکہ متعدد بڑے بڑے علماء کی نمازیں ایک سے زائد مرتبہ پڑھی گئی ہیں، اس لئے عوام میں غلط فہمی کی شہرت ہوگئی

ہے۔ بعض مرتبہ ایک سے زائد نمازوں کیلئے یہ حیلہ کیا جاتا ہے کہ پہلی نماز جنازہ سے ولی میت کو قصداً غیر حاضر کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ دوسری نماز جنازہ کا جواز پیدا کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ طرز عمل فقہی اعتبار سے درست نہیں اور خاص طور سے اہل علم کو اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی نماز جنازہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے صاحبزادے نے احقر سے بڑے اور بزرگ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم سے دارالعلوم کورنگی میں جنازہ پہنچنے کے بعد یہ بتایا کہ پہلی نماز جنازہ صرف ان کی اجازت کے بغیر ہی نہیں بلکہ علم کے بھی بغیر ہوئی ہے۔ اس پر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم نے نماز جنازہ پڑھائی اور ساتھ ہی مسئلے کی حقیقت بھی بیان فرمائی کہ ورثاء میت کے علم اور اجازت کے بغیر چند حضرات کا نماز جنازہ پڑھنا جبکہ وہ امام کی اقتدا میں بھی نہ ہو، کسی طرح درست طرز عمل نہیں تھا۔ اور آئندہ ایسے مواقع سے بھی پرہیز کرنا چاہئے جہاں دو نمازوں کا شبہ پیدا ہو۔

(البلاغ جلد ۲۹ شمارہ ۱۱)

مولانا سید ابوذر غفاری رحمۃ اللہ علیہ

مورخہ [illegible] اکتوبر بروز منگل کو مولانا سید ابوذر غفاری رحمۃ اللہ علیہ طویل علالت کے بعد رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا مرحوم امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند تھے اور ان کی سوچ، انداز تکلم اور خطابت میں اپنے والد ماجد کی بڑی رنگین جھلک موجود تھی۔ انہوں نے نیز مدارس ملتان میں درس نظامی کی تکمیل کی اور اس طرح حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم سے بھی استفادہ کیا۔ وہ بلا کے ذہین، حاضر جواب اور وسیع المطالعہ عالم تھے۔ خطابت میں فصاحت و بلاغت انہوں نے اپنے والد ماجد سے میراث میں پائی تھی، اور انداز زندگی بھی اپنے والد کی طرح درویشانہ تھا۔ سنا گیا ہے کہ قرآن کریم کے سات آٹھ پارے روزانہ تلاوت کرنے کا معمول تھا۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ اپنے والد ماجد کی طرح انہوں نے فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کیلئے گرانقدر خدمات انجام دیں، نیز صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی ناموس کا تحفظ اور ان کے بارے میں امت کے متوارث عقیدے سے انحراف کرنے والوں کی تردید ان کی زندگی کا خاص مشن تھا اور اسی جد و جہد میں انہوں نے بہت سی صعوبتیں جھیلیں، قید و بند کے مراحل سے بھی گزرے، لیکن کوئی انہیں اپنے موقف سے متزلزل نہ کر سکا۔

مولانا مرحوم کا جب بھی کراچی آنا ہوا تو عموماً دارالعلوم میں تشریف لا کر اپنا وقت برادرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم اور اس ناکارہ کے ساتھ ملاقات میں صرف کرتے۔ اپنے والد کی طرح وہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، اور جب بھی وہ تشریف لاتے ان کی شگفتہ گفتگو حاضرین کو نہال کر دیتی۔ انہوں نے قادیانیوں کے مرکز ربوہ میں مسلمانوں کی ایک بستی آباد کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور ایک مسجد بھی تعمیر کی، جہاں وہ [illegible] جلسے بھی منعقد کیا کرتے تھے۔ کئی بار اس ناکارہ کو انہوں نے ربوہ کی دعوت بھی دی، مگر میں اپنی کوتاہیوں اور مصروفیات کی وجہ سے پوری نہ کر سکا۔ آخر میں بھی جب ملتان حاضر ہوا تو ان سے ملاقات کی کوشش کی۔ اب وہ کافی

غربت سے تنگی کے سبب میں مبتلا تھے اور آخر میں زبان بھی بند ہو گئی تھی۔ اور بیمار ہوا تو بالآخر ان کی آخری منزل آپہنچی۔ اور وہ دنیوی زندگی کے چند دنوں کو ختم پا کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ مجھے مولانا کی وفات کی خبر بہت دیر سے ملی یعنی تقریباً دو ماہ بعد اور وہ بھی ایک رسالے میں یہ خبر پڑھ کر دل کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائیں۔ اور ان کو جوار رحمت میں درجات عالیہ سے نوازیں اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔ آمین۔

(البلاغ جلد ۳ شمارہ ۸)

حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ

مورخہ ۹ شوال ۱۴۱۷ھ کو یہ المناک خبر دل کو تڑپا گئی کہ عالم اسلام کے مایہ ناز محدث اور اسلامی علوم کے بے مثال خادم حضرت علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ موصوف شام کے مشہور شہر حلب کے باشندے تھے، اور عرصہ دراز سے ریاض میں مقیم تھے۔ عرب دنیا میں وہ اپنے وسیع و عمیق علم، اتباع سنت اور ورع و تقویٰ میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے، اور برصغیر پاک و ہند کے علماء کے تقریباً تمام حلقوں میں انتہائی مقبول اور ہردلعزیز شخصیت کے حامل تھے۔

میں نے ان کا نام پہلی بار اس وقت سنا جب ۱۹۵۹ء میں میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ موتمر عالم اسلامی کے ایک اجلاس میں شرکت کے لئے شام، اردن، لبنان اور فلسطین کے دورے پر تشریف لے گئے، دمشق سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جو خط آیا، اس میں شام کے علماء سے ملاقاتوں کا تذکرہ تھا اور ان علماء میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بڑی خصوصیت کے ساتھ کیا تھا۔ سفر سے واپسی کے بعد بھی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کا ذکر بڑی محبت سے فرماتے، اور یہ بات اہمیت کے ساتھ بیان کرتے کہ عرب کے علماء میں علم و تحقیق کے شناور تو اب بھی بہت ہیں، لیکن ایسے علماء جن میں علمی گہرائی کے ساتھ اتباع سنت کا اہتمام ہو اور ان کی گفتار و رفتار میں سلف صالحین کا رنگ جھلکتا ہو، اب بہت کم رہ گئے ہیں اور حضرت شیخ عبدالفتاح اُسی صف کی شخصیات میں سے ہیں۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ان کا یہ تذکرہ سن کر جی چاہتا تھا کہ ان کی زیارت کر لی جائے، لیکن بظاہر کوئی صورت اس لئے ممکن نہ تھی کہ وہ شام میں تھے، اور ہمارے لئے اس وقت سفر شام کا تصور بھی ناممکن تھا۔

لیکن مدت دراز کے بعد اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ ۱۳۸۲ھ میں اچانک یہ خبر ملی کہ وہ پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ حضرت شیخ نے پاکستان اور ہندوستان کے کتب خانوں میں مخطوطات کی تلاش و تحقیق اور یہاں کے علمی

طالب سے تعلق تو [illegible] انہی کے بچپن ہی سے قائم تھا۔

حضرت مفتیؒ کراچی تشریف لائے اور یہیں پاکستان میں قیام فرمایا تو اس دوران وہ دارالعلوم میں تشریف لاتے رہے۔ ان کے دور میں دارالعلوم کی طرف سے آپ جب [illegible] میں اس وقت حدیث کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔ حضرت والد صاحب ( ) نے مجھ کو مامور فرمایا کہ ان کے زیر تربیت رہ کر عربی میں تقریر سیکھوں۔ احقر نے انہی کی [illegible] تقریر کی اور [illegible] مولانا مدظلہ کو تقریر کرتے [illegible] وہ [illegible] عربی کی تعلیم دارالعلوم دیوبند [illegible] اور بعد میں دیوبند ہی کی خدمت کا شرف [illegible] کیا۔ حضرت شیخؒ نے احقر پر اس سلسلہ تقریر کی بڑی محنت اور توجہ فرمائی۔ جب [illegible] تقریر [illegible] ظاہر کیا:

"لقد كان من فصاحة الشاب [illegible] في [illegible] الشيخ
محمد تقي ابن مولانا محمد شفيع ما كشف تفوق
العرب في فهمهم"

ظاہر ہے کہ یہ کلمات محض احقر کی ہمت افزائی کے لئے کہے گئے تھے۔ لیکن ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ چھوٹوں کی ہمت افزائی اور ان کی حوصلہ افزائی کا کیا عالم تھا۔ پھر جب دارالعلوم سے رخصت ہونے لگے تو احقر کو بڑی شفقت و محبت کا [illegible] اس طرح فرمایا:

"لو كنت ابني لأخذتك"
"اگر تم میرے بیٹے ہوتے تو میں تمہیں لے جاتا۔"

اس کے بعد آپ نے مجھے "[illegible]" ([illegible] وجہ کہ [illegible]) [illegible] احقر کو [illegible] احقر نے حضرت شیخؒ سے اجازت حدیث بھی حاصل کی [illegible] شفقت سے عطا فرمائی۔

پاکستان میں ان کی تشریف آوری [illegible] اس کے بعد شام میں جو سیاسی انقلاب آیا اس نے [illegible]

کرا کر تہ تیغ کیا گیا، بے شمار نوجوانوں کو قید کر کے انہیں بدترین ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا، اور سینکڑوں علماء دین جو ملک چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ کبھی تشدد کے حامی نہیں رہے تھے، اور اقتدار کی سیاست سے کوسوں دور تھے، لیکن حکومت کے ظلم و ستم نے انہیں بھی نہ بخشا، وہ بھی ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اور بالآخر ریاض میں آکر مقیم ہو گئے، جہاں عرصۂ دراز تک وہ جامعۃ الامام محمد بن سعود کے کلیۃ اصول الدین میں تدریسی اور تحقیقی خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی دوران وہ بار بار پاکستان آئے۔ وہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بہت مانتے تھے، اور ان سے اجازت حدیث بھی حاصل کی تھی۔ نیز حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ چنانچہ جب بھی انہوں نے ہمارے یہاں قیام کیا، کبھی حضرت مولانا بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مقیم رہے، اور قیام کے دوران ان کے علمی افادات کا سلسلہ مستقل جاری رہا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد تشریف لائے تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یاد کر کے دیر تک اشکبار رہے، اور اس کے بعد ہم پر ان کی شفقتوں کا سایہ اور گہرا ہو گیا۔ اسی دوران ایک مرتبہ تقریباً دو ماہ تک ہمارے یہاں دارالعلوم میں مقیم رہے، اور اپنی متعدد تصانیف کی تکمیل فرمائی۔ دارالعلوم کے تقریباً تمام طلبہ اور اساتذہ سے بے تکلف تھے، اور شفقت میں اپنی مثال آپ۔

اگرچہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا اصل میدان تعلیم و تصنیف تھا، اور وہ بیشتر علمی کاموں ہی میں مشغول رہتے تھے، اسی بنا پر وہ طبعاً تو علمی آدمی تھے، لیکن دوسرے علماء کی طرح انہیں دینی مقاصد کے لئے سیاست میں حصہ لینے پر بھی مجبور کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں انہیں شام کی پارلیمنٹ کا رکن بھی منتخب کیا گیا۔ ان حلقوں میں اخوان المسلمون احیاء دین کی جدوجہد کرنے والی واحد طاقتور تنظیم تھی۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اس سے بھی متعلق رہے، اور شام میں اسلامی اقدار کی پامالی کے خلاف جدوجہد کے نتیجے میں ۱۹۶۶ء میں تدمر کے صحرائی قید خانے میں گیارہ ماہ گزارنے پر بھی مجبور ہوئے۔ شام سے ہجرت کے بعد اگرچہ وہ ریاض میں مقیم ہو گئے تھے، لیکن عرب دنیا میں بالعموم اور شام میں بالخصوص دین کے علمبرداروں کو سرکاری ظلم و ستم سے بچانے کے لئے ان کی کوششیں مسلسل جاری رہیں، اور ۱۹۸۹ء میں انہیں "اخوان" کا مرشد عام بھی بنا

[illegible] پھر یہ ذمہ داری ڈاکٹر حسن الہویدی کے سپرد کر کے اپنے خاص علمی مشغلے کی طرف واپس آگئے۔

سعودی عرب میں ان کے قیام کے دوران متعدد بار احقر کو ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ ایک مرتبہ ان کی دعوت پر ریاض بھی گیا، اور ان سے خط و کتابت اور علمی معاملات میں استفادے کا سلسلہ تو مستقل تعلق [illegible] جاری رہا۔

احقر نے "تکملہ فتح الملہم" کی تالیف کا آغاز کیا تو حضرت شیخ جب [illegible] میں دارالعلوم تشریف لائے، اس کام پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور جلد اولیٰ کے لئے کتاب پر تقریظی کلمات بھی تحریر فرمائے۔

حضرت شیخ عبدالفتاح علامہ محمد زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد تھے۔ علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تبحر علمی سے فقہ حنفی اور مسلک اشاعرہ کا بڑی قوت سے دفاع کیا، اور جن حضرات نے فروعی اختلافات کی بنیاد پر احناف اور اشاعرہ کو طعن و تشنیع بلکہ سب و شتم کا نشانہ بنایا ہے، ان کا ترکی بہ ترکی جواب دیا ہے۔ دوسرے معاصرین کی طرح علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کی بعض باتوں یا ان کے طرز بیان سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ انہوں نے ان مظلوم اہل علم کے دفاع کا فرض کفایہ ادا کیا ہے، جن پر کسی معقول وجہ کے بغیر تضلیل اور طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کی گئی ہے۔ حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس معاملے میں بھی اپنے استاذ علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کی وراثت کا حق ادا کیا، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے قلم میں مخالف نقطۂ نظر رکھنے والے علماء کے خلاف جارحیت یا سوء ادب کا شائبہ بھی نہیں آنے پایا۔ ان معاملات میں انہوں نے اپنی بحث کو ہمیشہ علمی حدود میں محدود رکھا، اور بحث میں [illegible] بار تحقیق و [illegible] تک پہنچنے نہیں دیا۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ سے ان معاملات میں انکا اختلاف ظاہر ہی ہے، لیکن ان بزرگوں کے بارے میں کوئی ہلکا کلمہ ان کی زبان یا قلم سے نکلتا ہوا میں نے نہیں دیکھا۔ بلکہ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے علمی مقام کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ وہ رو پڑے اور ان کی موجودگی میں ایک مرتبہ علامہ

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کسی نے ایسے الفاظ میں کر دیا جو ان کے شایانِ شان نہیں تھا تو اس پر انہوں نے سختی کا نوٹس فرمایا۔

اس احتیاط کے باوجود بعض ناقدرشناس حلقوں نے ان کے خلاف ایک محاذ بنا کر انہیں صرف تنقید ہی نہیں بلکہ تشنیع کا نشانہ بنایا جو بعض جگہ سب و شتم کی حدود میں داخل ہوگئی۔ فانا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ کے دین کے خادموں کو ہر دور میں اس طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہے۔ جو ان کے لئے مزید ترقی درجات کا ذریعہ بنتا ہے۔ کاش کہ امت مسلمہ میں فروعی اختلاف کو اختلاف کی حدود میں رکھنے کا مذاق پیدا ہو جائے تو ہماری صفوں میں پڑے ہوئے کتنے شگاف بھر جائیں۔

اس سلسلے میں ہمارے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کا سوچا سمجھا طریق کار یہ تھا کہ فروعی اختلافات کو عوامی سطح پر اچھالنے کے بجائے انہیں خالص علمی اور تحقیقی حلقوں تک محدود رکھا جائے اور جب تک کسی شخص کا نظریہ کھلی گمراہی یا کفر تک نہ پہنچا ہو، اس کے ساتھ فروعی اختلاف کو محاذ جنگ بنانے سے روکا جائے۔ اس کے بجائے تمام وہ صلاحیتیں جو دین کی بنیادوں سے متفق ہیں مل جل کر عصر حاضر کے ان فتنوں کا مقابلہ کریں جو براہ راست اصول دین پر حملہ آور ہیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر "وحدتِ امت" کے نام سے ایک رسالہ بھی تالیف فرمایا تھا جس کا عربی ترجمہ "الوفاق مع الخلاف" کے نام سے سعودی عرب میں بھی بڑی تعداد میں تقسیم ہوا۔ اس رسالے کی شیخ نے بھی دعوت کی ہے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مزاج و مذاق بفضلہ تعالیٰ راقم کو بھی نصیب ہوا۔ چنانچہ جن حضرات سے فروعی اختلافات ہیں ان کے ساتھ علمی اختلاف اور احترام کے ساتھ ہی تعاون، اخوت و محبت کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ سعودی عرب کے سلفی علماء سے فروعی مسائل میں علمی اختلاف اپنی جگہ اب بھی موجود ہے۔ بعض مرتبہ ان کی مجلسوں میں ان سے کھل کر گفتگو بھی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یہ اختلاف ان کے ساتھ تعلقات، مشترک مقاصد میں تعاون اور ان کے اچھے کاموں کی قدردانی پر بحمداللہ کبھی اثر انداز نہیں ہوا۔

پچھلے دنوں شاید احقر کے اس طرز عمل کی غلط توجیہ کرتے ہوئے کسی نے حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ تک یہ بات پہنچائی کہ میں اپنے مسلک کے معاملے

میں کسی علاحدہ جماعت یا تنظیم کا شکار ہو جاؤں۔ چنانچہ انہوں نے پہلے بزرگانہ شفقت کے مطابق مجھ سے اپنے اس خوف کا اظہار فرمایا لیکن جب میں نے اپنا مذکورہ بالا نقطۂ نظر اور طرزِ عمل شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے تفصیل کے ساتھ بیان کیا تو وہ نہ صرف پوری طرح مطمئن ہوئے بلکہ اس بات کی تائید فرمائی کہ ان مسائل کو نہ نزاع و جدال کی بنیاد بنانا چاہئے اور نہ انہیں مشترک دینی مقاصد میں باہمی تعاون کے راستے میں رکاوٹ بننا چاہئے۔ معاملہ انہی لوگوں نے خراب کیا ہے جو علمی اختلاف کی حدود کو پھلانگ کر تضلیل و تفسیق اور طعن و تشنیع پر اتر آئے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے احقر کی کتاب "تکملہ فتح الملہم" پر پہلی تقریظ اس وقت لکھی تھی جب میرا مسودہ شاید سو صفحات تک بھی نہیں پہنچا تھا، چنانچہ یہ تقریظ مختصر تھی۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے کتاب کی تالیف مکمل فرما دی اور وہ اس کی چھ جلدیں شائع ہو گئیں تو شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے خود فرمایا کہ اب میں اس پر دوسری تقریظ لکھنا چاہتا ہوں، چنانچہ انہوں نے بعد میں نہایت تفصیل سے تقریظ لکھ کر بھیجی اور اس میں جو حوصلہ افزائی کے جو غیر معمولی کلمات تحریر فرمائے وہ احقر کے استحقاق سے کہیں زیادہ اور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی انتہائی شفقت کے عکاس ہیں۔

سالہا سال سے شیخ رحمۃ اللہ علیہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا کتب خانہ بھی جو ان کی عمر بھر کا اثاثہ تھا، ان سے جدا تھا۔ وطن واپس جانے کی بظاہر کوئی سبیل نہ تھی لیکن پچھلے سال اچانک حکومت شام کی طرف سے ان کی مراجعت کے لئے کچھ نرمی پیدا ہوئی تو سولہ سال کے بعد آپ اپنے وطن حلب تشریف لے گئے۔ اس دوران آپ کی آنکھوں میں تکلیف شروع ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے دل کا بائی پاس بھی ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے علاج کے لئے آپ دوبارہ ریاض تشریف لائے۔ یہاں آنکھوں سے خون جاری ہونے کی بیماری پیدا ہو گئی۔ (بعض حضرات کا خیال ہے کہ بے وقت کی کتب بینی اس کا سبب تھی) جو علاج کے باوجود بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ آخر میں آپ پر غشی طاری ہو گئی۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے ڈاکٹر عبد الستار ابو غدہ میرے بے تکلف دوست ہیں (اور پچھلے سالوں میں ہمارے درمیان قربتیں اتنی بڑھی ہیں کہ ہم ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے ہیں) وہ بتاتے ہیں کہ اسی غشی کے دوران ایک روز شیخ

ہفتہ کو اچانک قدرے ہوش آیا تو پوچھتے ہی جو جملہ ان کی زبان سے ادا ہوا وہ یہ تھا ”کیا کتاب کے فرمے پریس سے چھپ کر آگئے؟“ اس کے بعد وہ دوبارہ غشی کی حالت میں چلے گئے، اور بالآخر ۹ شوال ۱۴۱۷ھ (مطابق ۱۶ فروری ۱۹۹۷ء) کو فجر کے وقت انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

اللهم اكرم نزله ووسع مدخله وابدله دارا خيرا من داره واهلا خيرا من اهله واغسله بماء الثلج والبرد ونقه من الخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس

اسی روز صبح آٹھ بجے ہوں گے کہ بیروت میں مجھے جدہ سے ہمارے محترم دوست جناب قاری عبدالباسط صاحب نے اور پھر ریاض سے ایک دوست نے فون پر ان کے اندوہناک سانحے کی اطلاع دی۔ اسی روز موصوف کو مدینہ طیبہ لے جایا گیا اور جنت البقیع میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

دنیا کا نظام اسی طرح چل رہا ہے کہ آنے والے آتے اور جانے والے جاتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسی شخصیتیں کم ہیں جن کے اٹھ جانے سے مشرق و مغرب کے انسانوں کے دل روئیں اور نسبی قرابت نہ رکھنے والے بھی ان کی وفات کو ذاتی حادثہ محسوس کریں۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ ایسی ہی شخصیت کے حامل تھے۔ یوں تو اب علم کی ظاہری صورت میں بھی انحطاط نمایاں ہے، لیکن صرف ظاہر کی حد تک اب بھی شخصیتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ایسی شخصیات جن کے کردار و گفتار میں علم رچا بسا ہو، جن کی زندگی اتباع سنت اور سلف صالحین کے طرز و انداز سے منور ہو، جن کی ادا ادا میں تواضع، علم، خشیت اور حسن اخلاق کا جلوہ نمایاں ہو، اب مشکل ہی سے کہیں نظر آتی ہیں، اور جب ایسی کوئی شخصیت اٹھتی ہے تو عرصہ دراز تک اس کا خلا پر نہیں ہوتا۔

حضرت شیخ عبدالفتاح رحمہ اللہ کی مطبوعات کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ انہوں نے اپنی مستقل کتابیں تالیف کم کی ہیں (جو شاید بیس سے کم ہیں) لیکن بزرگان سلف کی کتابوں کی تحقیق و تخریج اور تعلیق پر زیادہ کام کیا ہے۔ اور ایک بار اس کی وجہ خود یہ بیان فرمائی کہ ہم لوگوں کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے، ہمارے لئے سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ سلف میں سے کسی بزرگ کے دامن سے وابستہ ہو جائیں لہٰذا کسی بڑے کی کتاب کی خدمت میں عافیت بھی ہے اور برکت بھی۔ جو کام اس تواضع للہیت اور سلف کے ادب و احترام کے ساتھ کیا جائے اس میں نصرت الٰہی کیوں

شائع ہو چکی ہے، بسا اوقات ان کی تعلیقات اصل کتابوں سے زیادہ مفصل اور نادر نکات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے حکم پر احقر کے والد ماجدؒ نے "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" مرتب فرمائی تھی، حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے اس کتاب کو دریافت کر کے اپنے مبسوط حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے علاوہ "مقدمہ اعلاء السنن" "الاجوبۃ الفاضلۃ" اور "الرفع والتکمیل" پر ان کی تعلیقات ان کی محدثانہ بصیرت کا شاہکار ہیں۔

پچھلے دنوں آکسفورڈ کے مرکز الدراسات الاسلامیہ نے حدیثی خدمات پر سلطان برونائی ایوارڈ کا اعلان کیا تو حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کو بجا طور پر یہ ایوارڈ دیا گیا (اس ایوارڈ کے لئے شیخؒ کا نام تجویز کرنے والوں میں احقر بھی شامل تھا) لیکن موصوفؒ ان حضرات میں سے تھے جو اس قسم کے کسی ایوارڈ سے کہیں بلند ہوتے ہیں۔ یہ ایوارڈ کی خوش قسمتی ہے کہ وہ صحیح جگہ پر پہنچ جائے، ورنہ حضرت شیخؒ کی خدمات اس سے بے نیاز ہیں۔

آج حضرت شیخؒ اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن ان کی تصانیف، ان کے تیار کئے ہوئے شاگرد اور ان کی سیرت و کردار کی خوشبو سدا بہار ہے، اور ان شاء اللہ اس وقت تک یادگار رہے گی جب تک علم اور کردار کے قدردان دنیا میں موجود ہیں۔ ولا باقی الا اللہ

(البلاغ جلد ۳۱ شمارہ ۱۲)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

جب سے شعور کی آنکھ کھلی، اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بدولت گھر میں روزانہ آنے والی ڈاک کا ایک پلندا ڈاکیے سے وصول کرنا روزمرہ کے معمول میں شامل رہتا تھا۔ اس ڈاک میں خطوط کے علاوہ ماہنامے اور ہفتہ وار جرائد و رسائل بھی اچھی خاصی تعداد میں ہوتے تھے۔ جب یہ جرائد و رسائل آتے تو انہیں الٹ پلٹ کر ان کی کم از کم ورق گردانی کا شوق مجھے اس وقت سے تھا جب ان جرائد و رسائل کے مندرجات کا تقریباً اسی فیصد حصہ میری سمجھ سے بالاتر ہوتا تھا۔ انہی رسائل میں ایک ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ بھی تھا، جس پر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی ہوتا تھا، دیکھ دیکھ کر یہ نام دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اور بچپن ہی میں یہ بات ذہن میں جم گئی تھی کہ یہ بزرگ ایسے اہل قلم میں سے ہیں جن کی نگارشات اپنی فہم کی سطح سے بالاتر ہوتی ہیں۔

جب رفتہ رفتہ حرف شناسی میں اضافہ ہوا تو یہ نگارشات تھوڑی تھوڑی سمجھ میں بھی آنے لگیں، بالخصوص "الفرقان" میں "معارف الحدیث" کے مسلسل عنوان کے تحت احادیث نبوی ﷺ کی جو عام فہم تشریح حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے شائع ہوتی تھی، اس کا بیشتر حصہ فہم سے بالاتر نہ رہا، اور اس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے غائبانہ ایک انسیت پیدا ہو گئی۔

پھر طالب علمی کے دوران علمائے دیوبند اور علمائے بریلی کے مسلکی اختلافات پر متعدد کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی۔ اکابر علمائے دیوبند رحمہم اللہ کی جن بعض تحریروں پر علمائے بریلی کی طرف سے سخت اعتراضات کئے گئے تھے، ان کے بارے میں حقیقت حال کی وضاحت بہت سے حضرات نے کی، لیکن اس موضوع پر جس کتاب نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "فیصلہ کن مناظرہ" تھی۔ اس کتاب میں حضرت مولانا نے جس مدلل، متین اور مستحکم انداز میں ان تحریروں کی وضاحت فرمائی تھی، حقیقت یہ ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد کسی بھی

انصاف پسند ذہن کے دل میں ان اکابر کے عقائد کے بارے میں کوئی ادنیٰ شبہ بھی نہیں رہ سکتا۔ کتاب کا نام تو اگرچہ "علماء کا مناظرہ" ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کوئی مروجہ قسم کی مناظرانہ کتاب ہوگی، در حقیقت یہ جماعت اسلامی سے مقابلے کے بارے میں ہے [illegible] کہ یہ ایک فرقہ [illegible] ہے جس میں [illegible] اور پہلوان [illegible] مولانا مودودی کو زیر کرنے کے داؤں استعمال کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں حق تلفی کا پہلو بھی کم رہ جاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے کہ مولانا کی یہ کتاب اس قسم کی مناظرانہ فضا سے کوسوں دور ہے۔ بلکہ اسکو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک مناظرہ کیا ہوتا ہے؟ اصل میں "مناظرہ" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "مل کر کسی مسئلے پر غور کرنا"۔ مولانا نے اس کتاب میں مناظرے کی اسی حقیقت کی عملی تصویر پیش کی ہے۔ ان کا انداز، اسلوب عام مناظرے کا اسلوب نہیں بلکہ اس میں علمی تحقیق، سنجیدگی اور مدلل انداز بیان ہے جس کا نتیجہ حق کی تفہیم ہے نہ کہ مخالف کی تذلیل۔

پھر [illegible] کے لگ بھگ پاکستان اور ہندوستان کے علماء نے مل کر غلام احمد پرویز صاحب کی کتابوں کا جائزہ لیا اور ایک متفقہ فتویٰ مرتب کیا جس میں کہا گیا تھا کہ پرویز صاحب اپنے کفریہ عقائد و افکار کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ یہ فتویٰ پرویز صاحب کی کتابوں کی چھان بین کے بعد مرتب کیا گیا تھا۔ اور اس پر تمام مکاتب فکر کے علماء کے دستخط تھے۔

اس موقع پر پرویز صاحب کے متبعین نے یہ کہہ کر آسمان سر پر اٹھا لیا کہ علماء کرام کا تو مشغلہ ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو کافر بناتے رہتے ہیں۔ حالانکہ خود پرویز صاحب [illegible] بات سے دور ہے۔ بعض حضرات بھی اس پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اس فتوے کو اعتراضات کا نشانہ بنانے لگے۔ اس موقع پر فتویٰ کی تائید اور اس پروپیگنڈے کی تردید میں بھی متعدد مضامین و مقالات منظر عام پر آئے لیکن اس موضوع پر سب سے زیادہ مدلل، جامع اور [illegible] والی تحریر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم کی تھی جو "الفرقان" میں شائع ہوئی۔ اور اسے پاک و ہند کے بہت سے

علمی مجلات نے نقل کیا۔ مولانا کے مستحکم انداز تحریر کا قائل تو میں پہلے بھی تھا، لیکن اس تحریر سے اندازہ ہوا کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے قاری کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی کس غیر معمولی صلاحیت سے مالا مال فرمایا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ایران کے اس مضمون نے "خمینیت" کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کی دھند صاف کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

بعد میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بہت سی تحریریں پڑھنے کا موقع ملتا رہا، اور ان سے غائبانہ عقیدت و محبت پیدا ہوتی گئی، لیکن پاک و ہند کے تباین یا دوری کی وجہ سے انکی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ بالآخر پہلی بار مکہ مکرمہ میں انکی زیارت ہوئی۔ اور اس کے نتیجے میں مراسلت کا سلسلہ بھی قائم ہوا۔ کوئی نئی کتاب آتی تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ شفقت فرماکر احقر کو ارسال فرماتے، اور مختلف مسائل پر خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ افسوس ہے کہ مولانا کے ابتدائی کچھ خطوط میرے پاس محفوظ نہ رہے، لیکن بعد میں میں نے اکثر خطوط محفوظ بھی رکھے۔ اس کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ پاکستان تشریف لائے، اور دارالعلوم میں خطاب بھی فرمایا۔ اس وقت حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہو چکی تھی، اور ان کے ذکر مبارک کیلئے "البلاغ" کا مفتی اعظم نمبر زیر ترتیب تھا، مولانا نے احقر کی فرمائش پر اس کیلئے مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا، اور ہندوستان جاکر مضمون بھیجا جو مفتی اعظم نمبر کی زینت بنا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ "الفرقان" کی ادارت اپنے فاضل صاحبزادے جناب مولانا عتیق الرحمن صاحب سنبھلی کے سپرد کر دی تھی، لیکن وقت کی تقریباً ہر اہم ضرورت پر ان کی تحریریں "الفرقان" میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اسی دوران سعودی عرب میں علمائے دیوبند کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں نے وہاں یہ تأثر پھیلانا شروع کیا کہ علمائے دیوبند علمائے نجد کے سرخیل شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں معاندانہ رائے رکھتے ہیں، اور ان کے بارے میں توہین آمیز رویہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ مولانا نے اس تأثر کے ازالے کیلئے "الفرقان" میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جس میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور علمائے دیوبند کے درمیان وجوہ موافقت شرح و بسط

کے ساتھ بیان کی گئی تھیں اور شرک وبدعت کی تردید میں دونوں کے درمیان جو قدر مشترک تھی اس پر زور دیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ مضمون بھی مولانا کی عام عادت کے مطابق مدلل اور مفید تھا لیکن اس کی چند قسطیں پڑھنے کے بعد مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ قسط وار کے صرف ایک رخ ہی پر ختم نہ ہو جائے اور حضرات دیوبند کا شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بعض نظریات سے جو واضح اختلاف رہا ہے، اس کے تذکرے سے خالی نہ رہ جائے۔ چنانچہ میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں ایک خط لکھ کر جس میں اس جانب خفیف اندیشہ کا اظہار کرتے ہوئے یہ درخواست کی کہ مضمون کا تاثر یہ پیدا نہ ہونا چاہئے کہ علماء دیوبند اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے نظریات میں کوئی اختلاف ہی نہ تھا۔ بلکہ جس حد تک اور جتنا اختلاف تھا اس کا اظہار بھی دیانۃً درست رکھنے کیلئے ضروری ہے جس کے بغیر یہ سارا مضمون ادھورا لگتا رہے گا اور اس سے مزید غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔

میں نے یہ خط لکھ تو دیا تھا لیکن بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ مولانا کے مقام بلند کے آگے میری حیثیت ایک ادنیٰ شاگرد کی بھی نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ جسارت کر کے میں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہو۔ لیکن میرے خط کے جواب میں مولانا کا جو گرامی نامہ آیا اس میں انہوں نے اپنی بڑائی کی انتہا کر دی۔ میری گزارش پر کسی ناگواری کا اظہار تو کجا، میری اتنی ہمت افزائی فرمائی کہ میں پانی پانی ہو گیا۔ مولانا کا یہ گرامی نامہ چونکہ متعدد فوائد پر بھی مشتمل ہے اس لئے اسے بعینہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

برادر محترم و مکرم جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب

حرسکم اللہ تعالیٰ الیکم راضیاً

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا نامہ اخلاص و شفقت (مورخہ ۲ ربیع الثانی)

موصول ہوا اور آپ کی قلم سے نکلے ہوئے الفاظ سے

آپ کو اندازہ نہیں کہ کتنا اس کو پڑھ کر خوشی ہوئی۔ یہ حق

ذکی بھائی

خط و کتابت سے مجھے فطری مناسبت نہیں ہے اس لئے آنے والے خطوط میری طبیعت پر بوجھ بن جاتے ہیں لیکن آپ کا مکتوب محبت قبول ہونے کے باوجود میرے لئے راحت و فرحت کا باعث ہے۔

آپ نے [illegible] "واثقیت" [illegible] کے ذریعہ میرے دل میں آپ کی خاص قدر و قیمت ہے جس طرح شاعری کی ملاقاتوں میں آپ کو بھی دیکھا تھا۔ خدا تعالیٰ ہر طرح کی ترقیات سے نوازے۔ اب چند دنوں سے بیمار رہتا ہوں

۱۔ "[illegible]" اور "مسلم الفرجی" کا کوئی نسخہ [illegible] سے یہاں نہیں پہنچا [illegible] مجھے [illegible] منتظر رہوں گا۔ (ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ تحفہ مرتب (آئی [illegible]) والوں کے [illegible] جو ان کے ذریعہ مل جائے گی مجھے [illegible] مل جائے گا

۲۔ [illegible] آپ نے اپنے مولانا کے خط سے [illegible] مجھے آپ کی "[illegible]" کے اجمالی یا تفصیلی تبصرہ سے علاوہ [illegible] جوابی خط میں [illegible] بزرگوں کے جو واقعات اور تبصرے [illegible] کئے ہیں وہ مقصد کیلئے بہت مفید ہیں۔ لیکن اس کی ہیئت اور حضرت مولانا کی غیر معمولی عربی خدمت کی وجہ سے اس سے زیادہ فائدہ نہیں ہو سکا اس کے علاوہ اس میں ایک خاص کمزوری یہ ہے کہ اس میں "سیف النقی" کے اقتباسات [illegible] کے لحاظ سے رکھے گئے ہیں۔ ا۔ "سیف النقی" "سلم الفرجی" کے جواب میں اسی زمانے میں شائع ہوئی تھی اس میں مولوی

احمد رضا خان کے باپ ' دادا ' جی یا بابا پیر کی کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے نام سے کتابیں گھڑ کر ان کے مصنفین اور مؤرخین کے ساتھ حوالے دیئے گئے تھے (اور یہ سب حوالے بالکل بے اصل تھے) یہ کتاب کسی نے لکھ کر دیوبند بھیجی تھی اور اسی زمانہ میں (غالباً حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کے کتب خانہ کی طرف سے) چھپ کر شائع ہوگئی تھی۔ بعد میں جب مولوی احمد رضا خان نے گرفت کی اور حوالوں کو چیک کیا تو معلوم ہوا کہ یہ کسی دشمن کی حرکت تھی، اس کا مصنف (محمد تقی اجمیری) نامعلوم تھا۔ جب وہ چھپی تھی تو ہمارے حلقہ میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور اسی زمانہ میں حضرت مولانا مدنی رحمہ اللہ نے جب "الشہاب الثاقب" لکھی تو اس کے اعتماد پر حوالے دیدیئے۔ اس غلطی نے "الشہاب الثاقب" کی افادیت کو بہت نقصان پہنچایا۔ (مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رحمہ اللہ کا خیال تھا کہ یہ جال بریلی ہی سے پھینکا ہوا جال تھا، ناواقفی سے ہمارے حضرات اس میں پھنس گئے۔) واللہ اعلم۔

آپ کے مکتوب سے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے "الشہاب" کو اجمالی واقعاتی مع زبان کی تبدیلی کے ساتھ اس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ میں نے "سیف النقی" والی بات اس لئے لکھی کہ آپ کے علم میں رہے۔ خیال یہ ہے کہ ناواقفی کی وجہ سے دیوبند کے کسی کتب خانے نے پھر وہ چھاپ دی ہے۔

بڑا افسوس اور قلق ہے کہ میرے لئے اب سفر بہت مشکل ہو گیا ورنہ میں چاہتا تھا کہ ایک دو ہفتہ حضرت کے

لئے ادھر جاؤں۔ کراچی یا لاہور میں قیام کروں اور پھر دینی استعداد والے فضلا اور منتہی طلبہ کو بریلوی فتنہ سے مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت کرنے کی تیاری میں کچھ ان کی مدد کروں۔ یہ طائفہ ضرر کے لحاظ سے قادیانیوں سے بھی بڑا فتنہ ہے۔ اس سے امت کی حفاظت کے لئے پوری واقفیت کے ساتھ بڑی محنت عملی کی ضرورت ہے۔ لیکن میری صحت کے میں سفر سے معذور ہوں۔

۲۔ "زلزلہ کا پوسٹ مارٹم" الگ کوئی کتاب نہیں ہے "بریلوی فتنہ" کے دوسرے ایڈیشن میں بطور مقدمہ کے میرے ایک مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے۔ جو افادیت کے لحاظ سے اچھا اضافہ ہے اور مضمون ترمیمیں بھی کی گئی ہیں۔ اور ٹائٹل پر کتاب کے دوسرے نام کے طور پر "زلزلہ کا پوسٹ مارٹم" لکھ دیا گیا ہے۔

۳۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب اور اپنے اکابر سے متعلق جو سلسلہ جاری ہے اس کے بارے میں جس لگن اور کاوش اجتماعی بات کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے اس سے اندازہ ہوا کہ اب تک بھی آپ کو (کم عمری کے باوجود) علم وفہم کے جس امتیازی مقام پر سمجھتا تھا اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت سے آپ اس سے بھی بالاتر ہیں۔ آپ کی اس بات کی میرے دل نے بڑی قدر کی یہ نہایت ضروری اور اہم بات تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپ کو عطا فرما رکھا ہے اس سے ہزاروں درجہ زیادہ اور عطا فرمائے۔ اور علم کے ساتھ دین میں اور اپنی ذات پاک کے ساتھ خاص تعلق میں بے حساب اضافہ فرمائے۔ ہمارے اکابر اور علمائے نجد کے

مطلب میں باہم اختلاف بھی ہے اور اس مضمون میں ان کا اظہار بھی ضروری تھا۔ [illegible] شروع ہی سے [illegible] بھی تھا [illegible] کا [illegible] کیا شائع ہوئی ہے [illegible] آپ کی طرف سے [illegible] آیا ہے۔ احتیاطاً [illegible] کے لئے کیا ہے۔

[illegible] چوتھی قسط [illegible] کے شروع میں آ رہی ہے انشاء اللہ وہ [illegible] ان میں [illegible] واقعات [illegible] اور براہ راست واقفیت رکھنے والے اب بہت کم رہ گئے ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بھی [illegible] بالتفصیل [illegible] کا ارادہ ہے۔

۵۔ چوتھی قسط میں [illegible] ہو رہا ہے اس کا [illegible] جو اللہ تعالیٰ کی [illegible] ہے۔ مجھے [illegible] بھی [illegible] تعالیٰ نے اپنی خاص قدرت سے [illegible] انشاء اللہ۔

۶۔ [illegible] چوتھی قسط [illegible] آپ [illegible] مضمون [illegible] مستقل مضمون [illegible]

۷۔ [illegible] ایک صاحب [illegible] صاحب

"المنار" میں بھی شائع ہو رہے ہیں۔

۵۔ مجموعہ کی قسط میں نواب صدیق حسن خان مرحوم کی عبارتیں اقتباسات ان کتابوں کا پورا متن درج ہیں کہ جنہوں نے "الشہاب الثاقب" اور "الصدیقیات" سے اس موضوع سے متعلق مندرجات "وہابی" چھاپا ہے۔ تاہم آپ کے علم میں نہ ہوا ہو تو بہت پہلے مولانا محمد اسماعیل (گوجرانوالہ) مرحوم کا ایک رسالہ عربی میں وہاں بہت بڑی تعداد میں شائع کیا گیا تھا جس کے ذریعہ وہاں سے علماء اور عام باشندوں کو شیخ محمد بن عبد الوہاب اور ان کی جماعت سے متعلق "الشہاب الثاقب" اور "الصدیقیات" سے واقف کرایا گیا تھا۔ صرف یہی اس کا موضوع تھا۔ مجھے یہ رسالہ گذشتہ سال وہیں سے ملا تھا اور اس نے مجھے اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت کا احساس کرایا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا ہے کہ مرحوم نواب صدیق حسن خان اور دوسرے اکابر ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں میں نے نواب صاحب کی طرف سے بھی وہی عذر کیا ہے جو اپنے اکابر کی طرف سے کیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب دوسرے بزرگوں کی طرح ان کی کتابوں اور عبارت سے "بالکل ناواقف" نہ تھے۔ "اتحاف النبلاء" نواب صاحب نے "ترجمان وہابیہ" سے قریباً ۲۰ سال پہلے لکھی ہے۔ اور اس میں شیخ محمد بن عبد الوہاب کے تذکرہ میں ان کے فرزند شیخ عبداللہ ابن محمد بن عبد الوہاب کے اس رسالہ کا طویل اقتباس نقل کیا ہے جس کے چند اقتباسات بھی اسی مجموعہ کی قسط میں درج کئے ہیں کہا جا سکتا ہے کہ نواب صاحب اس سے

بارے میں پوری طرح مطمئن بھی نہیں تھے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ "ترجمان وہابیہ" انہوں نے اپنی خاص سیاسی مصلحت یا مجبوری سے لکھی تھی جب کہ ان کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ انگریزی حکومت ان کے "وہابی" ہونے کی بنا پر ان کے بارے میں غیر مطمئن ہو جائے گی۔ ترجمان وہابیہ لکھنے کی کتاب ہے اس کو ضرور دیکھئے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر صرف حنفیوں نے کیا تھا "اہل حدیث" اس سے بالکل الگ رہے۔ اس پوری کتاب کا حاصل یہ ہے کہ سید احمد اور ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کا محمد بن عبدالوہاب اور ان کی جماعت سے کوئی تعلق نہیں یہ مقلد حنفی ہیں اور اہل حدیث ہیں اور انہوں نے جہاد کے نام سے فساد برپا کیا اور ہم "امن پسند" ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حالات کی مجبوریاں بھی عجیب چیز ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ ہی محفوظ رکھے۔ بھائی مولانا محمد رفیع صاحب کو بھی سلام مسنون اور آپ سب حضرات سے دعا کی درخواست۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

محمد منظور نعمانی

دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر جب مجھے ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا تو میں دیوبند کے بعد لکھنؤ بھی گیا۔ اس سفر کا بڑا مقصد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مد ظلہم اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات تھی۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس وقت بہت کمزور ہو چکے تھے لیکن احقر کو نہ صرف شرف ملاقات بخشا بلکہ میرے استحقاق سے کہیں زیادہ شفقت اور اکرام کا معاملہ فرمایا۔

مولانا کے آخری ایام حیات کا ایک بڑا تاریخی کارنامہ مولانا کی کتاب "ایرانی انقلاب" ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے "الفرقان" میں ایک سلسلہ مضامین پر قلم

گیا تھا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس موقع پر بھی حضرت مولانا نے احقر کو مندرجہ ذیل خط تحریر فرمایا:

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۳ ذی الحجہ لکھنؤ ۱۴۰۰ھ

برادر مکرم محترم جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب

زید مجدہم۔ سلام و رحمت

خدا کرے ہر طرح عافیت ہو۔

”البلاغ“ تو اپنا پابندی سے روانہ ہوتا ہوگا لیکن کبھی کبھی ہی پہنچتا ہے۔ خدا کرے ”الفرقان“ پابندی سے پہنچتا ہو۔ معلوم ہوا ہے کہ دفتر سے پابندی سے روانہ کیا جاتا ہے۔

ایران کے انقلاب اور خمینی سے متعلق ”الفرقان“ کے تین شماروں میں جو کچھ لکھا گیا ہے خدا کرے نظر سے گزرا ہو (اس کی پہلی قسط تو البلاغ و بینات میں بھی شائع ہوئی ہے) ___ عمر کے تقاضے سے مجھ پر ضعف کا بہت غلبہ ہو گیا ہے میں اس حال میں نہیں تھا کہ کوئی ایسی چیز تصنیف کروں جس کیلئے محنت کرنی پڑے لیکن میں نے اس کو وقت کا اہم فریضہ اور بعض خاص وجوہات سے اپنے حق میں فرض عین سمجھا اور میں نے ایک مستقل کتاب لکھنا شروع کی ہے جس کا ابتدائی حصہ ”الفرقان“ کے تین شماروں میں شائع ہوا۔ وہ کتاب بفضلہ تعالیٰ تکمیل کے مرحلہ میں ہے کتابت بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتی رہی اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق دے اپنے بندوں کیلئے نافع بنائے اور قبول فرمائے۔ تقریباً تین سو صفحات ہوں گے۔

کہ یہ اصلی غلطی ہو تو بھی آپ خود تکلیف کریں کہ آپ پوری کتاب کو شروع سے [illegible] پر مقدمہ لکھیں تو [illegible] مناسب ہے کہ یہ آسان نہیں [illegible] اس لئے کہ [illegible] پڑے گا اور میں جلد سے جلد کتاب کی اشاعت چاہتا ہوں کتاب تیار ہو جانے پر انشاء اللہ [illegible] ارسال خدمت ہوگی۔ آپ نے [illegible] کتاب کو [illegible] ہوگا۔ مجھے [illegible] بے ادبی نہ ہو تھوڑی عرض کرتا ہوں۔ [illegible] مجھے [illegible] اور آپ کی صحت کے بارے میں [illegible] حسن ظن پیدا ہوا اور [illegible] کی خدمت [illegible] سے [illegible] ہونے والے نوجوانوں کا جو حال دیکھا ہے دیکھ کر مجھے [illegible] سے یہ کہنا آسان ہو گیا کہ آپ [illegible] کی ضرورت ہے [illegible] حضرت شاہ صاحب [illegible] بھی [illegible] ان کا حال [illegible] دیکھئے۔

میں نے اس کتاب کے ذریعے [illegible] کام شروع کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ جیسے حضرات (جن کے [illegible]) اس مسئلہ کی طرف پوری توجہ فرمائیں اور اس [illegible] کا مناسب [illegible] بتائیں۔

برادر محترم مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کی خدمت میں سلام مسنون اور آپ سے اور ان سے دعا کی درخواست ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

(ابو منصور نعمانی)

شیعہ عقائد کے بارے میں ہمارے اہل سنت کی طرف سے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن مولانا نے اس کتاب میں جس نئے اسلوب سے ان مباحث پر گفتگو کی ہے اور بہت سی ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو پردۂ خفا میں تھیں۔ میں نے اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات بھی حضرت مولانا کی خدمت میں ارسال کئے تھے۔ خود میں نے اس سے جس طرح استفادہ کیا تھا اس کا تذکرہ کیا۔ لیکن ساتھ ہی کچھ طالب علمانہ گزارشات مسئلہ خلافت کے سلسلے میں پیش کی تھیں۔ حضرت مولانا نے یہ کتاب ضعف و نقاہت کے دور میں لکھی تھی اور اس کے بعد یہ کمزوری بڑھتی ہی چلی گئی جس کی وجہ سے مراسلت کا سلسلہ بھی برقرار نہ رہ سکا۔ آنے جانے والوں سے مولانا کی مسلسل بیماری اور معذوری کی اطلاعات ملتی رہیں اور ایک طویل عرصہ ایسے گزرا کہ مولانا سے کوئی قابل ذکر رابطہ نہ رہ سکا اور بالآخر وہ وقت آ ہی گیا جو ہر انسان پر مقدر ہے۔ مولانا علمی و دینی خدمات کا ایک سرمایہ ہمارے لئے چھوڑ کر اس عالم سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی "سرگزشت حیات" خود انہی کے قلم سے لکھی ہوئی شائع ہو چکی ہے۔ جو ہم جیسے ہر صاحب دل کے لئے موعظت و نصیحت کے بہت سے باب کھولتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا رحمہ اللہ کو مقعد صدق میں اپنے مقامات قرب سے نوازے۔ ان کی زلات کی کامل مغفرت فرمائے اور ان کے فیوض کو امت کے لئے جاری و ساری رکھے۔ آمین۔

(البلاغ جلد ۳ شمارہ ۱۰)

مولانا محمد مجاہد کی شہادت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے۔

مولانا مفتی محمد طاہر [illegible] مکہ مکرمہ [illegible] ۱۹۰۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے والد بزرگوار [illegible] سے [illegible] مولانا [illegible] صاحب ان کی [illegible] انتہائی [illegible] سے آپ [illegible] خاندانی اور [illegible] کے ساتھ [illegible] وقت کی خدمت کی ہے [illegible] ایک متوسط [illegible] رہے ہیں ان کی تعلیمی اور تبلیغی خدمات [illegible] پڑھنے کے شوقین ہیں ان کا احترام [illegible] سے [illegible] محبت ہے [illegible] نے ترجمہ میں حصہ لیا [illegible] جب ۱۹۶۲ء [illegible] کو پیدا ہوا تھا [illegible] ۱۹۹۶ء۔ [illegible] مولانا [illegible] آپ نے نوزائیدہ بیٹے کا نام اس مناسبت سے [illegible] محمد [illegible] رکھا ہے۔ نوزائیدہ مجاہد ان کی آغوش تربیت میں علم و [illegible] کرتا رہا۔ اس نے قرآن کریم حفظ کیا پھر اسلامی علوم کی تکمیل کی اس کے بعد [illegible] دارالعلوم کراچی میں تین سال درجہ تخصص کے ذریعے فتویٰ کی تربیت حاصل کی اور اپنے قلم [illegible] یہاں تک کہ آپ نے اپنے والد بزرگوار کے قائم کردہ ادارے "جامعہ [illegible]" میں تعلیم و تدریس کی خدمات انجام دینی شروع کیں اور اپنی [illegible] کے باوجود اس ادارے کے ذریعہ افراد سازی کی [illegible] خدمت اس انداز سے انجام دینی شروع کی کہ ان کے تمام شاگرد اپنی مثال آپ [illegible] جب مدرسے [illegible] کرتے ہوئے [illegible] کے منتہی [illegible] ساتھ [illegible] آپ کے ساتھ ساتھ انہوں نے فتویٰ نویسی کا سلسلہ بھی [illegible] اور تحقیق کے ساتھ جاری رکھا یہاں تک کہ ان کے پاس صرف عام مسلمانوں کی طرف سے ہی نہیں بلکہ اہل علم کی طرف سے بھی سوالات آتے اور وہ پوری تحقیق کے ساتھ ان کا جواب دیتے تھے۔

تدریس و فتویٰ کے ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی ان کو شغف تھا۔ ان کی متعدد تحریریں ملک کے متعدد رسائل میں شائع ہوتی تھیں [illegible] لاہور کے ماہنامہ

جو ان کے کالم میں دو مستقل دینی سوالات کا جواب دیتے تھے جنہیں شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ اور اس کے علاوہ بھی وہ عصری موضوعات پر علمی مقالات لکھتے رہتے تھے۔

میں نے دارالعلوم کراچی اور مرکز الاقتصاد الاسلامی نے زیر اہتمام ایک چھ روزہ کورس میں جدید معیشت اور تجارت سے متعلق اسلامی تعلیمات پر کچھ مفصل تقریریں کی تھیں۔ مولانا محمد مجاہد نے ان تقریروں کو ٹیپ سے مرتب کیا اور وہ ''اسلام اور جدید معیشت و تجارت'' کے نام سے مستقل کتابی صورت میں شائع ہوئیں اور اب بعض مدرسوں میں وہ داخل نصاب ہیں۔ ان کی یہ خدمت انشاء اللہ عرصہ دراز تک یادگار رہے گی۔

کراچی میں ''مرکز الاقتصاد الاسلامی'' (Centre for Islamic Economics) کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے، جو معیشت کے شعبے میں اسلامی تعلیمات کا تعارف کرانے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ وہ اسلامی معیشت کے متعدد موضوعات پر بہت سے لٹریچر بھی شائع کر چکا ہے۔ اس نے اس موضوع پر متعدد تعلیمی کورس بھی کرائے ہیں، اسلام کی معاشی تعلیمات پر متعدد کتابیں بھی شائع کی ہیں، اور جو لوگ اپنی صنعت و تجارت کو حتی الامکان اسلامی تعلیمات کے تابع بنانا چاہتے ہیں، ان کی رہنمائی کیلئے انہیں مشورے بھی فراہم کرتا رہتا ہے۔ فیصل آباد کے بعض تاجروں اور صنعتکاروں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اس مرکز کی ایک شاخ فیصل آباد میں بھی قائم ہو۔ فیصل آباد میں اس مرکز کی نگرانی کیلئے جب کسی شخصیت کے انتخاب کا سوال آیا تو اس کام کیلئے مولانا مجاہد صاحب کا نام سرفہرست تھا، کیونکہ متکلم فیہ مقالات کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی معیشت کے موضوع پر مطالعہ و تحقیق کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ پھر انہوں نے اس بھاری ذمہ داری کو قبول کرکے ادارے کی داغ بیل ڈالنے کا کام شروع بھی کر دیا تھا اور مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے فیصل آباد کے بعض سرمایہ دار حضرات نے ایک مجلس میں ان کا تعارف کرایا تھا، جن حضرات نے ان کی بات سنی تھی، انہوں نے ان کی گفتگو کے انداز میں بھی ایک بڑی رکاوٹ محسوس کی۔

اسی رمضان سے جو پہلا ہوا ہے الحمد للہ حضرت مولانا [illegible] صاحب مدظلہم نے مجھ کو [illegible] کی خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں شیخ [illegible] کا سفر حجاز ہوا اور وہاں چند گھنٹے ان کے پاس ٹھہرے اور یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ مجھ سے انہیں بہت گہرا تعلق تھا [illegible] محبت سے خط لکھتے رہتے تھے اور اپنے نئے معمولات سے بھی مجھے باخبر رکھتے تھے۔ رمضان سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے مجھے [illegible] کی تین چھوٹی چھوٹی چھپی ہیں اور [illegible] ہوئی [illegible] افسوس ہے کہ [illegible] بھی [illegible] ہیں۔ لیکن [illegible] ان کی [illegible] آیا ہے۔ ان کا [illegible] آیا اور مجھے [illegible] ان کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا ہے [illegible] میری ان سے [illegible] آخری [illegible] ان کے [illegible] ان کی [illegible] آیا [illegible] ہو گیا اور ان کی ایک خواہش بھی پوری ہو گئی [illegible] اپنے [illegible] سے [illegible] ہو گئیں۔

مولانا مفتی محمد [illegible] صاحب [illegible] قطب [illegible] کا [illegible] ایک [illegible] رہتے تھے۔ [illegible] ان سے ملاقات تھا اور [illegible] تھا [illegible] مولانا [illegible] کے [illegible] گیا ہے۔ چنانچہ ۱۲ فروری [illegible] نماز [illegible] گیا۔ مولانا [illegible] صاحب [illegible] دینی خدمات [illegible] ایک [illegible] ایک مولانا [illegible] سے فارغ [illegible] دارالعلوم [illegible] تعلیم [illegible] آئے تھے [illegible] قصبہ [illegible] تھے [illegible] ان کی تعلیم و تربیت [illegible] محنت اور قربانی [illegible] تھا اس لئے [illegible] کرتے تھے اور اپنے فارغ اوقات انہی کے ساتھ گزارتے تھے [illegible] فروری کی شام انہیں [illegible] واپس [illegible] تھا [illegible] مولانا محمد [illegible] کے ساتھ گزارا اور انہی کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی

گئے۔ نماز جمعہ کے بعد ان دونوں نے رکشہ میں بیٹھ کر واپسی کا سفر شروع کیا ہی تھا کہ کچھ دہشت گردوں نے پہلے غریب رکشہ ڈرائیور پر فائرنگ کر کے اسے شہید کیا تا کہ رکشہ بے قابو ہو جائے' پھر مولانا مجاہد صاحبؒ اور مولانا محمد شاہدؒ پر پے در پے گولیاں چلائیں۔ مولانا مجاہدؒ کے صرف سینے پر دس گولیاں شمار کی گئیں۔ درندگی اور بربریت کا یہ اندھا دھند مظاہرہ کرنے والوں کو کیا پتہ کہ انہوں نے آن کی آن میں کیسی شخصیتیں ملک و ملت سے چھین لی ہیں' اور اس رکشہ ڈرائیور کے گھر میں کیسا اندھیرا کر دیا ہے' کہ جس کے بیوی بچوں کیلئے کوئی کمانے والا بھی باقی نہیں رہا۔

مولانا مجاہد صاحبؒ اگرچہ شہرت اور نام و نمود کے رائج الوقت اسالیب سے نہ صرف بیگانہ بلکہ متنفر رہے' لیکن اس نو عمری میں ایسے علم و فضل اور ایسی سیرت و کردار میں وہ مقناطیسی طاقت تھی کہ وہ علمی حلقوں کے علاوہ عوام کے اپنے حلقۂ تعارف میں بھی بڑے ہر دلعزیز تھے۔ جب ان کا چہرہ ایک شگفتہ پھول کی طرح چشم تصور میں آتا ہے تو عقل حیران ہوتی ہے کہ صلح و آشتی اور امن و الفت کا یہ پیکر جس کی ہر ہر ادا ہر ایک کیلئے محبت کا پیغام تھی' اور جس کے شفاف سینے پر کسی کی عداوت یا بغض کا کوئی ادنیٰ سا بھی دھبہ نہیں تھا' اسے کوئی یوں قتل کرنے کے درپے ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ان کی شہادت کے حادثے پر فیصل آباد کی فضا میں بڑا غم و غصہ تھا۔ اور جب فیصل آباد کے وسیع و عریض دھوبی گراؤنڈ میں ہزارہا افراد نے ان کی نماز جنازہ ادا کی تو دلوں میں غم ہی نہیں' اشتعال بھی پایا جاتا تھا۔ لیکن آفرین ہے ان کے والد ماجد (مولانا نذیر احمد صاحب) پر جنہوں نے اپنے ایسے ہونہار جوان بیٹے کے ایسے قتل پر بھی جو تقریر کی اس میں انہوں نے کہا کہ ہم نے اور ہمارے اکابر نے پاکستان کو اپنا خون پسینہ دیا ہے' اور ہمیں اس ملک کی سلامتی اپنی جان اور مال و اولاد سے زیادہ عزیز ہے' مولانا مجاہد صاحبؒ کی شہادت سے جو عظیم نقصان پہنچنا تھا پہنچ چکا' لیکن ہم اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ کوئی شخص اس واقعے کو بنیاد بنا کر یہاں توڑ پھوڑ کا بازار گرم کرے' اور جو کوئی ایسا کرے گا' وہ مرحوم کی روح کو صدمہ اور ہم پسماندگان کو اذیت پہنچائے گا۔ مولانا نذیر احمد صاحب کی اس تقریر نے جذبات

قائم ہی رہے گے اور ہمارے معاشرے میں [illegible] کا چلن [illegible] سب سے بڑے
عہدہ [illegible] پر [illegible] بیٹھنے کی قدر [illegible] ۔

افسوس یہ ہے کہ ہماری حکومت کا مزاج بھی بن چکا ہے کہ اس [illegible]
صرف وہ واقعہ قبول کیا جاتا ہے جو اپنے ساتھ [illegible] کو [illegible]
اور یہ باتیں [illegible] تحریر کیا [illegible] تہذیب کے لوگ ملک کی سلامتی پر اپنی جان
بھی قربان کرتے اور سچی بات کا اظہار کرتے ہیں [illegible] وقت کے [illegible]
سمجھتے ہیں کہ [illegible] ان کے [illegible] نے دو [illegible]
ہیں ۔ چنانچہ [illegible] نے [illegible] کے قتل [illegible] زبان کا [illegible]
کرنا تھا ان معصوموں نے بجائے قتل کے ان کی زبان [illegible] سے افسوس [illegible]
[illegible] کا کوئی ایک قطرہ بھی اگر تم ہمارے [illegible] میں [illegible] ——— [illegible]
[illegible] اس بات کی [illegible] نہیں تو [illegible] کہ جب تک تمہارے ہاتھوں میں [illegible]
[illegible] تمہاری طرف [illegible] ۔

مولانا محمد صاحب نے کل [illegible] سال کی عمر پائی [illegible] اس وقت میں
انہوں نے دو [illegible] اور [illegible] چلے گئے [illegible]
[illegible] نے [illegible] اٹھائی ہیں ۔

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

[illegible] ایک [illegible] کے [illegible]
[illegible] جاتا ہے ۔

مولانا محمد صاحب نے [illegible]
[illegible] اور [illegible] میں آ [illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] آمین

(ایقان جلد ۳ شمارہ ۱۰)

حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ

17 اکتوبر کی دوپہر [illegible] یہ حادثہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب کی المناک شہادت کا پیش آیا۔ میں 12 اکتوبر سے چند روز کے لیے اپنے عدالتی کام کے سلسلے میں اسلام آباد میں مقیم تھا۔ اسلام آباد کی حاضری کے موقع پر اکثر حضرت مولانا عبداللہ صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، مگر 12 اکتوبر سے 17 اکتوبر کے وقفے میں مجھے ان سے ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہو سکی۔ ان سے فون پر بات ہوئی، اور مولانا عبدالعزیز صاحب تشریف لائے تو ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے والد ماجد کا پیغام بھی پہنچایا کہ کسی وقت ان کی مسجد میں [illegible] میں نے اسے اگلے ہفتے پر ملتوی کر دیا اور سوچا تھا کہ [illegible] ان سے۔ یہ ملاقات مقدر نہیں تھی، اور اب [illegible] ان کی قبر پر حاضری ہوئی۔

7 اکتوبر کی شب میں اسلام آباد سے لاہور جانے کے لیے روانہ ہوا تو چکلالہ ایئرپورٹ پر حکیم محمد سعید صاحب کی شہادت کی اطلاع ملی، اور یہ [illegible] کا ذہن میں [illegible] کر رہے تھے کہ [illegible] وہاں سے رات [illegible] پہنچا تو [illegible] کہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب [illegible] کا [illegible] ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حکیم سعید صاحب کے حادثے سے دل پہلے ہی زخمی تھا، اس خبر نے تو دل پر بجلی سی گرا دی۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب کا معاملہ بھی عجیب تھا، وہ کسی گروہ بندی میں شامل تھے [illegible] کسی سے ذاتی دشمنی یا عداوت کا کوئی تصور [illegible] سالہا سال سے ملک کے دارالحکومت میں انتہائی اخلاص اور بے نفسی کے ساتھ خدمت دین میں مشغول تھے، اور خدمت خلق [illegible] سے [illegible] ایک شخص [illegible] نشانہ بنایا گیا

لیا؟ یہ ایسا سوال ہے کہ ہزار مرتبہ سوچنے کے بعد بھی اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔

حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ سے ہمارا تعلق زمانۂ طالب علمی سے تھا۔ ہم دارالعلوم کراچی میں پڑھتے تھے اور وہ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحبؒ کے مدرسے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں (جو اس وقت مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کے نام سے مشہور تھا) دینی مدارس میں یہ طریق کار تو مدت سے رائج ہے کہ جمعہ کی شب میں طلبہ جمع ہو کر تقریر و خطابت کی مشق کیا کرتے ہیں۔ ان میں سے جو طلبہ خطابت میں قدرے نمایاں ہو جائیں، انہیں مدرسے سے باہر بھی خطابت کیلئے مدعو کیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ ایسے ہی طالب علموں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور طالب علمی ہی کے زمانے میں ان کے حسن خطابت کی، شہر کے دینی حلقوں میں خاصی شہرت تھی اور ان کی تقریر سننے کیلئے اطراف سے انہیں مدعو کیا جاتا تھا۔

خطابت کی حد تک اس قسم کی شہرت بہت سے طلبہ کو حاصل ہو جاتی ہے، لیکن بسا اوقات خطابت کا شوق ایک تو طالب علم کا ذوق اور جذبۂ تحقیق کم کر دیتا ہے، دوسرے مجمع کی طرف سے اظہار پسندیدگی بعض اوقات انسان میں ایک خود پسندی کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے جو رفتہ رفتہ اسے اخلاص کی صراط مستقیم سے شہرت طلبی کی طرف لیجاتی ہے۔ لیکن مولانا عبداللہ صاحب کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ وہ صرف ایک اچھے خطیب ہی نہ تھے، ان کی صحبت کے فیض سے ان میں کسی قسم کی عجب یا پندار کا بھی کوئی شائبہ نہ تھا، وہ ہمیشہ سے متواضع، منکسر المزاج اور خوش اخلاق انسان تھے جن سے مل کر انسان کو دل میں ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ (مجھے یاد ہے کہ انہی کے ایک اور ہم سبق تھے جو انہی کی طرح اچھے خطیب تھے، مگر خطابت کے زعم اور جوش میں وہ اساتذہ کی صحبت و تربیت سے غافل ہو گئے، اس کے نتیجے میں خطابت ان کیلئے فتنہ بن گئی۔ اور آج ملک و ملت کی خدمت کے حوالے سے انہیں کوئی جانتا تک نہیں۔)

اسی زمانے میں اسلام آباد کا نیا شہر تعمیر ہو رہا تھا اور دارالحکومت کو کراچی سے وہاں منتقل کیا جا رہا تھا، اسلام آباد کے نئے شہر میں اس وقت جو سب سے بڑی مسجد تعمیر ہوئی اس کا نام ''مرکزی جامع مسجد'' تھا، لیکن چونکہ اس کا رنگ سرخ تھا اس لئے لوگوں کی زبان پر ''لال مسجد''

کو ہم نہ پایا مشہور ہو گیا۔ مولانا عبداللہ صاحبؒ اپنے اساتذۂ کرام کے مشورے سے اس مسجد کے امام و خطیب مقرر ہوئے اور یہ مسجد ان کے فیض رسانی کا مرکز قرار پائی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اخلاص سے بھی نوازا تھا اور سوزِ دروں سے بھی۔ وہ علم سے بھی آراستہ تھے اور حسنِ عمل سے بھی۔

ان کے کلام میں بڑی تاثیر تھی اور شخصیت میں انتہائی جاذبیت، چنانچہ انہوں نے اس مسجد کے ذریعے دعوت و تبلیغ اور اصلاح کا بڑا کام کیا۔ نہ جانے کتنی زندگیوں میں ان کی دعوت کے نتیجے میں انقلاب آیا، کتنے لوگوں کو دین کی صحیح معلومات بہم پہنچائیں، کتنی خرابیوں کی اصلاح ہوئی اور کتنے فتنے ان کی کوششوں سے فرو ہوئے۔ اس مسجد کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں تھا، اس لحاظ سے وہ ایک سرکاری ملازم تھے (اور اب ان کا عہدہ غالباً جوائنٹ سیکرٹری کے برابر تھا) لیکن انہوں نے یہ کام ملازمت کیلئے نہیں، دعوت کی غرض سے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کیا تھا۔ لہٰذا حکومت سے ان کا یہ تعلق کبھی حق گوئی میں مانع نہیں ہوا۔ انہوں نے اس مسجد کے منبر و محراب سے وہی بات برملا کہی جو ان کے نزدیک دین کا تقاضا تھی اور حکومت کے غلط اقدامات پر نہ صرف یہ کہ کبھی سکوت اختیار نہیں کیا، بلکہ کھل کر حکومت کو اس کی غلط کاریوں پر ٹوکا اور بلا خوف لومۃ لائم حق کا پیغام پہنچاتے رہے۔

ایسی حکومتیں بھی آئیں جنہوں نے مولانا کے اس اخلاص، حق گوئی اور جذبے کی قدر کی اور ایسی بھی آئیں جنہوں نے انہیں اپنے راستے کا کانٹا سمجھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی ہر دلعزیزی عطا فرمائی تھی، اس لئے ایک مرتبہ کے سوا انہیں براہ راست معزول کرنے کی جرأت تو کسی کو نہیں ہوئی، لیکن مختلف حکومتوں کی طرف سے انہیں تنگ کرنے کا سلسلہ بار بار جاری رہا۔ بعض حکومتیں تو خاص طور پر ان کے درپے آزار ہوئیں، انہیں ایک مرتبہ اغوا بھی کیا گیا، اور حق گوئی کی پاداش میں انہیں نہ جانے کتنی صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ ایک مرتبہ انہیں معزول کرنے کی بھی کوشش کی گئی، لیکن عوام نے جو ان پر جان فدا کرتے تھے، اس کوشش کو اس طرح ناکام بنا دیا کہ بدنامی اور رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے شیخ الاسلام حضرت علامہ

شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کا یہ مقولہ بارہا سنا کہ "حق بات، حق نیت اور حق طریقے سے کہی جائے تو کبھی بیکار اور بے اثر نہیں ہوتی۔" مولانا عبداللہ صاحبؒ کے انداز دعوت و خطاب میں بفضلِ تعالیٰ یہ تینوں باتیں جمع نظر آتی تھیں۔ چنانچہ اسلام آباد میں مولانا عبداللہؒ ایک ایسی شخصیت کے طور پر مشہور و معروف تھے جس سے عوام و خواص سب محبت کرتے تھے۔ اعلیٰ سرکاری افسران ہوں یا چپڑاسی اور مزدور، سب ان کے اخلاص، ان کی للّٰہیت اور ان کی حق گوئی کے معترف تھے۔ وہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک رہتے، ہر ایک کی خدمت کیلئے تیار رہتے، اور دوسروں کی مشکلات میں ان کی مدد کرنے کو اپنے مقاصد میں شمار کرتے تھے۔ دین کیلئے کوئی سرگرمی یا کوئی کام ہو، مولانا عبداللہؒ دل و جان سے اس کیلئے حاضر تھے، اور اس کیلئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کیلئے تیار۔

اسلام آباد میں کوئی قابلِ ذکر دینی مدرسہ نہیں تھا۔ ہمارے محبِ مکرم جناب الحاج اختر حسین (جو اس وقت حکومت پاکستان میں شاید جوائنٹ سیکریٹری تھے) ایک چھوٹا سا مدرسہ F-6/4 کے علاقے میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں قائم کیا تھا۔ جب حاجی اختر صاحب ریٹائر ہونے کے بعد کراچی منتقل ہوئے تو یہ مدرسہ مولانا عبداللہ صاحبؒ کے حوالے کر آئے۔ مولانا نے اپنی انتھک جدوجہد سے اسے ایک بڑے معیاری مدرسے میں تبدیل کر دیا۔ الحمدللہ مارگلہ کے دامن میں اسلام آباد کا سب سے بڑا مدرسہ ہے جس میں سینکڑوں طلبہ دینی علوم سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ مولانا عبداللہ صاحبؒ اس مدرسے کے مہتمم تھے اور اسے بزرگوں کے طریقے پر اخلاص اور دردمندی کی پونجی سے چلا رہے تھے۔

مرکزی جامع مسجد کے ساتھ ہی انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کیلئے ایک مدرسۃ البنات بھی قائم فرمایا تھا جو ماشاءاللہ اب بھی نہایت کامیابی سے چل رہا ہے جس میں ان کی بہو بھی درس دیتی ہیں۔ گذشتہ سال سے وہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے، اور عالمی سطح پر رویت ہلال کے مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کرنے کے لئے کوشاں تھے۔

پچھلے دنوں فرقہ وارانہ تشدد کی جس لہر نے ملک بھر کو اپنی لپیٹ میں لیا، اس سے ہر دردمند مسلمان پریشان تھا۔ مولانا عبداللہ صاحبؒ ان لوگوں میں سے تھے جو اس فرقہ وارانہ تشدد کے

مسائل کو معقولیت اور اصولوں کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ خلاصہ یہ کہ پچھلے تقریباً پچیس سال کے دوران ملک میں کوئی دینی سرگرمی ایسی نہ تھی جو اجتماعی سطح پر اٹھی ہو اور اس میں مولانا عبداللہ صاحب کا فعال حصہ نہ ہو۔ وہ جامعہ فریدیہ کے اہتمام کے ساتھ ساتھ وہاں درس بھی دیتے تھے۔ مرکزی مسجد کی امامت وخطابت کے ساتھ درسِ قرآن کا بھی متواتر سلسلہ رہتا۔ مدرسے اور جماعت کی دیکھ بھال بھی فرماتے۔ اور ان تمام مصروفیات کے ساتھ دین کو عملاً نافذ کرنے کیلئے ہر جدوجہد میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔

ان کے تعلقات کو بھی ذاتی مفاد کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ہر حال میں وہ ایک درویشانہ وضع پر قائم رہے۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے مکان میں قیام تھا۔ ان کے گھر والے بتاتے ہیں کہ وہ اپنا ہر کام خود کرنے کے عادی تھے، بیوی بچوں سے بھی اپنی کوئی خدمت نہیں لیتے تھے اور کبھی اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی کوئی سخت برتاؤ نہیں کیا۔ کھانا بھی سادہ اور کم کھانے کے عادی تھے اور اس لئے بھی گھر والوں کو اپنی زحمت دینے سے پرہیز کرتے تھے۔ اتباعِ سنت کا خاص اہتمام اور ذوق تھا، اور ہر چیز میں اتباعِ سنت کی کوشش فرماتے تھے۔ وہ خود ایک بزرگ سے بیعت تھے لیکن اپنے آپ کو اس حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ تواضع اور مسکنت ان کی ادا ادا سے نمایاں تھی اور یہی وہ جوہر ہے جس نے انہیں بالآخر شہادت کے مقامِ رفیع تک پہنچایا۔

17 اکتوبر کو وہ حسبِ معمول جامعہ فریدیہ میں درس دینے کے بعد اپنے گھر تشریف لائے۔ مسجد کے احاطے سے گھر کی طرف جانے کیلئے درمیان میں ایک چھوٹا سا دروازہ پڑتا ہے۔ جب اس کے سامنے پہنچے تو ایک شخص پہلے سے اس دروازے سے متصل کھڑا ہوا کسی تاک میں تھا، اس نے اچانک ان پر بے تحاشا فائرنگ شروع کردی۔ مولانا کے نوجوان اور فاضل صاحبزادے مولانا عبدالعزیز صاحب اس وقت مسجد کا کام چھوڑ کر جانے کی تیاری کر رہے تھے اور اپنے والد کو دیکھ کر ان سے ملنے کیلئے آگے بڑھ رہے تھے، اچانک فائرنگ دیکھی تو حملہ کرنے والے کی طرف لپکے۔ مولانا اس وقت تک متعدد گولیاں کھا کر زمین پر گر چکے تھے۔ اپنے صاحبزادے کو فائر کرنے والے کی طرف جاتے دیکھا تو فرمایا کہ "بیٹا! سامنے نہ جاؤ، گولی لگ

جب کہ مولانا عبدالعزیز پر اتفاقی فائر ہوئے، مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا، اور گولی ان کی قمیص سے چھوتی ہوئی گذر گئی۔ مولانا کو جلدی سے گاڑی میں لٹا کر ہسپتال پہنچانے کی کوشش کی گئی، راستے میں بھی ان کے ہونٹ ذکر اللہ سے حرکت میں تھے، مگر ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ شہادت کے مقام بلند تک رسائی حاصل کر چکے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا عبداللہ صاحب کی زندگی بھی قابل رشک تھی اور موت بھی اس لحاظ سے قابل رشک کہ دین کی خدمت کے عین درمیان انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔ ان کی کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی، اس لئے انہیں جن ظالموں نے نشانہ ستم بنایا اس کی وجہ بجز ان کی خدمت دین کے نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں مولانا عبدالعزیز کی شکل میں خلف صالح بھی عطا فرمایا۔ انہوں نے جس طرح اس نوجوان کی تربیت کی، وہ بھی ایک مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و عمل کی دولت سے مالا مال فرمایا ہے، اور اس کے ساتھ اعتدال و توازن کی نعمت بخشی ہے۔ مولانا کے ظالمانہ قتل پر جب کچھ لوگ بے قابو ہو کر توڑ پھوڑ کرنے لگے تو مولانا عبدالعزیز نے انتہائی دکھ اور تحمل کے انداز میں انہیں اس حرکت سے منع کیا، اور لوگوں کی جان و مال پر بلاوجہ حملہ آور ہونے کے خلاف تقریر کی۔ جس شخص نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے محبوب باپ کو خون میں نہاتے دیکھا ہو، اس کا ایسے موقع پر صبر و ہمت کی ایک تصویر بن جانا اور اعتدال و توازن کا دامن نہ چھوڑنا یقیناً قابل صد مبارکباد ہے، اور حضرت مولانا عبداللہ صاحب کے فیض تربیت کا خوبصورت نمونہ۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر، علم اور عمل میں برکت عطا فرمائیں، اور انہیں اپنے والد کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

(ماہنامہ "البلاغ" رمضان ۱۴۱۹ھ جنوری ۱۹۹۹ء)

حکیم محمد سعید صاحبؒ

دہشت گردی کے عفریت نے 17/ اکتوبر کو ایک ہی دن دو ایسی شخصیتوں کو نشانۂ ستم بنایا جو ملک بھر میں اپنے اخلاص، ہردلعزیزی اور ملک وملت کیلئے اپنی دردمندی میں مشہور و معروف تھے۔ ایک حکیم محمد سعید صاحبؒ اور دوسرے حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ خطیب مرکزی جامع مسجد (لال مسجد) اسلام آباد۔

میں اس روز اسلام آباد سے بنوں تبلیغی کانفرنس میں شرکت کیلئے روانہ ہوا تھا۔ جہاز جب پشاور اترا تو وہاں یہ خبر ملی کہ کراچی میں حکیم محمد سعید صاحب کو دہشت گردی کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا گیا۔ اسی وقت کراچی فون کیا تو اس المناک خبر کی تصدیق ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ حکیم صاحب ہی کی ہردلعزیزی کی بات تھی کہ جہاز کے تمام مسافر اس خبر پر اس طرح غم واندوہ کا اظہار کر رہے تھے جیسے ان کا کوئی عزیز ان سے رخصت ہو گیا ہو۔

حکیم محمد سعید صاحب ملک کی ان شخصیات میں سے تھے جن کا کسی سیاسی گروہ بندی، فرقہ واریت یا کسی اور قسم کے تنازعے سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا اور جب ملک میں مختلف متحارب گروہوں کو یکجا کرنے یا کسی اور اجتماعی کام کیلئے ایسے افراد کو تلاش کیا جاتا تھا جنہیں متفقہ طور پر احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہو تو ان کا نام سرفہرست ہوتا تھا لہذا انہیں قتل کرنے کا اقدام کسی سیاسی گروہ بندی کا نہیں، ملک وملت کی صریح دشمنی کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے۔

ملک وملت کیلئے بہت سی خدمات کے علاوہ حکیم محمد سعید صاحب دارالعلوم کراچی کے بانی ارکان میں سے تھے، دارالعلوم کے خازن بھی وہی تھے اور اب جامعہ کی مجلس منتظمہ میں اس کے بانی ارکان میں سے صرف وہی باقی رہ گئے تھے۔ اس لئے ان کی شہادت جہاں پورے ملک کیلئے ایک عظیم سانحہ ہے، وہاں دارالعلوم کے لئے خصوصی طور پر ایک ایسا حادثہ ہے، جس پر جتنا اظہار افسوس کیا جائے کم ہے۔

حکیم صاحبؒ ایک وضع دار شخصیت تھے، انہوں نے پاکستان کے ابتدائی دور میں فقر و افلاس کا بھی خاصا وقت گزارا، ہمدرد دواخانے کے قیام کیلئے انہوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ اس دور کی مشکلات کو انہوں نے جس خندہ پیشانی سے جھیلا، اس کی داستان کبھی کبھی وہ بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحبؒ سے انہیں ابتداء ہی سے عقیدت اور محبت تھی، چنانچہ حضرت والد صاحبؒ کے پاس ان کا کثرت سے آنا جانا رہتا تھا، اور اسی تعلق کے نتیجے میں دارالعلوم کے قیام کے وقت وہ اس کے بانی ارکان میں شامل ہوئے۔

طب یونانی کے فروغ اور اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے انہوں نے ہمدرد دواخانے کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا، طبیہ کالج کی بنیاد رکھی اور خود اپنی استقامت کے ساتھ آخر وقت تک مطب جاری رکھا۔ مختلف شہروں میں تقریباً 6 بجے سے مغرب تک متواتر مریضوں کا معائنہ کرتے، اور اس خدمت پر انہوں نے کبھی کوئی فیس نہیں لی۔ بلکہ غریب مریضوں کیلئے ہمدرد دواخانے سے دوائیں بھی بکثرت مفت فراہم کی جاتی تھیں۔ عرصۂ دراز سے ان کا معمول یہ تھا کہ مطب کے دن وہ روزے سے ہوتے تھے اور تمام دن مریضوں کی خدمت کے بعد روزہ افطار کیا کرتے تھے۔

ہمدرد دواخانے کے بعد انہوں نے "ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن" کی بنیاد رکھی جس کے ذریعہ انہوں نے مختلف میدانوں میں معاشرتی، تعلیمی اور تحقیقی کاموں کا آغاز کیا۔ دنیا کے مختلف حصوں میں کانفرنسیں منعقد کیں، بہت سے ماہنامے اور رسالے جاری کئے، کتابیں شائع کیں، اور بالآخر "مدینۃ الحکمۃ" کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم کی۔

مشاغل کے تنوع اور ہجوم کے باوجود ہمیشہ پرسکون رہتے تھے، انہیں کبھی بھی گھبراہٹ سے مغلوب نہیں دیکھا۔ ان کا نظام الاوقات اتنا مستقل اور معمولات اتنے منضبط تھے کہ وہ ہر کام اپنے وقت پر انجام دیتے اور مطمئن رہتے تھے۔ آخر شب میں بیدار ہو کر تہجد کے نوافل بھی ادا کرتے، اور طلوع فجر سے پہلے ہی کوئی ورزشی کھیل، مثلاً بیڈمنٹن کھیلتے تھے۔ پھر دن بھر کاموں میں مصروف رہتے تھے، زندگی سادہ تھی۔ صرف ایک وقت کھانا کھاتے، اور زمین پر سوتے

تھے۔ سفید شیروانی اور پاجامہ ان کا مخصوص لباس تھا۔ کبھی انہیں اس کے سوا کسی اور لباس میں نہیں دیکھا۔

جتنے اخبارات و رسائل ان کے پاس آتے تھے، سب کا کم از کم سرسری مطالعہ ضرور فرماتے تھے، پھر مطالعے کے دوران موضوعات کے حساب سے انہیں تقسیم کرکے ان پر نشان بھی لگاتے اور ان کے دفتر کا متعلقہ شعبہ ان حصوں کو ہر موضوع کی الگ فائلوں میں جمع کرتا رہتا تھا۔ سالہا سال کے مطالعے کا یہ ذخیرہ آج بھی "مدینۃ الحکمۃ" کے کتب خانے میں موجود ہے۔

جب سے میں نے "البلاغ" کی ادارت شروع کی تھی، ملاقات کے وقت وہ البلاغ کی کسی نہ کسی تحریر کا حوالہ ضرور دیتے کہ آپ نے فلاں موضوع پر فلاں بات لکھی ہے۔ کبھی اس کی تصویب فرماتے اور کبھی تنقید۔ مگر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اتنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود وہ کس طرح یہ ساری باتیں یاد رکھتے ہیں۔ بعض اوقات "البلاغ" کے کسی پہلو پر اپنی رائے کا اظہار تحریری شکل میں بھی فرماتے تھے۔

"دارالعلوم کراچی" کے وہ خازن تھے، اس لئے دارالعلوم کے ماہانہ اخراجات کے چیک پر ان کے دستخط ضروری تھے۔ میں وہ چیک لے کر ان کے پاس جاتا تو اتنی مصروفیات کے باوجود انہوں نے کبھی آنکھ بند کرکے چیک پر دستخط نہیں کئے۔ بعض اوقات وہ نشان دہی کرتے کہ فلاں چیز کا خرچ زائد معلوم ہوتا ہے، اس پر نظر ثانی کی جائے اور بعض اوقات کوئی اور مشورہ دیتے۔ دارالعلوم کی مجلس منتظمہ کے اجلاسات میں وہ پابندی سے شریک ہوتے اور تمام مسائل پر بصیرت کے ساتھ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا کرتے تھے۔

ایک عرصے تک وہ صوبہ سندھ کے گورنر بھی رہے اور اسی زمانے میں انہوں نے کراچی شہر میں تعلیم کے فروغ کے لئے متعدد یونیورسٹیاں قائم کرائیں۔ دارالعلوم کراچی کے سامنے جو سڑک ہے، اسے وہ عرصۂ دراز سے "مفتی محمد شفیع روڈ" لکھا کرتے تھے، گورنر بننے کے بعد انہوں نے باضابطہ اس سڑک کا نام "مفتی محمد شفیع روڈ" اور اس کے متصل شمال سے آنے والی سڑک کا نام "شارع دارالعلوم" اور دارالعلوم کے مغربی جانب کی سڑک (جو شمالاً جنوباً گئی ہے) اس کا نام "شارع شبیر احمد عثمانی" رکھ دیا، اور اب یہ سڑکیں انہیں

ہونے سے موسوم ہیں۔

موصوف نے اپنی عمر کا آخری حصہ تعلیم، بالخصوص بچوں کی تعلیم کیلئے تقریباً وقف فرمادیا تھا۔ اسی ضمن میں انہوں نے "مدینۃ الحکمۃ" کے نام سے شہر سے باہر ایک بڑا مرکز قائم کیا۔ اس کے لئے بہترین لائبریری ہوئی جس میں ہر علم وفن کی کتابوں کے بہترین ذخیرے کے علاوہ برصغیر کے تمام اہم رسائل ومجلات اور اخبارات کی پوری پوری فائلیں موجود ہیں جو اس جامعیت کے ساتھ ملک کی شاید کسی دوسری لائبریری میں نہ ہوں۔ اگرچہ شہر سے دور ہونے کی بنا پر ابھی اس لائبریری کی افادیت محدود ہے، لیکن جب بھی اس تک پہنچ آسان ہوئی یہ لائبریری طلبہ اور محققین کے لئے بڑا سرمایہ ثابت ہوگی۔

"مدینۃ الحکمۃ" ہی میں حکیم صاحبؒ نے ایک اعلیٰ معیار کا بچوں کا اسکول بھی قائم کیا تھا، اور اس کوشش میں تھے کہ ان بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کیلئے اس میں خصوصی نصاب اور پروگرام شروع کیا جائے۔ بچوں کی تربیت میں وہ ذاتی طور پر دلچسپی لیتے تھے، ان کے اجتماعات منعقد کرتے اور انہیں عملی طور پر آداب زندگی سکھانے کی کوشش کرتے تھے۔

حضرت والد صاحبؒ سے خصوصی تعلق کی بنا پر حکیم صاحبؒ ہم دونوں بھائیوں (احقر اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہم) پر بھی خصوصی شفقت فرماتے اور خاص طور پر حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد ہمیں مختلف مراحل پر مشوروں سے نوازتے۔ ہمیں بھی ان سے قدرے بے تکلفی تھی، اس لئے ان سے بہت سی معروضات پیش کرنے میں کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا تھا۔ حکیم صاحبؒ کے بعض اقدامات یا ان کے بعض افکار سے اختلاف ہوتا تو ان کے سامنے پیش کردیتے اور وہ خندہ پیشانی سے سنتے۔ بالخصوص مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم نے ان سے مفصل گفتگو فرمائی اور انہوں نے وضاحت کی کہ میں نے صرف ایک سوال کے طور پر علماء کرام کو اس مسئلے کی طرف متوجہ کیا تھا، میرا مقصد کوئی حتمی رائے دینا نہیں تھا۔

حکیم صاحبؒ نے بہت سے کاموں میں سے ایک یہ بھی تو کیا کہ وہ سالہا سال تک انتہائی استقامت کے ساتھ مریضوں کی خدمت کرتے رہے، اور اس خدمت کیلئے آخری بار

گھر سے نکلے تو مسجد کے دروازے ہی پر انہیں شہید کر دیا گیا۔ گویا یہ خدمت کرتے کرتے وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وکفّر عنہ سیاٰتہ وادخلہ الجنّۃ ونجّہ من النار۔

(ماہنامہ ’’البلاغ‘‘ رمضان ۱۴۱۹ھ جنوری ۱۹۹۹ء)

میرے استاذ حضرت مولانا سبحان محمود صاحب قدس سرہ

۱۴۱۸ھ کا آخری دن (۲۹ ذی الحجہ) ہم طالب علموں کیلئے ایک ایسا جانکاہ سانحہ لے کر آیا جس کا زخم مندمل ہونا آسان نہیں۔ میرے انتہائی شفیق استاذ، دارالعلوم کراچی کے شیخ الحدیث اور عظیم الشان شیخ طریقت، مولانا سبحان محمود صاحب (جن کے نام کے ساتھ آج رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہوئے دل پر چوٹ لگتی ہے) اسی دن اس دنیائے فانی کی سرحد پار کرکے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا قدس سرہ کا حادثۂ وفات دارالعلوم کیلئے تو ایک بہت بڑا نقصان ہے ہی کہ وہ دارالعلوم کے واحد استاذ تھے، جو مدرسے کے قیام کے تقریباً آغاز ہی سے دارالعلوم کی گرانقدر خدمات انجام دے رہے تھے اور تقریباً نصف صدی (۴۸) سال تک انہوں نے اس ادارے کو اپنا مرکزِ فیض رسانی بنائے رکھا۔ لیکن یہ سانحہ صرف دارالعلوم کا نہیں، پوری ملک و ملت کا ہے، اول تو اس لئے کہ بفضلہ تعالیٰ حضرتؒ کا دائرۂ فیض اب روز بروز بڑھ رہا تھا، اور دوسرے اس لئے کہ ایسے اللہ والے بزرگوں کا نفسِ وجود ہی دنیا کے فتنوں کیلئے آڑ بنا ہوتا ہے، اور ان انفاسِ قدسیہ سے محرومی پوری امت کا نقصانِ عظیم ہے۔

اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

میرے لئے مزید حسرت کی بات یہ ہے کہ میں آخری لمحات میں حضرتؒ کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکا، نہ تجہیز و تکفین اور نمازِ جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل کر سکا۔ میں بندہ جناب مولانا محمد اسلام قاسمی صاحب مدظلہم کی دعوت پر انڈیا گیا ہوا تھا، اور اس روز صوبہ بہار کے دارالحکومت پٹنہ میں تھا۔ وہیں برادرِ معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم (صدر دارالعلوم کراچی) نے ٹیلیفون پر یہ جانکاہ خبر سنائی، میں نے آگے کے اسفار ملتوی کر دیئے، مگر بروقت پرواز نہ ملنے کے سبب جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت والد صاحب کے ساتھ حضرت کی نیازمندی کا تعلق اڑتالیس سال تک برقرار رہا۔ آج جب یہ سطور لکھ رہا ہوں تو مجھے تقریباً نصف صدی کے واقعات کا ایک تسلسل ہے جو نگاہوں کے سامنے آرہا ہے۔

میں نے حضرت مولانا کو پہلی بار ۱۳۵۱ھ میں دیکھا۔ اس وقت ہم برنس روڈ کے ایک مکان میں رہتے تھے اور اس مکان کے قریب ہی مشرقی تعلیم کا ایک ادارہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں "دارالعلوم" کے نام سے قائم ہوا تھا۔ یہاں طلبہ کو ادیب، ادیب عالم اور ادیب فاضل وغیرہ کے امتحانات کی تیاری کرائی جاتی تھی۔ میرے بھانجے حکیم مشرف حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے (جو میرے بھانجے کم اور دوست زیادہ تھے) اس ادارے میں داخلہ لے کر وہاں تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی تھی۔ میری عمر اس وقت آٹھ نو سال کی تھی اور مشرف صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے۔ ایک دن میں مشرف صاحب کے ساتھ ان کی تعلیم گاہ "دارالعلوم" چلا گیا۔ وہاں دیکھا کہ ایک وجیہ، خوبرو اور بارعب نوجوان شاعر مشرق اقبال مرحوم کا "شکوہ جواب شکوہ" پڑھا رہے ہیں۔ ایک آٹھ نو سال کے بچے کو "شکوہ جواب شکوہ" کے مضامین کا ادراک تو ظاہر ہے کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن ان کے انداز تدریس میں جو شکوہ اور انداز میں جو سب سے زیادہ اثر انگیز تھا وہ دل پر نقش ہو کر رہ گیا۔ یوں تو میں نے بہت "شکوہ جواب شکوہ" میں نے اس عمر میں بھی پڑھ رکھا تھا اور اس کا یہ شعر تو یاد بھی تھا کہ

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

لیکن اس روز پہلی بار شعر کے مطلب اور ذوق کے معنی سمجھ میں آئے اور جس انداز سے اشعار سمجھائے جا رہے تھے وہ انداز ہمیشہ کے لیے دل میں گھر کر گیا۔ بعد میں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ استاد کا نام گرامی مولانا [illegible] محمود ہے۔

یہ تو آئی گئی ہوئی۔ اس وقت یہ تصور بھی نہ تھا کہ مولانا سے براہ راست تلمذ کا شرف کبھی حاصل ہونے والا ہے۔ جب ۱۳۷۰ھ میں حضرت والد صاحب قدس سرہ نے نانک واڑہ کی ایک تنگ عمارت میں دارالعلوم کی بنیاد ڈالی۔ میں اس وقت مسجد باب الاسلام کے مدرسے

میں فارسی پڑھتا تھا اور میرے برادرِ معظم حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے (جنہیں آج اہلِ علم مفتی اعظم کے لقب سے یاد کرتے ہیں) چونکہ اسی وقت حفظ کی تکمیل کی تھی (جس سے میں محروم رہا) اس لئے میں فارسی کی تعلیم میں ان کے ساتھ اور ان کا ہم سبق ہو گیا تھا۔ دارالعلوم کے پہلے تعلیمی سال میں ہم نے مولانا بدیع الزماں صاحب مدظلہم کے پاس فارسی پڑھنی شروع کی اور اسی وقت دیکھا کہ وہ مولانا سحبان محمود صاحب جنہیں میں نے "دانش کدہ" میں پہلی بار دیکھا تھا، ہمارے برابر کی درسگاہ میں عربی کی پہلی جماعت کو پڑھا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مولاناؒ نے "دانش کدہ" کی تدریس ترک کر کے دارالعلوم کی خدمت شروع کر دی ہے۔

اگلے سال ہم نے عربی پڑھنی شروع کی تو ہمارے تمام اسباق حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ کے پاس تھے۔ صرف ایک "عربی کا معلم" کا سبق حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحبؒ کے پاس رکھا گیا تھا۔ اسی وقت معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب (قدس سرہ) کا اصل میدان "دانش کدہ" میں اردو ادب پڑھانے کے بجائے اسلامی علوم کی تدریس تھا۔ انہوں نے مظاہر علوم سہارنپور کے اکابر اساتذہ سے درس پایا تھا اور حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کیمل پوری قدس سرہ جیسے یگانۂ روزگار علماء اور اہل اللہ سے کسب فیض کیا تھا۔ چونکہ اس وقت کراچی میں مظہر العلوم کے سوا کوئی دوسرا معیاری دینی مدرسہ موجود نہیں تھا، اس لئے وقتی طور پر "دانش کدہ" میں کام شروع کر دیا تھا، لیکن جونہی دارالعلوم قائم ہوا حضرت مولاناؒ نے اسے اپنا مرکز فیض رسانی قرار دے لیا۔

پہلے ہی سال میں حضرت مولاناؒ سے صرف میں میزان الصرف، پنج گنج اور علم الصیغہ، نحو میں نحو میر، شرح مائۃ عامل اور ہدایۃ النحو، اس کے علاوہ تیسیر المنطق، مرقاۃ، دروس الادب، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن بھی پڑھ لی۔ اس سال ہم نے جو کتابیں حضرت مولاناؒ سے پڑھیں وہ موجودہ نصاب کے مطابق دو سال میں پڑھائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ مولاناؒ کے انداز تدریس کا کمال تھا کہ ہمیں ایک لمحے کیلئے بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ ہم پر تعلیم کا کوئی زائد بوجھ ڈالا گیا ہے۔ اگلے دو سال بھی اسی طرح گذرے کہ ہمارے تمام اسباق حضرت مولاناؒ کے پاس تھے، اور ہم صبح کے پہلے گھنٹے میں حضرتؒ کی درسگاہ میں داخل ہوتے تو تمام چھٹی تک

اسی درسگاہ میں پڑھتے رہے تھے۔ ان دو سالوں میں ہم نے حضرت مولاناؒ سے کافیہ، شرح جامی، اصول الشاشی، قدوری کا کچھ حصہ (جو بعد میں پھر ایک دوسری استاذ کی طرف منتقل ہوگئی تھی) شرح تہذیب، تلخیص، نفحۃ العرب، مقامات حریری، نور الانوار، مختصر المعانی جیسی کتابیں حضرت مولاناؒ سے پڑھیں، اور نہ صرف یہ کہ ہمیں تسلسل اور یکسانیت کی وجہ سے کبھی اکتاہٹ نہیں ہوئی، بلکہ صبح سے لے کر شام تک کے یہ چھ گھنٹے انتہائی دلچسپ معلوم ہوتے تھے۔

حضرت مولاناؒ کے درس کی یہ خصوصیات جنہوں نے ہمیں ان کا گرویدہ بنالیا تھا، چند در چند تھیں۔ سب سے پہلے تو انہیں اپنی بات مختصر لفظوں میں انتہائی دلنشین انداز میں سمجھانے کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ وہ مشکل سے مشکل مسئلے کو طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق ایسے ترتیب سے بیان فرماتے تھے کہ مسئلے کی مشکلات کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے ان کے درس کا ماحول ہمیشہ اتنا شگفتہ رہتا تھا کہ اس میں اکتاہٹ کا گذر نہیں تھا۔ بعض اساتذہ سبق کو دلچسپ بنانے کے لئے لطیفوں اور قصوں کا سہارا لیتے ہیں۔ اس سے سبق دلچسپ تو ہو جاتا ہے، لیکن بہت سا وقت ان لطیفوں قصوں میں ضائع ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں طلبہ کا علمی نقصان ہوتا ہے۔ حضرت مولاناؒ اس قسم کی اضاعت وقت سے کوسوں دور تھے۔ اس کے بجائے وہ درس کی باتوں کو خارجی مثالوں سے سمجھاتے، بعض اوقات خود طلبہ کی مثالیں دیتے اور کبھی خوش طبعی و ظرافت کی چاشنی پیدا کر کے ماحول کو شگفتہ بنائے رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طالب علم کے ذہن پر مشکل سے مشکل مسئلے کا بوجھ نہیں پڑتا تھا۔

تین سال تک حضرت مولاناؒ کے اس دلنشین اسلوب تدریس سے مانوس ہونے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ جب چوتھے سال ہماری بعض کتابیں ایک دوسرے استاذ کے پاس منتقل ہوگئیں تو مدتوں ہمیں مولاناؒ کے انداز تدریس کی یاد ستاتی رہی۔ یہ دوسرے استاذ حضرت مولاناؒ سے زیادہ معمر، پختہ کار اور بڑے مقبول استاذ تھے، لیکن ہمیں ان کے انداز تدریس سے مانوس ہونے میں خاصا وقت لگا۔

وہ حضرت مولاناؒ کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا، ان کی وجاہت اور صحت قابل رشک تھی اور ان کا مذاق شعر و ادب بھی اپنے عروج پر تھا۔ وہ خود بڑے نفیس شعر کہتے تھے، اردو دونوں کے

چند اشعار بھی انہیں خوب یاد تھے۔ کبھی درس میں اور کبھی درس کے باہر وہ نہ صرف شعر سنتے بلکہ شعری فنی باریکیوں پر بہترین تبصرے فرماتے تھے۔ ہمارے گھر میں بھی شعر و ادب کا ماحول تھا، اس لئے حضرت مولاناؒ نے مجھے باقاعدہ شعر گوئی پر آمادہ کیا، وہ ہمیں ایک مصرعہ طرح دیدیتے، اور اس پر شعر کہنے کی ترغیب دیتے۔ چنانچہ اس زمانے میں حضرت مولاناؒ کی ترغیب پر میں نے تک بندی شروع کی جو رفتہ رفتہ واقعی شعر گوئی میں تبدیل ہو گئی۔

میرے مرحوم بڑے بھائی جناب محمد زکی صاحب کی شادی کا وقت قریب آیا تو میں نے ان کا سہرا کہنے کی کوشش کی اور پھر بے ڈھنگی سی تک بندی کر کے اس کی اصلاح تو فرمادی دی، لیکن پھر خود ایک نظم کہی اور فرمایا کہ اس کے بجائے یہ نظم موقع پر پڑھ دینا۔

حضرت مولاناؒ اس دور میں جو شعر کہتے تھے، اس کا اندازہ کرنے کیلئے حضرت مولانا کی ایک غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں جو انہوں نے اقبال مرحوم کی مشہور غزل کی زمین میں کہے تھے ؎

تجھ کو اے ہوش! اسے کر واقف انجام بھی
بیخودی سے مجھے لینا ہے بہت کام بھی
بے نیاز غم دنیا تو کیا تو نے مجھے
ہے مگر سر پہ مرے زیست کا الزام ابھی
کچھ تو باقی ہے ابھی خاک مری تربت پہ
کیسے رک جائے بھلا گردش ایام ابھی

اور غالب کی زمین میں یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

حسن مائل بہ اعتنا نہ ہوا
عشق مرہون التجا نہ ہوا
ان کو دیدار ہی نہ تھا منظور
ظرف کا میرے ایک بہانہ ہوا
عشق نے ان کو تمکنت بخشی

مذہب بت خود بخود خدا نہ ہو
ہوتا ہے حکماں دیا جو چشمہ
جوش دل سے جو ہوا تھا ہم
کیوں تجھ کو اب قبر پہ سوجھی؟
مجھ کو تو دیکھ دیکھ کر ترساتے ہوا

کچھ ابو غزنی کے یہ اشعار

روز ازل کے تھے ہم سے جو عہد و پیماں
ایما جو ہے یہ ادا اس قصہ کہنہ کا
دیر و حرم کا حاصل ذوق طلب ہے گویا
ہر ذرہ آستاں ہے دنیا کی انجمن کا
سوال عشق میں تو پچھتانا بہت ہیں
پھر تجھ اس قدر کیوں شکوہ ہے لو کن کا

ورلیف نعت کے یہ اشعار کتنے سرور انگیز ہیں

اسلام اک شجر دین بوجہ نزول جبریل
رحمت ہو وہ جہاں شجر شجرات خلیل
تیری رحمت بخشے تیرے اس طرح ظلمت و عصیان
جیسے ہو ظلمت شب نور سحر میں تحلیل
جلوہ سامان ہیں ترے نور سے یہ شمس و قمر
یہ تبسم ہیں ترے لبوں سے یہ جادہ و نیل
تو نے دیکھا تو ہوئے بزم میں انجمن ہم
تیرے پرتو ہی سے روشن ہے جہاں کی قندیل
تیرا ہر قول ہے تفسیر و ہدایت کی اساس
شرح قرآن مجید ہے تری ذات جمیل

میرے دامن میں گناہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
کاش ہو تیری محبت مری بخشش کی سبیل
تیرے عشاق کو ہے علم حضور حاصل
تیرے دیوانے کہاں ہوتے ہیں محتاج دلیل
انبیاء خشت و ستون گنبد و محراب رہے
تجھ سے اس قصر رسالت کی ہوئی تکمیل
میرا مقصود ہے کہ نعت ہے اپنی ہی نجات
ورنہ کیا وصف ترا پائے گا مرغ تخیل
ہے اسی کا یہ کرم غزل پہ تیرے محمود
ورنہ تو اور کہاں مدحت فرزند خلیل

حضرت کی شعر گوئی کا سلسلہ ۱۹۵۵ء کے بعد ختم ہو گیا، یہاں تک کہ بالآخر آپ نے شاعری کو بالکل خیرباد کہہ دیا، اور اب اگر کوئی یاد بھی دلاتا تو فرماتے کہ "اب میں یہ مشغلہ اس طرح ترک کر چکا ہوں کہ اب کچھ یاد بھی نہیں رہا۔"

حضرت مولانا بہترین خطاط بھی تھے، ان کی عام تحریر بھی اتنی خوبصورت تھی کہ موتی جڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور خطاطی بھی کمال کی تھی۔ چنانچہ درس کے علاوہ دوسرے اوقات میں وہ عرصہ دراز تک شوقین طلبہ کو خطاطی بھی سکھاتے رہے۔ میری تحریر بچپن میں بڑی خراب تھی۔ حضرت مولانا کے پاس میں نے خطاطی کی بھی مشق کی اور عام تحریر بھی درست کی۔ جمعرات کے دن مولانا تمام ہفتے کے پڑھائے ہوئے مضامین کا تحریری امتحان لیا کرتے تھے اور امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والوں کے ناموں کا اعلان بھی فرماتے۔ اس سے طلبہ میں مسابقت کا جذبہ بھی پیدا ہوتا تھا اور ہم اس امتحان کیلئے بڑے جوش و خروش سے تیاری کیا کرتے تھے۔ جہاں تک مضامین امتحان کا تعلق تھا، الحمدللہ ان کے لحاظ سے ہمارے پرچے بہت اچھے ہوتے، مگر تحریر کی خرابی حضرت مولانا کے ذوق کو بہت گراں گزرتی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے الگ سے تحریر کی مشق کرانی شروع کی، اور رفتہ رفتہ خط بہتر ہو گیا۔

یوں تو حضرت مولانا نے درس نظامی کی تقریباً تمام ہی کتابیں پڑھائی ہیں لیکن ابتداءً ان کی شہرت عربی ادب کے اچھے استاذ کی حیثیت سے ہوئی۔ ہم نے جس زمانے میں ان سے عربی پڑھی، وہ ہمیں عربی لکھنے کی مشق بھی ساتھ ساتھ کراتے تھے، چنانچہ چھوٹے چھوٹے جملوں سے شروع کر کے رفتہ رفتہ وہ ہمیں عربی میں مضمون لکھنے تک لے گئے یہاں تک کہ ہم نے امتحانی پرچوں کا جواب بھی عربی میں لکھنا شروع کر دیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے سب سے پہلے عربی میں جن پرچوں کا جواب دیا وہ نفحۃ الیمن اور نور الانوار کے پرچے تھے۔ اور اس کے بعد دورۂ حدیث تک ہر پرچے کا جواب عربی میں لکھا، اور یہ سب حضرت مولانا کا فیض تھا۔

اس زمانے میں سوریہ (شام) کے سفارت خانے سے دار العلوم کے بڑے اچھے روابط تھے۔ (یہ شام میں بعث پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے کی بات ہے) شام کے سفیر جواد المرابط صاحب بڑے علم دوست آدمی تھے اور ظاہری وضع قطع انگریزی ہونے کے باوجود انہیں عبادت کا بھی بڑا ذوق تھا، اور ان کی باتوں میں خشیت و انابت کا پہلو بھی بڑا نمایاں تھا وہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی خدمت میں کثرت سے آیا کرتے تھے، اور استفادہ بھی فرماتے تھے۔ اسی دوران انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ سفارت خانہ شام دار العلوم کے تعاون سے شہر بھر میں عربی زبان سکھانے کے مختلف مراکز قائم کرے۔ اس غرض کیلئے انہوں نے چار بہترین شامی اساتذہ استاذ امین المصری، استاذ احمد الاحمد، استاذ عبدالحمید الیافی اور استاذ حسنی الخطیب کو شام سے بلوا کر ان کا پاکستان میں تقرر کیا۔ اور ان کی مدد سے دار العلوم نے شہر بھر میں تقریباً بیس مراکز ایسے قائم کئے جن میں عربی بالطریق المباشر (ڈائریکٹ میتھڈ سے) پڑھائی جاتی تھی۔ ان مراکز میں سب سے بڑا مرکز خود دار العلوم نانک واڑہ میں تھا جہاں یہ چاروں اساتذہ شام کے وقت میں مختلف سطح کے طلبہ کو عربی پڑھاتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ شہر بھر کے تمام مراکز میں یہ چاروں حضرات نہیں جا سکتے تھے، چنانچہ دوسرے مراکز میں دار العلوم کے بعض اساتذہ اور کچھ باہر کے حضرات کو استاذ مقرر کیا گیا۔ دار العلوم کے جن اساتذہ کی خدمات اس مقصد کیلئے حاصل کی گئیں، ان میں حضرت مولانا سحبان محمود صاحب، حضرت

مولانا مفتی ولی حسن، حضرت مولانا مظہر بقاء صاحب اور حضرت مولانا عبدالحق صاحب بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ اس وقت پاکستان کوارٹرز کے ایک مرکز میں شام کو عربی کی تعلیم دیتے تھے۔

عربی کی تعلیم کے ان مراکز کا شہر کی تعلیمی فضا پر بہت اچھا اثر پڑا، اور وہ ہزار ہا افراد جو عربی سیکھنا چاہتے تھے مگر پورا وقت نہیں دے سکتے تھے، اس سلسلے سے بہت مستفید ہوئے۔ حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ اس میدان میں بھی نہایت ممتاز اور نمایاں استاذ ثابت ہوئے، اور سینکڑوں افراد نے ان سے استفادہ کیا۔

۱۹۵۶ء میں دارالعلوم نانک واڑہ سے موجودہ جگہ منتقل ہوگیا، یہ نئی جگہ شہر سے بہت دور اور آبادی سے کٹی ہوئی تھی، قریب کے شرافی گوٹھ کی وجہ سے اسے دارالعلوم شرافی کہا جاتا تھا، شہری سہولیات میسر نہیں تھیں، اور اساتذہ کی رہائش کیلئے مکانات بھی بہت چھوٹے اور گھٹے ہوئے تھے۔ دارالعلوم کے بعض قدیم اساتذہ اس مشکل صورت حال کو برداشت نہ کرسکے اور اس موقع پر وہ دارالعلوم چھوڑ کر دوسرے مدارس میں چلے گئے (اسی سال حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحبؒ نے نیوٹاؤن کی جامع مسجد میں اپنے مشہور جامعۃ العلوم الاسلامیہ کی بنیاد ڈالی تھی، چنانچہ بعض اساتذہ اس مدرسے میں منتقل ہوگئے) لیکن حضرت مولانا سحبان محمود صاحب قدس سرہ نے اس موقع پر دارالعلوم کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان کا قیام گولی مار کے محلے میں تھا اور شروع میں انہیں انتہائی صعوبت اٹھا کر روزانہ دارالعلوم آنا پڑتا تھا، مگر انہوں نے بڑی استقامت کے ساتھ دارالعلوم کی خدمت جاری رکھی، اور پھر اپنے اہل وعیال کے ساتھ دارالعلوم کے ایک نیم پختہ مکان میں منتقل ہوگئے جہاں انہوں نے سالہا سال گزارے۔

شرافی گوٹھ منتقل ہونے کے بعد دو سال تک ہمارا کوئی درس حضرت مولاناؒ کے پاس نہ گیا لیکن ان سے جو قلبی محبت اور انس تھا، اس کی بنا پر خارجی اوقات میں حضرتؒ سے استفادے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مولاناؒ کے اس قدیم مکان کے سامنے ایک چھوٹا سا پکا فرش تھا۔ مولانا عصر کے بعد وہاں تشریف فرما ہوتے، طلبہ اس وقت میں ان سے خوش نویسی کی مشق کرتے اور کبھی کبھی ہم بھی حضرتؒ سے ملاقات کیلئے وہاں جا بیٹھتے اور حضرتؒ کی باتوں سے استفادہ

کرتے تھے البتہ دورۂ حدیث کے سال میں ہمارا نسائی شریف کا سبق حضرت مولاناؒ کے پاس چلا گیا، اور اس سال ایک مرتبہ پھر ہمیں ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ اس درس کی خصوصیت یہ تھی کہ بخاری شریف اور ترمذی شریف کے درس میں جو طویل بحثیں ہم پڑھتے تھے نسائی شریف کے درس میں حضرت مولاناؒ ان کا بہترین خلاصہ اور نچوڑ بیان فرمایا کرتے اس طرح یہ بحثیں تازہ بھی ہو جاتیں اور ان کا لب لباب بھی ذہن نشین ہو جاتا۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت مولاناؒ کو انتظامی ذمہ داریاں بھی سونپ دی گئیں، اور وہ دارالعلوم کے شمالی والے حصے کے ناظم قرار پائے۔ اس میدان میں بھی انہوں نے اپنی عملی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ بعد میں انہیں دارالعلوم کا ناظم اعلیٰ بنا دیا گیا، اور وہ تدریس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

جب میں نے دورۂ حدیث سے فارغ ہونے کے بعد تدریس شروع کی تو میری عمر کل سترہ سال تھی، اور چہرے پر داڑھی بھی نہیں آئی تھی۔ حضرت مولاناؒ نے پہلی بار خود درسگاہ میں بٹھا کر تعارف کرایا، اور تدریس کے سلسلے میں ایسی نصیحتیں فرمائیں جو عمر بھر کام آئیں۔ شروع میں ترمذی شریف کا درس حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم کے پاس تھا۔ ان کے دارالعلوم سے چلے جانے کے بعد ترمذی شریف کا درس حضرت مولانا سحبان محمود صاحب قدس سرہٗ کی طرف منتقل ہو گیا۔ بعد میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم بھی تشریف لے گئے تو بخاری شریف جلد اول حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے خود پڑھانی شروع کر دی، اور جلد ثانی حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ کے سپرد فرمائی۔ حضرت والد صاحبؒ اپنے اعذار و اشغال کی وجہ سے پوری جلد اول نہ پڑھا سکتے تھے، اس لئے جلد اول کا باقی حصہ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب کی طرف منتقل کر دیا، اور جب ضعف ہو گیا تو پوری جلد اول حضرت مولانا کے سپرد فرما دی۔ اس موقع پر خود حضرت مولاناؒ نے ترمذی شریف کا درس میرے سپرد کرنے کی تجویز دی، احقر تو ڈرتا ہی تھا، مگر حضرت مولاناؒ نے حوصلہ بندھایا اور اسی وقت سے ترمذی کا درس میری طرف منتقل ہو گیا۔ حضرت مولانا اکبر علی صاحب کی وفات کے بعد حضرت مولاناؒ نے مکمل بخاری شریف کا درس شروع کیا، اور اس طرح تقریباً ۳۵ سال تک اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی تدریس کی

سعادت حاصل فرمائی۔

کتابی علم تو بہت سے لوگوں کو حاصل ہوتا ہے لیکن انسان کی عظمت درحقیقت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب علمی تبحر کے باوجود وہ تواضع اور خدمت کا پیکر بن جائے۔

حضرت مولاناؒ کی حیاتِ طیبہ اس معاملے میں بھی ایک مثال کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ اپنے گھرانے میں واحد عالم دین تھے۔ ان کے والد ماجد بھی جدید تعلیم یافتہ تھے اور تمام بھائی بھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و فضل کا اعلیٰ مقام عطا فرمایا، لیکن اپنے والدین کی خدمت کے معاملے میں انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ مٹائے رکھا۔ یوں تو خدمت والدین ان کی ادا ادا سے نمایاں تھی لیکن اس کا بطور خاص مظاہرہ ہمیں ۱۹۶۳ء میں اس وقت ہوا جب حضرت مولاناؒ اپنے والدین کے ہمراہ حج کے سفر پر تشریف لے گئے۔ حسن اتفاق سے اسی سال ہم دونوں بھائی حضرت والد صاحب قدس سرہ کی معیت میں حج فرض کی ادائیگی کیلئے گئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے بزرگ استاذ حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ نے بھی اسی سال حج کیا تھا۔ حضرت مولانا اکبر علی صاحب قدس سرہ مظاہر علوم سہارنپور کے قدیم اساتذہ میں سے تھے اور حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ نے ان سے باضابطہ کوئی درس تو نہیں لیا تھا، لیکن جس زمانے میں حضرت مولاناؒ مظاہر علوم میں پڑھتے تھے اس زمانے میں حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ وہاں پڑھایا کرتے تھے۔ اس نسبت سے حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ ان کی ایسی ہی عزت فرماتے تھے جیسے اپنے حقیقی استاذ کی کی جاتی ہے اور ساری عمر ان کے ساتھ استاذ جیسا ہی معاملہ فرماتے رہے۔ حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ چونکہ ضعیف تھے اور سفر حج میں بالکل تنہا، اس لئے حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ نے انہیں اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اس طرح ان کے ساتھ والدین بھی تھے، اور حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ بھی۔ یہ سب حضرات عمر رسیدہ بھی تھے، مختلف عوارض کے شکار بھی، اور نہایت نازک مزاج اور زود رنج بھی۔ حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ ان کی خدمت کیلئے تنہا تھے، پہلی بار حج کا سفر کیا تھا اور اس دور کے حج میں مشقتیں آج سے کہیں زیادہ تھیں۔ لیکن انہوں نے ان تینوں بزرگوں کی خدمت کا جو حق ادا کیا ہے۔ اور ان کے سامنے اپنے آپ کو مٹا دینے کے جو مناظر ہم نے دیکھے ہیں وہ آج بھی دل پر نقش ہیں

انہیں الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے، اور ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ظاہری علم و فضل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں تواضع اور خدمت کے کس مقام بلند پر فائز فرمایا ہے۔

حضرت مولانا کے والد ماجد بڑے نازک مزاج اور جلالی بزرگ تھے، خلاف طبع بات پر وہ حضرت مولانا کے شاگردوں کے سامنے بھی ان پر بگڑ جاتے تھے لیکن ایسے مواقع پر حضرت مولانا کا رویہ انتہائی متواضع اور نیاز مندانہ ہوتا تھا، اس کی مثالیں اب بہت کم ملتی ہیں۔ والد صاحب کی اطاعت ہی کا مظہر یہ واقعہ بھی ہے کہ حضرت مولانا کا اصل نام جو والدین نے رکھا تھا "جان محمد" تھا۔ جب مولانا کا تعلق ہمارے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) سے ہوا تو حضرت والد صاحب نے ان سے فرمایا کہ "جان" نام مناسب معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ عام طور سے یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ (جیسے جان اللہ) حضرت والد صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ اپنا نام بدل کر "سحبان محمود" رکھ لیجئے۔ حضرت مولانا اس تجویز سے متفق بھی تھے اور چاہتے تھے کہ حضرت والد صاحب کی اس ہدایت پر عمل کریں، لیکن جب انہوں نے یہ تجویز اپنے والد سے ذکر کی تو انہوں نے نام بدلنے سے منع کر دیا۔ اب ایک طرف تو مفتی اعظم پاکستان کی تجویز تھی جس سے وہ خود متفق تھے، اور مذکورہ ایہام کی وجہ سے خود اپنے نام کو مناسب نہ سمجھتے تھے لیکن دوسری طرف اپنے والد کا حکم تھا۔ حضرت نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ اپنے نام کی تبدیلی کا اعلان تو نہیں کیا (کیونکہ اس کام کا صراحۃً جانا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا اور والد تبدیلی کے حق میں نہیں تھے) لیکن اپنے دستخط اس طرح بنانے لگے کہ انہیں "سحبان" بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ جب تک مولانا کے والد بقید حیات رہے، انہوں نے نام تبدیل نہیں کیا، لیکن والد کی وفات کے بعد ابھی دو تین سال پہلے تمام رفقاء کے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے مشورے کے مطابق اپنا نام تبدیل کرتا ہوں، آج کے بعد مجھے "سحبان محمود" کہا اور لکھا جائے۔

اندازہ فرمائیے کہ اس واقعے میں کن کن پہلوؤں کی رعایت ہے۔ دستخط میں تو فوراً اس طرح نام تبدیل کر دیا کہ وہ حضرت مفتی صاحب کے مشورے کے مطابق ہو جائے مگر اعلان اپنے والد کے احترام میں مدتوں روکے رکھا، اور پھر تبدیلی کا اعلان ایک اچھے وقت فرمایا جب

وہ ہزاروں افراد کے مقتدا تھے، مگر کسی مرحلے میں اس تبدیلی کا اعلان نہیں، یہ بے نفسی کے اعلیٰ ترین مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔

حضرت مولاناؒ کو قرآن کریم کی تلاوت کا خاص ذوق تھا، وہ بہترین حافظ اور قاری تھے۔ تراویح میں ان کی تلاوت اتنی وجد آفریں ہوتی تھی کہ بہت لوگ خاص ان کی تلاوت سننے کیلئے گولیمار کی مسجد باب الاسلام جایا کرتے تھے جہاں وہ سالہا سال تراویح پڑھاتے رہے۔ اس وقت وہ رمضان میں تراویح کے علاوہ روزانہ پندرہ پاروں کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ یوں بھی چلتے پھرتے ان کے ہونٹ تلاوتِ قرآن کریم سے تر رہتے تھے۔ ہم ایسے مواقع ڈھونڈا کرتے تھے کہ جب پنج وقتہ نمازوں میں کوئی جہری نماز حضرت مولاناؒ پڑھائیں تاکہ ان کی تلاوت سننے کی سعادت ولذت حاصل ہوسکے۔

کتابی علم میں عموماً اس وقت تک برکت نہیں ہوتی جب تک انسان کسی شیخ کامل سے تزکیۂ نفس نہ کرائے۔ حضرت مولاناؒ نے دارالعلوم میں قیام کے دوران اس غرض کیلئے حضرت مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ، حضرت والد صاحبؒ (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ) اور آخر میں حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب سے اصلاحی تعلق قائم فرمایا، اور بالآخر حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرت کو مجاز قرار دیا۔

حضرت مولانا کا علمی اور تدریسی فیض تو دارالعلوم کے ذریعہ تقریباً نصف صدی سے جاری تھا۔ اس دوران حضرتؒ کے شاگردوں کی کم از کم پانچ چھ نسلیں فارغ التحصیل ہوکر علمی و دینی خدمات میں مشغول ہو گئیں۔ اس کے علاوہ کراچی میں اور بیرون کراچی بہت سے مدارس حضرتؒ کے زیر نگرانی چل رہے تھے جنہیں حضرت کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا، اور وہ ان سب کو اپنی ہدایات سے فیضیاب فرماتے تھے۔ ان کے شاگرد دنیا کے تقریباً ہر خطے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحبؒ کی وفات کے بعد اصلاح باطن چاہنے والے مسلمانوں کا رجوع حضرتؒ کی طرف اتنا بڑھا کہ سینکڑوں افراد نے اپنے تزکیۂ نفس کیلئے حضرتؒ سے فیض حاصل کیا۔ حضرت گلشن اقبال کی جامع مسجد بیت المکرم میں (جو دارالعلوم ہی کے زیر انتظام ہے) سالہا سال سے جمعہ میں خطاب فرماتے، جس میں شرکت کیلئے لوگ دور

ورت آتے تھے۔ ہفتے کے دن عصر کے بعد حضرت اپنے مکان پر اصلاحی مجلس منعقد فرماتے تھے جس میں دارالعلوم کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ شہر کے بہت سے خواتین و حضرات اہتمام سے شریک ہوتے۔ اس کے علاوہ ہفتے کے مختلف دنوں میں حضرت کی اصلاحی مجالس شہر کے مختلف مقامات پر ہوتی تھیں۔ نیز ملاقات کے ذریعہ لوگوں کے آنے اور خطوط کا سلسلہ بھی جاری تھا اور ان تمام مجلسوں کے علاوہ بھی لوگوں کی آمد کا سلسلہ تقریباً ہر وقت جاری رہتا تھا۔ لوگ انفرادی طور پر حضرت کی خدمت میں آتے اور اپنے معاملات میں زریں ہدایات کا تحفہ لے کر جاتے تھے۔ ہر شخص کے ساتھ حضرت کا معاملہ محبت و شفقت کا تھا اور حضرت کے نزدیک ہر کوئی سب سے قریب تر معلوم ہوتا تھا۔

ان کی زندگی شروع سے با اصول تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے معمولات پر غیر معمولی استقامت عطا فرمائی تھی۔ وہ اپنے نظام الاوقات کے اتنے پابند تھے کہ ان کے بعض معمولات کو دیکھ کر گھڑی ملائی جا سکتی تھی۔ ان کے درس کا گھنٹہ اس وقت بجتا تھا جب وہ درسگاہ کے آس پاس پہنچ چکے ہوتے تھے۔ ان کی ہر نماز صفِ اول میں ادا ہوتی تھی اور اگر وہ صفِ اول میں نہ ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ دارالعلوم سے باہر تشریف لے گئے ہیں یا بیمار ہیں۔ بڑی عمر کے بعد تقریباً ۲۵ سال تک ان کا کوئی دن بھی بیماری کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ اس دوران وہ نماز باجماعت ادا فرماتے رہے اور ان کے ہونٹ بھی ذکر سے شاذ ہی جدا ہوتے تھے۔

صحیح بخاری کی دونوں جلدیں دو گھنٹوں میں پابندی سے پڑھاتے اور اگر کبھی کوئی اور گھنٹہ خالی ہوتا تو اسے بھی اپنے درس میں مصروف فرما لیتے۔ اس کے علاوہ دارالعلوم کے انتظامی امور سے فارغ ہونے کے بعد ظہر تک اپنے گھر رہتے۔ شام کے اوقات زیادہ تر طالبین اصلاح کے لیے وقف تھے۔ جمعہ کے علاوہ ہفتے کے ہر دن شہر میں کسی نہ کسی جگہ اصلاحی مجلس سے خطاب فرماتے تھے۔ جمعہ کو گلشن اقبال کی جامع مسجد بیت المکرم میں بیان ہوتا۔ ہفتے کے دن خود اپنے مکان پر مجلس ہوتی۔ اتوار کے دن پی ای سی ایچ سوسائٹی کی مسجد خلفاء میں بعد عصر، منگل کو مسجد بیت المکرم میں، بدھ کو ناظم آباد نمبر 1 کی جامع مسجد میں اور جمعرات کو شادمان ٹاؤن میں مجلس ہوتی تھی۔ صرف جمعہ کا دن خالی تھا۔ اس میں شہر سے آنے والے مہمانوں

سے ملاقات فرماتے تھے۔

اس طرح بفضلہ تعالیٰ حضرت مولاناؒ کے شب و روز کے تمام اوقات کسی نہ کسی کارِ خیر میں مصروف تھے اور جو وقت اتفاق سے کبھی خالی مل جاتا تو ان کے ہونٹوں کی متواتر حرکت تلاوت یا ذکر اللہ کی گواہی دیتی رہتی تھی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ناچیز راقم الحروف پر حضرت مولاناؒ کی شفقتیں اور ان کے احسانات اتنے ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں اس بات کی تو حسرت ہی ہے کہ اپنے بزرگوں کی اہتمامی توجہات اور شفقتوں کے باوجود میں اپنی نااہلی سے ان توجہات کی قدر نہ کر پایا۔ لیکن احقر کو طلب علم کی جو ٹوٹی پھوٹی مقدار حاصل ہے۔ وہ میرے اساتذہ کی مرہونِ منت ہے اور ان میں حضرت مولانا سحبان محمود صاحب کا اسمِ گرامی سر فہرست ہے۔ میں اپنی مصروفیات اور اسفار کی بناء پر پچھلے کچھ عرصے سے حضرتؒ کی زیارت و ملاقات کی سعادت اپنی خواہش کے مطابق حاصل نہیں کر پاتا تھا، لیکن جب کسی مسئلے میں ذرا الجھن ہوتی، حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور ان کے چند جملوں سے تشفی ہو جاتی۔

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ کی وفات کے بعد بہت سے حضرات نے فرمائش کی کہ میں ہفتہ وار سرکاری تعطیل کے دن لوگوں کو بزرگوں کی باتیں سنایا کروں۔ مجھے اس لئے شدید تامل تھا کہ جس طرح کا اجتماع یہ حضرات چاہتے تھے۔ اس کا انداز اصلاحی مجلس کا تھا اور میں یقیناً اس کا اہل نہیں، لیکن حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ نے احقر سے ارشاد فرمایا کہ "میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہ کام شروع کرو۔" اس کے بعد انکار کی مجال نہ تھی، چنانچہ پہلے لسبیلہ کی جامع مسجد نعمان میں اور پھر جامع مسجد بیت المکرم (گلشن اقبال) میں احقر کے بیانات کا سلسلہ (جو اب بھی جاری ہے) حضرتؒ کے حکم سے شروع ہوا۔

مجھے 28 ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ کو مجمع الفقہ الاسلامی ہندوستان میں شرکت کیلئے انڈیا جانا تھا جس کا وعدہ میں نے مدتوں پہلے کیا تھا۔ اس سے چند روز پہلے حضرتؒ بنگلور تشریف لے گئے

تھے۔ نیز مجھے انڈیا جانے سے پہلے بہت سرسری اور مختصر ملاقات میسر آسکی۔ جو حضرت سے میری آخری ملاقات تھی۔ میں گھر والوں سے کہہ رہا تھا کہ نہ جانے اس مرتبہ انڈیا کے سفر کے لیے طبیعت کیوں آمادہ نہیں ہو رہی؟ میرا یہ سفر انڈیا میں ایک ہفتے کا تھا اور اس کے بعد مجھے وہیں سے لندن جانا تھا۔ میں بادلِ ناخواستہ انڈیا روانہ ہو گیا اور ابھی دہلی اور پٹنہ ہی پہنچ پایا تھا کہ یہ جانکاہ حادثہ پیش آگیا۔ اور میں سفر منسوخ کرنے کے باوجود نماز جنازہ کے اگلے دن ہی پہنچ سکا۔

یہ ۲۹؍ذی الحجہ کا دن تھا، یعنی ۱۴۲۸ھ کا آخری دن۔ حضرتؒ نے نماز فجر مسجد میں پڑھنے کے بعد حسب معمول صبح کی چہل قدمی کا معمول پورا کیا۔ گھر آ کر بھی تمام معمولات ٹھیک ٹھاک انجام دیے۔ صبح دس بجے حضرت کا درس بخاری شروع ہوا کرتا تھا۔ اس سے پہلے کچھ دیر دفتر میں انتظامی امور انجام دیا کرتے تھے۔ اس روز بھی دفتر تشریف لے گئے اور کچھ کاغذات نمٹائے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے سانس میں کچھ رکاوٹ اور سینے میں کچھ تکلیف شروع ہوئی تو اپنے صاحبزادے مولانا احسن محمود کو فون کر کے دفتر بلایا۔ ان کے ساتھ گھر تشریف لے گئے۔ کپڑے تبدیل فرمائے، دار العلوم کے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کو بلایا۔ انہوں نے حضرت کے قلب کے معالج کے مشورے سے ایک انجکشن دیا۔ اسی دوران حضرتؒ اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہسپتال لے جانے کی کوشش کی گئی، مگر وقت مقرر اس سے پہلے آچکا تھا۔

یہ سب کچھ تقریباً بیس منٹ میں ہو گیا اور مرض الموت سے لے کر آخری سانس تک کے تمام مراحل اسی مختصر وقت میں پورے ہو گئے۔ حضرتؒ انتہائی والہیت کے ساتھ جو دعائیں مانگا کرتے تھے، ان میں یہ دعا بھی ضرور شامل ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کی معذوری سے محفوظ رکھیں، اور موت کے مراحل کو آسان فرمائیں۔ حضرتؒ کی یہ دعا قبول ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس جھٹ پٹ بلا لیا۔ میں تو نماز جنازہ میں شرکت سے محروم رہا، مگر جو حضرات حاضر تھے، ان کا بیان ہے کہ حضرت والد صاحبؒ کی نماز جنازہ کے بعد اتنا بڑا مجمع کسی نماز جنازہ میں یہاں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ دار العلوم کی عیدگاہ کا میدان پورا بھرا ہوا تھا اور اس کے باہر بھی آدمی تھے۔ ۱۴۲۸ھ کا سورج غروب ہو رہا تھا جب یہ آفتاب علم و عمل بھی ہم سے روپوش ہو کر

اپنی منزل تک پہنچ گیا۔

دارالعلوم کی فضاؤں میں اور اس کے چپے چپے پر حضرت مولاناؒ کی یادوں کی مہک موجود ہے، اس عالم میں کسی کو بقا نہیں، ہر ایک کو اسی منزل کی طرف جانا ہے، لیکن مبارک ہیں وہ جو حضرت مولاناؒ کی طرح کی زندگی گزار کر اور اپنے فیوض کا ایک سمندر چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

اللّٰهم لا تحرمنا اجره ولا تفتنّا بعده.

(ماہنامہ "البلاغ" جمادی الاخریٰ و رجب ۱۴۲۰ھ مطابق نومبر ۱۹۹۹ء)

آہ! حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایسی بنائی ہے کہ اس میں غم اور خوشی، راحت اور تکلیف دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ نہ یہاں کی خوشی خالص ہے نہ غم خالص، اس لئے یہاں خوشیوں اور صدموں کا پیش آنا نہ کوئی تعجب کی بات ہے نہ کوئی غیر معمولی چیز، لیکن بعض صدمے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر پوری امت پر پڑتا ہے اور ان کے ہمہ گیر اثرات کی وجہ سے ان کا زخم مندمل ہونا آسان نہیں ہوتا۔ پچھلے مہینے (رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ میں) ایک ایسا ہی عظیم صدمہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا پیش آیا جس نے ہر اس شخص کو سوگوار کر دیا جو حضرت مولانا کی شخصیت اور ان کی خدمات سے واقف ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ ہمارے دور کی ان عظیم شخصیات میں سے تھے جن کے فیض سے عالم اسلام کو جو فیضان نصیب ہوا تھا کہ شاید ہی ان کے ہم زمانے میں کسی شخص کو نصیب ہوا ہو، ان کا وجود پوری امت کیلئے ایک سائبان کی حیثیت رکھتا تھا۔ علم و فضل کے میدان میں بہت سی شخصیات ہیں، عبادت و ریاضت میں بھی بہت سی شخصیات ملیں گی، لیکن ایسی شخصیات جو علم و فضل، صاحب فکر، تقویٰ اور اعتدال و توازن کی خصوصیات جمع کرنے کے ساتھ ساتھ امت کی فکر میں گھلتی ہوں اور جن کے دل میں امت کا درد ہو، ایسی شخصیات کم ہوتی ہیں، اور جب وہ اٹھ جاتی ہیں تو خلا محسوس ہوتا ہے اور ان کی وفات کا خلا پر ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو ان خصوصیات سے نوازا تھا اور یہ انہی صفات کا ثمرہ تھا کہ وہ ہر دلعزیز بن گئے تھے۔

حضرت مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تعلیم و تربیت پائی تھی لیکن ان کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند سے بھی اکتساب فیض کی توفیق عطا فرمائی تھی اور اس طرح ان کی ذات میں ہندوستان کے ان دونوں تعلیمی اداروں کے محاسن جمع فرما دیئے تھے جو علم

ظاہر کے اس مجمع البحرین کو اللہ تعالیٰ نے علم باطن کا بھی حصۂ وافر عطا فرمایا۔ انہوں نے حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت وصحبت سے فیض حاصل کیا۔ اور طریقت کے میدان میں بھی حضرت رائے پوری قدس سرہ کے خلیفۂ مجاز کی حیثیت سے آپ کا فیض دور دور تک پھیلا۔

آپ کی اردو اور عربی تصانیف اتنی ایمان افروز، فکر انگیز اور معلومات آفریں ہیں کہ وہ دل کو ایمان ویقین سے سرشار کرنے کے علاوہ دین کا صحیح مزاج ومذاق انسان پر واضح کرتی ہیں اور اسے افراط وتفریط سے ہٹا کر اعتدال کے اس جادۂ مستقیم پر لے آتی ہیں جو ہمارے دین کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی تحریروں میں علم وفکر کی فراوانی کے ساتھ بلا کا سوز وگداز ہے جو انسان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ خاص طور پر مغربی افکار کی یورش نے ہمارے دور میں جو فکری گمراہیاں پیدا کی ہیں اور عالم اسلام کے مختلف حصوں میں جو فتنے جگائے ہیں، ان پر حضرت مولانا کی نظر بڑی وسیع وعمیق تھی اور انہوں نے اپنی تقریر وتحریر کے ذریعے ان فتنوں کی تشخیص اور ان کے علاج کی نشاندہی اتنی سلامت فکر کے ساتھ اتنے دلنشین انداز میں فرمائی ہے کہ عہد حاضر کے مؤلفین میں شاید ہی کوئی دوسرا ان کی ہمسری کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں عربی زبان کی تحریر وتقریر پر وہ قدرت عطا فرمائی تھی جو بہت سے عرب اہل قلم کیلئے بھی باعث رشک تھی، اس منفرد صلاحیت سے انہوں نے خدمت اسلام کا وہ عظیم الشان کام لیا جو عربی زبان وادب کے معاصر ماہرین میں سے شاید کسی نے نہ لیا ہو۔ ان کی فصیح وبلیغ عربی تحریروں نے عربوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اور مغرب کی فکری یلغار سے سہمے ہوئے عرب ممالک میں دین کا پیغام اتنی خود اعتمادی، اتنے یقین اور اتنے پرجوش انداز میں پہنچایا کہ آج بیشمار عرب مسلمان اپنی اسلامی بیداری کو ان کی تحریروں کا مرہون منت سمجھتے ہیں۔ ان کی تحریر وتقریر میں جو اخلاص، دردمندی اور دلسوزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی وہ ان کی سخت سے سخت بات کو بھی مخاطب کیلئے قابل قبول بنا دیتی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ عربوں پر کھری کھری تنقید کے باوجود عرب ممالک میں ان کی مقبولیت کسی بھی غیر عرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ عرب ملکوں کے مقتدر حلقوں سے بھی ان کے مراسم تھے اور وہ اپنے مراسم کو

خدمت دین کیلئے استعمال فرماتے تھے اور ان کی بدولت بہت سے منکرات کا سدباب ہوا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بارے میں اگر یہ کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ حضرت مولانا کی قیادت نے اس ادارے کو نئی زندگی بخشی۔ یہ ادارہ درحقیقت حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری نے مسلمانوں کی اہم ترین ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم فرمایا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے ایسے اہل علم پیدا ہوں جو دینی علوم سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے بھی اتنی واقفیت رکھتے ہوں جو ان کی دعوت کو معاصر تعلیم یافتہ حضرات میں زیادہ موثر بنا سکے۔ یہ ایک عظیم الشان مقصد تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس ادارے میں تاریخ وادب اتنا غالب آ گیا کہ اس کی دینی چھاپ ماند پڑنے لگی۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کو دوبارہ اپنے اصل مقاصد کی طرف اسی حکمت اور بصیرت کے ساتھ لوٹایا کہ اس کی نمایاں خصوصیت بھی برقرار رہی۔ اس کے ساتھ اس میں خصوصاً اسلامی علوم کا معیار بھی پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہوا۔ اس کی مجموعی فضا پر تدین، تقویٰ، وانابت الی اللہ کا رنگ بھی نمایاں ہوا اور تاریخ وادب کو دین کی دعوت اور مقاصد شریعت کا خادم بنا کر اس طرح استعمال کیا گیا کہ یہ ادارہ دعوت وخدمت دین کا ایک اہم مرکز بن گیا جس کی خدمات سے پورے عالم اسلام نے استفادہ کیا۔ حضرت مولانا نے اپنی انتھک جدوجہد سے اس ادارے میں اپنے ہم رنگ علماء کی ایک بڑی کھیپ تیار فرمائی جو بفضلہ تعالیٰ حضرت مولانا کے انداز فکر وعمل کی امین ہے اور انہی کے طرز وانداز پر دین کے مختلف شعبوں میں گرانقدر خدمات انجام دے رہی ہے۔

یوں تو حضرت مولانا کی تمام ہی تصانیف ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں لیکن "تاریخ دعوت وعزیمت" اور "دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" اور "عالم اسلام میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" یہ تین کتابیں ایسی ہیں کہ راقم الحروف نے ان سے خاص طور پر بہت استفادہ کیا اور ان کے ذریعے بہت سی زندگیوں میں فکری اور عملی انقلاب رونما ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے مقالے جو الگ کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئے ہیں بلا کی تاثیر رکھتے ہیں۔ خاص طور پر "اسمعوھا منی صریحۃ ایھا العرب" اور "من غار حراء تری شمس الصحوۃ الاسلامیہ" ایسے آتشیں مقالے ہیں جنہوں نے دلوں کو جھنجھوڑ

کر انہیں فکر و عمل کی سیدھی راہ دکھائی۔

عصری ضرورتوں کا احساس ہمارے دور میں بہت سے علماء، مجتہدوں اور اہل قلم کو ہوا اور انہوں نے اخلاص کے ساتھ دین کی عصری ضرورتوں کی تکمیل میں بڑی توانائیاں صرف کیں لیکن بسا اوقات عصری ضرورتوں کی فکر نے ان کو دین کی متعین حدود اور تعبیر سے الگ کر کے نئی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا جو جمہور امت اور سلف صالحین کے جادۂ مستقیم سے ہٹی ہوئی تھی۔ لیکن حضرت مولانا کی میانہ روی اور اعتدال کا معاملہ ان سے کہیں مختلف تھا۔ اس دور کا کوئی بھی حقیقت پسند انسان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ملت مسلمہ کی عصری ضرورت کا کتنا احساس و ادراک رکھتے تھے۔ لیکن ان ضروریات کی تکمیل انہوں نے ہمیشہ جمہور امت کے مسلمہ عقائد و نظریات کے دائرے میں رہتے ہوئے کی اور کسی قسم کی مرعوبیت اور معذرت خواہی کی پرچھائیں بھی ان کی تحریروں پر نہیں پڑ سکی۔

جب مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم نے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی تو وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھ کر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ لیکن جب ان کے طرز فکر و عمل سے اختلاف سامنے آیا تو حضرت مولانا ان سے الگ ہو گئے لیکن جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کی مخالفت کو اپنا ہدف نہیں بنایا، بلکہ مغربی افکار کی تردید میں انہوں نے جو قابل قدر کام کیا تھا اس کی تعریف و توصیف میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ رہا آخر ان کے طرز فکر و عمل پر عالمانہ تنقید حضرت مولانا نے "اسلام کی سیاسی تعبیر" میں سپرد قلم فرمائی وہ انہی کا حق تھا۔ اس کتاب کے ذریعے انہوں نے مولانا مودودی اور ان کے ہم فکر کے حامل دوسرے اہل علم سے اپنے اختلاف کو انتہائی متانت کے ساتھ مدلل اور مختصر انداز میں بیان فرما کر ان بنیادی نکات کی نشاندہی فرمائی جن میں ان حضرات کی سوچ قرآن و سنت کے جادۂ اعتدال سے ہٹ گئی تھی۔

حضرت مولانا کی پوری زندگی ایک جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں مسلمانوں کی کوئی تکلیف یا خرابی ان کے دل میں کانٹا بن کر چبھ جاتی تھی اور وہ مقدور بھر اس کے ازالے کیلئے بے چین ہو جاتے تھے۔ ان کی خود نوشت سوانح حیات "کاروان زندگی"

کے نام سے چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اور اس کے مطالعے سے ان کی ہمہ جہتی خدمات کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اتنی مصروف زندگی میں انہوں نے اپنی یہ سوانح کس طرح تالیف فرمائی جس میں ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات اتنی روانی کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ سچ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی سے کام لیتے ہیں تو اس کے اوقات میں بھی برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ اس سوانح کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض واقعات زندگی کی داستان نہیں ہے، بلکہ اس میں قدم قدم پر قاری کے لئے فکر و بصیرت کے نئے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں جن ہمہ جہتی خدمات کے لئے چنا تھا، ان کے پیش نظر وہ ایک شخص کی نہیں، پورے ادارے کی شخصیت تھی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے سامنے جب کبھی حضرت مولانا کا ذکر آتا تو اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ موفق من اللہ ہیں اور جوں جوں حضرت مولانا کی خدمات سامنے آتی گئیں، حضرت والد صاحب قدس سرہ کے اس جملے کی حقانیت واضح ہوتی گئی۔ لیکن ان ہمہ جہتی خدمات اور بے نظیر مقبولیت کے باوجود حضرت مولانا تواضع کے پیکر تھے۔ ان کے کسی انداز و ادا میں عجب و پندار کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ قبول حق کے لئے ان کا ذہن ہمیشہ کھلا ہوا تھا اور وہ اپنے چھوٹوں سے بھی ایسا معاملہ فرماتے تھے جس سے انسان شرمندہ ہو کر رہ جائے۔

مجھ ناچیز کے ساتھ حضرت مولانا کی شفقت و محبت اور عنایت کا جو معاملہ تھا، اسے تعبیر کرنے کے لئے الفاظ مشکل ہیں۔ اگرچہ پاکستان اور ہندوستان کے بعد کی بناء پر مجھے حضرت مولانا سے شرف ملاقات اور حضرت کی صحبت سے مستفید ہونے کے مواقع کم ملے۔ لیکن الحمد للہ خط و کتابت کے ذریعے ان سے تعلق قائم رہا۔ میں نے اپنے بہت سے ذاتی اور اجتماعی مسائل میں حضرت مولانا سے رہنمائی طلب کی اور انہوں نے ہمیشہ بڑی شفقت و محبت کے ساتھ اپنے ارشادات سے نوازا۔ میں ایسے مواقع کی تاک میں رہتا تھا جب حضرت مولانا کی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل ہو۔ یہ اشتیاق سو فیصد فطری تھا کیونکہ میرے لئے ان کی حیثیت ایک رہنما کی تھی۔ اس بات کا عادی ہو چکا تھا کہ ان کی صحبت نصیب ہو سکے مگر اب

لیکن یہ حضرت مولانا کی شفقت کی انتہا تھی کہ وہ بھی محض اپنے الطاف کریمانہ کی بنا پر مجھے اس ندامت سے باہر دور کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مجمع الفقہ الاسلامی ہند کا اجلاس بنگلور میں ہوا تھا۔ احقر نے حاضری کا فی الجملہ وعدہ کرلیا تھا۔ حضرت مولانا کا گرامی نامہ آیا کہ میں نے تم سے ملنے کی خاطر اس سفر کا ارادہ کیا ہے۔ بعد میں اتفاق سے مجھے ایسی مجبوری پیش آگئی کہ میں وہاں نہ پہنچ سکا اور اس وقت ان کی زیارت سے محروم رہا۔ میں اپنی نادانی سے یہ سمجھا تھا کہ حضرت نے احقر کی خاطر داری کیلئے مذکورہ بالا فقرہ لکھ دیا ہوگا لیکن بعد میں انہوں نے اپنے خطوط میں جس طرح اس پر افسوس کا اظہار فرمایا اور صرف خطوط ہی میں نہیں، اپنی خودنوشت سوانح میں بھی اس واقعے کا جس طرح ذکر فرمایا ہے وہ احقر کو غرق ندامت کرنے کیلئے کافی ہے۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

> 15,14 ذی القعدہ 1410ھ 11,10,9,8 جون 1990ء کی تاریخوں میں مجمع الفقہ الاسلامی ہند کا تیسرا عالمی مذاکرہ تھا (سیمینار) بنگلور میں دارالعلوم سبیل الرشاد کے احاطے میں منعقد ہونے والا تھا۔ میں نے رائے بریلی کے قیام میں احتیاطاً مجلس کیلئے مقالہ عربی میں تیار کرلیا تھا۔ مقالہ اگرچہ تیار تھا اور بنگلور کا موسم بمبئی سے کہیں زیادہ خوشگوار و خنک بھی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس موقع پر سفر کے بارے میں جو تردد تھا اس کی وجہ یہ احساس تھا کہ فقہ پر راقم کو وہ درجۂ اختصاص اور مطالعے کی وسعت و عمق حاصل نہیں جو اس اہم مذاکرۂ علمی میں شرکت کیلئے ضروری ہے۔ اس لئے شرکت سے معذرت کا رجحان غالب تھا۔ پھر صحت و اوقات کی بنا پر جن علمی مجالس میں بہت "ہجوم عام" ہوتی ہے انہیں شرکت کرنے سے بھی طبیعت گریز کرتی ہے لیکن مجھ کو مولانا مجاہد الاسلام صاحب جیسے قابل احترام قدیم اہل تعلق اور فاضل دوست سے شرمندگی بھی تھی۔ پھر اس سب پر مستزاد یہ توقع تھی کہ فاضل گرامی قدر اور محب محترم مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب بھی اس مذاکرے میں شرکت کیلئے خصوصی طور پر کراچی سے تشریف

اسباب سے ہیں۔ بمبئی میں بھی مجھے ان کو دیکھا یاد تھا جس میں کسی ضرور
آمد کی تیاری اور ملاقات کے شوق کا ذکر تھا۔ ان کے بعد مجھ سے مولانا مفتی
محمد رفیع عثمانی صاحب سے بمبئی میں ملاقات بھی ہوئی تھی جو حیدر آبادی
ایک دعوت پر تشریف لائے تھے اور مولانا تقی عثمانی کی آمد و شرکت کے
منتظر تھے۔ بہر حال ان اسباب کی بنا پر بنگلور کے سفر کا فیصلہ کیا گیا۔
مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ناگہانی مصروفیت کی وجہ سے تشریف نہیں لا سکے
جس کی ذاتی طور پر مجھے بے حد کمی محسوس ہوئی۔ غالباً ان کی عدم شرکت کی بنا
پر مجھ ہی کو اس موقع پر مجلس مذاکرہ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

(کاروان زندگی 8، ج3 ص222)

اندازہ ہے اگر اضلاع، قصبات اور گاؤں پر مشتمل حضرت مولانا کی قدر افزائی کی اس سے
بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے؟ پھر بنگلور کے اس سفر میں ملاقات نہ ہو سکنے کا جو تأثر حضرت پر تھا
وقت تک رہا جب تک کہ بعد ازاں ان سے سفر حج میں ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا تذکرہ
بھی حضرت نے کاروان زندگی میں اس طرح فرمایا ہے۔

'' ذکر کے قابل اس حج میں پاکستان کے تین فاضلوں کا مجموعہ جیسے تو
معمول کی ہی کہ جس سے خصوصی قلبی و فکری رابطہ و انس و محبت کا رشتہ ہے
ایک حسنی مولانا محمد تقی عثمانی، حکیم محمود احمد اشرف صاحب و جسٹس
افضل چیمہ صاحب پر مشتمل تھی۔ یہ حضرات بھی غالباً حج تمتع میں
تھے۔ یہ حضرات مغرب کے بعد ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی صاحب
سے ملنے تشریف لائے، وہیں عشاء کی نماز پڑھی، کھانا ساتھ کھایا اور
دیر تک مجلس رہی۔ جس طرح بنگلور میں شرکت نہ کرنے کے موقع پر جو 11.8
دن 90 کا منصوبہ تھی مولانا محمد تقی صاحب عثمانی سے (جو ایک کمیٹی کی
سے تشریف نہیں لا سکے تھے) اس کی تلافی حرم میں پوری ہوئی۔ دیر تک مجلس
رہی جس میں پاکستان کے حالات پر بھی گفتگو رہی۔ آخری دن مولانا تقی

> طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند یا کوئی مخلص سے اچانک ملاقات ہوئی۔ ان سے بھی راقم کا خاص رابطہ ہے۔ اسی طرح جس کو حضرت مولانا ظفر احمد انصاری صاحب کو شامل کر لیا جائے تو جہاں تک راقم کا تعلق ہے یہ چار حضرات سب سے زیادہ معتمد ترین اور محبوب ترین افراد ہیں جن سے راقم کو خصوصی رابطہ و تعلق ہے۔ اور وہ بھی اس ناچیز پر خصوصی کرم فرماتے ہیں۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی راقم کے دل میں جو قدر و منزلت ہے کسی سے اس کے اسباب مخفی و واقف ہیں اور ان کا بھی حال ان پر عیاں ہے۔"
>
> (کاروانِ زندگی ج 4 ص 304)

حضرت کی خصوصی شفقت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی ان کی کوئی نئی تصنیف آتی اس کا ایک نسخہ اپنے دستخط کے ساتھ کارڈ پر لکھ کر بھجواتے۔ اس معاملے میں اکثر یہ ہوتا تھا کہ ان کو خبر بھی نہ ہوتی کہ کوئی کتاب آنے والی ہے تو پہلے ہی پہنچ جاتی۔ اور بعض اوقات اشاعت کی تاریخوں کے مرحلے طے ہونے سے پہلے ہی کتاب کے نسخے بھجوا دیتے تھے۔ جب حضرت کی معرکہ آرا تصنیف "المرتضیٰ" منظر عام پر آئی تو اس کے نسخے احقر کے پاس پہنچے اور حکم فرمایا کہ اس پر جامع تبصرہ لکھا جائے۔ احقر نے تعمیل حکم کی اور کتاب کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کرنے کے ساتھ چند طالب علمانہ گزارشات بھی پیش کیں۔ حضرت نے ان گزارشات کی جس قدر قدردانی فرمائی وہ بھی بڑی انوکھی ہے۔ اس واقعے کا ذکر بھی حضرت نے "کاروان زندگی" میں کیا ہے۔ "المرتضیٰ" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "بعض حلقوں میں اس کتاب کو جو قبول اور جو مقبولیت مصنف کی توقع اور کتاب کی قدر و قیمت کے مطابق ہوا، مؤلف کتاب کو ایسے خطوط اور تنقیدی تبصرے جن سے ان میں شدت و تعصب کا استقبال کیا گیا اور جن کی ہونی خوبی زبان میں آپ اور مولانا محمد تقی عثمانی نے تنقید و تحلیل بطور ہدیہ رسالے کے تبصرے کی شکل میں پہنچے اور جانب ہی کا مشورہ تھا اس کتاب میں بعض کتابوں کا حوالہ نا تحقیق سے پتہ لگا اور جہاں تک ہو سکا تبصرہ کیا گیا وہ تحقیقی

حیثیت رکھتی ہے۔ جو فضیلت مآب جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی کے قلم سے لکھا
اور رسالہ "البلاغ" رمضان المبارک 1409ھ کے شمارے میں شائع ہوا)

(نقوش رفتگاں ص 424)

حضرت مولانا کے جو مکاتیب میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان کی تعداد بھی خاصی ہے۔ چونکہ ان مکاتیب میں پڑھنے والے کیلئے کوئی نہ کوئی سبق ضرور موجود ہے اس لئے میں ان میں سے چند مکاتیب بلا تاریخ ہیں ان میں ایک ... اشاعت کیلئے دے رہا ہوں ان میں مرقوم فرمانے کے بارے میں تعریفی کلمات ہیں وہ احقر جیسے [illegible] اور [illegible] ضرور ہیں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کا اہل بننے کی توفیق عطا فرمائیں لیکن کوئی ان سے یہ تو کوئی صاحب احقر کی حقیقی حالت کے بارے میں کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار نہ ہوں البتہ یہ مکتوب ان کی شفقت کی دلیل ضرور ہیں کہ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی کس عزت افزائی کا معاملہ فرماتے تھے۔

حضرت مولانا نے میری کتاب "عیسائیت کیا ہے؟" بہت پسند فرمائی اور اسے عربی اور انگریزی میں ترجمے پر بھی زور دیا جو الحمدللہ ان کی زندگی میں شائع ہوا اور انگریزی ترجمے کیلئے مترجم کی خدمت میں بھی پیشکش فرمائی اور اس کے مخلص معاون بھی قلمی تعاون کی ... پھر حضرت نے میری کتاب "تکملہ فتح الملہم" پر بھی اپنے مکتوب میں خصوصیت سے یا بطور مقدمہ تحریر فرمایا۔

اس سال دارالعلوم کراچی کی طرف سے شوال کے آخر میں فضلائے دارالعلوم کی دستار بندی کیلئے ایک جلسہ منعقد کرنے کا خیال ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس موقع پر اکابر علماء کا ایک اجتماع بھی ہو جائے۔ اس موقع پر جن اکابر علماء کو دعوت دینے کا خیال تھا ان میں حضرت مولانا ندوی کا نام سرفہرست تھا چنانچہ احقر نے جمعرات 21 رمضان المبارک کو دعوت کے سلسلے میں فون کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت رائے بریلی میں تشریف فرما ہیں وہاں فون کیا تو حضرت اس وقت فون کے پاس نہیں تھے۔ قاضی ... مولانا محمد رابع ندوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ الحمدللہ حضرت کی صحت بہتر ہے۔ روزے کا معمول جاری ہو رہا تھا۔ بحمداللہ تعالیٰ وہ سب ... ہو چکا ہے اور حضرت کمزوری کے باوجود روزے بھی

رکھ رہے ہیں۔ یہ سن کر الحمد للہ بہت اطمینان ہوا۔ جناب مولانا رابع صاحب نے میرا پیغام حضرت تک پہنچانے کا وعدہ کیا اور فرمایا کہ آپ سے حضرت کو جو محبت ہے اس کے پیش نظر وہ اس دعوت کو ضرور اہمیت دیں گے۔ تاہم میں نے ان سے وہ مناسب وقت معلوم کیا جس میں ان سے براہ راست بات ہو سکے۔ مولانا نے فرمایا کہ صبح دس بجے کے قریب حضرت فون کے پاس ہوتے ہیں میں نے ارادہ کیا کہ ان شاء اللہ ہفتے کی صبح کو حضرت سے ہمکلامی کا شرف حاصل کروں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جمعہ کی رات کو میرے بھتیجے عزیز خلیل اشرف عثمانی صاحب سلمہ نے فون پر بتایا کہ ریڈیو ٹیلیویژن سے حضرت کی وفات کی خبر نشر ہو چکی ہے۔ دل پر بجلی سی گری، مگر اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر سر تسلیم خم کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس بلانے کیلئے رمضان کا مبارک مہینہ، جمعہ کا مقدس دن اور وہ وقت منتخب فرمایا جس میں وہ تلاوت قرآن کریم میں مشغول تھے۔ ان کی زندگی جتنی پاکیزہ تھی اللہ تعالیٰ نے موت بھی ایسی ہی پاکیزہ عطا فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس واقعے پر یوں تو ہر مسلمان تعزیت کا مستحق ہے۔ لیکن خاص طور پر حضرت کے اہل خانہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے منتظمین اور اساتذہ، نیز حضرت کے تمام متوسلین کی خدمت میں البلاغ کی طرف سے پیغام تعزیت پیش ہے۔

حضرت مولانا اب دنیا میں نہیں ہیں لیکن انہوں نے جو گرانقدر مآثر چھوڑے ہیں، وہ ان شاء اللہ رہتی دنیا تک امت کی رہنمائی کریں گے۔

اللهم لا تحرمنا اجره و لا تفتنا بعده، اللهم اكرم نزله و وسع مدخله و ابدله دارا خيراً من داره و اهلاً خيراً من اهله و اغسله بماء الثلج و البرد و نقه من الخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس. آمين يا ارحم الراحمين

(ماہنامہ "البلاغ" ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ فروری ۲۰۰۰ء)

آہ! حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب بلند شہری

اس رمضان کے آغاز میں [illegible] کے [illegible] سے دل و نظر [illegible] تھے کہ [illegible] حادثۂ وفات نے شدید صدمے سے دوچار کر دیا۔ کیونکہ وہ ان ہستیوں میں سے تھے جن کی وفات کسی ایک فرد یا خاندان نہیں بلکہ پوری امت کے لئے ایک المناک سانحہ اور ناقابل تلافی نقصان ہوتی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میں ۴ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ کو [illegible] مجلس تحقیق شرعی کے ششماہی اجلاس میں شرکت کے لئے [illegible] گیا تھا، اور [illegible] مقیم تھا۔ جمعہ کے دن [illegible] ان صاحب سے [illegible] رمضان کی بارہویں تاریخ تھی [illegible] کے بعد [illegible] یہ جانکاہ خبر ملی کہ آج حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ [illegible] ان کی طبیعت [illegible] تھی، اور چند روز [illegible] میں [illegible] ہسپتال میں [illegible] تھے [illegible] ہو گئے تھے۔ ان کا [illegible] معمول تھا کہ رمضان المبارک کے [illegible] حرم [illegible] کیا کرتے تھے۔ اس رمضان میں بھی انہوں نے [illegible] معمول پورا [illegible] انہوں نے [illegible] ادا کی [illegible] تھا [illegible] کہ [illegible] کے [illegible] سے [illegible] کا [illegible] تھے [illegible] سے [illegible] میں [illegible] کے [illegible] مولانا عبد الرحمٰن [illegible] صاحب [illegible] ان [illegible] ملاقات [illegible] مولانا [illegible] کے پاس [illegible] اور جب [illegible] وقت [illegible]

حرف روانہ ہو چکے ہیں۔ مولانا کو یہ حسرت یا اشتیاق تھا اور وہ اکثر مرض کی بنا پر معمولی طرب کے رہتے تھے۔ اپنے حضرات کی تدفین کے لئے حسب تقاضی کاروائیاں ادا کی جاتی رہی ہیں اور ان کی تمنا میں یہ سعادت کب جا ملے اس لئے خیال یہ تھا کہ مولانا کی تدفین حضرات کی تک نہ پہنچ سکی نہ ہوئی۔ چنانچہ میں سوچ رہا تھا کہ قافلہ سے میں تراویح پڑھنے کے بعد میں نے ذریعے مدینہ منورہ فون کیا اور یہاں جنازے شب کو ایک بجے تک نہیں ہے مغرب کے بعد میں نے مدینہ منورہ فون کیا تو معلوم ہوا کہ دفتر سے مجھے معلوم ہوا ہے چونکہ ظہر کی نماز سے پہلے تدفین کی اجازت ہو گئی ہے اور اب نماز جنازہ عشاء کے بعد ہوگی۔ اب یہ سب پہنچے ہ گویا، حضرت تھا اللہ تعالیٰ نے ان کی منت کے مطابق بعد تدفین کے معمول کو سب پورا فرما دیا۔ جمعہ کی شب تراویح اور وتر کے بعد نماز جنازہ ادا کی اور اس کے متصل بعد جنت البقیع کی سرزمین کے سپرد کر دیئے گئے جس کی تمنا میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری پچیس سال گذارے تھے۔ میں جنازے میں شریک نہ ہو سکا البتہ اگلے دن مدینہ منورہ پہنچا۔ لیکن میرے برادر معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم جو حسن اتفاق سے پہلے ہی مدینہ منورہ پہنچے ہوئے تھے، جنازے اور تدفین میں شرکت کا موقع مل گیا۔

مولانا کی شخصیت ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھی جن کے تصور سے اس پر آشوب دور میں ذہن کو اطمینان ہوتا تھا۔ وہ ان اہل اللہ میں سے تھے جن کو دنیا کی محبت چھو کر بھی نہیں گذری، جن کا ہر لمحہ اللہ کی رضا کا پابند ہو کر آخرت کی تیاری میں گذرتا ہے، اور جن کی دعاؤں کا سہارا پوری امت کے لئے رحمت کا باعث ہوتا ہے۔ وہ اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ، سادگی اور تواضع میں سلف کی یادگار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے علوم دینی کی خدمت کا بڑا کام لیا۔ مدینہ منورہ میں ان کی ذات ایک مرجع کی حیثیت رکھتی تھی اور شب و روز ان کے فیض کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ پچھلے پچیس سال میں جب کبھی مدینہ منورہ حاضری ہوئی روضہ اقدس پر سلام عرض کرنے اور مسجد نبوی میں حاضری کے بعد مولانا کی زیارت ملاقات اس حاضری کا لازمی حصہ ہوتی تھی۔ جمعرات ۲۳ رمضان کو جب میں مدینہ منورہ پہنچا تو گذشتہ پچیس سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی زیارت و ملاقات کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ان کے قبر

پر خوشی ہوتی تھی، ان کے لکھنے پڑھنے کو مزید ترقی اور پیشانی خوشی سے کھل جاتی تھی، اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ابھی کام کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئے ہیں۔ لیکن وہ جب [illegible] پہنچ چکے تھے، اور ان کی یادیں ذہن میں ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں۔

غالباً مولانا سے سب سے پہلا تعارف ان کی مقبول عام کتاب [illegible] کے ذریعے ہوا ہوگا جو [illegible] نے شائع کی ہے۔ لیکن اس وقت یہ اندازہ نہ تھا کہ ان سے اتنی قربت حاصل ہونے کا بھی موقع ملے گا۔ مولانا ہندوستان میں مقیم تھے، اس لئے ملاقات بھی آسان نہ تھی۔ لیکن ایک مرتبہ دارالعلوم کراچی میں میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ اور مجھے ان کے ساتھ ملاقات کی سعادت ہوئی۔ اس وقت حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم (موجودہ صدر وفاق المدارس العربیہ و مہتمم جامعہ فاروقیہ) جو اس وقت دارالعلوم میں استاذ حدیث تھے، انہوں نے بتایا کہ مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب پاکستان آنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ انہیں بحیثیت استاذ دارالعلوم کراچی میں بلا لیا جائے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ نے یہ تجویز منظور فرمالی، اور اس طرح حضرت مولانا ۱۳۹۲ھ میں پاکستان آکر دارالعلوم سے منسلک ہو گئے۔

دارالعلوم میں مولانا کے قیام کے دوران اتنی قربت رہی کہ ہمیشہ کا موقع ملا، ان کی روح پرور صحبتوں اور ان کے ساتھ ان کے علمی و تصنیفی ذوق کا مشاہدہ قدم قدم پر ہوتا رہا۔ مولانا عمر میں کافی بڑے تھے بلکہ ہمارے بعض اساتذہ کے ہم عمر تھے، اس کے باوجود انہوں نے ہمیں اپنے آپ سے اتنا بے تکلف کیا ہوا تھا کہ ان سے کسی قسم کی بات کرنے میں تکلف کا کوئی پردہ حائل نہیں تھا۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ کو مولانا کے خلوص، للہیت، زہد اور حسن [illegible] کی بڑی قدر تھی۔ شروع میں مولانا کو تدریس ہی کا کام سپرد کیا گیا تھا، لیکن بعد میں کچھ انتظامی ذمہ داریاں بھی دی گئیں، اور پھر آخر میں حضرت والد صاحب قدس سرہ نے فتویٰ کا کام بھی ان کے سپرد کیا۔ شروع میں مولانا اس کام کو قبول کرنے میں متردد رہے، لیکن حضرت والد صاحب کی گرانی کی وجہ سے مجبوراً قبول کیا، اور پھر دارالعلوم میں نائب مفتی کی حیثیت سے خدمات انجام

رہتے رہے۔ کام کے لئے مولانا کسی محدود وقت کے پابند تھے، کام کی دھن انہیں شب و روز مشغول رکھتی تھی، اور دارالافتاء میں دوپہر کی دو تین گھنٹوں اور پچھلے ہوئے کو فرصت کے درمیان رات گئے تک بیٹھے رہتے، اور فتوؤں کی تربیت حاصل کرنے والے طلبہ کا ایک مجمع بھی ان کے گرد رہتا تھا۔

مولانا کی تصنیف و تالیف کا ذوق ابتداء ہی سے تھا، اور ان کی عوامی کتابیں بڑی مقبول اور مفید ثابت ہوئی تھیں۔ ان دنوں البلاغ کی ادارت کی ذمہ داریاں کچھ عرصہ پہلے میرے پاس آئی تھیں، چنانچہ میں نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ خواتین کیلئے مضامین کا ایک سلسلہ البلاغ میں شروع کریں۔ مولانا نے "خواتین اسلام" کے نام سے یہ سلسلہ شروع کیا جو نہایت مقبول ہوا، اور آخر ان مضامین کا مکمل مجموعہ "تحفۂ خواتین" کے نام سے شائع ہوا، جو بفضلہ تعالیٰ خواتین کیلئے ایک بہترین راہنما کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

عوامی کتابوں کے ساتھ ساتھ مولانا نے خالص علمی انداز کی کتابیں بھی تحریر فرمائیں، دارالعلوم کے قیام کے دوران ہی طحاوی کی عربی شرح "مجانی الاثمار" کی جلد اول شائع ہوئی، بعد میں انہوں نے علامہ سیوطی کی تبییض الصحیفة اور علامہ ابن حجر مکی کی الخیرات الحسان کے حواشی بھی لکھے، اور علمائے دیوبند و سہارنپور کی اسانید پر العناقید الغالیة تصنیف فرمائی، نیز مقدمہ بذل المجہود کی تکمیل کی سعادت بھی انہیں حاصل ہوئی۔

حضرت والد صاحبؒ کی وفات شوال ۱۳۹۶ھ میں ہوئی، اسی سال حضرت والد صاحبؒ کی وفات سے کچھ پہلے مولانا کے دل میں حجاز مقدس کی طرف ہجرت کرنے کا داعیہ شدت سے پیدا ہوا، اور شعبان میں مولانا عازم حجاز ہو گئے۔ ان کے دل میں تڑپ یہ تھی کہ حرمین شریفین کی سکونت اور بالآخر جنت البقیع کی مٹی نصیب ہو، یہی تڑپ حضرت والد صاحبؒ کی وفات سے تھوڑی پہلے انہیں سعودی عرب لے گئی تھی، اور بعد میں وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میں حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی میں نہ چلا آتا تو ان کی وفات کے بعد دارالعلوم چھوڑ کر جانا میرے لئے مشکل ہوتا۔ حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد بھی انہوں نے دارالعلوم اور اہل دارالعلوم سے محبت و شفقت کا تعلق پوری طرح برقرار رکھا۔ برادر محترم حضرت مولانا مفتی

محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہم نے دارالعلوم کا اہتمام سنبھالنے کے بعد ان سے کہہ دیا تھا کہ آپ دارالعلوم سے مستعفی نہیں ہوئے، بلکہ رخصت پر ہیں اور آپ کی استاذ دارالعلوم کی حیثیت مستقل برقرار ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس تعلق کو نبھایا۔ دارالعلوم کے معاملات میں وہ دور رہ کر بھی پوری دلچسپی لیتے رہے، اپنی ہدایات اور مشوروں، بلکہ تنبیہات سے بھی نوازتے رہے ہیں۔

کراچی سے حجاز چلے جانے کے بعد ایک عرصے تک انہوں نے معاشی اعتبار سے بڑی تنگی ترشی سے گزارا، وہ خود حجاز میں تھے، اور ان کے اہل خانہ یہاں دارالعلوم میں مقیم تھے، دونوں جگہ اخراجات۔ ذریعہ معاش کچھ نہیں تھا، لیکن وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو کسی بڑی آمدنی کی وجہ سے محروم رہ جاتے ہیں، ان کا اصل مقصد حرمین شریفین کی برکات حاصل کرنا تھا، اور جو لوگ اس غرض سے ہجرت کرتے ہیں، وہ معاشی تنگی اور حالات کی ترشی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں، چنانچہ انہیں مدینہ منورہ میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے ہوئے بھی کئی سال ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں دین اور اس کی خدمت کی فکر عطا فرمائی تھی، ان کا کوئی کام دکھانے کے لئے نہیں تھا، دین کی جو ضرورت وہ خود پوری کر سکتے، خود پوری کرتے، اور جو ضرورت دوسروں سے متعلق ہوتی، خط و کتابت کے ذریعے دوسروں کو توجہ دلاتے رہتے تھے۔ پاکستان میں جو نت نئے فتنے سر اٹھاتے، ان کی فکر انہیں وہاں بیٹھے بیٹھے بعض اوقات یہاں کے لوگوں سے بھی زیادہ ہوتی، اور وہ ان کی مقاومت کیلئے یہاں کے حضرات پر زور دیتے رہتے تھے۔

ان کے مدینہ منورہ چلے جانے سے عام مسلمانوں کو یہ بڑا فائدہ ہوا کہ انہیں سعودی عرب میں دینی رہنمائی کا ایک مرجع میسر آگیا، خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں کو دین کے مسائل معلوم کرنے کیلئے ایک قابل اعتماد مرکز مل گیا تھا، ان کے پاس سعودی عرب کے اطراف سے مسلمانوں کا رجوع رہتا تھا، اور وہ پوری شفقت سے سب کی پیاس بجھاتے تھے۔ اہل عرب میں سے بھی علم کے قدر دان مولانا کی ذات سے استفادہ کرتے، اور ان کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور جذبۂ اتباع سنت کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔

مولانا کی پیدائش ۱۳۴۳ھ میں ضلع بلند شہر کے ایک گاؤں "بسی" میں ہوئی تھی، دس برس کی عمر میں چھ مہینے میں انیس پارے حفظ کر لئے تھے۔ ابتدائی تعلیم حسن پور، مراد آباد اور میرٹھ کے مدرسوں میں حاصل کی، پھر ۱۳۶۰ھ میں مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا، اور وہاں کے اکابر سے تین سال فیض حاصل کیا۔ بعد میں میوات، دہلی اور کلکتہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ آخری ڈھائی سال مراد آباد کے مدرسہ حیاۃ العلوم میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، پھر حضرت والد صاحب کی فرمائش پر ۱۳۸۲ھ میں دارالعلوم کراچی منتقل ہوئے جہاں پندرہ سال خدمات کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

چند سال پہلے جب مولانا کو پہلی بار دل کی تکلیف ہوئی اور میں مدینہ منورہ میں ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوا تو فرمانے لگے کہ میں نے اس بیماری میں اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ "یا اللہ! میں نے ابھی تک تفسیر مکمل نہیں کی" چنانچہ صحت یاب ہونے کے بعد میں نے تفسیر لکھنی شروع کر دی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ "حضرت! ابھی تفسیر مکمل کرنے کی کیا جلدی ہے؟ بہت سے کام آپ کے پیچھے لگے ہیں۔ پھر تفسیر کی تکمیل کیجئے" مولانا [illegible] گئے، لیکن اس کے بعد بڑی تیز رفتاری سے تفسیر کی تصنیف جاری رکھی، یہاں تک کہ "انوار البیان" کے نام سے نو جلدوں میں یہ تفسیر کچھ ہی عرصہ پہلے مکمل فرما لی۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی آخری آرزو بھی پوری فرما دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مبارک مہینے اور روزے کی حالت میں تلاوت قرآن کے بعد اپنے پاس بلا لیا۔ یہ سب ان کی قبولیت عند اللہ کی قابل رشک علامات ہیں۔

[illegible] مولانا کا آخری کراچی آنا اس وقت ہوا جب تین سال پہلے دارالعلوم کراچی میں پچیس سال کے فارغ التحصیل طلبہ کیلئے تقسیم اسناد کا جلسہ منعقد کیا گیا، اور ہم نے مولانا کو دعوت دی۔ اگرچہ مولانا اپنی علالت کی بنا پر مدینہ منورہ سے باہر جانا پسند نہ کرتے تھے، مگر ہمارے پاس خط بھیجنے پر تشریف لے آئے، یہاں لوگ ان سے فیضیاب ہونے لگے، حضرات اکابر کی خواہش نے انہیں یہاں زیادہ دن قیام پر مجبور کر دیا۔ اسی سال صفر ۱۴۲۲ھ میں جب میں مدینہ منورہ حاضر ہوا تو مسجد نبوی میں ان سے آخری ملاقات ہوئی، کسے معلوم تھا کہ آئندہ ان سے ملاقات مقدر میں نہیں۔

اللّٰھم اکرم نزلہ و وسع مدخلہ و ابدلہ دارا خیرا من دارہ و اھلا خیرا من اھلہ و اغسلہ بماء الثلج و البرد و اغفرلہ و ارحمہ و اوسعہ و ارض عنہ یا ارحم الراحمین۔

یہ چند باتیں میں نے جلدی جلدی میں [illegible] قلم پر آگئیں، ورنہ ان کی زندگی اور خدمات ایسی ہمہ جہت ہیں کہ یہ مختصر مضمون میں نہیں آسکتے، [illegible] ہر پہلو کا [illegible] کے لئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو انشاء اللہ [illegible] ان تمام پہلوؤں کا تفصیلی تذکرہ ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کو اپنے جوار رحمت میں مقامات عالیہ عطا فرمائے، اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور ان کے صاحبزادگان مولانا [illegible] [illegible] کو ان کے نقش قدم پر چلنے اور ان کے کام کو جاری رکھنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

(ماہنامہ [illegible] جمادی الثانی و رجب ۱۴۲۳ھ ستمبر ۲۰۰۲ء)

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہ

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ ان شخصیات میں سے تھے جن کی نظیریں ہر دور میں کم ہی ہوا کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و فضل کی گہرائی کے ساتھ ساتھ بہت تقویٰ اور جزئیات شریعت کی رعایت کا وہ اہتمام عطا فرمایا تھا جو اس پرفتن دور میں کہیں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے خدمت دین کے ہر شعبے میں قابل رشک کام لیا۔ اور ان کے فیوض کے دریا مختلف جہتوں میں بہے۔ انشاء اللہ عرصہ دراز تک مخلوق خدا کو سیراب کرتے رہیں گے

وہ ہمارے ان اساتذہ میں سے تھے جن کے احسانات سے ہماری گردن جھکی رہے گی، حرف شناسی کی جو پونجی آج ہمارے پاس ہے وہ انہی حضرات اساتذہ کرام کا فیض ہے جن کے احسانات کا حق ادا کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اپنے مقامات قرب میں عظیم ترقیات عطا فرمائیں۔ آمین

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد صاحب قدس سرہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے مریدین میں سے تھے اور انہوں نے اپنے فرزند ارجمند کو تعلیم کیلئے اس دور میں بالخصوص دارالعلوم دیوبند بھیجا جو اس دور کی بڑی عظیم شخصیتوں سے جگمگا رہا تھا جن حضرات سے انہوں نے علم حاصل کیا ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اور شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب، شیخ المعقول حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمہم اللہ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہ نے تعلیم سے فراغت کے بعد اپنی عملی زندگی کا آغاز صوبہ سرحد سے کیا، جہاں مختلف مقامات پر تدریس کے علاوہ انہوں نے فتویٰ کا

فاضل بھی ہیں، اور ضلع خیرپور کے قصبہ ٹھیڑی کے مدرسہ دارالہدیٰ کو اپنا مرکز فیض بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے انہیں تحقیق، تدقیق اور تصنیف کا ذوق عطا فرمایا تھا، چنانچہ اس ابتدائی دور میں انہوں نے مسلسل فتاویٰ کے ذریعے قابل قدر علمی تحقیقات قلمبند اور متعدد کتابیں تالیف فرمائیں۔

ابتداء میں ہمارا دارالعلوم کراچی شہر کے ایک گنجان محلے نانک واڑہ کی ایک تنگ سی بوسیدہ عمارت میں تھا۔ ۱۳۷۶ھ (مطابق ۱۹۵۷ء) میں شہر سے دور شرافی گوٹھ کے قریب ایک وسیع رقبہ ایک صاحب خیر نے دارالعلوم کیلئے وقف کیا گیا تو اس پر چند عمارتیں تعمیر کی گئیں، اور مدرسے کو وہاں منتقل کر کے اسے آباد کردیا گیا۔ یہ جگہ شہر سے بہت دور اور ایک ویران صحرا میں واقع تھی، یہاں تک پہنچنے کیلئے میلوں تک کوئی پختہ سڑک نہ تھی۔ ضروریات کے ذرائع نہ تھے، نہ بجلی اور نہ وہاں پانی کی سہولت میسر تھی۔ ہمارے حضرات اساتذہ کرام شہر میں رہتے تھے، مثلاً حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی، حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب، حضرت مولانا بدیع الزمان صاحب وغیرہ ان کیلئے اپنی خانگی مجبوریوں کی بنا پر مدرسے کی نئی عمارت میں منتقل ہونا مشکل تھا، اور دوسری طرف غالباً اسی سال حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ نے جامع مسجد نیو ٹاؤن میں اپنا مدرسہ شروع فرمایا تھا، اس لئے ان حضرات نے حضرت بنوری کے مدرسے میں تدریس کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ ان حضرات کے اس ارادے کی بنا پر دارالعلوم میں جو اساتذہ کا ایک بڑا خلا پیدا ہو رہا تھا، اس موقع پر حضرت والد صاحب نے اور ہمارے دارالعلوم کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا نور احمد صاحب نے چند نئے اساتذہ سے رابطہ قائم کیا، ان میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب، حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم العالی، حضرت مولانا اکبر علی صاحب قدس سرہ اور بہاولپور کے حضرت مولانا سعید احمد صاحب شامل تھے۔ چنانچہ جب شوال ۱۳۷۶ھ میں دارالعلوم کی نئی عمارت میں تعلیم شروع ہوئی تو یہ حضرات دارالعلوم تشریف لا چکے تھے، اور انہوں نے شوال سے تعلیم کا آغاز فرمایا۔ اسی طرح ہمیں حضرت مفتی صاحب کی ضرورت اور ان سے

استفادے کا بہترین موقع اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادیا۔

اس سال ہمارے محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم العالی درجۂ موقوف علیہ ہدایہ آخرین کی جماعت پڑھاتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے پاس اس سال ہمارے کوئی اسباق نہ تھے، ایک طالب علم [illegible] مرے [illegible] اور [illegible] سے [illegible] کی تحقیق کی کتاب تھی، اور حضرت مفتی صاحب کا خصوصی موضوع تھا، لیکن انہوں نے اس انداز سے [illegible] کہ اس کے نتیجے میں [illegible] سے بھی [illegible] مناسبت پیدا ہوئی۔ علم فلکیات حضرت مفتی صاحب کے خصوصی موضوعات میں سے تھا۔ اس موضوع پر انہوں نے نہ صرف فلکیات کے قدیم و جدید نظریات سے بحث فرمائی، بلکہ اس کے ساتھ [illegible] سے کہیں زیادہ ریاضی کی بھی تعلیم دی۔ "[illegible] الحساب" کی کتاب [illegible] اور ریاضی کے مختلف قواعد اور [illegible] کی عملی مشق بھی کرائی۔ [illegible] کا خاص موضوع تھا، [illegible] "تسہیل [illegible]" کے نام سے [illegible] ایک طالب علم کے لئے [illegible] اس لئے انہوں نے [illegible] اس کتاب کے [illegible] اور اس کی مکمل مشق اس طرح کرائی کہ [illegible] نکالے گئے۔ [illegible] کے طول بلد [illegible] ہوتے تھے۔

اگلے سال ہم نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہ سے مشکوٰۃ المصابیح پڑھی، یہ ہمارا بہت [illegible] کتاب تھی، اور حضرت مفتی صاحب قدس سرہ [illegible] شان سے پڑھائی [illegible] حدیث [illegible] ان [illegible]

[illegible]

سے انہیں مختلف مسائل کی تحقیق کے علمی کام بھی دیئے، وہ کوئی مختصر بھی ہے اور ہمارے قدیم اثاثے کی کتب خانہ میں جا کر مختلف کتابوں کی مدد سے ان کی تحقیق کریں۔ اس طرح مجہول ۔ لئے قدیم ہوئی کتب سے استفادہ کا سلیقہ سکھایا، چنانچہ جب اگلے سال ہم دورۂ حدیث میں پہنچے اور صحیح بخاری ان سے پڑھنی شروع کی تو اسی سال انہوں نے ہمیں فتویٰ نویسی سے مناسبت پیدا کرنے کیلئے مختلف فقہی مسائل کی تحقیق کا کام بھی سپرد کر دیا۔

حضرت مفتی صاحب کا درس بڑا پر مغز، معلومات آفریں اور سچے تلے جملوں پر مشتمل ہوتا تحقیق ہوتی تھی، جس میں موضوع سے متعلق علمی لطائف و ظرائف بھی کثرت سے ہوتے تھے، جن کی وجہ سے درس کبھی خشک نہیں ہونے پاتا تھا بلکہ اس میں شگفتگی اور دلچسپی برقرار رہتی تھی۔

زبانی تعلیم کے ساتھ طلبہ کی عملی تربیت کا بھی خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔ جب طلبہ میں کوئی غلط بات دیکھتے تو موقع پر یا بعد میں جیسا مناسب ہو تنبیہ فرمایا کرتے تھے۔ دارالعلوم پرانا دور تھا جب یہاں بجلی بھی نہ تھی، نہ پانی، نہ پنکھے تھے، دارالعلوم کی چند عمارتوں کے علاوہ دور دور تک کوئی عمارت نہ تھی، حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے چاہا کہ ہمیں آخر شب میں بیدار ہو کر نماز پڑھنے کی عادت پڑے، اس غرض کیلئے ایک مدت تک آخر شب میں اپنے گھر سے تہجد کے وقت دارالعلوم کے کمروں تک چل کر تشریف لاتے اور ہمیں بیدار کرتے۔ بعض طلبہ بھی اٹھ کر مسجد میں جا بیٹھتے اور حکم دیتے کہ وضو کر کے تہجد پڑھیں، کبھی ایسا بھی ہوا کہ ان کے تشریف لے جانے کے بعد ہم پھر سو گئے۔

چونکہ دارالعلوم آبادی سے بہت دور تھا، نیز اگر کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اسے کسی معالج کے پاس لے جانا دشوار ہوتا تھا، حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے ہومیو پیتھی علاج سیکھنے کے ساتھ ہوتے ابتدائی علاج معالجہ بھی سیکھ لیا تھا، چنانچہ طلبہ کو فوری طبی امداد بھی پہنچا دیتے تھے۔ اگر کسی طالب علم کو انجکشن لگانے کی ضرورت پیش آ جاتی تو دور دور تک کوئی انجکشن لگانے والا میسر نہیں تھا، حضرت مفتی صاحب اپنے طالب علم کو انجکشن لگانے کیلئے خود تشریف لے جاتے، بعد میں یہ خدمت انہوں نے ہمیں بھی سکھلا دی تھی، چنانچہ ضرورت کے وقت ہم بھی طلبہ کو انجکشن لگا دیا کرتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے ایک مثالی استاذ کی طرح ہماری تعلیم و تربیت میں جو محنت فرمائی اس کے احسان کا حق ادا کرنے کا ہمارے پاس ان کے حق میں دعائے خیر کے سوا کوئی راستہ نہیں، اور کم از کم اپنی حد تک میرا سر اس احساس ندامت سے جھک جاتا ہے کہ اساتذہ کی اتنی کوشش کے باوجود نہ میں اپنی اصلاح کر سکا، اور نہ ان کے احسانات کا کوئی ادنیٰ حق ادا کر سکا۔

ابتداء میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہ پر علم و تحقیق ہی کے رنگ کا غلبہ تھا۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے مشورے پر انہوں نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاحی تعلق اور بیعت کا رشتہ قائم فرمایا اور کچھ ہی عرصے میں ان کی طرف سے بیعت و تلقین کی اجازت بھی عطا ہو گئی۔ اس وقت سے ظاہری علم و تحقیق کے ساتھ عشق و محبت اور باطنی علوم کی آمیزش نے ان کے فیوض کو دو چند کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک منفرد مزاج عطا فرمایا تھا، اور ان کے فیوض کے جوہر اس صورت میں زیادہ کھل سکتے تھے جب وہ اپنے اس مزاج کے مطابق خدمت دین میں مصروف ہوں چنانچہ انہوں نے ناظم آباد کی ایک چھوٹی سی جگہ میں فتویٰ کی تربیت کا ادارہ قائم فرمایا جو شروع میں "اشرف المدارس" اور بعد میں "دارالافتاء والارشاد" کے نام سے معروف ہوا۔ اور جب دارالعلوم کراچی سے ان کی رسمی وابستگی ختم ہوئی تو انہوں نے شہرت کے معروف ذرائع سے دور رہتے ہوئے اس ادارے کو اپنا مرکز فیض رسانی قرار دے لیا۔ رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ نے اس ادارے سے بڑے عظیم الشان کام لئے۔ یہاں ان کی ہفتہ وار اصلاحی مجلس عوام و خواص کا مرجع بن گئی۔ اطراف و اکناف سے لوگ اس مجلس میں شرکت کیلئے آتے اور اس کی بدولت سینکڑوں مردوں اور عورتوں کی زندگی میں خوشگوار دینی انقلاب رونما ہوا۔ اسی ادارے سے انہوں نے اپنا مجموعہ فتاویٰ "احسن الفتاویٰ" کے نام سے آٹھ ضخیم جلدوں میں مرتب فرما کر شائع کیا جو گرانقدر علمی اور فقہی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ ان کے اصلاحی مواعظ کثیر تعداد میں طبع ہو کر اصلاح خلق کا باعث ہوئے۔ ادارے سے بہت سے علماء نے فتویٰ کی تربیت حاصل کی اور اپنے اپنے علاقوں میں فتویٰ کی خدمت انجام دی۔ پھر جہاد افغانستان کے موقع پر اس ادارے

نے روسی استعمار کے خلاف جہاد میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ "الرشید ٹرسٹ" کے نام سے ایک عظیم رفاہی ادارہ قائم ہوا جس نے افغانستان اور پاکستان میں عظیم رفاہی منصوبوں پر کام کیا اور اب تک اس خدمت میں مصروف ہے۔ "ضرب مومن" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری ہوا جس نے قلیل عرصے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی اور لاکھوں کی تعداد میں طبع ہوکر قرآن وسنت کی تبلیغ میں نمایاں کردار ادا کیا، اور اب کچھ عرصے سے "اسلام" کے نام سے ایک روزنامہ انہی خطوط پر جاری ہوا۔ جانداروں کی تصاویر اور غیر شرعی اشتہارات کے بغیر اس پیمانے کے کسی اخبار کا تصور اس سے پہلے مشکل تھا، لیکن ان دونوں جریدوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا کہ اس دور میں بھی منکرات کے بغیر اخبارات وجرائد کامیابی کے ساتھ نکالے جا سکتے ہیں۔ یہ سارے صدقہ ہائے جاریہ ان کے نامۂ اعمال کا چمکتا ہوا حصہ ہیں۔

دارالعلوم کراچی سے رسمی علیحدگی کے بعد بھی حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے دارالعلوم اور اہل دارالعلوم کے ساتھ شفقت ومحبت کا تعلق ہمیشہ برقرار رکھا، اور ہمیشہ ہم لوگوں کی رہنمائی فرماتے رہے۔ ہمیں بھی یہ سعادت حاصل تھی کہ ان کی شفقتوں کے سائے میں رہے، اور بوقت ضرورت ان سے ہدایت ورہنمائی حاصل کرنے کی بھی توفیق ہوجاتی تھی۔ حضرت مفتی صاحب وقتاً فوقتاً دارالعلوم تشریف لاتے رہتے، اور بے تکلفی کے ساتھ کچھ وقت گذار کر اور ہدایات دے کر تشریف لے جاتے۔ آخری بار دارالعلوم کے جلسۂ تقسیم اسناد میں اپنے عام معمول سے ہٹ کر تشریف لائے اور دو روز قیام فرمایا۔

کچھ عرصے سے حضرت مفتی صاحب کی آواز بیٹھ گئی تھی، اس لئے اصلاحی مجلس میں بیان موقوف ہو گیا تھا، اس کے باوجود ان کے کیسٹ اور طبع شدہ مواعظ مستفیدین کی پیاس بجھاتے رہتے تھے۔ آخر میں شکر اور گردے کی بیماری کی وجہ سے باہر تشریف لانا بھی بند ہو گیا، کمزوری حد سے زیادہ ہوگئی۔ میں ۵ ذوالحجہ ۱۴۲۲ھ کو ایک کام کے سلسلے میں قاہرہ پہنچا، اور ۶ ذوالحجہ کو مجھے قاہرہ ہی میں اپنے بھانجے مولوی محمد اشرف صاحب سلمہ کا پیغام ملا کہ حضرت مفتی صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ اس دنیا کو قید خانہ فرمایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں

اس قید خانے سے رہائی عطا فرما کر اپنی منزلِ مقصود کی طرف بلا لیا۔ آپ اس بات کا بڑا اہتمام فرماتے تھے کہ کسی کے انتقال کے بعد اس کی تجہیز و تکفین اور تدفین جلد از جلد ہو، چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق انتقال کے بعد تین چار گھنٹے کے اندر اندر ان کی تجہیز و تکفین اور نمازِ جنازہ کے تمام مراحل مکمل ہو گئے، اور پھر انہیں اپنے شیخ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری قدس سرہ کے پہلو میں ایک نئی جگہ سپردِ خاک کیا گیا جو غالباً خود انہوں نے پہلے سے منتخب فرما رکھی تھی۔

بندہ سفر پر ہونے کی وجہ سے ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل نہ کر سکا، ان کی قبر پر حاضری ہوئی تو ان کے احسانات کے ساتھ ساتھ اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کے تصور سے بڑی ندامت محسوس ہوئی، دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات قرب میں ترقی عطا فرمائے اور ہمیں ان کی برکات سے محروم نہ فرمائے۔ آمین

اللّٰھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ، وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ، واغسلہ بماء الثلج والبرد، ونقہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس، اللھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ. آمین یا رب العالمین.

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے حالات اور ان کی عظیم خدمات کا کما حقہ تذکرہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں، امید ہے کہ انشاء اللہ ان کے تلمیذ رشید مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب ان کی مفصل سوانح حیات ترتیب دینے کی طرف توجہ دیں گے، اور اس سے یہ ضرورت پوری ہو سکے گی۔ ان سطور میں تو صرف ان چند تأثرات کا ذکر ہے جو فوری طور پر نوکِ قلم پر آ گئے۔

(ماہنامہ البلاغ محرم ۱۴۲۳ھ مطابق اپریل ۲۰۰۲ء)

پروفیسر محمد شمیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ

دنیا میں بہت سے اہلِ علم و فضل تو ایسے ہوتے ہیں جنھیں دنیا جانتی ہے۔ کم از کم ان کے اپنے کام کے بارے میں ان کو شہرت اور عام مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ دنیا سے جاتے ہیں تو ایک عالم سوگوار ہوتا ہے۔ ان کی تعریف و توصیف اور ان کی خدمات کے اعتراف میں تعزیتی جلسے منعقد ہوتے ہیں، اخبارات و رسائل میں ایک عرصے تک ان کے بارے میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ انھیں زندگی میں نہیں جانتے تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے کارناموں سے واقف ہو جاتے ہیں۔

لیکن علم و ادب اور ملی خدمات کے آسمان پر ایسے ستارے بھی ان گنت ہیں جن کی روشنی زمین میں سب طرف پھیلی ہوئی ہیں، مگر ان کے بارے میں کوئی واقف نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ گوشۂ تنہائی میں خاموشی سے اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ ان کی خوبی اور گمنامی ان کے کام کی لگن، محنت اور افادیت میں کوئی کمی نہیں آنے دیتی ہے مگر ہمیشہ سے دور رہ کر ان کی شناسائی کاوشیں زندگی دنیا تک ہوں کو ہے۔ ایسے لوگ ہیں جنھیں جب دنیا میں تعریف و توصیف کے تحفے پیش کیے جانے کا وقت آتا ہے تو وہ اپنا ہاتھ پیچھے کر کے اوروں کے حق پر ہوتے ہیں۔ ان کیلئے یہ تصور سب سے بڑا انعام اور ان کی تسکین کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی خوشنودی کیلئے کام کر رہے ہیں جو ان کے کام کی ہر جزوی تفصیل سے خوب واقف ہے، اور اس کے سوا کسی اور کو جتانے یا بتلانے کی ضرورت نہیں۔ اسے صحبت میں لا چکے۔ ایسے لوگ جب دنیا سے جاتے ہیں تو نہ ان کی یاد میں کوئی تعزیتی جلسہ منعقد ہوتا ہے، نہ اخبارات میں ان کے انتقال کی خبر شائع ہوتی ہے، نہ ان کی تعریف میں مضامین لکھے جاتے ہیں۔ وہ دنیا سے اس طرح چپکے چپکے اٹھ جاتے ہیں کہ ۔۔

کس کو خبر کہ چھوٹ گیا کارواں سے کون؟

پچھلے مہینے ایک ایسی ہی شخصیت دنیا سے رخصت ہوگئی، اور سوائے ان معدودے افراد کے جو انہیں اور ان کے کام کو قریب سے جانتے تھے، کسی کو اس حادثے کا علم بھی نہ ہوسکا، لیکن جو لوگ انہیں جانتے تھے، ان کیلئے ان کی وفات کا صدمہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے انتقال کے صدمے سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ عمر اور علمی رتبے میں میرے محترم بزرگ اور برتاؤ میں میرے محبوب اور سراپا محبت واخلاص دوست جناب پروفیسر محمد شمیم صاحبؒ کی شخصیت تھی جن کے بارے میں اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی جدائی کے صدمے کی ٹیسیں ان کی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادگان کے بعد شاید سب سے زیادہ میرے دل نے محسوس کیں اور اب تک ان کی شدت میں کمی نہیں آئی۔ گزشتہ سے پیوستہ البلاغ کے شمارے میں، میں نے ان کی وفات کی مختصر خبر تو دیدی تھی، لیکن ان کے بارے قدرے مفصل تاثرات اب سپرد قلم کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

پروفیسر محمد شمیم صاحبؒ کا مختصر تعارف تو یہ ہے کہ انہوں نے معارف القرآن کے انگریزی ترجمے کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا، اور اس کام کیلئے اپنی زندگی وقف کرکے انہوں نے معارف القرآن کی تقریباً چھ جلدوں کا ترجمہ مکمل کرلیا تھا جن میں سے پانچ جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان سے میرے تعارف کی ابتدا بھی اسی حوالے سے ہوئی، اور عجیب طرح ہوئی۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر معارف القرآن کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی، لوگوں کی فرمائش بھی تھی اور حضرت والد صاحبؒ کی خواہش بھی کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو، اردو اور انگریزی کے مشہور ادیب اور نقاد پروفیسر محمد حسن عسکری صاحب مرحوم نے اس کا ترجمہ شروع کیا اور جب سورۂ بقرہ کی آیت انا للّٰہ وانا الیہ راجعون پر پہنچے تو وفات پاگئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ان کا مفصل تذکرہ میں پہلے لکھ چکا ہوں جو میری کتاب ''نقوش رفتگاں'' میں شائع ہوچکا ہے۔

ان کی وفات تقریباً ۱۹۷۸ء میں ہوئی تھی، اس کے بعد عرصۂ دراز تک ترجمے کا کام بند رہا اور کوئی مناسب مترجم میسر نہ آیا، یا میسر آیا تو اس کی مصروفیت مطلوبہ رفتار میں مانع بنی، خود میں بھی اس زمانے میں اتنا مصروف ہوگیا کہ مناسب مترجم کی تلاش کیلئے کما حقہ وقت نہ نکال سکا، اور سات سال اسی طرح بیت گئے، لیکن میرے ذہن پر یہ بوجھ مسلسل تھا کہ معارف القرآن کا

یہ کام کسی طرح پورا ہو جاتا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں مجھے حرمین شریفین کے سفر پر آیا، اور ملتزم پر بحمد اللہ اہتمام سے یہ دعا کرنے کی توفیق ہوئی کہ اللہ تعالیٰ معارف القرآن کے ترجمے کا کوئی مناسب انتظام فرما دیں، اور اس کیلئے موزوں مترجم مل جائے۔

چند روز بعد جب میں کراچی واپس آیا تو میرے معاون خصوصی مولانا عبداللہ میمن صاحب نے مجھے بتایا کہ آپ کی غیر موجودگی میں ایک صاحب آپ سے ملنے کیلئے آئے تھے۔ انہوں نے اپنا نام محمد شمیم بتایا تھا، اور وہ یہ خواہش ظاہر کر رہے تھے کہ معارف القرآن کے انگریزی ترجمے کا جو کام محمد حسن عسکری صاحب مرحوم نے شروع کیا تھا وہ اس کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں، ساتھ ہی انہوں نے اپنے ترجمے کے نمونے کے طور پر کچھ ٹائپ شدہ صفحات بھی دیئے تھے کہ اگر آپ انہیں پسند فرمائیں تو انہیں بلوا کر ان سے بات کر لیں۔ میں نے نمونے کے وہ صفحات پڑھے تو مجھے ترجمہ مناسب معلوم ہوا، اور اندازہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی ہے۔ میں نے شمیم صاحب کو پیغام بھیجا، وہ تشریف لائے تو چھریرے بدن کا متواضع نوجوان، چہرے پر خوبصورت داڑھی، سادہ مگر نفیس لباس، بے حد متین و شائستہ انداز گفتگو، اور ان میں تواضع و شرافت اتنی کہ ترجمے سے پہلے مجھے ان کی شخصیت نے متاثر کر لیا۔ انہوں نے اپنے حالات بتاتے ہوئے بتایا کہ وہ اردو اور انگریزی ادب کے استاذ رہے ہیں، اور پچھلے دنوں انہوں نے تفسیر عثمانی کے ترجمے کو بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، اور اب ان کی خواہش ہے کہ وہ معارف القرآن کی خدمت کریں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے آپ کا ترجمہ پسند آیا ہے اور آپ اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیں، لیکن ہمارے بزرگوں نے ہمیں یہ تلقین اور معاملات کی صفائی سکھائی ہے، لہٰذا اجرت کے بارے بھی ارشاد فرما دیں کہ اس کام کیلئے آپ کی خدمت میں کتنا اور کس حساب سے حق الخدمت پیش کیا جائے؟ اس پر انہوں نے دلی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا کہ "الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے میری ضرورت کے مطابق مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے، اور میں یہ کام کسی دنیوی معاوضے کی خاطر نہیں، بلکہ قرآن کریم کی خدمت کی سعادت کیلئے کرنا چاہتا ہوں۔" مجھے اس بات کا تجربہ تھا کہ متعدد لوگوں سے مل چکا ہوں جن کے پیچھے حقیقت کم ہوتی ہے، اس لئے میں نے شمیم صاحب سے اصرار کیا، اور

مختلف اسباب سے انہیں ٹالنے کی کوشش کی، جب میری جستجو بڑھی تو وہ کھلے، اور کہنے لگے کہ دراصل میں چند سال پہلے ایک شدید بیماری کا شکار ہو گیا تھا اور اس وقت میں نے یہ عہد کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت عطا فرما کر مجھے عمر کی مزید مہلت دی تو میں عمر کا باقی حصہ قرآن کریم کی خدمت میں صرف کرنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت عطا فرمائی تو میں نے ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لی، الحمدللہ میری پنشن آتی ہے کہ میں اور میری اہلیہ آرام سے گذارا کر سکتے ہیں اور میرے بیٹے امریکہ میں برسرروزگار ہیں، لہٰذا میں نے اپنا عہد پورا کرنے کیلئے تفسیر عثمانی کا ترجمہ شروع کیا تھا، مگر وہ جزوی طور پر ہو سکا، اب میں امریکہ سے واپس پاکستان آتے ہوئے عمرے کیلئے حاضر ہوا تھا، میں نے وہاں ملتزم پر دعا کی تھی کہ یا اللہ! مجھے اپنا عہد پورا کرنے کیلئے قرآن کریم کی خدمت کا موقع عطا فرمائیے، اور ذہن میں یہ تھا کہ کراچی پہنچ کر آپ سے معارف القرآن کے بارے میں بات کروں گا، اور اب یہی دعا مجھے آپ کے پاس لے آئی ہے۔

شمیم صاحب کی یہ بات سن کر میں نے کہا کہ محترم! آپ خود تشریف نہیں لائے، آپ کو بھیجا گیا ہے، اور اس معاملے میں ملتزم کی دو دعائیں آپس میں مل گئی ہیں، ماشاء اللہ اب یہ کام اسی طرح مقدر معلوم ہوتا ہے، آپ بسم اللہ کریں، لیکن میں آپ کو ایک مرتبہ پھر بتادوں کہ کوئی حق الخدمت قبول کرنا انشاء اللہ اس عہد کے منافی نہیں ہوگا۔

وہ پھر چند لمحے خاموش رہے، پھر فرمانے لگے کہ "مولانا! میں ایک بات آپ سے کہنا نہیں چاہتا تھا، لیکن شاید آپ کا اطمینان اس کے بغیر نہ ہو، اس لئے عرض کرتا ہوں کہ جب معارف القرآن کے ترجمے کی پیشکش کرنے کیلئے آپ کے پاس آ رہا تھا تو مجھ سے کسی نے کہا کہ "تم تو اس طرح جا رہے ہو جیسے کوئی ملازمت کی درخواست لے کر کسی کے پاس جاتا ہے، وہ تم سے واقف نہیں ہیں، ممکن ہے وہ کیسے ردعمل کا اظہار کریں، اس کے بعد وہ تم سے رجوع کریں، لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ کوئی تیسرا شخص پہلے تمہارا تعارف کرائے، پھر وہ خود طلب و رغبت کا اظہار کریں، اس کے بعد وہ تم سے رجوع کریں، اور تم باوقار طریقے پر کام کرو۔" لیکن میں نے انہیں جواب دیا کہ چونکہ دنیا کے عام قاعدے کے لحاظ سے آپ کی بات درست ہے مگر جب

میں نے قرآن کریم کی خدمت کا ارادہ کیا ہے تو میں اپنی ذاتی لائبریری کا یہ حصہ بھی تم کو تحفتاً دیتا ہوں۔ میں نے دل سے یہ سوچ رکھا ہے کہ اگر آپ نے [illegible] اور معاوضہ [illegible] دیں تو مجھے ترجمہ کر دیجئے۔

میرے سامنے یہ پہلا شخص تھا جو [illegible] سے پہلے [illegible] مال و دولت کی محبت کا بت توڑ کے [illegible] نے [illegible] کا حق ادا کیا اور پھر میں نے ان سے حق خدمت کی بات بھی نہیں کی۔ اس کے بعد انہوں نے انگریزی میں ترجمے کا کام شروع کیا، اس کے ساتھ مختصر تشریحی نوٹ بھی [illegible]۔

پروفیسر شمیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۲۱ دسمبر ۱۹۲۱ء کو [illegible] میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد جناب محمد ظہور صاحب تجارت پیشہ تھے۔ شمیم صاحب کے بچپن ہی میں ان کی والدہ انتقال کر گئی تھیں، اس لئے انہوں نے پہلے اپنے چچا اور پھر خالہ کے گھر ایک یتیم [illegible] گذارا۔ وہیں رہتے ہوئے [illegible] امتحان انہوں نے [illegible] سے پاس کیا اور آگرہ کے سینٹ جانز کالج سے بی۔ اے کیا، پھر آگرہ یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ ایم۔ اے کیا اور بعد میں کانپور کے مشہور حلیم کالج میں ۱۹۴۵ء سے انگریزی ادب کے استاذ رہے۔ اس دوران جنہوں نے ان سے پڑھا ان میں ہمارے دور کے متعدد مشہور اہل قلم مثلاً ابو الخیر کشفی صاحب بھی شامل تھے۔ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے پاکستان کی طرف ہجرت کی، اور یہاں کراچی یونیورسٹی میں استاذی کی آسامی کیلئے درخواست دی، جب انٹرویو کیلئے پہنچے تو وہاں جناب ابو الخیر کشفی صاحب بھی پہلے سے انٹرویو کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ شمیم صاحب کو اس بات سے شرم آئی کہ استاذ اور شاگرد دونوں ایک ہی ساتھ انٹرویو دیں، چنانچہ وہ اس سے انٹرویو دیئے بغیر واپس آگئے۔ بعد میں انہیں امریکی سفارت خانے میں کلچرل ایڈوائزر کے منصب پر فائز کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں سفارت خانے کی طرف سے انہیں امریکہ بھیجا گیا۔ واپسی میں قاہرہ پہنچے تو وہاں سے انہوں نے عمرہ ادا کرنے کا پروگرام بنایا اور سعودی سفارت خانے میں ویزا لینے کی درخواست دی۔ سعودی سفارت خانے نے کہا کہ آپ امریکی سفارت خانے کے ذمہ دار عہدے پر ہیں، اس لئے اس سفر کے دوران آپ کو ویزا نہیں دیا جاسکتا۔ اس پر شمیم صاحب نے یہ

جواب دیا کہ اگر امریکی سفارتخانے کا مشن اور عمرے کا سفر دو متضاد چیزیں ہیں جن میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کیا جا سکتا ہے تو میں امریکی سفارت خانے کی ملازمت سے استعفیٰ دینے کو تیار ہوں۔ شاید ان کے اس عزم صمیم کی برکت تھی کہ بعد میں انہیں کسی طرح ویزا مل گیا اور انہوں نے پہلی بار حرمین شریفین کی حاضری کی سعادت حاصل کی اور عمرے کا یہ سفر ہی ان کی زندگی میں خوشگوار دینی انقلاب کا نقطۂ آغاز بن گیا۔

۱۹۷۰ء کے بعد کسی وقت انہیں پھیپھڑوں کی ایک بیماری لاحق ہوئی۔ اس بیماری کے دوران انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا کہ اگر انہیں اس بیماری سے صحت نصیب ہوگی تو وہ اپنی باقی عمر قرآن کریم کی خدمت میں صرف کریں گے۔ اسی بیماری کی بنیاد پر ۱۹۷۳ء میں انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی، اور صحت ہونے پر انہوں نے باقاعدہ ایک استاذ سے ناظرہ قرآن دوبارہ پڑھا۔ اگرچہ بچپن میں ناظرہ پڑھ چکے تھے، لیکن الفاظ و حروف کی تصحیح کی غرض سے انہوں نے اڑتالیس سال کی عمر میں مکتب والی تعلیم از سر نو شروع کی، یہاں تک کہ بفضلہ تعالیٰ قرآن کریم کی صحیح تلاوت پر قادر ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ دینی کتب، بالخصوص تفاسیر کا مطالعہ جاری رکھا، اور اپنی دلچسپیوں کا تمام تر محور دینی علوم کو بنا لیا۔ زندگی میں بھی یہ تبدیلی آئی کہ وہ اپنے ابتدائی دور میں بڑے ٹھاٹ باٹ کے آدمی تھے، دن میں دو مرتبہ جوڑے تبدیل کرنا روزمرہ کا معمول تھا۔ دفتر جاتے تو ایک جوڑا ساتھ ہوتا اور دن میں کسی وقت اسے تبدیل کرتے۔ لیکن زندگی کے اس نئے دور میں سادگی کا یہ عالم ہو گیا کہ قمیص پاجامے کے صرف تین جوڑوں پر اکتفا کرتے۔

اسی زمانے میں مولانا قاضی عبدالرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ کی تصانیف کو انگریزی میں منتقل کرنے کا کام شروع کیا ہوا تھا۔ شمیم صاحبؒ نے ان کی تفسیر عثمانی کے ترجمے کا کام اپنے ذمے لے لیا، اور ۱۹۷۹ء میں یہ کام شروع کیا۔ ۱۹۸۱ء میں وہ اپنے صاحبزادگان کی تعلیم وغیرہ کے سلسلے میں امریکہ چلے گئے، اور تین سال وہاں مقیم رہے۔ اس پورے عرصے میں وہ تفسیر عثمانی کے ترجمے کے کام میں مشغول رہے۔ ۱۹۸۴ء میں کراچی آکر بھی یہ کام جاری رکھا، جو مولانا قاضی عبدالرحمن صاحب رحمۃ

اللہ علیہ کی وفات کی بنا پر منقطع ہو گیا اور افسوس ہے کہ اس کی اشاعت کی بھی نوبت نہ آ سکی۔ ۱۹۸۹ء میں شمیم صاحب دوبارہ امریکہ تشریف لے گئے، اور وہاں سے واپسی پر عمرہ کرتے ہوئے قرآن کریم کی خدمت کی وہ دعا کی جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں، اور جس کے نتیجے میں راقم الحروف کو ان سے تعارف حاصل ہوا، اور بالآخر انہوں نے "معارف القرآن" کے ترجمے کو اپنی زندگی کا واحد مشن بنا لیا۔

انہوں نے پہلی جلد کا کام وہاں سے شروع کیا جہاں سے جناب محمد حسن عسکری صاحب مرحوم نے چھوڑا تھا، انہیں انگریزی زبان پر تو بحمد اللہ عبور حاصل تھا، مگر وہ تفسیر کے ترجمے میں انتہائی محتاط تھے، اور یہ فکر انہیں ہر وقت دامنگیر رہتا تھا کہ کہیں زبان کی بہتری کے شوق میں دینی احتیاط کا کوئی پہلو نظر انداز نہ ہو جائے۔ چنانچہ اول تو انہوں نے معارف القرآن کے مباحث کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کیلئے متعلقہ دینی علوم کی کتابوں کی مراجعت کو خاص طور پر جاری رکھا، عربی لغت اور دینی اصطلاحات کو ہضم کرنے کی کوشش کی، شروع میں جب میں نے ان کے کام پر نظر ثانی کی تو محسوس ہوا کہ ذہنی طور پر تفسیری اور کلامی مباحث میں ان کی غایت احتیاط نے زبان کی روانی کو متاثر کیا ہے، چنانچہ جب میں نے ان سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے اس کا ایک ایک لفظ بغور پڑھ کر وہ اصول ذہن نشین کر لئے جو ایسے مواقع پر مدنظر رکھنے چاہئیں، اور اگلی جلدوں کے ترجمے میں بڑی حد تک ان کو ملحوظ رکھا، رہا مسئلہ عربی ناموں کے تلفظ اور انگریزی میں ان کے املا کا، تو نظر ثانی کے دوران مجھے ان میں بکثرت تبدیلی کرنی پڑی، لیکن شمیم صاحب نے نہ صرف یہ کوشش کی کہ جتنا ایک مرتبہ درست کر دیا گیا ہو، آئندہ غلط نہ ہو، بلکہ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ عربی ناموں کے صحیح املا کی رہنمائی کرنے کیلئے کون سی کتاب مفید ہو سکتی ہے۔ میں نے انہیں علامہ طاہر پٹنی کی کتاب "المغنی" کا نام بتایا، پھر انہوں نے ساری تفسیر کے ترجمے میں اسے سامنے رکھا، اور باوجودیکہ وہ کتاب عربی میں ہے، انہوں نے اس کی مدد سے عربی ناموں کے صحیح املا کا علم حاصل کیا، جبکہ عربی کتاب کی مراجعت آسان نہ تھی، لیکن انہوں نے اپنا مقصد زندگی ہی اس مشقت کو بنا رکھا تھا جو قرآن کریم کی خدمت میں صرف ہو، اس لئے وہ اس میں بھی لذت محسوس کرتے تھے۔ اس شان سے انہوں نے چھ جلدیں مکمل کیں۔ چوتھی

جلد کا ابتدائی حصہ میرے بڑے بھائی جناب محمد ولی رازی صاحب نے لکھا تھا، لیکن اس کا بیشتر حصہ بھی شمیم صاحب نے ہی مکمل کیا۔ اسی دوران شمیم صاحب اپنے صاحبزادگان کے پاس امریکہ تشریف لے گئے، اور وہاں انہیں دل کی بیماری لاحق ہوئی، لیکن وہیں زیر علاج رہتے ہوئے انہوں نے پانچویں جلد کا ترجمہ کیا، اور کراچی تشریف لے آئے۔ ان کی علالت کی وجہ سے انہی کے مشورے کے مطابق چھٹی جلد کا ترجمہ برادر محترم جناب محمد عشرت حسین صاحب کے سپرد کیا جا چکا تھا، اس لئے شمیم صاحب نے پانچویں جلد کی تکمیل کے بعد ساتویں جلد کا ترجمہ شروع کیا، لیکن ابھی سورۂ احزاب کے درمیان میں تھے کہ ان کے صاحبزادے جناب شمائل شمیم صاحب انہیں علاج کیلئے دوبارہ امریکہ لے گئے۔ اس مرتبہ وہ مستقل قیام کے ارادے سے امریکہ گئے تھے، البتہ معارف القرآن کے کام کے سلسلے میں یہاں آتے رہنے کا ارادہ تھا۔ وہاں پہنچ کر بھی انہوں نے ساتویں جلد کا کام جاری رکھا، اور اس کا بیشتر حصہ مکمل کر لیا۔ ان سے ای میل کے ذریعے برابر رابطہ قائم تھا۔ قرآن کریم کا جو ترجمہ ہم سورۂ انبیاء تک اکٹھے بیٹھ کر کیا کرتے تھے، ان کی امریکہ روانگی کے وقت یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اب اس کی رفتار تیز کرنے کے لئے وہ اب تنہا میں کروں گا، اور ان کے پاس بھیج دیا کروں گا، چنانچہ سورۂ انبیاء سے سورۂ روم تک کا ترجمہ کر کے میں ای میل کے ذریعے ان کے پاس بھجواتا رہا۔ اور وہ میرے ترجمے کی ہر قسط کو انتہائی باریک بینی سے دیکھتے، تمام دوسرے تراجم سامنے رکھتے، پھر اس ترجمے پر اپنی رائے اہتمام کے ساتھ بھیجتے تھے جو میرے لیے بڑی مددگار ہوتی تھی۔ اور اب کسی اور سے اتنی دقت نظر کے ساتھ رائے دینے کی بظاہر امید نظر نہیں آتی۔

۹ مارچ کو اچانک رات کے وقت میرے پاس شمیم صاحب کی اہلیہ کی ہمشیرہ کا فون آیا کہ شمیم صاحب کو دل کا شدید دورہ ہوا ہے اور وہ ہسپتال میں داخل کر دیے گئے ہیں۔ میں نے ان کے صاحبزادے شمائل صاحب کو امریکہ فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ حملہ شدید ہے، اور ڈاکٹر صاحبان تقریباً نا امیدی کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ رات بے چینی میں گذری، اور صبح ہونے تک خبر آ گئی کہ وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے جس کی تیاری کیلئے انہوں نے سالہا سال سے شب و روز وقف کئے ہوئے تھے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

اپریل کے وسط میں مجھے امریکہ جانا تھا، وہیں سے ملاقات کیلئے نیویارک جانے کا بھی ارادہ تھا مگر ملاقات قسمت میں نہیں تھی، میں ۱۸ اپریل کو نیویارک پہنچا اور تقریباً چوبیس گھنٹے انہی کے گھر میں گذارے۔ شاکر صاحب نے بتایا کہ ان کے سینے میں تکلیف کی وجہ سے چل رہی تھی، مگر روزانہ کام کئے جا رہے ہیں۔ مجھے جب تکلیف کچھ بڑھتی نظر آئی تو صاحبزادگان نے ہسپتال لے جانے پر اصرار کیا، مگر انہوں نے پہلے اپنے چھوٹے صاحبزادے سعد صاحب کو بلوا کر کمپیوٹر میں ان کا کیا ہوا جتنا کام موجود ہے پہلے وہ اس کی نقلیں لے لیں۔ چنانچہ انہوں نے وہ فلاپیاں اپنے سامنے بنوائیں، وہ جتنے پرنٹ نکلے ہوئے تھے انہیں منظم کر کے لفافوں میں رکھا، اور انہیں تاکید کی کہ یہ مجھے (راقم الحروف کو) کراچی بھجوا دیں۔ شام کے وقت درد زیادہ ہونے لگا تو انہیں معائنے کیلئے ہسپتال لے جایا گیا۔ ہسپتال جاتے ہوئے انہوں نے شاکر صاحب سے کہا کہ معارف القرآن کی ساتویں جلد کے جو صفحات باقی رہ گئے ہیں، اگر میں واپس نہ آؤں تو تقی صاحب سے کہیں کہ وہ خود ہی اس کی تکمیل کر لیں تو بہتر ہے۔ شاکر صاحب نے کہا کہ ان شاء اللہ آپ واپس آئیں گے اور ابھی تو آپ کو تفسیر جلد بھی مکمل کرنی ہے۔ اس پر وہ فرمانے لگے کہ پہلے میرے دل میں بھی یہی آرزو تھی کہ تفسیر میرے ہاتھوں سے مکمل ہو، لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ قرآن کریم ایسی چیز نہیں جسے ختم کیا جائے، بلکہ ایسی چیز ہے جس میں زندگی ختم ہو جائے۔ (یہ حضرت والد صاحبؒ کا جملہ ہے جو انہوں نے معارف القرآن میں لکھا ہے، شیخ صاحب نے وہی جملہ اس موقع پر دہرایا)۔

ہسپتال پہنچ کر طبیعت نسبۃً سنبھل رہی، لیکن رات تین بجے ان پر دل کا شدید حملہ ہوا، اور انہوں نے اپنے صاحبزادے سعد صاحب کو بتایا کہ ایسی تکلیف پہلے کبھی نہیں ہوئی، اس کے چند ہی گھنٹے بے ہوشی رہنے کے بعد بالآخر اس دنیا کو خیرباد کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں ان کی قبر پر پہنچا تو وہ ان کی زندگی کی طرح سادہ تھی، اور ایسا لگتا تھا کہ دنیا کی وہ رنگینیاں جن سے وہ ہمیشہ بیزار تھے، ان سے ہمیشہ کیلئے جان چھڑا کر اس ویرانے میں آسودہ ہو گئے ہیں۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

ان کے کمرے میں ان کا کمپیوٹر، ان کے مسودات اور ان کی کتابیں اسی طرح رکھی تھیں جیسے

وہ ابھی کام کرنے کے لائق تھے جن میں سے بیشتر مکمل کر چکے تھے تو قرآن کی وہ آیت جس پر کام کر رہے وہ لکھے تھے وہ ترجمہ آخری دن کی آیت تھی۔

إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات لهم أجر غير ممنون

(حم السجدہ ۸)

بیشک جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ان کیلئے ایسا اجر ہے جو
کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

انشاء اللہ یہ فال نیک ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ انہیں اس آیت کا مصداق بنا لیا گیا ہوگا۔

نسیم صاحب نے معارف القرآن کے ترجمے کے دوران اور بھی متعدد کتابوں کی ترجمے کئے۔ سب سے پہلے انہوں نے میرے رسالے "نماز سنت کے مطابق پڑھئے" کو انگریزی میں منتقل کیا۔ پھر ہمارے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی قدس سرہ کی کتاب "احکام میت" کا ترجمہ کیا۔ اور اپنے صاحبزادوں کو یہ کتاب دے کر وصیت کی کہ ان کی تجہیز و تکفین پوری طرح اس کتاب کے مطابق کی جائے۔ اس کے علاوہ میری کتاب "پُر نور دعائیں" کا ترجمہ انہوں نے بڑے شوق و ذوق کے ساتھ کیا۔ انہیں مسنون دعاؤں سے بڑی مناسبت تھی اور یہ کتاب مجھ سے لکھوانے میں ان کا بھی بڑا دخل تھا۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ پڑھنے والوں کو یہ بات خاص طور پر محسوس ہوگی کہ مسنون دعاؤں میں احادیث کا جو انداز ہے نسیم صاحب نے اپنی استطاعت کی حد تک انگریزی میں منتقل کرنے کی بڑی کوشش کی ہے۔

جب میں نے "اسلام اور جدت پسندی" انگریزی میں شائع کرنی چاہی تو اس کی عبارت اور ترتیب میں بھی نسیم صاحب نے بڑا حصہ لیا اور بہتر بنانے کی کوشش کی۔ بعد میں خود میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی توجہ تفسیر کے کام پر مرکوز رکھیں، تو وہ اس کام میں مشغول ہو گئے۔

پچھلے تقریباً دس سال میں نسیم صاحب سے میرا تعلق ان کے کام کی وجہ سے تھی، لیکن ایک انسان اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت میں، میں نے انہیں بڑے عظیم اوصاف کا حامل

پایہ۔ ان کی تواضع، ان کی بےنفسی، ان کا خلوص، ان کی للہیت اور ان سب کے ساتھ ان کی قناعت، مزاج کی ایسی صفات تھیں کہ آج اس دور میں بہت کمیاب ہیں۔ دنیا کی محبت سے تمام عمر اپنے دامن کو بالکل پاک رکھ کر گئے تھے۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ہسپتال والوں نے پوچھا کہ ان کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ (Death Certificate) کی کتنی کاپیاں آپ کو درکار ہوں گی؟ صاحبزادے نے کہا: ایک بھی نہیں۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا: ”کیا آپ کو ان کے بینک اکاؤنٹ کیلئے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہوگی؟“ صاحبزادے نے کہا: ”ان کا کوئی اکاؤنٹ نہیں“۔ انہوں نے پوچھا: ”مکان کی ملکیت وغیرہ کیلئے؟“ صاحبزادے نے کہا: ”ان کا کوئی مکان نہیں۔ وہ اپنے پیچھے نیک بیوی، دو بیٹوں اور چند کتابوں اور کاغذات کے سوا کچھ چھوڑ کر نہیں گئے“۔ ہسپتال والے سخت حیرت زدہ تھے کہ ایسے انسان بھی امریکہ میں ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان پر اس حدیث نبوی ﷺ کی بشارت صادق آتی ہے جس میں ایسے شخص کو اعلیٰ درجات کی خوشخبری سنائی گئی ہے جس کے مرنے کے بعد اس پر رونے والے بھی کم ہوں اور اس کی میراث بھی کم۔ قلت بواکیہ قل تراثہ۔ اور یہ حالت اس بنا پر نہیں کہ انہوں نے فقر و فاقہ کی زندگی گذاری تھی، بلکہ یہ حالت اس شخص کی ہے جو روپے پیسے میں کھیلتا تھا اور بالآخر اپنا سب کچھ قرآن کریم کی خدمت کے حوالے کر کے ہاتھ جھاڑ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ ونقہ من الخطایا کما ینقی الثوب الأبیض من الدنس.

(ماہنامہ ”البلاغ“ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ مئی ۲۰۰۲ء)